گئو دُھول

سید محمد عقیل

گئو دھول
خود نوشت سوانح حیات

سید محمد عقیل (C)

گئو دھول : مصنف : سید محمد عقیل
قیمت : دو سو روپئے
کتابت : سید محمد خورشید جمیل
طباعت : [illegible] الہ آباد
ناشر : انجمن تہذیب نو، ۵۷ مالویہ نگر، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳ (یوپی)
تاریخ طبع : نومبر ۱۹۹۵ء
مصنف کا پتہ : محمود منزل دریا آباد، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

اس کتاب کی اشاعت میں
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

ملنے کے پتے :-

(۱) انجمن تہذیب نو، ۵۷ مالویہ نگر، الہ آباد، ۲۱۱۰۰۳۔
(۲) نصرت پبلشرس، حیدری مارکٹ، امین آباد۔ لکھنؤ۔
(۳) کتابستان، کریلی اسکیم، الہ آباد

GAU DHOOL : An Autobiography

Author : SYED MOHAMMAD AQUIL
Mahmud Manzil,
Daryabad,
Allahabad - 211003 (INDIA)

Telephone : 652335

Price : Rs. 200.00

www.taemeernews.com

فہرست

۱۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔	۶
۲۔ میرے بھائی اسے کوردہ کہا کرتے تھے۔	۱۰
۳۔ ایدل پور، میری تعلیم اور شرارتوں کی جولانگاہ۔	۱۸
۴۔ جلتا ہوا کھیت اور پٹتے ہوئے کسان۔	۲۴
۵۔ نئے دوست، نیا ماحول اور نئی شرارتیں۔	۲۸
۶۔ پھر اسکول چھوٹ گیا......	۵۲
۷۔ نیا سفر۔	۶۳
۸۔ کوشکِ سلطاں میں چند دن۔	۶۸
۹۔ پھر وہی شامِ الم۔	۷۵
۱۰۔ کراچی۔ اپنے تاریخی پس منظر میں۔	۸۶
۱۱۔ کہانیاں کیا کیا۔	۹۲
۱۲۔ نسب نامہ۔	۹۹
۱۳۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا۔	۱۰۲
۱۴۔ کہاں سے ہم کہاں۔	۱۱۴
۱۵۔ خبرِ تحیرِ عشق سن۔	۱۲۳
۱۶۔ الہ آباد آزادی کے بعد۔	۱۵۶
۱۷۔ نیا اُفق اور نئی منزلیں۔	۱۸۲

www.taemeernews.com

۱۸۔ جنگل جنگل گھوما ہوں۔	۱۹۸
۱۹۔ بمبئی ہماری باہوں میں۔	۲۰۹
۲۰۔ نظر نہیں تو کیا! نظریہ تو ہے۔	۲۲۰
۲۱۔ بارغ نشاط کے گلو۔	۲۴۲
۲۲۔ دکن ملک بھو تیج خاصا ہے۔	۲۶۰
۲۳۔ پھر الہ آباد۔	۲۸۷
۲۴۔ دامن نئے نئے ہیں۔	۳۰۱
۲۵۔ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے۔	۳۰۹
۲۶۔ ایک بے رس کہانی۔	۳۲۶
۲۷۔ لندن بارِ دگر۔	۳۳۴
۲۸۔ اگر تو آج بن میں۔	۳۴۱
۲۹۔ تازہ ہوا کے جشن۔	۳۵۱
۳۰۔ جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے۔	۳۶۰
۳۱۔ سُنار بانگلہ۔	۳۶۸
۳۲۔ معترض کے منہ سے ہے کُتّا بندھا۔	۳۷۶
۳۳۔ مگر کوئی بنارس شاہدے ہست۔	۳۸۴
۳۴۔ یوں کراچی میں ہوں۔	۳۹۶
۳۵۔ مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو۔	۴۱۵

www.taemeernews.com

اپنی بیٹیوں

ریشماں، سیما، افشاں

نیز

اپنے بیٹے

ظہیر بابر اور اس کی بیوی

ڈسپینا (DESPINA)

کے نام۔

نجفی بیگم!

تم تو میرے ساتھ میری تحریر ہی میں شامل ہو ورنہ بھلا یہ سب میں کہاں لکھ پاتا!

سید محمد عقیل

www.taemeernews.com

سب کہنے کی باتیں ہیں

سوانح حیات تو ان کے لائق مطالعہ ہوتے ہیں جو تاریخ بناتے اور بتاتے ہیں۔ یا پھر ایسے لوگوں کے جنھوں نے دنیا میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن سے ملک و قوم کی تقدیریں بدلی ہیں۔ یہ ادیبوں اور شاعروں نے کیوں اپنی سوانح عمریاں لکھی ہیں؟ ان کے بغیر دنیا کے کون سے کام بند تھے کہ انھوں نے یہ تکلف برا اٹھائی؟ چلئے فلسفی اور مشائخ بھی سہی کہ انھیں اپنے نقطۂ نظر اور افکار کی بھی وضاحت کرنی تھی۔ مگر شاعر اور ادیب کیوں؟ بات یہ ہے کہ خود نوشت سوانح، ادیب یا شاعر کی خود اپنی تلاش ہیں۔ دوسرے تو اس کے اشعار اور تحریریں پڑھ کر ہی ان کی حیثیت کے ایک رُخ کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ لیکن بہت سی باتیں زندگی کی ایسی ہوتی ہیں کہ جب تک انسان خود نہ بتائے، دوسروں کو مشکل سے معلوم ہوتی ہیں۔ پھر کبھی کبھی انسان خود اپنا بھی تجزیہ چاہتا ہے یا اپنے مصائب، مسائل اور خوشیوں کا پھر سے مزہ خود بھی لینا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کرنے کا خواہشمند۔ اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اپنے سوانح حیات کیوں پیش کرتے ہیں! بہر حال میں نے تو یہی سوچ کر یہ سب باتیں لکھی ہیں کہ زندگی کے جس کیف و کم سے میں گزرا ہوں اگر وہ کچھ دیر کے لئے دوسروں کو بھی بہلا سکیں یا پھر میری خامیاں دوسروں پر بھی عیاں ہو جائیں تو کیا ہرج ہے کہ خود نوشت ایک طرح کا کنفشن (Confession) بھی تو ہے۔ کبھی کبھی ناآسودہ خواہشات بھی، سوانح حیات میں تخیلاتی تو تے مینا بنا لیتی ہیں، جیسا کہ میں نے کہیں لکھا بھی ہے۔ مگر یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ انسان خطا و نسیان کا بہر حال مرکب ہے۔ وہ غلطیاں بھی کرتا ہے اور اس سے اچھے کام بھی انجام پاتے ہیں۔ اس میں نیکیاں بھی ہیں اور خباثتیں بھی جنھیں انسان اپنے برتاؤ سے ظاہر کرتا رہتا ہے۔ بس یہی اس کا اصل روپ ہے باقی سب ملمع۔ انسان نے

www.taemeernews.com

علم و ادب، تہذیب اور تمدّن سے اس جانور کو سدھایا ہے جو اس کے اندر چھپا بیٹھا ہے تاہم کارزار حیات میں کبھی کبھی ایسے مواقع آتے ہیں جب یہ سدھایا ہوا جانور بے مہار ہو جاتا ہے۔ پھر بقول تلسی داس ع تب لگ پنڈت، مورکھ اور تلسی ایک سمان۔ خود نوشت سوانح عمری میں ایسی صورتوں کا بھی اظہار ہونا چاہئے تاکہ انسان کے اندر چھپے ہوئے جانور کا بھی مطالعہ ہو سکے۔

راقم الحروف نے اپنی اس خود نوشت میں، ظاہر داری، بے جا تفاخر اور ادعائیت سے کہیں کام نہیں لیا ہے بلکہ پوست کندہ حالات لکھ دیئے ہیں۔ اس میں گفتنی بھی ہے ناگفتنی بھی۔ میں نے کسی کی دل آزاری کی کہیں کوشش نہیں کی ہے۔ ہاں جنھوں نے بلا سبب میری دلآزاری کبھی کی ہے صرف ان کے واقعات لکھ دیئے ہیں اور بس۔ اس بیان واقعہ میں شاید اگر کہیں تلخ صورت یا مبالغہ کی لہر پیدا ہو گئی ہو مگر واقعات سب صحیح و درست ہیں۔ ایسا نوشتے میں کہیں معاندانہ رویہ اختیار نہیں کیا گیا، اور مجھے اس میں کبھی مزہ نہیں ملتا۔ ہاں کہیں از راہ مزاح کسی کے لئے کچھ لکھ دیا ہو تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

چند الفاظ اس سوانح عمری کے نام کے سلسلے میں بھی۔ شام کے وقت، گاؤں کی طرف واپسی پر چرواہوں کے گلّے کے پیروں سے اڑتی دھول، ڈوبتے سورج کی روشنی کو دھندلا دیتی ہے۔ یہی 'گئو دھول' ہے۔ یہاں اسے ایک طرح سے 'شام زندگی' سمجھ لیجئے۔

اس کتاب کے لکھنے میں کل دس مہینے صرف ہوئے۔ اس عرصے میں میرے گھر والوں نے بڑی پریشانیاں اٹھائیں۔ اس دوران مجھ پر ایک گم سُم سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ سارا وقت یادداشتوں کو ذہن میں اکٹھا کرنے اور ان کے قلم بند کرنے میں صرف ہوتا۔ یادوں کا اکٹھا کرنا ایک خوش گوار کام بھی ہے اور جانکاہ بھی۔ چنانچہ بہت سے کام اس درمیان بگڑے کہ انھیں بر وقت نہ کر سکا۔ معلوم نہیں کتنے دوستوں کے خطوط اور ان کی محبتوں کا جواب نہ دے سکا۔ ان سے معذرت۔

www.taemeernews.com

اس کتاب کی تیاری کا اشارہ پروفیسر محمد حسن نے ایک خط میں مجھے کیا۔ لیکن ابھی تک میں نے انھیں نہیں بتایا کہ میں نے ان کی خواہش پوری کر دی۔ کتاب کی تیاری میں سب سے زیادہ مدد ڈاکٹر رفیع اللہ لکچرر کاشی ودیا پیٹھ بنارس نے کی۔ انھوں نے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تیار کرائیں۔ ڈاکٹر فخر کریم صدیقی اور اسرار گاندھی نے مجھ سے یہ سوانح زور ڈال کر لکھوائے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے بڑی صائب رائے دی کہ یہ کام ابھی قبل از وقت ہے اور ٹھہر کے کیجیے۔ بھلا اب ایسے شاگرد کہاں کہ سچ بات کہیں! ان کا شکریہ۔ جناب ماسٹر منظور حسین نقوی کراروی نے مجھے میرا نسب نامہ خود لکھ کر عنایت کیا، ورنہ میں کہاں ڈھونڈتا پھرتا۔ ان کا بے حد شکریہ۔ حسن انتظار خاں اور نگینہ جبیں نے اس کتاب کے پروف دیکھے۔ اب پروف کی غلطیوں کا عذاب و ثواب سب انھیں کی گردنوں پر۔ سید حامد رضوی، مدد گار حسین رضوی اور قاری شریف احمد خاں نے بہت سا تاریخی مسالہ فراہم کیا۔ اگرچہ یہ سب میرے شاگرد ہیں تاہم ان کا شکریہ۔ آخر میں ذوالفقار صدیقی صاحب کا بے حد شکریہ جنھوں نے کتاب کی کتابت، طباعت اور اشاعت سب کا بار اپنے ذمے لیا اور بہ حسن و خوبی اسے اتمام تک پہنچایا

ایک آخری بات یہ کہ یہ سوانح بالترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) بہ ظاہر نہیں ہیں، مگر زندگی کے ایک بڑے گھیرے میں، ان میں ترتیب پیدا ہوتی ہے۔

سید محمد عقیل

۱۵ر دسمبر ۱۹۹۴ء

الہ آباد

www.taemeernews.com

○

ہوائی قلعے بنانا آدمی کو کتنا اچھا لگتا ہے اور خاص طور پر جب کوئی ادیب یا شاعر اپنی زندگی کی سرگذشت سناتا ہے تو یہی سمجھتا ہے کہ اس کی کہانی سننے کے لئے زمانہ گوش برآواز ہے۔ ادھر اس نے اپنی سرگذشت بیان کی اور اُدھر ہر سامع اور قاری دریائے حیرت میں غرق ہو جائے گا۔ یا ادیب یا شاعر کے حالات سن کر اس پر غبطہ کرے گا۔ مگر یہ بات بھی محض ہوائی قلعہ ہی تو ہے۔ کسے پڑی ہے جو اپنے معمولات چھوڑ کر، آپ کی زندگی کے حالات سُنے گا اور اُن پر سر دُھنے گا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ مجھ جیسے کم سواد لوگ اپنی سرگذشت اس لئے بھی بیان کرنا چاہتے ہیں کہ شاید اسی بہانے ہم بھی کچھ پہچان لئے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ زندگی کے کیف و کم کا تجربہ ہم نے کیا ہے، شاید آنے والی نسلیں اس سے کچھ مدد یا عبرت حاصل کریں۔

نہ میر تقی میر اپنے سوانح ذکر میر کے نام سے لکھتے (ادیبوں میں یہ بدعت میر نے شروع کی) اور نہ شاید یہ بدعت اُردو میں رائج ہوتی۔ یہ جذبہ بھی سوانح حیات لکھنے کا محرک ہو سکتا ہے کہ ذرا اپنا محاسبہ تو کریں اور خود کو تلاش کریں۔ مگر حساس آدمی کے لئے یہ بڑی مشکل منزل ہے ہاں بے حس اور لسّان جیسا چاہتا ہے خود کو پیش کرتا چلا جاتا ہے اور لن ترانیوں کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔ کبھی یہ بھی کہ جو کام زندگی میں نہ کر سکے اُسے خیالی پلاؤ پکا کر ہی کر لیں۔ کون جانتا ہے کہ سچ کیا ہے۔ یہ منزل بھی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ ہم خواب و خیال کی دنیا میں ہیں، قلم ہمارے ہاتھ میں ہے اور پھر

نَے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ یہ سمجھ کر جو جی چاہے لکھو، کسی کو کیا معلوم۔ مگر ایسا ہے نہیں۔ اگر کسی نے تلاش کیا تو سب دُودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ میر کی سیادت سے لے کر فراق صاحب کے آئی سی ایس ہونے تک لوگ سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ تو پھر بقول میر امن دہلوی "کس برتے پر تتا پانی"؟ مگر خیر میر ہی کا مصرعہ پڑھ کر کہ "چل اے خامے بسم اللہ" اپنی روداد شروع کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

میرے بھائی اسے کوردِہ کہا کرتے تھے

دیہہ کوردِہ آج کی تحریر میں 'ایدل پور' ہے۔ مگر میرے بچپن میں لوگ اسے 'عیدلپور' لکھا کرتے تھے۔ اور پرانے لہجے میں لوگ 'عیدل پور' بولا بھی کرتے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ "عیدل" کون تھے؟ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو کراری اور منجھن پور کے درمیان، قریب قریب دونوں جگہوں سے برابر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کراری سے شمال کی جانب اور منجھن پور سے جنوب کی جانب۔ یہاں پنچانوے فی صد آبادی پاسیوں کی ہے اور پانچ فی صد میں مسلمان، ٹھاکر، برہمن اور اہیر آباد ہیں۔ میرے بچپن میں یہاں صرف دو گھر شیعہ زمینداروں کے تھے اور باقی سب ان کی رعایا۔ میرے دادا، میر علی اشرف نے ایک چھوٹی سی زمینداری خود خریدی اور اگرچہ وہ اصلاً کراری کے رہنے والے تھے مگر زمینداری کی وجہ سے عیدل پور میں مکان بنا کر ڈیلی وقتی طور سے سکونت اختیار کر لی جو بعد کو مستقل طور پر سکونت میں بدل گئی۔ صرف ایام عزا میں وہ کراری جاتے اور اپنے ایک معمولی امام باڑے میں عزاداری کرتے۔ میرے والد میر اکبر حسین دو بھائی تھے۔ میر ضامن حسین جو بعد کو ڈپٹی کلکٹر ہو گئے مگر میرے والد صرف اپنی زمینداری پر قناعت کئے رہے۔ شعر و شاعری اور ادب سے انھیں شغف تھا اور کراری کے عام ادبی مزاج کے مطابق انھیں بھی قصیدے کہنے کا ملکہ حاصل تھا جو آئمہ کی ولادت کے موقعوں پر کراری اور منجھن پور کی تہنیتی محفلوں میں پیش کئے جاتے۔ انھیں میر اکبر حسین کے گھر اکتوبر ۱۹۲۸ء میں تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اس کے والد نے محمد عقیل رکھا۔ میرے والد

www.taemeernews.com

نے اپنی پہلی بیوی اکبری بیگم کی وفات کے بعد، کراری کے محلہ بارہ دری کے ایک غریب خاندان کی بیوہ بیٹی سے عقد کیا جس کا نام شجاعت النسا تھا۔ جو ایک مفلوک الحال سیّد، مشرف علی کی بیٹی تھیں۔ یہ غریب سیّد اتنا مفلس تھا کہ کبھی کبھی جان و تن میں رابطہ قائم رکھنے کے لئے اُسے واقعی مزدوری کرنی پڑتی اور اس طرح صحیح معنوں میں پیروی مولائے کائنات حضرت علیؑ کرتا۔ مگر اپنی سیادت اسے اتنی عزیز تھی کہ اس کا قول، اس کے بھتیجے اور الہ آباد کے مشہور شاعر، مومن حسین شعلہ سنایا کرتے تھے کہ "مشرف۔ بابا، اکثر کہا کرتے کہ امیری غریبی تو چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ مگر خدا نے سیادت کا جو مرتبہ مجھے عطا کیا ہے، وہ اگر اب چاہے بھی تو واپس نہیں لے سکتا۔" مشرف علی مرحوم کا خاندان تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گیا۔ جہاں اسلام آباد میں ان کے پوتے اور ان کی ذریات آج بھی اقامت پذیر ہیں۔ ان کے ایک پوتے سیّد عاشور حسین، ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہو کر اسلام آباد میں رہ رہے ہیں۔ ہمارا اصل گھر قصبہ کراری ہی میں تھا۔ وہیں گھر اور وہیں امام باڑہ بھی۔ ہم لوگ صرف محرم میں کراری جاتے، مگر میرے چچا ڈپٹی ضامن حسین کراری ہی میں رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ قیام اور مستقل ہو گیا۔ کچے امام باڑے کو انھوں نے پکا بنا لیا اور اپنے آبائی مکان سے ملحق زمین خرید کر ایک اور بڑا مکان بنا لیا اگرچہ یہ بھی کچی اینٹوں ہی کا رہا مگر اس میں ایک وسیع باغ لگایا اور ایک اصطبل بھی اسی سے ملا ہوا بنا تھا جس میں ان کی ٹم ٹم کے دو گھوڑے رہتے تھے۔ میرے والد کا ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا تھا جو ایدلپور میں رہتا۔ کراری کا امام باڑہ، اگرچہ ہمارا آبائی امام باڑہ ہے، مگر اس کی توسیع ضامن حسین صاحب نے اس طرح کی کہ اب یہ انھیں کے نام سے مشہور ہے۔ اور کراری میں یہ ڈپٹی صاحب کا امام باڑہ ہی جانا جاتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال میرے چچازاد بھائی اظہر حسن صاحب کرتے ہیں۔ (ابھی خبر ملی کہ اظہر حسن صاحب کا کمبٹی میں انتقال ہو گیا)

میرے بڑے بھائی سید علی اصغر رضوی، جو اکبری بیگم کے بطن سے تھے! انکی اور میری عمر میں تقریباً تیس سال کا فرق تھا۔ دوسری شادی کے باعث، باپ بیٹوں میں تعلقات کشیدہ رہتے تھے۔ علی اصغر رضوی اپنی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر الہ آباد میں رہتے اور

www.taemeernews.com

خوب جم کر فیل ہوا کرتے۔ اُن کے دوستوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین بھی ان کے ہم جماعت تھے، وہ بھی خوب فیل ہوتے۔ یہاں تک کہ اعجاز صاحب کو ہائی اسکول پاس کرنے کے لئے کلکتہ جانا پڑا تب جاکر وہ ہائی اسکول پاس ہوسکے (اس وقت ہائی اسکول، اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ اکزامینیشن S.L.C. کے نام سے جانا جاتا تھا) مگر علی اصغر صاحب نے حد علم دوست اور مجلس پسند آدمی تھے اور طرح طرح کی صحبتیں دیکھے ہوئے تھے۔ الہ آباد میں وہ اپنے چچا ڈپٹی صاحب کے ساتھ اس بنگلے میں رہتے تھے جو اب بھی شکستہ حالت میں ریلوے کے اس فلائی اوور کے پاس ہے جہاں سے ہائی کورٹ کو راستہ جاتا ہے۔ یہ بات بھائی علی اصغر صاحب نے خود مجھ سے بتائی تھی۔ بھائی صاحب کے دیگر دوستوں میں خان بہادر کلب عباس جو بعد کو ٹرائیبونل کے جج بھی ہوئے۔ حیدر مہدی صاحب ایڈوکیٹ جو کانگریس کے اس وقت کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے، رانی منڈی کے نواب آغا محمود صاحب اور دریاآباد کے نواب آغا علی خاں صاحب خاص تھے۔ یہ حلقۂ دوستاں، علی اصغر صاحب کو، ڈپٹی صاحب ہی کی وجہ سے ملا تھا۔ علی اصغر رضوی پھر ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمی جنگ میں بھرتی ہو کر عراق، لام پر گئے اور پھر درسائی کی صلح کے بعد جب ہندوستان لوٹے تو انگریز حکومت نے انہیں تحصیل میں ایک معمولی سی ملازمت دے دی جس پر سے وہ ۱۹۵۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ کچھ دنوں کے لئے بیچ میں نائب تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ وہ سادات کراری میں سے پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے نام کے ساتھ 'رضوی' لکھنا شروع کیا تھا۔ کراری کے سادات اس وقت اپنے ناموں سے پہلے 'سید' بھی بہت کم لکھتے تھے۔ اپنے ناموں سے پہلے 'میر' کا سابقہ ضرور لگاتے تھے اور دوسروں کو بھی 'میر' ہی کے سابقے سے یاد کرتے تھے۔ نسب نامے میں کہیں ناموں کے ساتھ "سید" لکھا ہے اور کہیں صرف نام درج ہے۔ شجرے میں، اہلِ کراری کے مورثِ اعلیٰ کے نام کے ساتھ 'سید حسام الدین' لکھا ہوا ہے۔ جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

علی اصغر رضوی، اپنی شہری زندگی کی دلچسپیوں کے باعث ایدلپور سے متنفر رہتے تھے۔ اگرچہ بعد کو وہ اپنے بچوں کو بھی ایدلپور لائے اور یہیں سے اوسا اسکول سے ان بچوں نے

www.taemeernews.com

کچھ تعلیم حاصل کی۔ اس تنفر میں ان کی باپ سے اُن بَن کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ اسی تنفر کے باعث وہ غالباً ایدلپور کو 'کوردہ' کہا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ پورا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا اور ۱۹۵۷ء میں بھائی علی اصغر کا وہیں انتقال ہو گیا۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے، سید علی غضنفر رضوی، میرے رضاعی بھائی بھی ہیں اور مجھ سے شاید ایک یا ڈیڑھ سال چھوٹے۔ انھوں نے مشرقی علوم میں مہارت حاصل کی اور اب پاکستان میں ایک عالم دین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جن کا قلمی نام مولانا ع۔ غ کراروی ہے

O

اواخر ۱۹۲۹ء میں میرے والد سید اکبر حسین کا انتقال ہو گیا اور یہیں سے میرے لئے مصائب کا دروازہ کھل گیا۔ جیسا کہ زمیندار خاندانوں میں جائداد کے لئے ہوا کرتا ہے، ہمارے گھر میں بھی ہوا۔ علی اصغر بھائی نے تمام جائداد پر قبضہ کر کے ہمیں زمانے کے حوالے کر دیا۔ میری دو بہنوں کی شادی میرے والد نے اپنی زندگی ہی میں الہ آباد کے محلہ چک کے ایک خاندان میں کر دی تھی۔ اب صرف میری ایک بہن اور والدہ تھیں۔ میری عمر اس وقت صرف ایک سال کی تھی اور بہن تین سال کی۔ بھائی علی اصغر الہ آباد میں ملازم تھے۔ کچہری کی ملازمت نے انھیں سرد و گرم زمانہ اور زمین و جائداد کے معاملات میں خاصہ پختہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ شاید ہمیں گھر سے بے گھر کرنے کے لئے کچھ دنوں کے لئے وہ ہمیں اپنے ساتھ الہ آباد لے آئے اور کچھ دنوں اپنے ساتھ بھی رکھا۔ اس ساتھ رکھنے میں دو فائدے تھے ایک تو یہ کہ مقدمہ بازی کے داؤں پیچ کے لحاظ سے ایدلپور کی جائداد سے ہمارا قبضہ ختم ہونا چاہئے تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کا نوزائیدہ بچہ علی غضنفر اپنی ماں کے دودھ خشک ہو جانے کے باعث، میرا دودھ شریک بن گیا تھا۔ یہ دونوں صورتیں بھائی صاحب کے حق میں تھیں۔ بہرحال ان تلخیوں میں مزید جانے سے بہتر یہی ہے کہ انھیں یہیں ختم کر دینا چاہئے۔ ہم بھائی صاحب کے ساتھ الہ آباد چلے آئے اور تقریباً ایک سال تک محلہ رانی منڈی کے ایک مکان میں کہیں رہے جو مجھے کیسے یاد رہ سکتا ہے۔ ابھی ہم انھیں حالات میں تھے کہ پردۂ غیب سے ایک نئی صورت رونما ہوئی۔ میری والدہ کے پہلے شوہر کے بیٹے سید علی صفدر کو

www.taemeernews.com

انھیں دنوں جبل پور میں ایک چھوٹی سی ملازمت مل گئی اور جب وہ ایک مرتبہ ہم سے ملنے الہ آباد آئے تو ہماری کس مپرسی دیکھ کر ہمیں اپنے ساتھ جبل پور لیتے گئے کہ وہ ابھی تک چھڑے تھے یعنی غیر شادی شدہ تھے۔ غالباً ۱۹۲۳ء تک ہم جبل پور میں رہے۔ اور وہیں جبل پور میں علی صفدر عرف چھکّن میاں نے میری بسم اللہ کرائی اور خود ہی مجھے مولوی اسماعیل کی کتاب پڑھانے لگے اور اس طرح علم کی دنیا میں میں نے قدم رکھا۔ چھکّن میاں کے ہم ہی خاندان بن گئے۔ اب زیادہ باتیں تو جبل پور کے متعلق یاد نہیں ہیں۔ صرف وہاں کا ایک بچوں کا پارک گوبند بھون اور ریلوے کوارٹر کے گرد و پیش کی دنیا کی کچھ باتیں مجھے یاد ہیں۔ ہم ریلوے کوارٹر میں رہتے تھے کہ چھکن میاں کی چھوٹی سی ملازمت ریلوے ہی میں تھی اور وہیں لوکو (Loco) کے کوارٹر میں ہمارا قیام رہا۔ اتوار کے دن میرے یہ بھائی مجھے گُرندی نام کا ایک بازار گھمانے لے جاتے اور ہر طرح سے میری دلجوئی کرتے۔ عمر کے ابھی پانچ سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ میرا نام بچوں کے ایک اسکول میں لکھا دیا گیا۔ یہ اسکول محلہ بیل باغ میں تھا ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ چھکن میاں اپنی عارضی ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے اگرچہ تقریباً چھ ماہ بعد انھیں وہی ملازمت بمبئی میں پھر مل گئی، مگر ہمیں وہ بمبئی جیسے بڑے شہر میں اتنی چھوٹی سی تنخواہ پر نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے ہم کو انھوں نے پھر ایدلپور بھیج دیا، جہاں اب سوائے ایک مکان کے ہمارا کچھ بھی نہ تھا۔ ایدلپور میں ہمارا یہ پہلا مکان تھا جو پختہ بنا ہوا تھا پانچ دَر کا وسیع دعریض دالان اور اس کے پیچھے کئی کمرے اور اس سے ملا ہوا زنانخانہ۔ مگر ہماری اتنے دنوں کی غیبت سے خانۂ خالی را دیو می گیرد والی صورت پیش آئی۔ کمروں کے دروازے کھڑکیاں کہیں کہیں سے غائب اور پھر برسات میں کئی کمروں کی کچّی اینٹ کی دیواریں زمین بُوس ہو چکی تھیں۔ پھر مزید یہ کہ بھائی علی اصغر صاحب نے پورا مکان اپنے نام تحصیل میں درج کرا لیا تھا۔ جب انسان حالات اور زمانے کی بے التفاتی سے گزرتا ہے تو شاید اس کے حواسِ خمسہ بہت حسّاس اور تیز ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت میری بھی ہوئی۔ آج تقریباً چھیاسٹھ سال بعد جب یہ سب باتیں لکھ رہا ہوں تو جیسے سارے واقعات اپنی تصویریں لئے میرے

www.taemeernews.com

سامنے کھڑے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس وقت مصیبت میں سخت کلامی کرنے اور رحم دلی دکھانے والوں کے پورے پورے جملے مجھے آج بھی یاد ہیں۔ اگرچہ اس وقت میری عمر مشکل سے چھ سال کی تھی۔

سید علی صفدر عرف چھکن میاں (جو خدا کے فضل سے ابھی زندہ ہیں۔ عمر کے پچاسی سال گزار کر اب بھی اسی ایدلپور میں اقامت گزیں ہیں) ہمیں ایدلپور میں چھوڑ کر واپس اپنی ملازمت پر بمبئی چلے گئے اور وہیں سے کچھ رقم ہماری گزر بسر کے لئے بھیجتے رہے۔ میرا نام بھی انھوں نے کراری کے پرائمری اسکول میں لکھا دیا۔ کراری کا فاصلہ ایدلپور سے تقریباً دو میل کا ہے۔ مسلمانوں اور علی الخصوص زمینداروں میں اس وقت علی العموم تعلیم اور وہ بھی اسکول میں تعلیم کا رواج نہ تھا۔ گھر میں خاندانی استاد یا مولوی صاحب ہوا کرتے وہی تعلیم دیا کرتے۔ کچھ یہ بھی کہ زمیندار صاحب کا بیٹا، اسکول میں عام بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کیسے تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ پھر پڑھنے لکھنے کے بارے میں نواح کراری کے زمینداروں کا یہ مقولہ تھا کہ جس کے گھر میں کھانے کو نہیں ہوتا وہ پڑھتا ہے۔ زمینداروں کے بچوں کو صرف اتنا پڑھنا چاہئے کہ وہ اپنے کاشتکاروں کو لگان کی رسید وغیرہ دے سکیں اور مقدمے کے کاغذات پر دستخط وغیرہ کر سکیں بس۔ شیعہ زمینداروں کے گھروں میں، ایک قدم آگے یہ بھی لغو ہوا کہ ان کے بچے رسیدیں لکھنے کے علاوہ بھی اتنا پڑھ لکھ لیں کہ وہ محرم میں نوحے، مرثیے پڑھ سکیں یا ائمہ کی ولادت کے موقع پر قصیدہ خوانی کی محفلوں میں شریک ہو سکیں۔ مگر یہ صرف کراری قصبے کے زمینداروں ہی میں تھا۔ یا ان میں بھی جن کا سلسلہ کسی طرح الہ آباد کی شہری زندگی سے تھا۔ گویا قصباتی زندگی میں، یہ تہذیبی شعور بھی تھا۔ مگر کراری سے باہر ایسی استعداد تقریباً ناپید تھی۔ ہمارے گھر میں بھی علم و ادب سے دلچسپی اس لئے تھی کہ ابھی ہمارا گھر اصلاً کراری ہی میں تھا اور ایک طرح سے قصباتی زندگی کی چھاپ ہم پر باقی تھی۔ ہاں لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کی قطعی ممانعت تھی۔ محرم کے دنوں میں مرد ہی عورتوں کی مجلس یا ماتم پڑھ دیا کرتے۔ اس طرح کہ عورتوں کی مجلس کے آگے ایک پلنگ کھڑا کر دیا جاتا، اس پر ایک چادر ڈال دی جاتی اور کوئی مرد، معمر قسم کا، پس پردہ

www.taemeernews.com

ایک دو نوحے پڑھ دیتا اور بعد کو تمام عورتیں کھڑی ہو کر ماتم کر لیا کرتیں کیونکہ یہ بیچاری عورتیں پڑھی نہ تھیں اس لئے نوحے کیسے پڑھتیں؟ اس کا ایک دلچسپ قصہ ایک مرتبہ ہوا۔ ایک بزرگ جنکا نام امانت حسین عرف امنتو میاں تھا عورتوں میں نوحے پڑھنے میں بہت مقبول تھے۔ مگر عورتوں کی مجلسیں اس قدر تعداد میں بڑھ گئیں کہ امنتو میاں کہاں کہاں نوحے پڑھتے پھرتے۔ امنتو میاں خاصے بذلہ سنج آدمی بھی تھے۔ راقم نے اپنے بچپن میں انھیں دیکھا ہے۔ تقریباً اسّی کے پیٹے میں رہے ہوں گے۔ ہاں تو جب ان پر عورتوں کی مجلسوں کا دباؤ بہت پڑنے لگا اور ان کے پاس نوحوں کا اسٹاک ختم ہو گیا تو انھوں نے اپنی طباعی سے کچھ یوں ہی آئیں بائیں شائیں قسم کی باتیں نوحے کے طرز میں ڈھال لیں اور مجلسوں میں جا کر غمگین آواز میں وہ نوحے نما واقعات مرثیئے کے طرز میں پڑھ دیتے اور عورتیں یہ سمجھ کر کہ نوحہ پڑھا جا رہا ہے خوب گریہ کرتیں۔ ایک دن اتفاقیہ طور پر کسی گھر کے مرد نے سُن لیا تو امنتو میاں کا یہ راز فاش ہو گیا عورتوں نے پھر اُن کو خوب بُرا بھلا کہا مگر انھوں نے ہنس کر سب اُڑا دیا۔ ایک ایسے نوحے کے کچھ شعر مجھے یاد ہیں جو میں نے بچپن میں سُنے تھے۔ نوحہ یوں تھا ؎

- سادل گئے مرنے کو تو سادل کی متاری، کھاتی ہیں سُپاری، ارے سادل گئے مرنے کو
- واپس نہ ہوئے رَن سے تو سادل تمھیں کر یاد، میں کرتی ہوں زاری ہائے میں کرتی ہوں زاری
- منگوایا تھا بازار سے مکمل کا شلوکہ، سب میں لگا ٹوکا،
- تمباکو تلک لوٹ کے سب لے گئے ملعون، اس غم سے ہے دل خون، ہائے اس غم سے ہے دل خون

اور اسی طرح کے دو ایک نوحے تھے جو اب یاد نہیں۔ عجب لوگ تھے یہ اور عجب سماج تھا۔ کبھی کبھی اگر کوئی لڑکی لکھنے پڑھنے کی فکر کرتی تو اسے روک دیا جاتا۔ شہروں کی اگر پڑھی لکھی لڑکی کبھی کسی تقریب میں دیہات پہنچ جاتی تو لڑکیوں کی نئی نسل اس پر غبطہ کرتی۔ مگر بڑی بوڑھیاں اُسے اچھی نظر سے نہ دیکھتی تھیں کہ ان کے خیال میں صرف طوائفیں اپنا کاروبار چلانے کیلئے پڑھتی ہیں۔ میرے پاس کوئی ثبوت تو نہیں ہے مگر عورتوں میں جو ایک گالی 'علامہ' رائج تھی اس کے پس پشت بھی یہی طوائف کی نفسیات کی کارگردگی رہی ہو گی۔

www.taemeernews.com

ایک معمّر خاتون نے ایک مرتبہ اپنی پوتی کی اس لئے پٹائی کر دی کہ اس نے اپنے سر میں خوشبو دار تیل ڈال لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ صرف شادی شدہ عورتیں سر میں خوشبودار تیل ڈالتی ہیں۔ باعفت اور آئیڈیل لڑکی وہ ہے جس کے پاس سے بدبو آتی ہو اور سر سے جوئیں ٹپکتی ہوں تاکہ کوئی غیر مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ مگر یہ رسم صرف دیہاتوں میں تھی۔ (ظاہر ہے کہ یہ باتیں الہ آباد اور اس کے نواح کے علاقوں کی ہو رہی ہیں) پھر کچھ گھروں میں جن کے مرد شہروں میں ملازمت کرتے تھے، وہاں لڑکیوں کو کچھ پڑھا بھی دیا جاتا۔ مگر قرآن، احادیث اور اسی طرح کی مذہبی کتابیں ہی وہ پڑھ سکتی تھیں۔ تاہم انھیں لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ مبادا وہ خطوط لکھ کر غیر مردوں سے معاشقے نہ شروع کر دیں۔ یہ باتیں کوئی کہتا نہیں تھا مگر سب کے ذہن میں یہی خوف تھا۔ پھر کراری کے نواحی علاقوں میں جہاں نہ سڑکیں تھیں نہ آنے جانے کے راستے۔ وہاں تعلیم کے بارے میں کون سوچتا تھا؟

مُردوں میں بھی مدرسوں کی تعلیم کا رواج عام نہ ہوا تھا۔ تصوّر یہی تھا کہ مدرسوں میں وہی پڑھتے ہیں جو اس کی استطاعت نہیں رکھتے کہ گھر پہ استاد رکھ سکیں۔ گویا مدرسوں میں تعلیم حاصل نہ کرنا اس سماج میں ایک وجہِ افتخار بھی تھا۔ مگر ایدکپور میں ایسا نہ تھا۔ سب سے پہلے آدمی جنھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی وہ بھائی علی اصغر تھے۔ اس وقت کا معیارِ تعلیم یہ بھی تھا کہ جو ورناکیولر مڈل پاس کرتا وہ علم میں منتہی سمجھا جاتا تھا۔ عجیب بات ہوئی کہ ہمارے گھر میں کسی نے بھی مڈل پاس نہیں کیا اور جنھوں نے بھی اس وقت تعلیم حاصل کی وہ انگریزی ہی تعلیم تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میرے چچا ضامن حسین صاحب ہی کا اثر رہا ہو۔ یہ خاکسار تیسرا فرد تھا جس نے ایدکپور میں رہ کر علم کی خارزار وادی میں قدم رکھنے کی جسارت کی تھی اور جسے چھ سال کی عمر میں اکیلے دو میل کا دیہاتی راستہ طے کر کے پیدل کراری کے اسکول تک جانا ہوتا تھا جس میں تمام موسم بھی پنی شدت کے ساتھ شامل تھے۔

www.taemeernews.com

ایدل پور، میری تعلیم اور شرارتوں کی جولانگاہ

میر ضامن حسین اور میر اکبر حسین کی محبتیں اور رفاقتیں ضرب المثل تھیں۔ ضامن حسین اپنی محنت اور لگن سے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے تک پہنچے، جو اس وقت کسی مسلمان گھرانے کے لئے بڑے فخر و افتخار کی بات تھی۔ کچھ یہ بھی اتفاق ہے کہ اس وقت سے آج تک پرگنہ کراری اور تحصیل منجھن پور میں مسلمان گھرانوں میں سے کوئی شخص بھی ڈپٹی کلکٹر نہیں ہو سکا۔ کراری اور نواح کے زمیندار اس ملازمت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے کہ بہرحال یہ انگریز کی ملازمت تھی اور یہ بھی کہ یہ لوگ معمولی زمیندار ہیں۔ انسان اپنے افتخار کا کوئی نہ کوئی سبب ڈھونڈھ ہی لیتا ہے۔ حالانکہ کراری کے یہی زمیندار بعد کو ڈپٹی کلکٹر اور کلکٹر بننے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے مگر کسی کو کامیابی نہ مل سکی۔ ڈپٹی ضامن حسین، اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنی حیثیت کو بہتر بناتے رہے۔ کچھ دنوں کے لئے ٹیکم گڑھ اسٹیٹ (جو اب مدھیہ پردیش میں ہے) میں گورنمنٹ کی طرف سے منیجر مقرر ہو گئے۔ شاید اسٹیٹ انکم برڈ میں آ گئی تھی۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے تو نانپارہ اسٹیٹ، اتر پردیش (جو اس وقت ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کہلاتا تھا) میں منیجر مقرر ہوئے۔ پھر صحت کی خرابی کے باعث واپس آ گئے اور کراری میں ۱۹۲۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ بڑے بردبار اور منتظم قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اپنے چھوٹے بھائی اکبر حسین کا تو اتنا خیال رکھتے تھے کہ ہر ہفتے کراری سے اپنی ٹم ٹم پر ایدل پور خیریت دریافت کرنے آتے تھے

میرے والد علوم مشرقیہ کے دلدادہ تھے۔ جیسا کہ اس دور کا عام رواج تھا لیکن سید اکبر حسین کو فن شاعری سے خاصی دلچسپی تھی۔ ان کا زیادہ وقت قصیدہ خوانی کی محفلوں میں گزرتا۔ چودھری سید غلام حیدر، رئیس منجھن پور اور ان کے عزیز مظہر میاں (یہی نام مجھے معلوم ہے)

www.taemeernews.com

کے یہاں جشنِ نوروز کی محفلیں ہوتیں۔ سید اظہر حسن، رئیس رکسوارہ کے یہاں تیسری شعبان کو حضرت امام حسین کی پیدائش پر ایک بڑی محفلِ قصیدہ خوانی ہوتی جس میں صفی، ثاقب، عزیز صاحبان بطور خاص شرکت کرتے۔ میر اکبر حسین معرکے کے قصیدے لکھ کر ان محفلوں میں شرکت کرتے ان کے کچھ قصیدے یہاں کی محفلوں کے چھپے ہوئے گلدستوں میں موجود ہیں، جنہیں چودھری اظہر حسن نے شائع کرایا تھا۔ یہ محفلیں ۱۳۳۵ھ ۱۹۱۶ء تک مرحوم سید اظہر حسن چلاتے رہے۔ پھر جب ایک خاندانی جھگڑے میں ان کا قتل ہو گیا تو ان کے بیٹے بھی محافل منعقد کرتے۔ مگر مدت ہوئی کہ یہ محفلیں ختم ہو گئیں۔ مشہور سائنٹسٹ، سید ظہور قاسم اور مشہور بینکر سید شمیم کاظم انھیں چودھری اظہر حسن کے پوتے ہیں۔

یہ سب باتیں لکھنا ضروری تھا تاکہ میرا کچھ علمی و ادبی پس منظر اور میری دیگر صورتیں بھی واضح ہو جائیں۔ کراری کے اسکول سے رفتہ رفتہ مجھے الرجی ہونے لگی۔ سب سے پہلی وجہ تو اتنی دور اکیلے اسکول جانا۔ راستے میں دو ایک گاؤں پڑتے جہاں کے کتے پریشان کرتے۔ کتوں سے کون نہیں ڈرتا چہ جائے کہ صغیر سن بچے۔ اس لئے بھی کہ بقول پطرس بخاری، ان کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کب بھونکنا بند کر دیں اور کاٹنا شروع کر دیں۔ اس خوف سے اکثر اسکول سے غیر حاضر رہنے لگا۔ پھر وہ دور آج جیسا نہیں تھا۔ بلکہ استاد یہ سوچتا تھا کہ اگر بچے کی پٹائی نہ کی گئی تو بچہ خراب ہو جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ تقریباً یہی صورت انیسویں صدی کے یورپ میں بھی تھی۔ انگریزی زبان میں مشہور کہاوت تھی کہ 'SPARE THE ROD AND SPOIL THE CHILD'

چنانچہ غیر حاضری کے باعث اسکول میں میری خوب پٹائی ہوتی۔ کسی عذر کی شنوائی نہ تھی۔ پھر مزید یہ ہوا کہ چھکن میاں کی شادی انھیں دنوں آپڑی اور الٰہ آباد آنے جانے اور شادی کی تکمیل میں تقریباً ایک ماہ تک اسکول جانا نہ ہوا۔ گھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو اسکول جا کر اس لمبی غیر حاضری کی صفائی استاد سے پیش کرتا۔ چنانچہ پٹائی کے خوف سے میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ گھر سے کتابیں لے کر صبح اسکول کے وقت نکلتا مگر اسکول جانے کے بجائے کھیتوں اور باغوں میں گھومتا پھرتا اور ہر فصل کا مزہ لوٹتا۔ برسات ہے تو تالاب میں پیراکی کی

www.taemeernews.com

مشقیں کرتا، جاڑوں میں امرود کے باغوں میں کنجڑوں کے لڑکوں کے ساتھ بُلبلیں پھنساتا اور اس کام کے لئے برگد کے پیڑ پر چڑھ کر اس کے پتوں سے دودھ جمع کرکے لاسہ بناتا جو بُلبل پھنسانے کے کام آتا۔ کبھی کسی جاتی ہوئی بیل گاڑی پر بیٹھ کر جوائے رائڈ (Joy - Ride) کرتا اور شام کو گھر لوٹ آتا۔ گھر میں تھا ہی کون جو مجھ سے حساب کتاب کرتا۔ ایک ماں اور ایک بہن جو خود ہی علم کی روشنی سے بیگانہ تھیں۔ اسی زمانے میں اپنے گاؤں کے ایک پاسی کے لڑکے سے جو میرا ہم سن تھا، دوستی ہوگئی۔ دوستی کیا، گویا ساتھ ہوگیا تھا کہ دوستی تو برابر والوں ہی سے ہوتی تھی۔ اس وقت تک زمینداروں کے بچّوں کا بھی احترام گاؤں میں ہوتا تھا۔ اوّل تو ہم کو یہ ہدایت تھی کہ گاؤں کے اندر سے نہ گزرا کریں کہ یہ ہمارے منصب کے خلاف تھا۔ اور اگر کبھی گاؤں کے اندر سے گزرنے کا موقع آتا تو گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی چھ سال کے بچّے کے احترام میں اپنے پلنگ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور جب تک ہم گزر نہ جاتے کسی کی مجال نہ تھی کہ پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ تو پاسی کا لڑکا اپنے گھر سے سُور چَرانے گاؤں کے باہر جنگل کی طرف جاتا اور میں اپنی کتابوں کا بستہ لئے گاؤں سے باہر نکل کر اس سے جا ملتا۔ یہ پاسی کا لڑکا جس کا نام ،رام کھلاون تھا۔ ہم لوگ اسے کھلونا کہتے تھے۔ یہاں زمینداروں کی ایک عجیب و غریب سیکالوجی کا بتا دینا مناسب ہے۔ زمیندار صرف اپنے برابر والوں کا نام تو قاعدے سے لیتے تھے لیکن جنہیں انھوں نے اَراذل سمجھ رکھا تھا اُن کا نام ضرور بگاڑ کر لیتے تھے تاکہ اُنھیں ہر وقت اپنی سماجی پستی کا احساس رہے۔ چنانچہ شمالی ہند کے یا کم از کم اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں یہی اخلاقیات کام کرتی تھی۔ ہم چھوٹے تھے مگر تقریباً ساٹھ ستّر سال کے بزرگ کو، اگر اس کا نام کندھئی یا رام کھیل ہے تو ہم اُسے کندھیا یا رام کھِلوا ہی کہہ کر بلاتے تھے اور یہ 'بندگی خوگرفتہ' شخص اسی نام سے ہماری آواز پر دوڑتا ہوا آتا تھا اور خوش ہوتا تھا کہ ہم نے اُسے یاد کیا ہے۔

ہاں تو کھلونا گلّی ڈنڈے کے کھیل میں بڑا ماہر تھا۔ گاؤں میں کوئی بھی گلّی اس سے زیادہ دور تک نہیں پھینک سکتا تھا۔ میں برابر اس سے ہار جاتا اور بے حد کھسیانا ہوتا۔ پھر اس کو زک دینے کے لئے کسی پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ جاتا اور مولوی اسماعیل کی کتاب نکال کر پڑھنا شروع

www.taemeernews.com

کر دیا اور کھلونا کو بھی اس کتاب کے چھوٹے چھوٹے قصے سناتا، جنہیں وہ بڑی حیرت سے سنتا کیونکہ وہ پڑھ نہ سکتا تھا۔ نہ ہی وہ کسی اسکول سے واقف تھا۔ گویا اس طرح میں کھلونا سے اپنی شکست کا بدلہ لیتا۔ پھر ایک دن گلی دور تک پھینکنے کا راز مجھے معلوم ہو گیا۔ میں اپنے ایک عزیز کے یہاں دعوت میں قریب کے گاؤں میں گیا۔ وہاں میرے عزیز کا بچہ گلی کھیل رہا تھا۔ میں بھی شریک ہو گیا جب میں نے وہ گلی ڈنڈے میں ماری تو گلی اُمید سے زیادہ دور تک چلی گئی۔ میں نے اپنے وقتی ساتھی سے گلی کے دور جانے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ گلی 'ہیر' کی بنی ہوئی ہے اور اس لئے بھاری ہے اور اسی لئے یہ دور تک چلی جاتی ہے (ہیر اصلاً درخت کے تنے کے آبنوس کو کہتے ہیں) میں نے اپنے ساتھی سے وہ گلی مانگی مگر اس نے دینے سے انکار کیا۔ مگر چلتے وقت میں اس کی گلی چرا کر اپنے گھر لیتا آیا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی میں نے رام کھلاون کی راہ دیکھنی شروع کی اور جب وہ اپنے سُوروں کا ریوڑ لے کر نکلا تو میں بھی اپنی کتابوں کا بستہ اور ہیر کی گلی لے کر نکلا۔ پھر میں نے اُسے چیلنج کیا۔ ظاہر ہے کہ پہلی ہی بار میں میری گلی اسکی گلی سے آگے نکل گئی تھی۔ اس نے دوبارہ کوشش کی مگر ہیر کی گلی کے آگے اس کی گلی پتے کی طرح اڑ کر جلد گر جاتی۔ اس طرح میں نے اس پر اپنے ہتھیاروں کی بہتری کے باعث فتح حاصل کی۔ مگر کھلونا کے پاس اور بہت سے فن تھے۔ وہ پیڑ پہ بندر کی طرح چڑھ جاتا اور آم جامن توڑ کر لے آتا۔ میری مشق پیڑ پہ چڑھنے کی اتنی نہ تھی کھلونا مجھے جامن کھانے کو دیتا مگر میں انکار کر دیتا کہ اس میں میری توہین تھی۔ وہی میر حسن دہلوی والی بات کہ بیوں میں کسی کے بہورے سے کیوں؟ چنانچہ میں نے بھی پیڑ پہ چڑھنے کی مشق کی اور رفتہ رفتہ پڑھنا لکھنا تو سب پس منظر میں چلا گیا، اب یہی سب فن اپنی مشق میں رہنے لگے۔ روز کسی کے آم پہ چڑھ کر کچے پکے آم توڑ لانا، تالاب میں تیراکی کی مشقیں کرنا اور پھر اپنے ہم سنوں میں کھیلنا اور پھر ہار جانے پر ان کی پٹائی کرنا اور ذرا ذرا سی بات پر ان سے جھگڑنا۔ اسی زمانے میں میاں جی نام کے ایک شخص کہیں سے آئے اور بھائی علی اصغر صاحب کے یہاں قیام پذیر ہو گئے۔ انھیں لاٹھی چلانے کا بڑا اچھا فن آتا تھا۔ ان کے پاس ایک آبنوسی رنگ کی تیل پلائی ہوئی لاٹھی تھی۔

www.taemeernews.com

جو پانی میں ڈوب جاتی تھی۔ انھوں نے لاٹھی چلانے کا فن لوگوں کو سکھانا شروع کیا۔ میں نے اپنی دلچسپی سے یہ فن بہت اچھی طرح میاں جی سے سیکھ لیا۔ اس زمانے میں دیہات کا یہی سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ میں صورت گنج، جہاں لاٹھیاں بنا کرتی تھیں جا کر ایک بہت اچھی لاٹھی خرید لایا۔ اور اُسے تیل پلانا شروع کیا۔ کوشش یہ تھی کہ یہ بھی میاں جی کی لاٹھی کی طرح ہو جائے۔ بہت کچھ یہ لاٹھی اچھی تو ہوئی مگر وہ بات کہاں؟ کسی نے بتایا کہ مانڈہ اور مرزا پور کی لاٹھیاں سب سے اچھی ہوتی ہیں۔ وہاں سے لاٹھی منگانی چاہیے۔ خیر میں مرزا پور تو نہیں گیا مگر اپنے بہنوئی اختر حسین صاحب کی مدد سے مانڈہ سے ایک لاٹھی منگالی۔ مانڈہ کے راجہ کے یہاں میرے بہنوئی کا کچھ درخور تھا۔ چند دنوں میں لاٹھی چلانے کی میری شہرت قریب کے گاؤں میں پھیل گئی۔ (ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب "میری دنیا" میں، میری ایسی کچھ دلچسپیوں کا تذکرہ کیا ہے) لاٹھی چلانے کے فن نے مجھے بے حد بیباک اور نڈر بنا دیا، اگرچہ میری عمر ابھی دس سال سے زیادہ نہ تھی، مگر دیہات کے لاٹھی چلانے والوں نے میرے فن کا احترام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ نوجوان لاٹھی کے ہاتھ اور پینترے بھی مجھ سے پوچھنے آتے تھے۔ گاؤں کے ایک نوجوان ٹھاکر رگھو بیر سنگھ نے مجھ سے لاٹھی چلانے کا فن بھی حاصل کیا۔ (ابھی چھ ماہ ہوئے کہ رگھو بیر سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ لاٹھی کے فن میں وہ اکیلے میرے شاگرد تھے۔) زمینداروں کے گھرانے کا یہ دستور تھا کہ وہ فن تو جتنے چاہیں حاصل کر لیں لیکن اُسے اپنا پیشہ نہ بنائیں۔ اب دیہات کی زندگی کا صرف ایک ہی فن رہ گیا تھا جس سے میں واقف نہ تھا اور وہ تھا کشتی گیری کا فن۔ میں نے ادھر بھی توجہ کی۔ ڈنڈ، مگدر، کسرت سب شروع کیے اور اکھاڑے میں چھوٹی موٹی کشتیاں بھی لڑنے لگا مگر اس میں دور تک نہ جا سکا۔ کیونکہ جسمانی لحاظ سے میں کمزور تھا۔ میرے دوست نصیر حسن نے اس فن میں کافی مہارت حاصل کی۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

اور پھر جب گاؤں کے مشقی اکھاڑے میں ایک دن ایک اہیر کے لڑکے مٹھو نے مجھے چاروں خانے چت کر دیا تو میں نے کشتی لڑنا چھوڑ دیا کہ اس میں میری ہیٹی تھی۔ کشتی گیری میں میرے والد اور میرے بھائی علی اصغر صاحب نے بھی مہارت حاصل کی تھی مگر کبھی پبلک اکھاڑے یا کسی دنگل کا رُخ نہیں کیا تھا کہ یہ زمینداروں کا طریقہ نہیں تھا۔ میرے والد چھ فٹ کے لمبے چوڑے انسان تھے۔ تقریباً یہی طول و

www.taemeernews.com

عرض بھائی علی اصغر کا بھی تھا۔ مگر میں پیدائشی کمزور تھا۔ پھر بچپن کی پریشان حال زندگی نے مجھے نہ بلند قامت ہونے دیا اور نہ جسیم۔

ابھی میری یہ مشقتیں جاری تھیں کہ بمبئی سے میرے دوسرے بھائی علی صفدر عرف چھکن میاں ایک مرتبہ اید لپور آئے۔ انھوں نے میری یہ حالت دیکھی تو ایک دن مجھے لے کر پھر اسکول گئے اور معافی تلافی کے بعد میں نے پھر اسکول جانا شروع کر دیا۔ کراری کے اسکول میں مولوی جمال الدین میرے نگراں ہوئے جو میری نانہال، بارہ دری ہی کے رہنے والے تھے۔

○

www.taemeernews.com

جلتا ہوا کھیت اور پٹتے ہوئے کسان

اب صحیح سن تو یاد نہیں رہ گیا کہ بہت سے واقعات گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ بلکہ دیہات میں کانگریس کا خاصہ زور تھا۔ ایدلپور جیسے گاؤں میں جس کی آبادی مشکل سے ڈیڑھ دو سو آدمیوں پر مشتمل تھی، ہر شام کو کانگریس کا جھنڈا لے کر عام کسان جلوس نکالتے، جس میں کھیت مزدور اور کسان، بڑے چھوٹے سبھی شامل ہوتے۔ صرف زمیندار اس جلوس سے الگ رہتے کہ کانگریس میں زمین داریاں ختم کرنے کی بھی کبھی کبھی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے کانگریس کے ہمدردوں کا یہ جلوس زیادہ تر کھیت مزدوروں اور کسانوں ہی کا ہوتا تھا۔ اور جلوس بھی کیا صرف پندرہ بیس آدمی ہوتے جن کے اپنے کھیت نہیں تھے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ تو زمینداروں سے لگان پر کھیت لیتے تھے۔ اور پیداوار جیسی بھی ہوتی وہ لگان پر کھیت لینے والے کبھی اس قابل نہ ہوتے کہ زمیندار کا لگان ادا کر سکتے۔ نتیجے کے طور پر، زمیندار یا تو کھلیان ہی سے ان کا غلّہ اپنے لگان کے عوض میں لے لیتے یا پھر انھیں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر پیسہ وصول کرتے۔ کانگریس نے کسانوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر انگریزوں سے حکومت حاصل کرے گی تو زمین پر کسانوں کو مالکانہ قبضہ دیدے گی۔ اس طرح کانگریس نے کسانوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ چنانچہ روز شام کو یہ کسان جلوس نکالتے اور نعرے لگاتے۔ نعرے کچھ اس طرح کے ہوتے۔

جھنڈا اونچا رہے ہمارا — وجئی، وشوا، ترنگا پیارا

اس جھنڈے کی شان نہ جاوے — چاہے جان بھلے ہی جاوے

لندھن سے انکھیں ملاتا جواہر — ولایت سے کپڑے دھُلاتا جواہر

کانگریس کے والنٹیر، اسکولوں میں بھی پہنچتے۔ استاد اور لڑکے کانگریس کی چھوٹی چھوٹی میٹنگ کرتے مگر بہت چھپا کر کہ اسکول بہر حال گورنمنٹ کے تھے۔ ہمارے اسکول میں ایک منشی جگ نندن

www.taemeernews.com

پر سادھے۔ انھیں اُردو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ گاؤں کی طرف سے اسکول کی ایک میٹنگ میں انھوں نے ایک نظم سنائی۔ نظم انگریزی حکومت کے خلاف تھی۔ جب وہ نظم سنا رہے تھے تو بار بار اِدھر اُدھر دیکھتے بھی جاتے تھے کہ کوئی سرکارِ انگلشیہ کا آدمی تو نہیں ہے۔ ایک شعر اس نظم کا یاد ہے ؎

تو انگلستان کے سب بندروں کا منہ ہوا کالا ؎ ہوا، موتی سے پیدا جب جواہر لال سا لالا

اگرچہ اس میں تمام رعایات لفظی تھیں مگر جواہر لال کا نام آجانے پر سبھوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ایک شام جب ایدل پور میں کانگریس کا یہ جلوس نکلا ہوا تھا جس میں گاؤں کے مزدور قسم کے مسلمان اور ہندو سبھی شامل تھے تو یکایک زمینداروں کے ارہر کے کھیت میں کسی نے آگ لگا دی کھیت سوکھا ہوا تھا بس بالکل سرو چراغاں بن گیا۔ سارا گاؤں آگ بجھانے کے لئے ٹوٹ پڑا جن لوگوں کے کھیت اس جلتے ہوئے ارہر کے کھیت کے قریب تھے وہ بالکل سہم گئے اور جھنڈا وغیرہ پھینک کر اپنے کھیتوں کو بچانے کی فکر کرنے لگے۔ آگ کس نے لگائی یہ تو پتہ نہ چلا مگر عام خیال یہی ہوا کہ انھیں جلوس اٹھانے والوں میں سے کسی نے آگ لگائی ہوگی۔ دوسرے دن آس پاس کے گاؤں سے کانگریس کے والنٹیر اکٹھا ہوئے اور ایک بہت بڑی سبھا ہوئی۔ اب تقریریں تو یاد نہیں مگر نتیجہ یہی نکلا کہ کسانوں کو پریشان کرنے کے لئے جو تقریباً سارے کے سارے کانگریس سے ہمدردیاں رکھتے تھے، زمیندار کے کسی کارندے نے ایسا کیا ہوگا۔ اس لئے زمینداروں کا سوشل بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ زمینداروں پر بہت سی پابندیاں لگا دی گئیں۔ کنویں سے انھیں پانی نہ بھرنے دیا جائے۔ ان کے جانوروں کو گاؤں کی کسی چراگاہ میں کوئی چرانے کے لئے نہ لے جائے، نہ کوئی ان کا بیگار کرے اور نہ بازار سے سودا وغیرہ لائے۔ کہنے کو تو ہم تمام بچے، کانگریس کا جھنڈا اٹھاتے تھے کہ یہ ہمارے لئے ایک مشغلہ بن گیا تھا مگر ہم بھی سے کچھ تو آخر زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہی تھے۔ شاید گاندھی جی اور کانگریس نے اس وقت لگان نہ دینے کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ کسان دل و جان سے اس نعرے کا پالن کرنے لگے۔ جب لگان بند ہوا تو زمینداروں کی آمدنی بھی بند ہوئی۔ زمینداروں نے سرکاری مطالبہ دینا اسی عذر کے تحت بند کر دیا شاید کانگریس کی بھی یہی پالیسی اور اسٹریٹجی (STRATEGY) رہی ہوگی۔ مگر اس کا خراب اثر یہ ہوا

www.taemeernews.com

کہ زمینداروں کی زمینداریاں قُرق تحصیل ہو گئیں۔ یعنی اب سرکار اپنے کارندے بھیج کر خود لگان وصول کرے گی۔ ایدلپور پر ان حالات میں قیامت ٹوٹ پڑی۔ سرکاری عملہ گاؤں میں داخل ہوا اور ظلم و جبر سے مطالبہ وصول کرنے لگا۔ پولیس اور اہل کار لوگوں کے گھروں کا سامان نیلام کرنے لگے۔ مگر وہاں سامان ہی کیا تھا۔ دن بھر بھوکے پیٹ کام کرنے والے کسانوں کے یہاں، سوا چند سیر جوار، باجرہ یا چنے کے اور کیا دھرا تھا۔ کچھ تھوڑے بہت برتن بھی کچھ لوگوں کے یہاں نکلے۔ جن میں بس لوٹا، تھالی جیسی چیزیں تھیں۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ سرکاری عملہ اس تھوڑے سے غلّے کو زمین پر بکھیر دیتا اور کسانوں اور ان کھیت مزدوروں کو دھوپ میں کھڑا کر کے زد و کوب کرتا۔ ایک ڈفالی، فیض اللہ نامی، دھوپ میں کھڑے کھڑے، پیاس کی شدت سے جاں بلب تھا، وہ میرا پڑوسی بھی تھا۔ اُس نے مجھ سے اشاروں سے پانی مانگا۔ میں جھٹ سے اپنے گھر سے ایک لوٹے میں پانی لا کر فیض اللہ کو پانی پلانے لگا۔ اسی اثنا میں ایک سرکاری اہل کار نے دیکھ لیا۔ دوڑ کر اس نے مجھے ایک طمانچہ مارا اور لوٹے کا سب پانی وہیں زمین پر پھینک دیا۔ فیض اللہ اسی طرح پیاسا رہ گیا۔ لطف کی بات یہ ہوئی کہ مجھے طمانچہ مارنے پر سرکاری اہل کار کی سرزنش ہوئی، جب افسروں کو معلوم ہوا کہ میرا تعلق کسی زمیندار گھرانے سے ہے۔ تمام تنبولی، ڈفالی اور پاسی کسان اپنے کھیتوں سے بے دخل کر دیئے گئے اور یہ کھیت سرکار انگلشیہ کے گوینداروں کے نام کر دئے گئے۔ ایک پاسی کی عورت ننگی کر کے گاؤں میں گھمائی گئی۔ اس لئے کہ اس کا شوہر اُن کانگریسی جلسے جلوسوں میں بہت آگے آگے رہتا تھا۔ پورے گاؤں میں دہشت گردی کا راج تھا لیکن افسوس کہ جب ہندوستان آزاد ہوا تو ایدل پور کے کسی کسان کو کوئی معاوضہ نہ ملا اور نہ ایدلپور سے کوئی "سوتنترتا سینانی" (Freedom Fighter) سمجھا گیا۔ نہ کسی کو اس کے کھیت واپس ملے۔ پھر نئی حکومتوں کے کارندوں نے فیض اللہ کو پاکستانی اور کھلونا کے باپ کو "بغیر سفارش کا ٹٹو" سمجھ کر دونوں کے جذبۂ حریت کو پامال کر ڈالا۔ انھیں کوئی حیثیت نہ ملی۔ وہ جیسے پہلے کھیت مزدور تھے ویسے ہی رہے۔ یہاں تک کہ ابھی کچھ دنوں پہلے اُن کا انتقال ہو گیا۔ ایدلپور میں پاسی چمار سب ایک تالاب کے کنارے دفن ہوتے تھے اور مسلمان

www.taemeernews.com

اپنے باغوں میں یا اپنے پیڑوں کے تلے۔ کھلونا کا باپ اور دوسرے کانگریسی جھنڈا اٹھا کر چلنے والے پاسی چمار جس تالاب کے کنارے دفن ہوتے تھے، نئے ہندوستان کی نئی حکومت کے افسر چک بندی نے اس تالاب کو بنجر زمین قرار دے کر، ایک خواستگار سے کچھ رقم لے کر اس کے نام کھیت درج کر دیا۔ پاسی چمار لاکھ کہتے رہے کہ یہ ہمارا قبرستان ہے۔ آج وہاں، ان کے آباؤ اجداد کی قبر پر دھان کا کھیت کھڑا رہتا ہے۔

ع سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں۔ اور فیض اللہ کے گھر والوں نے جب خاندانی جھگڑوں میں اپنا باغ بیچ ڈالا تو خریدنے والوں نے باغ کے درخت لکڑیوں کے لئے بیچ کر باغ کو کھیت بنا ڈالا۔ اب وہاں گیہوں اور چنے کی کھیتی ہوتی ہے۔ کیا مساوات ہے؟! اصل سوتنترتا سینانیوں کا یہ انجام ہوا۔ جب کہ بہت سے دھوکے باز، سوتنترتا سینانی بن کر مزے کر رہے ہیں۔

○

www.taemeernews.com

نئے دوست، نیا ماحول اور نئی شرارتیں

کسی طرح نشتم پشتم درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد میرا داخلہ کراری کے مڈل اسکول کی پانچویں جماعت میں ہو گیا اور میں پابندی سے اسکول جانے لگا۔ یہاں میرے ایک نئے دوست نصیر حسن نامی ہو گئے جو اسی مڈل اسکول میں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے اور ایدلپور سے ملے ہوئے ایک دوسرے گاؤں، دلپور کوتاری میں رہتے تھے۔ ان کے والد سید صغیر حسن ایک پڑھے لکھے شائستہ قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ مدتوں حیدرآباد دکن میں رہے تھے۔ ان پر شہری تہذیب کی پالش بہت اچھی تھی۔ صغیر حسن صاحب کے والد سید وزیر حسن، مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی پیشکاری میں کہیں ملازم تھے (صغیر حسن صاحب اکثر حیدرآباد کا جب ذکر کرتے تو یہ سب ضرور بتاتے) صغیر حسن صاحب بے حد متوازن اور نستعلیق قسم کے آدمی تھے اور علم و ادب پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے۔ کوتاری جیسے بنجر دیہات میں انھوں نے ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ جس سے میں نے بعد کو بہت فائدہ اٹھایا۔ مگر ابھی اس قصے کو چھوڑتے ہیں۔ صغیر حسن صاحب کے بیٹے سید نصیر حسن مجھ سے عمر اور تجربے، دونوں میں بڑے تھے۔ اور میری ہی طرح وہ بھی کھلنڈرے تھے۔ کچھ گراں گوش بھی تھے۔ ان سے باتیں کرنے میں خاصی انرجی صرف کرنی پڑتی تھی۔ مگر ہمسایہ اور ایک ہی اسکول میں پڑھنے اور بہت کچھ ایک جیسی عادتوں نے رفتہ رفتہ ہمیں یاجوج ماجوج بنا دیا۔ تقریباً ہر وقت ساتھ رہتے اور طرح طرح کی فنٹاسٹک اسکیمیں بناتے۔ نصیر حسن بھی کشتی لڑتے پیراکی، پیڑ پر چڑھنے اور اسی طرح کے دوسرے شوق کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے موتیا نام کا ایک کتا بھی پال رکھا تھا۔ اکثر اتوار کو ہم لوگ پروگرام بنا کر پاس کے ایک جنگل میں، موتیا کو لے کر مور پکڑنے یا لومڑیوں کو دوڑانے کا مشغلہ کرتے۔ نصیر حسن بھی جسیم تو نہ تھے مگر بڑے چھوٹ کے آدمی اور لڑنے بھڑنے میں بھی طاق تھے۔ مگر کسی سے بلا سبب نہ الجھتے۔ غرض کہ ہم دونوں مل کر رابنسن کروسو کی

www.taemeernews.com

زندگی بسر کرتے۔ ایک مرتبہ اسکول جاتے ہوئے راستے میں ایک تالاب میں مرغابیوں کے کچھ بچے تیر رہے تھے۔ ہم انھیں دیکھ کر تقریباً دیوانے ہو گئے۔ جھٹ کپڑے اتار کر تالاب میں کود پڑے اور دوپہر تک ہم نے کئی بچے پکڑ لئے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہوا کہ ان کو گھر کیسے لے جائیں۔ چنانچہ ہم لوگوں نے اپنی اپنی قمیصوں کی جھولیاں بنائیں اور ان میں ان بچوں کو قید کر کے گھر واپس ہوئے۔ کمہار کے یہاں سے ایک ایک ہودہ لیا اور اس میں پانی بھر کر ان بچوں کو پالنے لگے۔ لیکن چار پانچ دنوں بعد وہ بچے مر گئے۔ بھادوں کا مہینہ تھا۔ خوب زوردار بارش اس سال ہوئی تھی۔ ایدل پور سے آگے ایک بہت بڑا تال تھا۔ اس تال کے بیچ بیچ پانی کی قدِ آدم گہرائی میں سارس نے انڈے دیئے تھے۔ ایک دن ایک پاسی کے لڑکے نے ہم کو یہ خبر دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک اتوار کو ہم اپنی اپنی لاٹھیاں لے کر تال میں اتر گئے۔ پانی میں تقریباً آدھے میل جانے کے بعد لمبی لمبی گھاس کے درمیان، گھاس کا ایک چھوٹا سا بجرہ سطحِ آب پر تیر رہا تھا جس کے ایک کنارے پر نر سارس بیٹھا مادہ کو انڈے سیتا ہوا دیکھ رہا تھا، اور حفاظت بھی کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنے لحیم شحیم شہپر تول کر دوڑا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے مگر ہم لاٹھیاں تان کر نر سارس پر پل پڑے اور مادہ کو بھی پانی میں لاٹھیاں مار مار کر بھگا دیا۔ اب انڈے ہماری گرفت میں تھے۔ ٹینس بال سے بھی بڑے بڑے لمبوترے سفید رنگ کے انڈے۔ ہمیں ایسی خوشی ہوئی جیسے ہم نے پانی پت کا میدان جیت لیا۔ پہلے تو خیال آیا کہ انڈے لے چلیں۔ پھر نصیر حسن کی رائے ہوئی کہ جب بچے نکل آئیں تو لے چل کر پالیں گے۔ چنانچہ ہم انڈے چھوڑ کر واپس چلے آئے۔ پھر دس پندرہ دن بعد گئے تو سارس گھاس کا بجرہ بہا کر کہیں اور لے کر چلے گئے تھے اور ہم بے نیل مرام واپس لوٹ آئے۔ مور اور لومڑیوں کے پکڑنے کا جب پروگرام بنتا تو صبح ہی سے مویا کوٹے کر ہم لوگ جنگل میں داخل ہو جاتے۔ بھوک لگتی تو لوگوں کے کھیتوں یا فصلوں سے اپنا پیٹ بھرتے۔ کس کی مجال تھی کہ وہ زمینداروں کے لڑکوں سے تعرض کرتا۔ پیاس لگتی تو ایکھ کے کھیتوں میں گھس جاتے اور ایکھ یا گنے سے پیاس بجھاتے۔ کراری اور ایدل پور میں ابھی کچھ لوگ ہماری اس زندگی سے واقف زندہ و سلامت موجود ہیں۔ نصیر حسن اب کراچی میں رہ رہے ہیں۔

www.taemeernews.com

ہمارے اسکول کے راستے میں ایک پاسی نے ایک کتا پال رکھا تھا۔ وہ اکثر ہمیں پریشان کرتا۔ ایک دن اسکیم بنی کہ موتیا کو لا کر اس سے لڑایا جائے تب یہ ٹھیک ہوگا۔ چنانچہ نصیر حسن نے پندرہ بیس دن تک اپنے کتے کو خوب دودھ پلایا اور ایک چھٹی کے دن موتیا کو لے کر ہم لوگ اس پاسی (نام اس کا بھوروا پاسی تھا) کے کتے کی طرف سے گذرے۔ مثل مشہور ہے کہ اپنے گھر پر کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ چنانچہ بھوروا کا کتا اپنے پالے میں موتیا کو دیکھ کر اس پر لپکا۔ نصیر حسن موتیا کی پشتی پر تھے۔ انھوں نے موتیا کو لوہا دیا۔ بس پھر کیا تھا جنگ شروع ہوگئی۔ جب موتیا پیچھے ہٹنے لگتا نصیر حسن اسے پھر للکارتے۔ تھوڑی دیر کی جنگ و جدل کے بعد موتیا نے پاسی کے کتے کو پچھاڑ دیا۔ وہ کتا بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گیا۔ پھر کیا تھا تماشائیوں نے تالیاں بجا دیں ہم لوگ مظفر و منصور واپس ہوئے اور سمجھے کہ پاسی کا کتا ہمیشہ کے لئے اب ہم سے دب گیا۔ مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ اب تو وہ کتا ہمارا اور دشمن ہوگیا۔ ہمارے وہاں سے گزرنے کا جیسے اُسے وقت معلوم ہوگیا اور جب وہ وقت قریب آتا تو وہ اپنے دروازے پر کھڑا ہو کر ہم پر اس وقت تک بھونکتا رہتا جب تک ہم نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ یہ کتا گویا "نواب" کا کتا ہمارے لئے بن گیا کہ خواہ مخواہ ہم پر عف عف کرتا۔ موتیا کی اس کامیابی سے اس کی ہمت بڑھی ہو یا نہ بڑھی ہو مگر ہماری ہمت ضرور بڑھ گئی۔ ہم نے کتے لڑانے کا ایک منصوبہ بنایا۔ کوتاری کی آبادی میں ایک پنڈت اومادت تھے۔ انھوں نے بھی ایک کتا پال رکھا تھا۔ یہ کتا بھی ایک طرح کا TERROR تھا۔ بیچ راستے میں لیٹا رہتا اور ہر آیند و روند پر عف عف کرتا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔ ایک دن اسکیم بنی کہ یہ منزل بھی سر کرنی چاہئے مگر مشکل یہ تھی کہ وہ ایک برہمن کا کتا تھا اور برہمن بھی مندر کا پجاری۔ مگر ہم نے اس کتے سے بھی نپٹنے کا پلان بنایا۔ یہ طے ہوا کہ پہلے روٹی دکھا کر کتے کو اس کے دروازے سے آگے بلایا جائے پھر جنگ شروع کرائی جائے۔ نصیر حسن اپنے گھر سے روٹی لائے اور اسی ترکیب پر عمل کیا۔ کتا جیسے ہی اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹا اور کچھ فاصلے تک روٹی کے لالچ میں آیا موتیا اس پر پل پڑا۔ شور مچا تو پنڈت جی گھر سے نکل آئے۔ یہ منظر دیکھ کر بے حد خفا ہوئے اور اپنے کتے کو بلانے گئے مگر معرکہ

www.taemeernews.com

صاحب سے شکایت بھی کر دی۔ ہم لوگوں پر خاصی ڈانٹ پڑی۔

آموں کی فصل تھی۔ ہمارے بھی چھوٹے بڑے تخمی آم کے درخت تھے۔ ایک چھوٹا سا باغ بھی تھا جو کرار ی جاتے ہوئے کچی سڑک کے کنارے تھا (اب یہ سڑک پختہ ہو گئی ہے) یہیں نصیر حسن کا بھی ایک بڑا باغ تھا۔ ہم لوگ صبح شام آموں کے باغ میں جاتے اور اگر آندھی آجاتی تو آموں کے جھابے بھر کر آم لاتے۔ راستے میں شیو موہن راؤ نام کے ایک بھاٹ کا اکیلا آم کا پیڑ تھا۔ وہ بہت مزے دار آم تھا۔ پیلے پیلے رنگ کے بڑے بڑے آم اس میں لٹکتے رہتے۔ ایک آدمی دن رات اس کی نگرانی کرتا اور کسی کو آم توڑنے نہ دیتا۔ ہم لوگ ان آموں کو دیکھ کر بہت للچاتے مگر کچھ نہ کر سکتے۔ آخر ایک دن ہم لوگوں نے ایک ترکیب نکالی۔ نصیر حسن سے یہ طے ہوا کہ آج رات کو آموں کی چوری کی جائے۔ رات ہوئی تو میں اپنے گھر سے لالٹین اور نصیر حسن اپنے گھر سے ٹارچ لے کر نکلے۔ جب کافی رات گزر گئی تو ہم نے اپنے اپنے کپڑے اتارے اور ایک سیاہ لنگوٹ باندھ کر لالٹین اور ٹارچ جلاتے بجھاتے اس آم کے پیڑ کی طرف چلے۔ قریب پہنچ کر ہم نے بھوتوں کی طرح منمنانا شروع کیا اور خوفناک کلکاریاں مارنے لگے۔ کبھی ٹارچ جلاتے بجھاتے۔ کبھی لالٹین کو چرخ دیتے۔ یہ دیکھ کر وہ آدمی جو نگرانی کر رہا تھا مارے خوف کے بھاگ نکلا۔ اور اب ہم اپنی جلتی بجھتی روشنیوں کے ساتھ پیڑ پر چڑھ گئے۔ اس وقت تک ٹارچ سے دیہات کے لوگ واقف نہ تھے یا اگر تھے تو صرف زمینداروں کے گھر والے۔ ہم نے خوب زور زور سے ڈالیں ہلا کر بہت سے آم اکٹھا کئے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹے۔ صبح ہوتے ہی بھوتوں کا قصہ ہر طرف گاؤں میں مشہور ہو چکا تھا۔

طرح طرح کی شرارتیں ایجاد کرنے میں ہم کو ملکہ حاصل تھا۔ ایدلپور کے مشرق میں ایک بہت بڑا ٹیلا ہے۔ کبھی یہ اشوک کا چھوٹا موٹا قلعہ تھا (یہ بات میں نے یونیورسٹی پہنچ کر جان پائی جب وہاں کے کچھ ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے ٹکڑے میں نے قدیم تاریخ کے شعبے کے اساتذہ کو دکھائے) ہم جب نکلتے موتیا ہمارے ساتھ اسی طرح رہتا جس طرح رب ڈآن ژکل کا کتا اس کے ساتھ جاتا تھا۔ ایک دن شام کے وقت ہم لوگ اس ٹیلے کی طرف جا نکلے تو دیکھا کہ ایک جانور سُوا جیسا مگر قد میں قدرے چھوٹا دھیرے دھیرے ہمارے آگے آگے چلا جا رہا ہے اور اس کے

www.taemeernews.com

بدن پر کانٹوں کا ایک جنگل اُگا ہوا ہے۔ ہم نے موتیا کو اشارہ کیا وہ اس جانور کی طرف جھپٹا۔ مگر وہ عجیب و غریب جانور دوڑ کر ایک دَرّے میں گھس گیا۔ بس پھر کیا تھا ہم نے جھٹ گھاس اکٹھا کی اور آم کی نگرانی کرتے ہوئے کنجڑے سے آگ حاصل کر کے دَرّے کے منھ پر آگ جلادی۔ جانور کہیں نزدیک ہی تھا۔ ایک غراہٹ کے ساتھ اپنے کانٹے کھڑے کئے ہوئے تڑپ کر نکلا۔ ہم جلدی سے کنارے ہٹ گئے۔ مگر جانور نے موتیا کو زخمی کر دیا اور موتیا چلّاتا ہوا بھاگا۔ یہ سیہی (Porcupine) تھی۔

کوتارہ میں مروّت خاں نام ایک معمّر سے آدمی رہتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام علی حسین تھا اور دوسرے کا جو کچھ بھی نام رہا ہو، مجھے نہیں معلوم، مگر اُسے سیّد کہتے تھے۔ سیّد کچھ دنوں تک کانپور کی کسی مل میں کام کرتا تھا۔ مروّت خاں اگرچہ بوڑھے تھے مگر خاصے شاطر تھے۔ ایک بیوہ برہمنی کے نام چند بیگھے کھیت تھے۔ مروّت خاں نے اس سے آشنائی پیدا کر کے اپنے گھر میں اُسے ڈال لیا تھا اور اس کے کھیت اپنے تصرّف میں لاتے تھے۔ سیّد آموں کی فصل میں کوتارہ آیا ہوا تھا۔ شہر میں رہنے کی وجہ سے وہ اپنے کو سب سے بالاتر سمجھتا تھا۔ خاصہ تومند بھی تھا۔ اس کے بھی کچھ آم کے درخت نصیر حسن کے باغ کے پاس تھے مگر جب آندھی آتی تو سیّد اپنے آموں کے ساتھ نصیر حسن کے باغ کے آم بھی چُن لیتا تھا اور پھر اکڑتا بھی کہ کوئی میرا کیا کرے گا۔ ایک شام آندھی کے کچھ آثار تھے تو نصیر حسن میرے پاس آئے کہ چلو آج اپنے آم ہم لوگ خود چُنیں گے۔ ہم نے اپنی اپنی لاٹھیاں اٹھالیں اور باغ کی طرف چل دیئے (اس وقت یہ عام بات تھی کہ لوگ جب باہر نکلتے تو لاٹھیاں ضرور لے لیتے۔ اگرچہ زمینداروں کے یہاں یہ رسم نہ تھی۔ مگر ہم تو رسم توڑ لوگ بن گئے تھے) اتنے میں زوردار آندھی آئی۔ ہم رُکے اور جب آندھی کا زور کم ہوا تو باغ میں داخل ہوئے کیا دیکھتے ہیں کہ سیّد بڑی بے خوفی سے نصیر حسن کے باغ سے آم چُن رہا ہے۔ نصیر حسن نے اسے للکارا مگر وہ اپنے طاقت کے نشے میں تھا۔ چنانچہ اس نے کچھ سماعت نہ کی۔ بس پھر ہمیں بھی جلال آگیا۔ نصیر حسن نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیّد پر لاٹھی لے کر پل پڑے۔ سیّد، نصیر حسن سے لپٹ پڑا۔ میں تو لاٹھی چلانے کی ٹریننگ لئے ہی ہوئے تھا۔ پینترہ بدل کر دشمن کے پاؤں پر پالٹ کا وہ ہاتھ مارا

www.taemeernews.com

کہ سید لڑکھڑا کر گر پڑا۔ نصیر حسن نے مزید اس کی کھوپڑی پر ایک لاٹھی جڑ دی۔ سید وہیں ڈھیر ہو گیا اور شور مچانے لگا کہ بچاؤ۔ آس پاس کے آم چننے والے دوڑے مگر ہم اپنی اپنی لاٹھیاں لے کر جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔ صبح کو صغیر حسن صاحب کے پاس مروّت خاں ہماری شکایت لے کر پہنچے۔ صغیر حسن صاحب نے ہمیں بلا کر بہت ڈانٹا۔ سید کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ اس پر اڑا تھا کہ وہ تھانے جا کر رپٹ لکھائے گا۔ مگر مروّت خاں نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا کہ بہر حال زیادتی اسی کی تھی۔ پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

الٰہ دین نام کا ایک کنجڑا تھا۔ وہ آم کے باغ لے کر اُن کے پھل بازار میں بیچا کرتا تھا۔ اُس کے باغ میں ایک پیلے رنگ کی چڑیا نے ایک آم کی سب سے اونچی ڈال پر گھونسلہ بنا رکھا تھا ہم نے پہلی مرتبہ ایسی خوبصورت چڑیا دیکھی تھی۔ اسے اس نواح میں 'بیلو' یا 'ہردوا' کہتے تھے۔ نصیر حسن نے اسکیم بنائی کہ اگر اس کے بچے ہمیں مل جائیں تو یہ خوبصورت چڑیا ہمارے گھر میں بھی ہو گی۔ آم کا پیڑ بہت اونچا تھا اور ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اس میں جا بجا لال چیونٹوں نے اپنے جھونجھے بنا رکھے تھے۔ لال چیونٹے کس قدر خطرناک ہوتے ہیں اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جنہوں نے کبھی پیڑوں پر چڑھنے کا تجربہ حاصل کیا ہے۔ اب ہم روز اسکیمیں بناتے۔ مگر لال چیونٹے ہمارا دل دہلا دیتے آخر ایک دن نصیر حسن کہیں سے ایک ترکیب لائے کہ اگر کسی طرح درخت میں دھواں کر دیا جائے اور بدن پر نیم کا تیل مل لیا جائے تو لال چیونٹے کچھ نہیں کر سکتے۔ الٰہ دین کو ہماری یہ ترکیبیں معلوم ہوئیں تو اس نے منع کیا۔ مگر ہم کہاں ماننے والے تھے۔ ایک دن آخر پروگرام بن ہی گیا۔ ہم دونوں نے اپنے بدن پر نیم کا تیل ملا اور بہت سی سوکھی پتیاں پیڑ کی جڑ کے پاس جمع کر کے اُن میں آگ لگا دی اور خوب دھواں کر دیا اور پھر پیڑ پر چڑھ گئے۔ دھواں ہوتے ہی لال چیونٹے بلبلا کر باہر نکل آئے اور ہمارے بدن میں چمٹ گئے۔ ہم سمجھے تھے کہ ہمارے بدن پر نیم کا تیل ملا ہونے کے باعث کچھ اثر نہ ہو گا، مگر یہ محض خیال خام تھا۔ چیونٹے ہماری کھال میں پیوست ہو گئے اور ہم پیڑ سے نیچے کس طرح کودے بیان نہیں کر سکتے۔ ہمارے سارے جسم میں لال چیونٹے ڈنک گاڑے تھے اور ہم بھاگتے پھر رہے تھے۔ الٰہ دین نے ہماری یہ حالت دیکھی تو دوڑ کر آیا اور

www.taemeernews.com

اس نے ہمیں نزدیک کے پانی کی تلیا میں ڈبکیاں لگانے کا مشورہ دیا۔ کچھ نجات تو ملی مگر جسم میں اب بھی جا بجا لال چیونٹوں کے ڈنک گڑے ہوئے تھے اور سوزش کا یہ عالم کہ جیسے ہمارے تمام بدن پر مرچیں مل دی گئی ہوں۔ آخر الہ دین نے ڈھاک کے کچھ پتے توڑے اور ان سے ہمارے جسم کو مَلا تب جا کر نجات ملی۔ گھر پہنچ کر ہم نے کسی سے کچھ اپنے مصائب کا تذکرہ نہ کیا۔ مگر صبح کو جب ہم سو کر اُٹھے تو تمام جسم سوج گیا تھا۔ چہرہ ایسا کہ سوا آنکھوں کے اور کچھ پہچان میں نہ آتا تھا سب کو بڑی پریشانی ہوئی۔ آخر الہ دین نے سب ماجرہ نصیر حسن کے والد سے بیان کیا۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ نصیر حسن کے والد ہومیوپیتھک طریق علاج کے ڈاکٹر بھی تھے۔ انھوں نے کوئی دوا ہمیں کھلائی۔ بارے دو ایک دن بعد ہمیں بدن کی سوجن سے نجات ملی۔

انھیں دنوں ایک دلچسپ تجربہ اور ہوا۔ نصیر حسن کا ننھیال قریب ہی کے ایک ایسے گاؤں میں تھا جہاں زمینداروں کی بڑی جائدادیں بھی تھیں اور وہاں کی آبادی بھی بڑی تھی۔ یہ آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی تھی۔ تھا تو یہ بھی گاؤں مگر دولت کی فراوانی اور وقت کی فراغت نے ان میں دو عجیب متضاد ذوق پیدا کئے تھے۔ ایک فنون لطیفہ علی الخصوص موسیقی سے دلچسپی، دوسرے مظالم اور ان کے ایجاد کے طریقوں کا شوق۔ ایک خاندان کے بزرگ طبلے اور ہارمونیم کے اتنے شوقین کہ ان کے کمرے میں ہمہ وقت راگ راگنی، ستار اور نَے نوازی کا ذکر چھڑا رہتا۔ کہیں سے انھیں دو نابینا طبلہ نواز استاد مل گئے تھے۔ وہ انھیں کے یہاں ہمہ وقت رہتے اور مشق دف و چنگ میں مصروف رہتے۔ اکثر طبلے کی گمک کی دھمک پر زمیندار صاحب بھی گردن جھٹک کر کیف میں آکر فرش پر گر جاتے۔ ان زمیندار صاحب کو افیون اور چانڈو کا بھی شوق تھا۔ دور دور سے چانڈو باز اور چانڈو تیار کرنے کے مسالے یہاں آتے اور جب محفل سرور جمتی تو وہ منظر اور چانڈو بازوں کی ادائیں قابل دید ہوا کرتیں۔ پوری محفل ایک ایک اینٹ کا تکیہ لگا کر فرش پر غش ہو جاتی اور پھر سرور کم ہوتا تو پھر سے "چھینٹے" تیار کئے جاتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد یہ شغل شروع ہوتا اور شام تک جاری رہتا۔ نصیر حسن کے ایک عزیز کو نوٹنکی کرانے کا شوق تھا۔ آس پاس کے ڈوم ڈھاڑی اور قوال اور اس فن کے جاننے والے بلائے جاتے اور مہینے

www.taemeernews.com

پندرہ دن میں پوری رات پھر نوٹنکی کا پروگرام ہوتا۔ حسنِ اتفاق سے نصیرحسن ایک پروگرام میں مجھے بھی ساتھ اپنے ننہال لے گئے۔ اس دن کی نوٹنکی میں "لیلیٰ مجنوں" کا تماشہ تھا جنہوں نے نوٹنکیاں دیکھی ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اُس وقت عورتوں کا پارٹ بھی تو بڑے لڑکے ہی کرتے تھے۔ عورتوں کو ان ناٹک منڈلیوں سے دُور رکھا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ اگر نوٹنکی والے چاہتے تو اربابِ نشاط ان کے کام آسکتے تھے مگر شاید وہ لوگ روایت کی پاسداری کے لئے لڑکوں سے زنانہ پارٹ کراتے تھے۔ ہاں تو یہ لیلیٰ مجنوں کی نوٹنکی مجھے بہت اچھی لگی۔ اس لئے بھی کہ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہ بات واضح کر دوں کہ ابھی میری عمر تقریباً گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ مگر نصیرحسن بلوغ کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے اور شاید ایراس (EROS) کے دیوتا نے ان کے دل میں مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ قصّہ وہی پرانا تھا مگر اس میں گانے بدلتے رہتے تھے۔ مجنوں کا گانا کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا۔

الفت کا زخم سینے پہ کھایا نہ جائے گا ۔۔۔ دانستہ خون دل کا بہایا نہ جائے گا

مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ غزل کس کی تھی مگر گانے والے نے اسے بڑی پُرسوز آواز میں گایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ غزل آغا حشر کے کسی ڈرامے سے لی گئی ہو۔ اس غزل کے ساتھ ایک ماہر نَے نواز سنگت کر رہا تھا۔ یہ نَے نوازی ہم کو بہت اچھی لگی۔ اس کھیل میں جب وہ سین آتا جس میں اچانک مجنوں کو لیلیٰ مل جاتی ہے تو مجنوں "ہائے لیلیٰ" کہہ کر اُسے دبوچ لیتا ہے۔ تو ناظرین میں سے بہت سے لوگ "ہائے لیلیٰ، ہائے لیلیٰ" چلانے لگتے۔ میرے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ کچھ ایسے مَن چلے بھی تھے جو اپنی نشستوں سے کود کر خود بھی لیلیٰ کو دبوچنے کے لئے پہنچ جاتے اور ظاہر ہے کہ یہ سب زمینداروں کے گھرانے والے ہوتے اور کس کی مجال تھی کہ اُن کو روکے جو اسی گاؤں کا تھا۔ شاید کچھ لوگوں کا منظورِ نظر بھی رہا ہو کہ بہرحال اس میں خاصی نسائیت تھی۔ صبح ہوتے ہی یہ محفلِ نشاط درہم برہم ہوگئی اور ہم لوگ بھی اپنے گاؤں لوٹ آئے۔ نصیرحسن پر اس تماشے کا خاصہ اثر ہوا۔ دو تین دن بعد دیکھا کہ نصیرحسن کہیں سے ایک بانسری لے آئے اور ہر وقت اسی "لیلیٰ مجنوں" والی غزل کی مشق میں تن مَن سے لگ گئے اور چند دنوں کی مشق کے بعد وہ بانسری پر یہ نغمہ

www.taemeernews.com

بجانے بھی لگے۔ اگرچہ بہت پھوہڑ ڈھنگ سے۔ مگر ہم لوگوں کے درمیان یہ رنگ زیادہ دنوں نہ چل سکا کہ ہم مردانے (Manly) کھیلوں کے عادی تھے اور یہ نرم و نازک معاملے ہم سے نہیں نبھ سکتے تھے اور جب اس بانسری کے ساتھ ایک اور واقعہ وابستہ ہو گیا تو ہم نے اپنی اپنی بانسریاں پھینک دیں۔

واقعہ یہ ہوا کہ نصیر حسن کے گاؤں کے دوسرے کنارے پر جہاں بھنگی آباد تھے جنہیں دیہات میں حلال خور کہا جاتا تھا۔ اسی کے قریب کایستھوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ اس گھرانے میں شہر سے ان کا ایک عزیز متھلیش نامے ان کے گھر آ پڑا۔ متھلیش شکل و صورت میں خاصہ وجیہہ تھا اور شہر میں رہنے کے باعث لباس وغیرہ بھی صاف ستھرے پہنتا۔ اسے حلال خوروں کی ایک لڑکی بھا گئی۔ کچھ دنوں میں ان کے رابطے بہت گہرے ہو گئے۔ متھلیش ہم لوگوں سے بھی ملتا رہتا اور ہمیں طرح طرح کی شہری کہانیاں بھی سنایا کرتا جن میں سنیما کی کہانیاں خاص ہوتیں۔ کبھی کبھی متھلیش، نصیر حسن سے اپنی مہترانی کے واقعات بھی لطف سے بیان کرتا۔ ایسے وقت میں نصیر حسن مجھے ہٹا دیا کرتے۔ پھر ایک دن متھلیش اور اس مہترانی کی لڑکی کو لوگوں نے ایک نامناسب حالت میں پکڑ لیا۔ مگر معاملہ کسی طرح رفع دفع کر دیا گیا۔ مگر متھلیش کچھ دنوں کے بعد کہیں سے ایک چمکتی ہوئی پیتل کی بانسری لے آیا اور وہی غزل اس نے بھی بجانی شروع کر دی جو نصیر حسن بجایا کرتے تھے۔ اور یہ نغمہ گویا ایک طرح کا مہترانی کا بلاوا تھا۔ نصیر حسن کو جب یہ معلوم ہوا تو ہم لوگوں نے اپنی اپنی بانسریاں پھینک دیں اور پھر یہ طے ہوا کہ آج سے ہم لوگ نے نوازی نہیں کریں گے۔ کہ اس میں اب دھوکے کا احتمال تھا کہ حرکت تو متھلیش کرتا مگر شبہہ ہم پر بھی پڑ سکتی تھی۔

زمینداروں کی زندگی کی دوسری کڑی رہ گئی۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، یہ ظلم کی کہانیاں ہیں۔ ان زمینداروں کا یہ طریقہ تھا کہ لاوارث لڑکے لڑکیوں کو ان کے قریبی عزیزوں سے لے لیتے اور انھیں اپنے گھروں میں پال لیتے۔ ہندوستان جس مفلسی کے دور سے گزر رہا تھا اس میں یہی بہت سمجھا جاتا تھا کہ لاوارث بچوں کے کم از کم کھانے کپڑے کا تو انتظام ہو گیا۔ مگر یہ لاوارث بچے کھانے کپڑے کے عوض کس عذاب سے گزرتے تھے اس کی فکر کسی کو نہ ہوتی۔ یہ زمینداروں کے لونڈی غلام ہوتے

www.taemeernews.com

اور اسی طرح کے کام بھی ان سے لئے جاتے۔ انھیں سخت سے سخت زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا زمیندار گھرانے کی عورتیں، لڑکیوں کو بان زیادہ پسند کرتیں کہ وہ ہر محفل میں ان کے ساتھ لونڈیاں بن کر جائیں۔ کسی زمیندار عورت کی شان و شوکت اور تمول کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاتا تھا کہ اس کے ساتھ کتنی لونڈیاں ہیں۔ انھیں صاف کپڑے پہننے کی اجازت نہ تھی۔ انھیں گھر والوں کے بچے ہوئے جھوٹے کھانے میں سے کھانا ملتا اور اگر کبھی ان کے لئے الگ سے کھانا پکایا جاتا تو سب سے خراب قسم کے اجناس میں سے کچھ کچا پکا کھانا پکوا دیا جاتا۔ کھانا کیا بلکہ صرف روٹی پکوادی جاتی اور نمک مرچ کی چٹنی ان کا سالن ہوتی جسے تفرقی کھانا کہا جاتا جب کہ زمینداروں کا کھانا خاصہ کہا جاتا۔ اگرچہ یہ شاذ و نادر ہی پکتا تھا کہ یہاں کے زمیندار دال اور ترکاریاں اصلی گھی میں پکوا کر اسے خاصہ سمجھتے تھے۔ ان لونڈی غلاموں کو پلنگ پر سونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ زمین پر بھی سو نہیں سکتے تھے۔ انھیں دیوار کے سہارے ٹیک کر جھپکیاں لینے کی اجازت تھی تاکہ رات میں اگر گھر کے کسی فرد کو کسی کام کی ضرورت پڑے تو یہ فوراً جاگ جائیں۔ اور اگر ان پر فطری نیند کا غلبہ ہو جاتا تو ان کے بال پکڑ کر کھینچ لئے جاتے اور گھونسوں اور تھپڑوں سے ان کی تواضع کی جاتی۔

لڑکیاں جب سن بلوغ کو پہنچتیں تو فطرت تو اپنا کام کرتی ہی ہے۔ تو یہ لڑکیاں زمیندار کے لڑکوں کی تفریح کے کام آتیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی حاملہ ہو جاتی تو جھٹ اس کا نکاح کسی غلام سے کر دیا جاتا اور نوزائیدہ خونِ زمینداری اسی غلام کی اولاد سمجھا جاتا۔ کنیزیں، زمیندار کی عورتوں کا پاؤں دباتیں جب تک وہ سو نہ جاتیں۔ ایک دفعہ، ایک کنیز کو بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کی کسی بات پر ہنستے دیکھ لیا۔ اس کی سزا اس کنیز کو یہ دی گئی کہ رات کو بیگم صاحب نے اس کنیز کی ہتھیلی اپنے پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دی اور رات بھر اسی پلنگ پر اسی حالت میں سوتی رہیں۔ صبح وہ لڑکی بیہوش پائی گئی مگر زندہ تھی۔ اس زمانے میں اسی طرح کے ظلم کا ایک اور واقعہ ہوا ایک جوان لونڈی جس کا نام حمیقن تھا رات کو ایک بیگم صاحب کے شوہر کو پانی پلانے اٹھی۔ یہ کام بیگم صاحب کا تھا مگر شوہر نے حمیقن کا نام لے کر اس سے پانی مانگ لیا۔ بیگم صاحب جاگ رہی تھیں۔ مگر شوہر نے سمجھا کہ وہ سو رہی ہیں۔ بس بیگم صاحب کو شبہ ہو گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا

www.taemeernews.com

ہے۔ اس وقت تو وہ چپکی ہو رہیں مگر جب دوسرے دن ان کے شوہر کسی مقدمے کی پیروی میں الہ آباد شہر چلے گئے تو بیگم صاحب نے حمیقن کو طلب کیا۔ پہلے تو اس سے تفتیش کرتی رہیں مگر جب اس نے کوئی بات ان کے مطلب کی نہ بتائی تو بیگم صاحب آگ بگولہ ہو گئیں۔ فوراً آگ میں لوہے کی سلاخ گرم کرائی اور یہ جلتی ہوئی سلاخ حمیقن کے اندام نہانی میں ڈال دی گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا، اور جب وہ تڑپنے لگی تو جھاڑو اٹھا کر اس کے منھ پہ متعدد جھاڑو مارے، یہاں تک کہ وہ مر گئی عورت کا جذبۂ رقابت اور انتقام کہاں تک پہنچ سکتا ہے یہ اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے مر جانے کے بعد بیگم صاحب کا غصہ فرو ہوا۔ باہر سے ایک غلام بلایا گیا اور حمیقن کی لاش ایک پرانی دری میں لپیٹ کر مکان کے کونے میں کھڑی کر دی گئی۔ شام کو جب زمیندار صاحب شہر سے واپس آئے تو پھر انھوں نے حمیقن کو پانی لانے کے لئے آواز دی۔ بیگم صاحب بڑے سکون سے بولیں کہ وہ کونے میں دری اوڑھے کھڑی ہے۔ زمیندار صاحب نے جا کر دیکھا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اب کیا کریں۔ خاموشی سے رات میں اپنے چند معتمد ملازمین کو بلا کر اس کی لاش زمین میں دبوا دی۔ بعد کو انھیں ملازمین میں سے کسی نے پولیس کو خبر کر دی۔ وہ انگریزوں کی عملداری تھی پھر کیا تھا، ایک دن ایک پوری لاری پولیس کی اس گاؤں میں پہنچی اور اس نے زمین کھود کر لاش برآمد کر لی۔ الہ آباد کی عدالت میں قتل کا مقدمہ چلا اور کئی برس تک چلتا رہا۔ مگر کوئی معقول ثبوت اور چشم دید گواہ نہ ملنے کے باعث زمیندار صاحب مقدمہ تو جیت گئے مگر انجام کچھ اچھا نہ ہوا جتنے لوگ قتل میں شریک تھے یا جنھوں نے اس قتل کو چھپانے میں مدد کی تھی سب تباہ ہو گئے۔ ایک دو سال میں سب راہیٔ عالم بقا ہوئے۔ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ یہ مثل اپنا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر گئی۔ پریم چند زمینداروں کی ایسی زندگیوں سے شاید واقف نہ تھے ورنہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں ان واقعات کو ضرور بیان کرتے۔ اور میرے پاس پریم چند کا قلم نہیں ورنہ مجھے ایسے مظالم کے متعدد واقعات معلوم ہیں کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ زمیندارانہ زندگی کی کھردری حقیقتیں ہیں۔ قاضی عبدالستار کے "پیتل کا گھنٹہ" کو پڑھ کر قاضی انعام حسین کی زندگی پر افسوس معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب زمینداروں کے مظالم

www.taemeernews.com

کے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا تو خیال ہوتا ہے کہ کیا یہ سماجی زندگی باقی رہنے کے قابل تھی؟ ایک زمیندار کے صاحبزادے جو ہر سال آئی سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں میں بیٹھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ چونکہ وہ ایک بڑے زمیندار کے بیٹے ہیں اس لئے یقیناً ان مقابلے کے امتحانات کو پاس کرلیں گے۔ مگر آئی سی۔ ایس، پی سی۔ ایس ہونا کیسا، وہ نائب تحصیلدار بھی نہ ہو سکے انہیں زمیندار کے صاحبزادے کا قصہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جب سپاہیوں کی بھرتی عام تھی، ان کے گاؤں کا ایک آدمی جھلرو نامی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ پشاور میں اس کو ڈیوٹی ملی۔ ایک مرتبہ چھٹیوں میں جب وہ اپنے گھر آیا تو پشاوری کلاہ اور صافہ پٹھانوں جیسا پہن کر گاؤں میں داخل ہوا۔ اور کچھ دنوں تک محض دکھاوے کے لئے وہی لباس پہن کر اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے جاتا۔ ایک دن وہ زمیندار صاحب کے گھر کے سامنے سے بھی وہی لباس پہنے گزرا۔ زمیندار کے یہ صاحبزادے باہر بیٹھے تھے۔ انھوں نے جھلرو کو بلوایا۔ جھلرو ان کے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ یہ کپڑے اتارو اور جب تک اس گاؤں میں رہنا یہ لباس اب نہ پہننا۔ جھلرو فوج میں ملازم تھا اور وہ بھی برٹش آرمی میں، وہ کیسے یہ برداشت کرتا۔ اس نے جواب دیا کہ یہ برٹش عملداری ہے اور میں گورنمنٹ برطانیہ کی فوج میں ملازم ہوں۔ میں جس لباس میں اپنی ملازمت میں رہتا ہوں وہی لباس یہاں بھی پہنے ہوں۔ اس پر زمیندار صاحب کے صاحبزادے کو تاؤ آگیا۔ اپنے ملازموں کو آواز دی جنھوں نے مار پیٹ کر جھلرو کو زمین پر گرادیا اور اس کا لباس تار تار کر ڈالا اور پھر اسی نیم برہنگی حالت میں اسے گاؤں میں پھرایا گیا اور خوب جوتوں سے اس کی پٹائی کی گئی۔ جھلرو Active Service میں تھا اور میدانِ جنگ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس نے الہ آباد آکر فوجی محکمے کے آر۔ ٹی۔ او کو اس واقعے کی رپورٹ کی۔ دوسرے دن فوج کا ایک دستہ گاؤں پہنچ گیا۔ فوجیوں کی اس وقت حکومت بڑی دلجوئی کرتی تھی۔ زمیندار صاحب کے بیٹے روپوش ہو گئے۔ مگر فوج نے ان کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ ضلع کلکٹر اور نواح کے سربرآوردہ لوگوں کے بیچ میں پڑنے پر معاملہ ختم ہوا مگر زمیندار صاحب کی ساری عزت خاک میں مل گئی۔ پھر لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر جھلرو اور اس کے گھر والوں نے اپنی نالش واپس لی

www.taemeernews.com

ورنہ اس کے امکانات پیدا ہو گئے تھے کہ حکومت زمیندار صاحب کی زمینداری ضبط کر لینے کے احکامات صادر کر دیتی۔ حکومت برطانیہ لاقانونیت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسے کسی سے ووٹ تو لینا نہیں تھا کہ سب کو خوش رکھنے کا ڈھونگ رچاتی۔ جیسا کہ آج کی حکومتیں کرتی رہتی ہیں۔

لیکن انھیں زمینداروں میں کچھ اچھی مثالیں بھی ہیں۔ منجھن پور کے ایک زمیندار کے بیٹے چودھری احسان حیدر جو ایک بینک کے منیجر تھے۔ انھوں نے پرگنہ کراری اور تحصیل منجھن پور کے سیکڑوں بے روزگاروں کو بینک میں ملازمت دلوائی اور آج بھی وہ لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں (یہی احسان حیدر بعد کو عرب امارات میں ہندوستان کے سفیر بھی مقرر ہو گئے تھے) رکسوارہ کے زمینداروں میں سید شمیم کاظم نے بھی بہت سے بے روزگاروں کو ملازمت دلوائی جو آج بینک میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ یہ دونوں حضرات اپنے زمینداری کے دور ہی سے بے حد خلیق اور ملنسار تھے اور آج بھی ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں میرے ایک دوست نواب احسن ہیں جن کی وضعداری اور محبت لازوال ہے۔ ان کا شمار یقیناً اب "بیتل کا گھنٹہ" والے قاضی انعام حسین میں کیا جا سکتا ہے۔ نواب احسن (اصل نام منظور الحسن عرف احسن ہے) میں اس وقت بھی یہی انکسار اور محبت تھی جب وہ صاحب اقتدار تھے۔ انھیں گھوڑے پالنے کا بڑا شوق تھا اور یہ گھوڑے زیادہ تر دوستوں کو لانے لیجانے کے کام میں آتے تھے۔ تقریباً یہی صورت ظہور قاسم (مشہور سائنسٹ) میں بھی ہے۔ ان سے میری دوستی طالب علمی کے زمانے سے تھی اور آج بھی ہے۔ جبکہ آج وہ دنیا کے عظیم سائنس دانوں میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ میرے ریٹائرمنٹ پر الوداعی جلسے کی صدارت کے لئے جب میرے طالب علموں نے ان سے درخواست کی تو وہ بڑی محبت سے دلی سے الہ آباد آئے اور میرے الوداعی جلسے کی صدارت کی جو شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا پہلا یادگار جلسہ تھا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

ہاں تو میں نے کسی طرح اپنے کھیل تماشوں اور دلچسپیوں کو روک کر پانچویں درجے کا امتحان بڑی مشکلوں سے پاس کر لیا۔ مگر نصیر حسن باوجود اپنی تمام الٹی دلچسپیوں کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا،

www.taemeernews.com

فرسٹ ڈویژن میں اُردو مڈل پاس ہوئے۔ نصیرحسن علم الحساب میں بڑے ماہر تھے اور دوسرے موضوعات بھی یکساں تھے اور میں علم الحساب میں بے حد کمزور۔ نتیجہ آنے پر میں بے حد مایوس ہوا اگرچہ اپنی زندگی کے طور طریقوں میں پاس ہو جانا ہی بہت تھا۔ اس وقت نہ ہوم ورک ہوتا تھا اور نہ گھر پر کوئی اپنا بستہ یا کتاب کھول کر دیکھتا تھا۔ بس جو کچھ پڑھائی ہوتی وہ اسکول میں استاد کی مدد سے۔ کم از کم دیہات کے مڈل اسکولوں کی یہی حالت تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ کوئی گھر پر کبھی پڑھتا رہا ہو۔ یہاں تک کہ امتحان کے زمانے میں بھی وہی کلاس کی پڑھائی کام آتی تھی۔

میری دو بہنوں کی شادی الہ آباد کے محلہ چک میں ہوئی تھی اور میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے تقریباً ہر سال الہ آباد شہر چلا آتا۔ لیکن اس دفعہ ایک دلچسپ بات ہوئی۔ میرا دل تو یونہی پڑھائی سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس پر جب کچھ شہر کی تہذیبی ہوا لگی تو بالکل ہی مڈل اسکول کی پڑھائی سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ گرمیوں میں الہ آباد میں کچھ نئے دوست بھی مل گئے جو انگریزی اسکولوں کے طالب علم تھے۔ مجھے انگریزی زبان اور اپنے شہری دوستوں کے طور طریقے بہت اچھے لگے یہاں تماشہ گاہ ہستی بھی سجا سجا سا ملا۔ چنانچہ میں نے اعلان کر دیا کہ اب دیہات کے مڈل اسکول میں نہیں پڑھوں گا۔ اگر پڑھوں گا تو انگریزی۔ اور یہ طے کر کے تعلیم سے کنارہ کش ہو گیا۔ ہاں بڑھا لئے اور انگریزی اسکول میں نہ پڑھنے کے باوجود میرا برتاؤ انگریزی اسکولوں میں پڑھنے والے دوستوں جیسا ہو گیا۔ اور میرے گھر کا یہ حال کہ انگریزی اسکولوں کا خرچ برداشت کرنے کی کسی میں سکت نہ تھی۔ نہ ادھر کے ہوئے نہ اُدھر کے۔ میری ضد پر میری بہنوں نے میرا داخلہ ایک نیم انگریزی مڈل اسکول میں کرا دیا جہاں دیگر زبان کے طور پر انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ اسکول محلہ چک کے نزدیک ہی تھا (اب وہاں ہندی ساہتیہ سمیلن کی نئی عمارت بن گئی ہے۔ اسکول شاید کہیں اور منتقل ہو گیا) یہ میرے لئے ایک نئی تہذیبی دنیا تھی۔ صبح اٹھ کر سب کو سلام کرنا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنا اور محرم میں سارے شہر کی مجلسوں میں شرکت کرنا۔ خیر مجلس ماتم کی ٹریننگ تو مجھے اپنے وطن کراری ہی سے مل چکی تھی۔ مگر اور باتیں میرے لئے سخت پابندیاں محسوس ہوئیں جو مجھ جیسے سیلانی اور ہوا کی طرح آزاد لڑکے پر بھاری پڑیں۔ مگر اس تہذیب میں اور بہت سی دلچسپیاں تھیں۔ مثلاً پتنگ اڑانا، سینما کے پوسٹر دیکھنا،

www.taemeernews.com

رمضان کے مہینے میں مسجد کے اجتماع میں شریک ہونا اور سب کے ساتھ پابندی سے روزے رکھنا رات میں سحرگہی کے مزے۔ غرض کہ یہ سب تجربے خاصے دلچسپ معلوم ہوئے۔ میں نے اسکول تو جانا شروع کر دیا مگر پھر وہی مڈل اسکول کا ماحول۔ یہ ضرور ہوا کہ یہ ماحول شہری تھا۔ تاہم مجھے مڈل اسکول کے خیال ہی سے وحشت ہوتی۔ پھر محلہ چک کا ماحول، مہذب تو ضرور تھا مگر کچھ دبو قسم کا ماحول جس میں ملائے مسجدی اور قل اعوذئیے پن کا رنگ غالب تھا۔ پھر شہر کے لوگ میری آزادہ روی کو دیہاتیت سے تعبیر کرتے اور میں انھیں صرف پاجامے شیروانی پہننے والے شہراتی جو مردانے کام کرنے اور لڑنے بھڑنے سے کترانے والے۔ عجب نفسیات تھی میری کہ دنیا میں بغیر لڑے بھڑے کوئی کام نہیں ہوتا اور چاہے زندگی پر جتنی تہذیب کی پرتیں چڑھا دی جائیں، مگر بھینس ہمیشہ لاٹھی والے ہی کی ہوگی اور سچ بات یہ ہے کہ زندگی اپنے تمام عمرانی تجربوں اور شائستہ فلسفوں کے باوصف اس بنیادی اصول کو بدل نہیں سکی۔ آریوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر جولیس سیزر ہلاکو، چنگیز، مغل شاہنشاہیت، نپولین، ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کا قیام، ہٹلر، مسولینی اور اب امریکی اقتدار کی بالادستی، سب کے پیچھے، لاٹھی اور بھینس والا انسانی تجربہ اور فلسفہ ہی کام کر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان دوستی اور صلح و آشتی کے جذبے نے ہمیشہ اس کو مسترد کیا ہے اور صحیح طور پر مسترد کیا ہے۔ خیر تو میری بھی ایسی سوچ کا نتیجہ کچھ اچھا نہ نکلا۔ مگر پانی کی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے راستے بنا لیتا ہے۔ سو، میں نے بھی وہی کیا۔ محلہ چک میں میری دوستی اپنے ایک ہم سن شوکت نام کے طالب علم سے ہو گئی۔ شوکت کا اصل وطن تو گنگا پار کے کسی دیہات میں تھا مگر اس کے والد، الہ آباد میں وکالت کرتے تھے اس لئے شوکت الہ آباد ہی میں رہتا۔ اب ہم لوگ صبح شام ساتھ گھومنے لگے۔ دونوں سن بلوغ کی منزل کے قریب تھے۔ ابھی تک میں نے سینما نہیں دیکھا تھا۔ جسے اس زمانے میں "بائیس کوپ" کہا جاتا تھا۔ ایک دن شوکت آیا کہ چلو آج سینما چلتے ہیں میں دو ٹکٹ سینما کا لے آیا ہوں۔ یہیں پاس والے سینما کا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا مگر میں شوکت کے ساتھ ہو گیا۔ ہم لوگ ٹکٹ دکھا کر ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوئے جو چاروں طرف سے ٹین کی چادروں سے ڈھکا تھا۔ فلم کا نام تھا "ہمتِ مرداں، مددِ خدا"۔ یہ پہلا فلم ہے جو میں نے

www.taemeernews.com

اپنی زندگی میں دیکھا۔ پہلے تو بڑی بڑی تصویروں کو دیکھ کر ڈرا پھر خیال آیا کہ یہ تو تصویریں ہیں ان سے کیا ڈرنا۔ کھیل ختم ہوا تو ہم لوگ باہر نکلے اور اس فلم کے گانے بھی خریدے جو چھوٹے چھوٹے لڑکے ہندی اُردو میں چھپے ہوئے بیچتے پھرتے تھے۔ شوکت اور میں دونوں مل کر یہ گانے کئی دن تک گاتے پھرتے۔ پھر تو مجھے تفریح کی ایک نئی دنیا مل گئی اور دیہات کے تمام مردانے مشاغل لایعنی سے لگنے لگے۔ شوکت کا یہ پہلا فلم تو نہ تھا مگر ہمیں فلم کے دیکھنے کی لت لگ گئی۔ پھر تو 'انصاف کی توپ'، 'مایا مچھندر'، 'شوخ دلربا'، 'بڑھے چلو'، 'حاتم طائی'، 'قسمت کی تیزن'، 'ٹاروللنا'، 'لعل یمن'، 'نور یمن'، 'اچھوت کنیا' اور 'بندھن' تک ہماری رسائی ہو گئی۔ اب مجھے ہیرو ہیروئن کے نام بھی یاد رہنے لگے۔ دیویکا رانی، اشوک کمار، ای بلموریا، ڈی بلموریا، موتی لعل، مس کجن، سلوچنا، جدن بائی، سورن لتا، کانن بالا، ماسٹر نثار اور جانے کون کون۔ اس زمانے میں معمولی سینما گھروں کی شرح ٹکٹ صرف دو آنے تھی (جو آج تقریباً پینسٹھ روپے ہوں گے) اور اچھے سینما گھروں میں چار آنے۔ یہ سب سے نچلے درجوں کی شرحیں تھیں جہاں بیٹھنے کے لئے صرف لکڑی کی بنچیں ہوا کرتیں۔ اس کے بعد آٹھ آنے کا درجہ ہوا کرتا۔ اور سب سے آخر میں سوا روپے کا۔ ہم طالب علم بھلا دو آنے سے آگے کہاں جا سکتے تھے۔ اسی زمانے میں پری چہرہ نسیم بانو کی ایک فلم 'میں ہاری' اور پھر دوسری فلم 'اُجالا' آئی۔ ہم فلم دیکھنے میں اتنے مشتاق ہو گئے تھے کہ ہر نئی فلم کے بدلنے کی تاریخیں ہمیں ازبر ہوتیں۔ جب فلم نہ دیکھتے تو شام کو موتی محل اور لشمبھر پیلیس میں خوش قسمت فلم دیکھنے والوں ہی کو دیکھنے سینما ہال تک جاتے اور اس وقت تک وہاں کھڑے رہتے جب تک فلم شروع نہ ہو جاتا۔ ہم لوگ جو کچھ پیسے خرچ کے لئے اپنے اپنے گھروں سے پاتے سب جمع کرتے جاتے کہ چار آنے ہو جائیں تو ایک دن 'میں ہاری' لشمبھر پیلیس میں دیکھیں گے۔ پری چہرہ نسیم کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اس کا سب سے مشہور فلم 'پکار' بمبئی میں ریلیز ہو چکا تھا۔ مگر ابھی الہ آباد جیسے شہر میں اس فلم کے پہنچنے میں خاصی دیر تھی۔ بہرحال آخر ایک دن ہم لوگوں نے چار چار آنے جمع ہی کر لئے اور پری چہرہ نسیم کا فلم 'میں ہاری' دیکھ ہی ڈالا۔ نسیم کا اثر ہم لوگوں پر جادو کی ڈھنگ کا ہوا۔ ہم بھی فلم کے عشقیہ سین کی نقلیں اتارنے لگے۔ کچھ ڈائیلاگ بھی ہم کو یاد ہو گئے تھے، وہ بھی دہراتے کہ آخر ہم بھی عنفوان

www.taemeernews.com

شباب کی منزلوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ شوکت نے بھی اسکول سے برائے نام واسطہ رکھا اور میں نے بھی۔ پھر ایک دن شوکت کی والدہ کو دیہات جانا تھا۔ شوکت مجھے بھی اپنے ساتھ چھوٹی لائن کے اسٹیشن رام باغ لیتا گیا۔ اس وقت تک رام باغ بالکل کھلا ہوا بغیر سائبان کا بہت چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ شاید صرف ایک گاڑی صبح کو گورکھپور جاتی تھی اور شام کو ایک گورکھپور سے واپس آتی تھی۔ میں نے چھوٹی لائن (Meter gauge) کی گاڑی پہلی دفعہ دیکھی۔ اس وقت نہ مسافروں کا یہ اژدھام ہوتا جو آج کل ہے۔ اور نہ اسٹیشن پر جانے کا کوئی ٹکٹ۔ مشکل سے آٹھ دس مسافر الہ آباد سے سوار ہوتے۔ گاڑی تقریباً خالی جاتی تھی۔ شوکت کی والدہ کو ٹرین میں بٹھا کر ہم لوگ پوری ٹرین کا جائزہ لینے لگے۔ ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کوئی اینگلو انڈین خاندان سفر کر رہا تھا۔ (اینگلو انڈین وہ کہلاتے تھے جن کے باپ انگریز اور ماں کوئی ہندوستانی عیسائی ہوتی) اسی میں ایک ہندوستانی بنگالی خاندان بھی تھا۔ شوکت کی ہمت ذرا کھلی ہوئی تھی۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا کہ دیکھو یار اس میں سلوچنا سے ملتی جلتی ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ میں دیہات کی جس دنیا سے شہر آیا تھا وہاں یہ تاک جھانک اور اسی طرح کی باتیں اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ اس لئے میں نے شوکت کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ٹال گیا۔ شوکت بار بار اس ڈبے کے چکر لگاتا اور اس سلوچنا نما لڑکی کو دیکھتا۔ اتنے میں گاڑی روانہ ہو گئی۔ جب وہ ڈبہ ہمارے سامنے سے گزرا تو شوکت نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا تو میں نے بھی ایک نظر ڈالی۔ واقعی لڑکی میں سلوچنا کی مشابہت تھی۔ ہم واپس لوٹ آئے مگر میرے ذہن میں سلوچنا نما چہرہ رہ رہ کر ابھرنے لگا۔ تاہم میں نے شوکت سے کچھ کہا نہیں۔ اب ہم لوگ اکثر صبح اٹھ کر رام باغ اسٹیشن جانے لگے۔ سواریوں کو دیکھتے، انجن کی روانگی دیکھتے مگر ہمارے دلوں میں کسی سلوچنا نما لڑکی کو دیکھنے کی خواہش ضرور ہوتی۔ شاید یہ ہماری عمروں کا تقاضہ تھا۔ شوکت تو بیباک بھی تھا۔ جب ٹرین چلی جاتی تو ریلوے لائن کے گرد کوئلہ چننے والی لڑکیوں ہی کو گھورا کرتا۔ اور فلمی گانے گاتا۔ اس زمانے میں الہ آباد کی آبادی مشکل سے ایک لاکھ رہی ہوگی یا اس سے بھی کم، اور ہر تیسرا چوتھا آدمی ضرور صورت آشنا یا شناسا نکل آتا۔ ایک دن شوکت کے ایک عزیز نے ادھر سے گزرتے ہوئے ہمارا یہ تماشہ دیکھا اور جا کر شوکت کے گھر میں شکایت کر دی۔ بس پھر کیا تھا، شوکت کی

www.taemeernews.com

پٹائی ہوئی اور یہ پابندی لگ گئی کہ وہ میرے ساتھ نہ رہا کرے کہ اس کے گھر والوں کے خیال میں میں نے ہی شوکت کو یہ فن سکھایا ہے جب کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ خیر شوکت نے مجھ سے اور میں نے شوکت سے ملنا چھوڑ دیا۔ دس پندرہ دن اسی طرح گزر گئے۔ مگر شوکت کو میرا جیسا گانا تو گھومنے والا دوست کہاں ملتا۔ اسی زمانے میں ایک بڑے دھوم دھام کا فلم 'جھولا' الہ آباد میں آگیا جس میں اشوک کمار کے ساتھ ایک نئی لڑکی لیلا چٹنس اس فلم میں آئی تھی۔ جسے دیکھو اس فلم کو دیکھنے چلا جاتا۔ یہ فلم اس وقت کے نئے سینما ہال 'موتی محل' میں لگا۔ شام کو ایک مجمع اس سینما ہال کے گرد اکٹھا ہو جاتا۔ اسی زمانے میں سینما چلانے والوں نے ایک نئی ترکیب لوگوں کو للچانے کے لئے نکالی ہال کے برآمدے میں جالیوں سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے لکڑی کے چوکھٹے لگاتے اور ان چوکھٹوں کے اندر چلتے ہوئے فلم کے ایکشن سین کی متعدد تصویریں جڑ دیتے۔ جو لوگ سینما دیکھنے آتے وہ تو اندر چلے جاتے اور جو اندر نہ جاتے وہ محض ان تصویروں سے دل بہلاتے۔ کچھ ایسے بھی ان چوکھٹوں کو دیکھنے آتے جو فلم دیکھ چکے ہوتے اور ان تصویروں کو دیکھ کر دیکھے ہوئے فلم کی یاد تازہ کرتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے کہ دیکھو یہ فلاں موقع کا سین ہے۔ میں بھی ان دونوں گروہوں میں شامل ہو جاتا، اور فلم کے متعلق معلومات حاصل کرتا۔ یہ سینما ہال بھی ہمارے گھر سے چند قدم پر شیو چرن لال روڈ اور ہیوٹ روڈ کے چوراہے پر واقع تھا۔ میں شام کو یہاں ضرور جاتا اور سینما کا شوق اس طرح پورا کرتا۔ ایک دن وہاں شوکت بھی دکھائی دیا اور فوراً میرے پاس آگیا۔ ہم لوگوں نے ایک ایک پیسے کی 'جھولا' فلم کے گانوں کی کتاب خریدی اور اس فلم کا مشہور گانا تلاش کر کے دھیرے دھیرے گانے لگے۔ یہ گانا اس وقت بہت مشہور ہوا تھا۔ اور ہر دوسرا تیسرا آدمی اسے اس وقت گاتا پھرتا۔ گانے کا ٹکڑا تھا "نہ جانے کدھر آج میری ناؤ چلی رے، چلی رے چلی رے مری ناؤ چلی رے۔" اسی زمانے میں ایک اور فلم خاندان کا بھی ایک گانا مشہور ہوا تھا جو نور جہاں نے پہلی مرتبہ گایا تھا۔ ٹکڑا تھا "تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے آجا۔" شوکت یہ دونوں گانے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں گاتا پھرتا۔ ایک دن میں نے بھی اپنی باریک اور سُریلی آواز میں یہ گانے اُسے سنائے تو وہ حیران رہ گیا۔ میری آواز اس وقت بہت اچھی تھی اس کا اندازہ مجھے دیہات میں ہو چکا

www.taemeernews.com

تھا۔ ہمارے گھر کے پاس ایک پیشہ ور گویّا رہتا تھا۔ وہ اکثر شادی بیاہ کی رسموں میں ہارمونیم لے کر گانے گایا کرتا تھا۔ یہ گویّا علم موسیقی میں تو مہارت رکھتا تھا آواز اس کی اچھی نہ تھی۔ نیز اُسے آواز کی volume کا بھی صحیح اندازہ نہ تھا۔ وہ کومل سُروں کو بھی اتنا کھینچ کر بلند آواز میں گاتا کہ موسیقی کی نرمی اور اثر انگیزی خاصی متاثر ہوتی۔ مگر جن لوگوں کے درمیان وہ گاتا تھا وہ ایسی ہی تیز آواز پسند کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی شوق میں اس کا گانا اور ہارمونیم سننے چلا گیا۔ میرا شوق دیکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا، "میاں! تم کچھ گانا جانتے ہو؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کسی سے ایک غزل کندن لال سہگل کی گائی ہوئی سُن رکھی تھی۔ غزل تھی "حیرتِ نظارہ آخر بن گئیں رعنائیاں۔ خاک کے ذرّوں میں آتی ہیں نظر گل کاریاں" سہگل کی یہ غزل اس زمانے میں بہت مقبول تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ غزل کس کی تھی۔ خیر میں نے یہ غزل اس گویّے کو سنائی تو وہ حیران رہ گیا۔ پھر اُس نے اسی غزل کو میرے ساتھ اپنی ہارمونیم پر سرٹ کی اور پھر مجھ سے ہارمونیم کے ساتھ غزل گانے کو کہا۔ غزل گائی تو گانے کو چار چاند لگ گئے۔ یہ خبر گاؤں کے کسی آدمی نے میری ماں تک پہنچا دی۔ میری ماں نے مجھے خوب زد و کوب کیا اور آئندہ اس گویّے کے یہاں جانے سے منع کر دیا کہ ان کے نزدیک گانا بجانا ڈوم ڈھاڑیوں کا کام ہے۔ شریف آدمیوں کے بچے کہیں یہ فن اختیار کرتے ہیں؟ میری ماں کو کیا معلوم کہ موسیقی کے ماہرین کیسے کیسے لوگ رہ چکے ہیں جن میں شاہ اودھ، واجد علی شاہ اور بادشاہ دلّی محمد شاہ رنگیلے تک شامل ہیں۔ خیر یہ سب تو ہوا، مگر مجھے اپنی آواز کا جادو معلوم ہو گیا۔ اور اب جب شوکت نے میری ایسی آواز سُنی تو وہ میرا گرویدہ ہو گیا۔

تقریباً ایک ماہ تک ہم لوگ 'جھولا' فلم کے لئے للچاتے رہے کہ اسی زمانے میں عید یا بقر عید کا تہوار آگیا اور ہم لوگوں کی تمنا پوری ہوئی۔ ہم نے اپنی عیدی کے پیسے جمع کئے اور ایک شام کو آٹھ آنے والے ٹکٹ لے کر موتی محل کے ہال میں جھولا دیکھنے کے لئے داخل ہو گئے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی ہمیں جولیس سیزر جیسا احساس ہوا جس نے برطانیہ کو فتح کر کے کہا تھا کہ "میں گیا، میں نے دیکھا اور پھر میں نے فتح کر لیا۔" ہم حیرت اور استعجاب میں ڈوبے ہوئے فلم دیکھتے رہے اور جب باہر نکلے تو وہ کاغذ کی ٹوپیاں بھی ہم نے خریدیں (جو باہر ہی لڑکے گانے کی کتاب کے ساتھ بیچ رہے تھے) جسے بھن کو اشوک کمار نے

www.taemeernews.com

نگر نہ جانے کدھر آج مری ناؤ چلی رے، والا گانا گایا تھا۔ گھر پہنچے تو ہر طرف ہماری ڈھونڈیا پڑی تھی۔ میرے بہنوئی مجھے وہ کاغذ کی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھ کر سمجھ گئے کہ میں 'جھولا' فلم دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اور شوکت کو برا بھلا کہنے کے بعد، میری پٹائی ہوئی۔ انسانی نفسیات کی یہ عجیب ٹیڑھ ہے کہ اُسے اپنے بچوں میں خرابی نظر نہیں آتی۔ دوسروں کے بچے ہی ہمارے بچوں کو خراب کرتے ہیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ شوکت بھی اپنے گھر میں پٹا اور اس کے گھر میں مجھے برا بھلا کہا گیا کہ میں شوکت کو خراب کر رہا تھا۔ جیسا کہ بعد کو شوکت نے مجھے بتایا! افواہ کی بھی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ شہر میں کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ کئی لڑکے "نا جانے کدھر آج مری ناؤ چلی رے" والا گانا گاتے گاتے بمبئی بھاگ گئے اور کتنے ہی لاپتہ ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جس گھر کا بچہ یہ گانا گاتا ہوا پایا جاتا، گھر والے اس کی پٹائی کر دیتے۔ یہ افواہ پتہ نہیں سینما کے مخالفین نے پھیلائی تھی یا موتی محل سینما ہال کے رقیبوں نے۔ اس زمانے میں (اور آج بھی) سینما کے مالکوں میں آپس میں لاگ ڈانٹ چلتی تھی۔ موتی محل کی آمدنی اور مقبولیت سے جل کر شمبھو پیلیس والوں نے بھی کسی اچھے فلم کے حاصل کرنے کی فکر شروع کر دی اور جب کہ موتی محل میں 'جھولا' کا چالیسواں ہفتہ چل رہا تھا، شمبھو پیلیس والوں نے ایک نیا فلم 'قسمت' لگا دیا۔ 'قسمت' میں اشوک کمار کے ساتھ ایک نئی ہیروئن ممتاز شانتی تھی۔ اور گانے اس فلم میں ایک کے بجائے دو 'سینما لوٹ قسم' کے تھے۔ ایک گانا تھا۔ ع "میرا بلبل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا، بادل دھیرے دھیرے جا" اور دوسرا گانا تھا۔ ع "گھر گھر میں دیوالی ہے مرے گھر میں اندھیرا" ہندوستانی فلموں کا عجیب حال ہے۔ یہ زیادہ تر اچھے گانوں ہی پر چلتے ہیں۔ میں فلم کا پارکھ تو نہیں مگر میری رائے ایک عام ناظر کی رائے ہے۔ یہ بھی کہ ایسے فلموں کے زیادہ تر دیکھنے والے یکے، تانگے والے یا جوتا پالش کرنے والے لڑکے ہی ہوتے ہیں جو ایسے گانوں یا کسی خاص سین کو دیکھنے کی دلچسپی میں فلم کو متعدد بار دیکھتے ہیں اور انھیں سے فلم والوں کو پیسے بھی ملتے ہیں۔ ثقہ قسم کے لوگ کہاں فلم دیکھنے جاتے ہیں؟ اور اگر گئے بھی تو ایک آدھ بار۔ اصل پیسہ دینے والے تو یہی عامی ہوتے ہیں۔ پھر ثقہ لوگ ابھی تک آغا حشر کے تھیٹر کا ہی خمار لیے تھے۔ ہاں ٹاکی فلم کی وجہ سے کچھ اچھے فلم بھی دیکھ لیتے تھے۔ ان کے خیال میں فلم میں سب بے سلیقہ گانے بجانے والوں کا بھونڈا اظہار ہوتا ہے۔ جہاں بے سرے گویّے، طوائفیں اور ڈھاڑی، ماسٹر نثار

www.taemeernews.com

چاندن بائی اور مس کجن کے نام سے داخل ہو گئے ہیں۔ اُدھر عامی بھی اپنے ہیرو اور ہیروئن کی حیثیت بڑھانے کے لئے اُن کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اسی زمانے میں عام لوگوں میں مشہور ہوا کہ مس کجن کی ایکٹنگ اور گانے سے نظام حیدرآباد اتنا متاثر ہوئے کہ اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا اور اسی طرح کی باتیں، جن کی کوئی تصدیق نہیں کرتا تھا۔ یہ بات سچ بھی تھی کہ ٹاکی فلم آنے کے بعد عام طور پر گانے بجانے والی طوائفیں اپنا پیشہ چھوڑ کر فلم میں چلی آئی تھیں کہ اس میں پیسے زیادہ ملتے تھے۔ مگر فلم انڈسٹری کے پیسوں نے رفتہ رفتہ اچھے اچھے گھروں کی عورتوں اور لڑکیوں کو بھی فلم کی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ بنگال کے کچھ اچھے گھرانے کی لڑکیاں بھی فلموں میں کام کرنے لگی تھیں۔ تاہم فلموں میں سب کی حدیں مقرر تھیں۔ ابھی تک عورتوں کے بدن کو چھوتے کا رواج نہ تھا۔ دیوداس جیسی مشہور فلموں میں بھی افلاطونی محبت ہی دکھائی جاتی تھی بہت ہوا تو محبتیں شادی پر انجام پذیر ہوتیں اور اس طرح ایک گھریلو زندگی کا اچھا آغاز ہوا کرتا۔

خیر، تو میں نے اور شوکت نے پھر ملنا جلنا شروع کر دیا۔ اسکول میں اب ہمارا جی نہ لگتا۔ میں تو پہلے ہی سے اسکول سے بھاگنے کا تجربہ رکھتا تھا، مگر اب شوکت نے بھی اسکول سے بھاگنا شروع کر دیا اور اس میں یقیناً میں نے اُسے راہ دکھائی۔ ہم گھر سے اپنی کتابیں لے کر نکلتے اور کبھی رام باغ کبھی جمنا برج، کبھی خسرو باغ اور کبھی جمنا کے پُل کی دوسری طرف ایگریکلچر انسٹی ٹیوٹ نکل جاتے اور وہاں کے باغوں میں گھومتے، جھولا فلم کی ایکٹنگ کرتے، کبھی تیز آواز اور تیز سُروں میں، "میرا بلبل سو رہا ہے" والا گانا گاتے۔ شوکت کے لئے ایگریکلچر میں ایک خاص دلچسپی یہ بھی تھی کہ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس لئے ذوقِ دید کی تشفی بھی ہوتی تھی۔ ایک دن ہم اسی طرح گشت کر رہے تھے کہ شوکت کے ایک چچازاد بھائی نے ہمیں دیکھ لیا جو خود ایگریکلچر کے طالب علم تھے اور شوکت کو ایک دو تھپڑ مار کر اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا کر لے گئے۔ اب پھر ہمارا ملنا جلنا بند ہو گیا۔ اسی زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ شوکت کے ایک عزیز کہیں سے اپنی بیٹی کو الہ آباد میں منشی کا امتحان دلانے کے لئے لائے اور میرے پڑوس میں ایک قریبی عزیز کے یہاں ٹھہر گئے۔ شام کو شوکت ان لوگوں سے ملنے آیا تو میرے پاس بھی چلا آیا۔ یہیں شوکت کا ایک ہم جماعت حامد بھی رہتا تھا جو آر تھیٹک میں

www.taemeernews.com

بہت ہوشیار تھا۔ شوکت کو ارتھمیٹک نہیں آتی تھی۔ شوکت نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ وہ حامد سے مدد لے کر اپنی ارتھمیٹک درست کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے گھر والوں نے اُسے اجازت دے دی۔ مگر مجھ سے نہ ملنے کی تاکید بھی کر دی۔ اب شوکت روز شام کو ہماری طرف آنے لگا۔ حامد بھی شوکت کو ارتھمیٹک پڑھانے لگا۔ کئی دن بعد حامد نے محسوس کیا کہ جب شوکت کو وہ حساب سمجھاتا ہے یا جیومیٹری کی کسی شکل THEORUM کی تشریح کرتا رہتا ہے تو شوکت کا ذہن کہیں اور رہتا ہے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں کہیں اوپر کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ پھر اچانک ایک مرتبہ جب حامد نے بھی نظر اوپر اٹھائی تو وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ (یہ سب حامد نے مجھے بعد کو بتایا) حامد متحیر رہ گیا اور اس دن سے اس نے شوکت کو ارتھمیٹک پڑھانا چھوڑ دیا۔ مگر شوکت ہر شام کو آکر حامد کے پاس یا میرے پاس بیٹھتا اور "میرا بلبل سو رہا ہے" والا گانا تیز سُروں میں گاتا۔ حامد ایک سنجیدہ طالب علم تھا۔ وہ پھر شام کو اپنے گھر سے باہر چلا جاتا اور میاں شوکت اب میرے پاس بیٹھ کر "میرا بلبل سو رہا ہے" والا گانا گاتے اور اوپر کی طرف دیکھتے جاتے اور پھر ایک دن شوکت نے مجھ سے اپنے اس معاشقے کا حال بیان کیا۔ میں ہنس کر اس کی داستان سنتا رہا۔

انھیں دنوں الہ آباد کے گورنمنٹ کالج کے سامنے والے میدان میں سودیشی نمائش لگی۔ یہ سودیشی نمائش الہ آباد کا خاص "سماروہ" ہوتی تھی۔ جسے دیکھو نمائش دیکھنے کے لئے بیتاب رہتا۔ اس نمائش میں کشمیر سے لے کر میسور تک کے دوکاندار آتے اور طرح طرح کے سامان بیچتے۔ کچھ لوگ خرید و فروخت کیلئے نمائش جاتے مگر زیادہ تر لوگ دیکھنے یا خود کو دکھانے کے لئے جاتے۔ کچھ مسلمان عورتیں خاص طور پر اس موقعے کے لئے سیاہ برقعے سلواتیں اور نمائش گھومنے جاتیں تاکہ جوش ملیح آبادی کے شعر "برقع یہ سیاہ اور یہ روئے انور ــــ ظلمت کی جبیں پہ چاندنی کا جھومر" کا مصداق بن سکیں۔ اور جب وہ نقاب اُلٹ کر کسی دوکان پر چیزیں خریدتی ہوتیں تو خواہ مخواہ لوگ اس دکان پر جمع ہو جاتے اور ضرورت نہ ہونے کے باوجود چھوٹی موٹی چیزیں اس دکان سے خریدنے لگتے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ زیادہ تر بے فکرے نوجوان مسلمان ہی ہوتے کہ اس وقت صرف مسلمان ہی مسلمان عورتوں سے عشق کر سکتے تھے۔ اس وقت کے معاشقوں میں ذات پات کو بھی بہت دخل تھا۔ ہاں اینگلو انڈین اور اس کے بعد انگریز لڑکیوں

www.taemeernews.com

کے یہاں یہ پابندی نہ تھی۔

تو پھر یہ ہوا کہ ایک شام شوکت میرے پاس آیا اور مجھے نمائش چلنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک میں نے نمائش نہیں دیکھی تھی، میں فوراً تیار ہو گیا۔ مگر احتیاطاً میں نے یہ بات اپنی بہن سے بھی بتادی۔ خیر ٹھیک چھ بجے شام کو ہم لوگ نمائش گاہ میں داخل ہو گئے۔ میرے لئے یہ بالکل ایک نئی دنیا تھی۔ ہم نے پہلے پوری نمائش کا ایک چکر لگایا۔ تمام طرح کی چیزیں دکانوں پر جھانکتے پھرے۔ خریدتے کیا کہ گرہ میں مال کہاں تھا! پھر ایک جگہ سے ایک ایک آنے کا پانی ویٹا خریدا اور پاس کی پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ مگر میں محسوس کر رہا تھا جیسے شوکت کسی کا منتظر ہے۔ بار بار وہ داخلے کے گیٹ کی طرف دیکھتا جاتا تھا کہ یکایک وہ اچھلا، "آگئی" کہا اور پھر مجھے گھسیٹتا ہوا گیٹ کی طرف چلا۔ ہم لوگ آگے بڑھے تو دیکھا کہ دو برقعہ پوش عورتیں ایک لڑکے کے ساتھ نمائش گاہ میں داخل ہوئیں۔ اب شوکت نے مجھ سے بتایا کہ یہ وہی فیض آباد والی لڑکی ہے جس سے اس نے اپنے معاشقے کا حال بتایا تھا اور جس کے لئے وہ "میرا بلبل سو رہا ہے" والا گانا گایا کرتا تھا۔ شوکت اور میں اب ذرا دور دوران برقع پوشوں کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ دیکر چلنے لگے۔ کبھی کبھی وہ لڑکی بھی برقع اٹھا کر شوکت کو دیکھ لیتی۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ آخر جب رات کے نو بجے تو وہ دونوں برقع پوش باہر نکلیں اور اپنے گھر کو روانہ ہوئیں۔ ہم اس وقت ایک کالا جادو دکھانے والے اسٹال کے سامنے تھے جہاں لوگ ایک ایک پیسے میں یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ مگر اب شوکت کا جی اچاٹ ہو گیا تھا اس لئے ہم بھی نمائش گاہ سے باہر نکل آئے۔

کہنے کو تو یہ نمائش ایک سودیشی نمائش اور کسانی میلا ٹائپ کی چیز تھی مگر یہاں ایسے دیسیوں کا گزر نہ تھا۔ یہاں صرف مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس کے لوگ ہی ہوتے جو اپنی حیثیت سے بڑھ کر دکھانے اور خرچ کرنے کی نمائش کرنے آتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی دکھائی دیتے جن کا حلیہ ایسا ہوتا کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ عام طور پر اپنے روزمرّہ کے لباس سے وہ مختلف ہوتے۔ کبھی کبھی دوستوں کے کپڑوں سے وہ ایک متموّل شخص بن جاتے اور ایسا لگتا گویا واقعی اپنی نمائش کے لئے وہ نمائش میں آئے ہیں۔ کچھ صاحبانِ حیثیت خاص نمائش کے لئے نئے سوٹ سلواتے اور نمائش میں اس طرح گھومتے جیسے کہہ رہے ہوں کہ "نہ ایسے ہوئے ہیں نہ ہوں گے کبھی"۔ کبھی کبھی یہ جگہیں شوکت کی طرح محض ملاقاتوں

www.taemeernews.com

اور جلوے دیکھنے کے لئے بھی ہوتی ہیں۔

عجیب بات تھی کہ معاملاتِ عشق میں، میں ابھی تک محض کیمپ فالوور (camp Fol- lower) تھا۔ میری کئی مشکلیں اور رکاوٹیں تھیں۔ اوّل تو میں ابھی اس عمر کو نہیں پہنچا تھا جو ایسے کاموں کے لئے مناسب ہوتی ہے۔ دوسرے میری دیہات کی زندگی نے سیکس (sex) کو ایک طرح سے ممنوع (Taboo) بنا کر پیش کیا تھا کہ دیہات کی سماجی زندگی میں ایسے معاملات کی بہت کم اجازت ہے۔ وہاں ایک خاص قسم کی اخلاقیات کا دباؤ ہوتا ہے۔ پھر دیہات کی زندگی ایک عملی زندگی ہوتی ہے جس میں کسی طرح کے رومان کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ پھر میں معاملاتِ عشق کی راہوں سے بھی واقف نہ تھا اور نہ ان باتوں کا مجھے سلیقہ تھا۔ اگرچہ جنسیات کی دنیا میں یہ باتیں عملی طور پر خارج نہیں ہوا کرتیں۔ مگر ہندوستان کی تہذیبی جمالیاتی زندگی میں رنگ روپ اور اس کے لوازم کو رومان کی دنیا میں خاصی اہمیت ہوتی ہے۔ قدرت نے میرے ساتھ ستم ظریفی کی تھی۔ رنگ روپ تو کچھ تھا ہی نہیں اس پر مستزاد یہ کہ چیچک نے چہرے کی رہی سہی آب بھی رخصت کر دی تھی۔ ایسی صورت میں انسانی نفسیات دو طرح سے کام کرتی ہے۔ یا تو وہ اپنی محرومیوں کا انتقام سماج سے اس طرح لیتا ہے کہ وہ اور بڑھ چڑھ کر جنسی معاملات میں کھل کھیلتا ہے یا پھر اپنے خول میں چلا جاتا ہے۔ میں ابھی تک دونوں صورتوں کے بیچ میں معلّق تھا اور طے نہیں کر پاتا تھا کہ میرا راستہ کون سا ہے۔ اس لئے کسی رومانی اقدام کے لئے خود کو تیار نہیں کر پاتا تھا۔ پھر یہ خطرناک کھیل بھی تھا اور میں کوئی خطرہ آسانی سے مول نہیں لیتا۔ پھر میرے حالات میں ایسی صورتوں کی گنجائش بھی کہاں تھی۔

ایک شام کو ریڈیو سے خبر ملی کہ اچانک جرمن فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ روس اور جرمنی اس جنگ میں ساتھ ہیں اور اب برطانیہ کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیونکہ برٹش پرائم منسٹر نیویل چیمبرلین اور ہٹلر کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو سکی۔ یہ دوسری ستمبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے ہٹلر اور استالین کا نام سنا۔

www.taemeernews.com

پھر اسکول چھوٹ گیا

جس تمنا کے ساتھ الٰہ آباد کے اسکول میں داخلہ لیا تھا وہ پوری نہ ہو سکی یعنی کہ انگریزی کی تعلیم کا حصول۔ اس لئے دل اسکول سے ہٹتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن اسکول چھوڑ کر گھر بیٹھ رہا چھٹے درجے کا نتیجہ آیا تو فیل تو نہیں تھا مگر وہی لشتم پشتم پر دموشن مل جانے کی کیفیت تھی اور یہ صورت کیوں نہ ہوتی جب مجھے کتابوں اور کلاس سے شاذ و نادر ہی واسطہ پڑتا۔ امتحان دینے جاتا تو بجائے آموختہ دُہرانے کے ایک مولوی صاحب سے تعویذ لے لیتا۔ قرآن کا حمائل ایڈیشن جیب میں رکھتا کہ یہی سب صورتیں مجھے امتحان میں کامیاب کر دیں گی۔ خوب نمازیں پڑھتا اور پاس ہونے کی دعائیں مانگتا لیکن عملی رُخ کی طرف دھیان نہ دیتا یعنی کتابیں وغیرہ نہ پڑھتا۔ ایک میرا دوست آنند تیواری بھی تھا۔ تھا تو وہ بھی کھلنڈرا اور اُسے بھی پاس ہونے کے لالے پڑے رہتے مگر اسے جیومیٹری سے کچھ دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی امتحان کے زمانے میں اس کے ساتھ پریم ناکیز سے ملے ہوئے پارک میں صبح صبح جیومیٹری کی کچھ اشکال ہم لوگ حل کرنے کی فکر کرتے مگر یہ بھی کسی لگن کے ساتھ نہیں۔ تاہم اس مشق سے جیومیٹری کچھ بہتر ہو گئی۔ مگر امتحان صرف جیومیٹری کے سہارے تو پاس نہیں کیا جا سکتا تھا؟

دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہر طرف فوجی بھرتیاں ہو رہی تھیں اور فوجی سامان کیلئے کارخانے کھل رہے تھے۔ مجھ سے سن میں کچھ بڑے لڑکے فوج میں بھرتی ہو کر، سیلون (سری لنکا)، ملایا اور سنگاپور جا رہے تھے۔ میرے دو ایک ہم جماعت جو ذرا قد میں لمبے اور ہاتھ پیر کے اچھے تھے اور جو سن میں بھی مجھ سے خاصے بڑے تھے سب فوج میں بھرتی ہو کر باہر جا چکے تھے یا پھر الٰہ آباد کے قریب آرڈیننس فیکٹری جو چھیوکی میں کھلی تھی اس میں کام کرنے لگے تھے۔ میری بہنوں نے یہ خیال کیا کہ یہ کمبخت پڑھ لکھ نہیں سکتا لہٰذا اسے کسی نئے بنتے ہوئے فوجی کارخانے میں بھرتی کرا دیا جائے۔ میرے ایک بہنوئی کو خیمہ بنانے کا ایک فوجی ٹھیکہ الٰہ آباد قلعے کے سامنے والے میدان میں مل گیا جہاں ایم۔ جی۔ قادر نامی ٹھیکیدار

www.taemeernews.com

کا بڑا ملیٹری ٹھیکہ تھا میری آوارگی سے تنگ آکر میرے بہنوئی مجھے اپنے ساتھ اسی ٹھیکے کے دفتر میں لے جانے لگے اور میں ان کا کام دیکھنے لگا۔ یہاں چھولداریاں اور مچھردانیوں کے ڈنڈے بنتے تھے۔ بانس کی فراوانی دیکھ کر مجھے اپنی لاٹھی یاد آنے لگی اور ان بانسوں میں کسی ایسے بانس کو میں اکثر تلاش کرتا جو ٹھوس ہو اور جس کی لاٹھی بنائی جاسکے۔ مگر یہاں زیادہ تر کھوکھلے بانس آتے تاکہ وزن میں کم ہوں۔ کھوکھلے بانسوں سے میں نے برگد سے دودھ نکالنے کے لئے کچھ چونگے ضرور بنوا لئے کہ جب دیہات جاؤں گا تو یہ چونگے بلبل پھنسانے کے کام آئیں گے۔ چونگے بنوانے کے بعد مجھے دیہات بُری طرح یاد آنے لگا۔ نصیر حسن کی صحبتیں اور کنجڑوں کے لڑکوں کے ساتھ بلبل پھنسانے کے مزے یاد آنے لگے اور آخر میں سب کچھ چھوڑ کر میں پھر دیہات واپس چلا گیا۔ شوکت، سینما، سلوچنا، حسن کجن، پری چہرہ نسیم، اور ٹھیکہ بنوانے والے ٹھیکے دار سب الٰہ آباد ہی میں رہ گئے۔

الٰہ آباد میں اُن دنوں بڑی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ہوائی حملے کے خوف سے ساری سڑکوں کے کنارے اونچی اونچی دیواریں اٹھا دی گئی تھیں اور مکانوں یا دکانوں کے سامنے کی برساتیاں (برآمدے) سب بند کر دئیے گئے تھے۔ یہ جگہیں ہوائی حملوں سے بچنے کی پناہ گاہیں (Air Raid Shelter) بنادی گئی تھیں۔ سڑک سے نہ تو کوئی دکانوں کو دیکھ سکتا تھا اور نہ کسی کا گھر سامنے سے دکھائی پڑتا تھا ایک پتلا سا راستہ چھوڑ دیا جاتا جس سے پردوں کی دیواروں کے پیچھے جا کر سودا سلف خریدا جاسکتا تھا پورا شہر ایک جیل خانہ سا لگتا تھا۔ عالمی جنگ بھیانک طور پر پھیل گئی تھی۔ ہر طرف سے ہٹلر کی فتح کی خبریں آنے لگیں اور حکومت ہند بے حد خوف زدہ تھی۔ الٰہ آباد اور کانپور لڑائی کا سامان سپلائی کرنے کے بڑے اڈّے تھے۔ ہر طرف فوجی رنگ (OLIVE GREEN) مقبول ہو رہا تھا۔ ہوائی حملے کا الٰہ آباد پر یہ خوف طاری تھا کہ رات کو کہیں باہر روشنی کی کرن نہیں دکھائی دیتی تھی۔ بلیک آؤٹ BLACK OUT کا لفظ پہلے پہل اپنی معنویت اور پریکٹس کے ساتھ پہلی دفعہ الٰہ آباد میں سننے میں آیا۔ رات میں نکلنے سے پرہیز کیا جانے لگا۔ جا بجا چوراہوں اور سڑکوں پر پولیس والے بیٹھے رہتے اور ہر آیند و روند سے استفسار کرتے کہ وہ کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جارہا ہے اور ایسے ویسے آدمی کو دیکھتے تو اس کی جامہ تلاشی بھی لیتے اور کبھی کبھی تو جو روپے پیسے اس کی جیب میں ہوتے

www.taemeernews.com

سب پولیس والوں کی تحویل میں چلے جاتے اور آدمی مارے خوف کے اس کا تذکرہ بھی کسی سے نہ کرتا بلکہ آئندہ احتیاط کے طور پر رات میں نکلنا بند کر دیتا ہے۔ گویا یہ منظم قانونی رہزنی تھی۔ جس کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ ہر طرف ایک ہی بات کہی جاتی کہ لڑائی کا زمانہ ہے اس لئے پولیس اور فوجیوں کو ہر طرح کی چھوٹ ہے۔ افواہیں پھیلانے کی سخت سزا تھی۔ شہر میں جابجا فوجی بھرتی کے دفتر کھل گئے تھے۔ میوہال جس کا شہر میں سب سے بڑا دفتر تھا چھیونکی میں فوجی گاڑیوں اور ان کے بنانے کے سرکاری کارخانے وہیکل ڈپو کے نام سے کھلے جس میں شہر کے بہت سے بے روزگاروں کو ملازمتیں مل گئیں۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کے طلبا بھی گرمیوں کی تعطیل میں دفتر کی ملازمتیں کر لیتے اور اپنے سال بھر کے اخراجات ان عارضی ملازمتوں سے نکال لیتے چھیونکی کی ملازمت میں سب طرح کے لوگ ملازمت کر رہے تھے۔ کچھ شاعر بھی وہاں پہنچ گئے تھے چھیونکی کا فاصلہ الہ آباد سے چھ سات میل کا ہے۔ ریل گاڑیاں تو زیادہ تر فوجیوں کے لئے وقف ہو گئی تھیں اس لئے لوگ سائیکل یکے سے اور زیادہ تر پیدل چھیونکی صبح صبح بھاگتے کچھ شعراء نے چھیونکی پر ایک نظم بھی لکھی تھی اور پیدل جانے والے اکثر کورس میں وہ نظم گاتے چلتے۔ نظم کا ٹکڑا تھا ؎

برسات میں والللہ مزا دیتی ہے چھیونکی　　　دل والوں کو کیا خوب سزا دیتی ہے چھیونکی

اور بقیہ اشعار یاد نہیں۔ کسی نے بتایا تھا کہ یہ اشعار منظر شاہجہاں پوری کے تھے جو اس وقت چھیونکی میں وہیکل ڈپو میں موٹر ڈرائیور تھے۔ ملازمت کے لئے عمروں کی پابندیاں بھی کم کر دی گئیں تھیں۔ پندرہ سال کی عمر تک کے لوگ بھرتی ہو سکتے تھے۔ ایک دن میں نے بھی ایک ہوائی جہاز کے دفتر میں درخواست بھیج دی۔ انٹرویو ہوا تو عمر ابھی پندرہ سال بھی نہیں تھی اس لئے درخواست نامنظور ہو گئی اس دن مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرے بھائی چھکن میاں بمبئی سے ملازمت چھوڑ کر دیہات واپس آ چکے تھے اور جب ان کو میرے الہ آباد کے کارنامے معلوم ہوئے تو انھوں نے مجھے پھر دیہات واپس بلا لیا۔

دیہات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مگر مٹی کا تیل، شکر اور کھانے پینے کی وہ اشیاء جو دیہات میں نہیں بنتی تھیں سب غائب ہو گئیں یا زیادہ قیمتوں میں ملنے لگیں۔ بلیک مارکٹ کا نام

www.taemeernews.com

اور کام بھی اسی زمانے سے شروع ہوا۔ اشیائے خوردنی اور زندگی کے دیگر ضروری اشیاء پر حکومت نے پہلے کنٹرول لگایا، پھر راشننگ شروع ہو گئی۔ شہروں میں لوگوں کے راشن کارڈ بن گئے اور اُسی راشن کارڈ پر غلہ، مٹی کا تیل، پہننے کے کپڑے سب بر وقت ملنے لگے۔ یہیں سے بلیک مارکٹ کا آغاز اس طرح ہوا کہ لوگوں کے راشن کارڈ پر دکاندار چیزیں لے لیتے اور پھر اصل آدمی کو نہ دیکر ضرورتمندوں یا دیہات والوں کے ہاتھ مہنگی قیمتوں پر بیچتے۔ گیہوں اور چوکا ایک روپئے کا پندرہ سیر اور بیس سیر الہ آباد کی خلیفہ منڈی میں (غلّے کی منڈی کا نام ہے) بکا کرتا تھا۔ اچانک دس سیر اور بارہ سیر ہو گیا۔ اس وقت آج کی طرح ہندوستان کے ہر شہر میں غلّے کی شرحیں ایک نہیں ہوا کرتی تھیں الہ آباد، کانپور، دلّی ہر جگہ شرحیں مختلف ہوا کرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خاص طور پر بنئے ذخیرہ اندوزی کرنے لگے اور ہر طرف ایک خلفشار کی صورت نظر آنے لگی۔ ایدلپور پہنچا تو معلوم ہوا کہ نصیر حسن فوج میں بھرتی ہو کر دلی اور پھر وہاں سے کولمبو اور پھر کانڈی شہر میں پہنچ گئے۔ جھکن میاں نے اپنے فنڈ کے پیسوں سے کھیتی کا کاروبار شروع کیا اور ان سب کی نگرانی میرے سپرد کر دی گئی۔ جھکن میاں عملی آدمی ہیں۔ انھوں نے تعلیم تو واجبی واجبی پائی مگر دنیا کے تجربے بہت انھیں اتنی سی زندگی میں ہو گئے تھے۔ مجھ پر عتاب یہ بھی تھا کہ جب پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تو کھیتی باڑی کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہو میرے پاس کچھ آبائی کھیت رہ گئے تھے انھیں میں سب کچھ کرنا تھا۔ چنانچہ اب میں نے یہی کام شروع کیا۔ دن بھر کھیت جتواتا، کھیتوں میں بوائی کراتا اور جانوروں کی نگرانی وغیرہ سب میرے ذمّے کر دی گئی۔ ایسے میں جب الہ آباد کی صحبتیں یاد آتیں تو جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ کر پھر الہ آباد بھاگ جاؤں اور مس کجّن، سکو چینا اور پری چہرہ نسیم کی فلمیں دیکھوں۔ مگر کہاں؟ میں نے تو اپنی تمام کشتیاں جلادی تھیں۔

میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ دیہات میں سید صغیر حسن ایک باذوق آدمی میرے گاؤں سے ملے ہوئے گاؤں دلورکوتاری میں رہتے تھے۔ انھوں نے ایسے دیہات میں اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ایک لائبریری کھول رکھی تھی جس کے وہ اکیلے قاری تھے۔ میں نے ان کے گھر پھر سے آنا جانا شروع کیا اور مجھ پر ان کے مطالعے اور ذوق کا اثر ہونے لگا۔ اُس وقت آج کا ''ہماری زبان'' والا اخبار نما رسالہ ''اردو'' کے نام سے ڈاکٹر عبدالحق، اورنگ آباد سے نکالا کرتے تھے۔ صغیر حسن صاحب وہ اخبار نما رسالہ بھی منگاتے

www.taemeernews.com

اور ہم دُو قاری اب ان کتابوں اور رسالے کے بن گئے۔ اُردو کے متعلق تمام خبریں رسالہ اُردو میں نکلا کرتیں جنہیں میں بھی اب سمجھنے لگا تھا۔ کبھی کبھی صغیر حسن صاحب کی لائبریری سے کتابیں بھی لاتا۔ تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجمہ کئے ہوئے تقریباً تمام جاسوسی اور رومانی ناول صغیر حسن صاحب کے کتب خانے میں موجود تھے۔ میں نے فسانۂ لندن، نظارۂ پرستان، باپ کا قاتل، شب حسرت، نقلی ہیرا، کارنامہ جاسر آرسین لوپن، شرلاک ہومز اور جانے کیا کیا صغیر حسن صاحب کے اس کتب خانے سے لے کر پڑھ ڈالے۔ اب میرا ادبی شعور کچھ بالغ ہونے لگا تھا۔ کبھی صغیر حسن صاحب شعر و شاعری کے نکات مجھے بتاتے۔ وہ اچھے شاعر اور مرثیہ خواں بھی تھے۔ خاصے وجیہہ آدمی تھے اور جب منبر پر بیٹھ کر وہ کراری کے امام باڑوں میں مرثیے پڑھتے تو مجلسوں کی شان ہی کچھ اور ہو جاتی۔ واقف کار ایسے کہ کیا مجال کہیں کوئی لفظ یا کوئی صوت ادبی شعائر سے الگ نکلے۔ ان کا مرثیوں کے پڑھنے کا بھی اپنا ایک انداز تھا۔ نہایت متوازن، نہ کہیں ہاتھ پاؤں زیادہ جھٹکتے پٹکتے، نہ کرخت لہجے میں کوئی شعر یا مصرعہ پڑھتے۔ بین بھی بس غمگین آواز سے آگے نہ جاتے۔ رونا پیٹنا یا تیز آواز میں واویلا مچانا ان کے بیان مصائب میں نہ تھا۔ وہ صرف میر انیس یا میر مونس کے مرثیے پڑھتے تھے۔ انھیں نے مجھ میں میر انیس کے مرثیوں کا ذوق پیدا کیا۔ میر انیس کے مرثیوں میں "بخدا فارس میدان تہوّر تھا حُر" اور "نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری" ان کے محبوب مرثیے تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں انھوں نے طلسم ہوشربا کا ذکر چھیڑا۔ ان کی لائبریری میں داستانِ امیر حمزہ، موجود تھی اور طلسم ہوشربا کی کچھ جلدیں۔ میں نے ان سے لے کر یہ داستانیں پڑھیں تو آتشِ شوق کو اشتعال ہوئی مگر جتنی جلدیں صغیر حسن صاحب کے پاس موجود تھیں وہ سب جب ختم ہو گئیں تو مزید کی تلاش ہوئی مگر وہاں کہاں سے ملتیں۔ پھر بعد کو میں نے الہ آباد کے قیام کے دوران بقیہ طلسم ہوشربا، بالا باختر لعل نامہ، ایرج نامہ اور طلسم ہفت پیکر کی جلدیں پڑھیں۔ ان داستانوں کے مطالعے کا یہ اثر ہوا کہ میری اردو کی لیاقت بہت اچھی ہو گئی۔ ہوتا یہ کہ جب دن میں مجھے کھیت پر نگرانی کے لئے جانا ہوتا طلسم ہوشربا کی کوئی جلد لے جاتا اور جب ہلواہے کھیت جوتتے ہوتے تو میں یہی کتابیں پڑھتا رہتا۔ جس دن فرصت ہوتی صغیر حسن صاحب کے یہاں جاتا۔ جہاں اکثر حیدر آباد کی علمی، ادبی صحبتوں اور دلچسپیوں کی باتیں ہوتیں۔ وہ ڈاکٹر عبدالحق سے حیدر آباد میں مل چکے تھے۔ اکثر ان کے چڑیا خانے

www.taemeernews.com

کا تذکرہ مزے لے کر کرتے۔ کبھی محاذ پر سے نصیر حسن کا خط آتا یا فوجی لباس میں کوئی تصویر آتی تو مجھے دکھاتے ایسے میں پڑھنے لگا تھا اور اب پھر پچھتاوا ہونے لگا کہ میں نے اپنی تعلیم کیوں چھوڑ دی۔ مگر اب تو میں Point of no return کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ اپنے شباب پر تھی۔ سنگاپور اور کلکتے پر جاپانیوں نے حملے شروع کر دیئے تھے۔ سبھاش چندر بوس کا گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے اسی جنگ کو لے کر اختلاف شروع ہو چکا تھا۔ اور پھر ایک دن خبر آئی کہ سبھاش چندر بوس، ہندوستان سے اچانک نکل کر جاپان جا پہنچے اور وہاں انگریزوں کے خلاف ایک فوج انڈین نیشنل آرمی (I.N.A) کے نام سے بنا ڈالی ہے اور اب بہت جلد جاپانیوں کی مدد سے وہ ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے بزورِ شمشیر آزاد کرائیں گے کہ وہ گاندھی جی کی حکمتِ عمل کے مطابق بیٹھ کر چپ چاپ گڑی کے تھان نہیں بن سکتے تھے۔ انھیں دنوں جب پرل ہاربر پر جاپانیوں نے بم گرائے تو افواہ پھیل گئی کہ جاپانی، الہ آباد کے قلعے اور کانپور کے جنگی سامان بنانے والے ڈپو Depot پر بم گرانے والے ہیں چنانچہ الہ آباد شہر کی آبادی دیہات منتقل ہونے لگی، جن کے اپنے گھر دیہات میں تھے وہ تو اپنے بچوں کو دیہات پہنچانے ہی لگے مگر ان کے ساتھ ان کے کچھ شہری اعزّا بھی دیہات بھاگنے لگے۔ الہ آباد میں سراسیمگی (Panic) پھیل گئی۔ ہر وقت ہوائی حملے سے بچاؤ کی مشقیں شروع ہو گئیں۔ بم سے آگ لگنے پر آگ بجھانے کی Mock پریکٹس ہر طرف ہونے لگی۔ A.R.P. کا ایک محکمہ وجود میں آگیا جس میں لوگوں کی خاصی بڑی تعداد ملازم ہو گئی۔ بم سے بچاؤ کے لئے ہر محلّے میں زمین میں گڑھے کھود دیئے گئے کہ جب ہوائی حملہ ہو تو لوگ دوڑ دوڑ کر ان گڑھوں میں منہ کے بل لیٹ جائیں۔ حالات خاصے تشویشناک ہو گئے۔

پھر ایک دن بھائی علی اصغر بھی اپنے بچوں کے ساتھ ایدلپور میں وارد ہوئے اور یہاں یہ بتایا کہ اب وہ اپنے بچوں کو دیہات کے اسکول ہی میں پڑھائیں گے کیونکہ اب الہ آباد شہر خطرے میں ہے۔ سب بچوں کو اوسا گاؤں کے پرائمری اسکول اور منجھن پور میں کھلے ہوئے نئے انگریزی اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ ان کے بڑے بیٹے علی غضنفر مجھ سے تقریباً دو سال عمر میں چھوٹے تھے اور جونپور کے کسی اسلامی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ پھر انھیں بھائی صاحب نے الہ آباد کے کسی اسکول میں

www.taemeernews.com

داخل کرایا جہاں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اور اب وہ بھی مچھن پور میں نئے قائم شدہ انگریزی اسکول میں داخلے کے لئے ایدلپور رہا لئے گئے۔ یہ غالباً جون ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا کہ سب لوگ ایدلپور میں رہنے لگے۔ غضنفر تقریباً میرے ہم سن تھے اور کچھ میرا ہی جیسا سیلانی مزاج بھی رکھتے تھے۔ ہم لوگ محرم کے ایام میں کراری میں ہوا کرتے۔ ہم دونوں کو شہری زندگی کا بھی خاصہ تجربہ تھا اور میں نے تو شوکت کے ساتھ اور تجربے بھی کئے تھے جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ غضنفر اور میں دونوں اپنے کو زنگ باز سمجھتے تھے۔ اسی درمیان حمیدہ نام کی ایک تیز طرار لڑکی ہم لوگوں کو متاثر کرنے لگی۔ ہم لوگ اس سے دلچسپ باتیں کرتے اور اس کی معیت میں ہم لوگوں کو بڑا مزہ آتا۔ وہ ایک بے حد خوش لحن لڑکی تھی اور محرم میں جب نوحے اپنی پرسوز آواز میں پڑھتی تو سماں بندھ جاتا۔ اس کے والدین نے اسے پڑھنا تو سکھا دیا تھا مگر اُسے لکھنا نہیں آتا تھا۔ غضنفر کی تحریر بہت اچھی تھی چنانچہ ہم لوگ اس کی بیاض میں نئے نئے نوحے لکھ دیتے اور وہ خوش ہو جاتی۔ مگر ربط ضبط اس سے زیادہ نہ بڑھ سکا کہ نہ تو حمیدہ کو باتیں بڑھانے کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ہم لوگوں کو۔ پھر ایک دن اکیلے میں ہم لوگوں نے اسے گھیرنے کا ارادہ کیا۔ مگر عین وقت پر ہماری ہمتیں جواب دے گئیں۔ اور ہمارے متفقہ عشق کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی درمیان غضنفر ایک حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا اور وہ علاج کے لئے الہ آباد چلے گئے۔ دو چار ماہ بعد جب وہ الہ آباد سے آئے تو سب کچھ بھول چکے تھے اور حمیدہ کا واقعہ بچکانی شرارت سے زیادہ اور کچھ نہ رہا۔ لیکن غضنفر الہ آباد میں جہاں مقیم تھے وہاں کوئی واشنگ کمپنی پاس میں تھی جہاں رات دن دھوبی کام کی یکسانیت دور کرنے کے لئے طرح طرح کے دیہاتی گیت گاتے۔ غضنفر بھی اس وقت کھلنڈرے قسم کے آدمی تھے (اب تو وہ مولانا ہو گئے ہیں۔ مگر کوئی مولانا پیدا تو نہیں ہوتا؟ مولانا بھی پہلے ایک عام انسان ہوتے ہیں، اپنی جملہ نفسیات کے ساتھ) الہ آباد سے لوٹے تو اکثر ترنگ میں آتے تو دھوبیوں کا یہ گیت گاتے۔

ع ساس ننند مورا لڑکا کھلادیں   ہائے راما مورا سوامی اُٹھے نہ دیکھے... ہائے راما۔

غضنفر کے تمام بھائی ایدلپور ہی میں رہ رہے تھے۔ بھائی علی اصغر کو کسرت اور مذہبیات سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ جب ایدلپور آتے تو صبح اٹھ کر ایک بجے سے بہ آواز بلند اذان دلواتے پھر نماز پڑھاتے

www.taemeernews.com

اور بعد کو ڈرل (Drill) کراتے۔ اسی زمانے میں مجھے بھی مذہبیات سے کافی دلچسپی ہوگئی۔ نماز پنجگانہ ادا کرتا، قرآن کی تلاوت کرتا۔ رمضان میں پورے روزے رکھتا۔ اسلامی تاریخ پر کتابیں صغیر حسن صاحب سے لے کر پڑھ ڈالیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں کچھ نہ آئیں۔ مگر کرکٹ وغیرہ سے میری دلچسپی ختم ہوچکی تھی۔ مذہبیات سے دلچسپی نے ایک دن مجھے ایک انوکھی کتاب سے دوچار کیا۔ اس کتاب کا نام نقش سلیمانی تھا۔ یہ تعویذ اور گنڈوں کی کتاب تھی۔ اس میں بھوت پریت، جناتوں اور ہمزاد کو مسخر کرنے کی ترکیبیں درج تھیں۔ چنانچہ میں عملیات میں بھی مہارت حاصل کرنے کی فکر کرنے لگا۔ رمضان کے مہینے میں عمل پڑھا کرتا۔ کبھی تحفۃ العوام میں درج 'الودود' کا نقش بناتا۔ کبھی مدار کی لکڑی جلا کر اسے شہد میں سان کر گولیاں بناتا اور اس پر نقش سلیمانی میں لکھی ہوئی کوئی دعا پڑھ کر پھونکتا اور پھر دشمن کو مسخر کرنے کے لئے ان گولیوں کا استعمال کرتا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک دن نقش سلیمانی میں دیکھا کہ اگر جمعرات کے دن انجیر کی لکڑی صحرا میں جلا کر اسے کالی بکری کے دودھ میں گوندھ کر ایک ہزار بار 'الودود' پڑھ کر گولیاں بنا کر رکھ لے۔ اور منگل کے دن جس کسی پر یہ گولیاں ماردی جائیں تو وہ مارنے والے کی محبت میں گرفتار ہو جائے گا۔ میں انجیر کی لکڑی لایا۔ دوپہر میں ایک باغ کے سامنے کھلے میدان میں اسے جلا کر اس کی راکھ سمیٹ لی اور پھر دھوپ میں ادھر ادھر گھومتی ہوئی بکریوں میں سے ایک کالی بکری کو پکڑ کر اس کا دودھ ایک کٹورے میں نکال۔ اسے انجیر کی لکڑی کی راکھ میں ملا کر گولیاں بنا ڈالیں۔ پھر انھیں سکھا کر احتیاط سے ایک ڈبیہ میں رکھ لیا۔ اب ذہن میں طرح طرح کے نقشے ابھرنے لگے۔ سب سے پہلے حمیدہ کا نقشہ ابھرا۔ پھر ٹرین والی سلوچنا، پھر شوکت کی فیض آباد کی عزیزہ کا نقشہ اور پھر نقشے ذہن میں ابھرتے ہی چلے گئے اور میں ڈبیہ ہاتھ میں لئے ہوئے ٹہلتے ہوئے کر بار بار سوچتا رہا کہ اس کا استعمال کہاں کیا جائے۔ انسان جب خام خیالی میں گرفتار ہوتا ہے تو کیا کیا حماقت کی باتیں سوچتا ہے؟ فینٹیسی (Fantacy) کی کوئی حد تو ہے نہیں۔ خیر میں نے ڈبیہ احتیاط سے جیب میں رکھ لی اور گھر واپس آگیا۔ اب ذہن میں ایک کشمکش پیدا ہوئی۔ کیوں نہ اس کا کسی اور سے امتحان کرایا جائے۔ گاؤں میں گنگا سنگھ نام کے ایک منچلے تھا کرتے تھے۔ وہ اکثر گاؤں کی گلیوں کی خاک چھانتے پھرا کرتے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ان سے ان گولیوں کا قصہ بیان کیا جائے اور وہی

www.taemeernews.com

انھیں پہلے آزمائیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ گنگا سنگھ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ کیسے ان سے یہ بات بتائی جائے۔ مگر میں نے گنگا سنگھ سے بھی یہ بات نہ بتائی اور ڈبیہ ایک محفوظ مقام پر رکھ کر موقع کا انتظار کرنے لگا۔

برسات ابھی شروع نہیں ہوئی تھی مگر اس کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ بڑی تپش تھی۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر تیرنے لگے تھے کہ ایک صبح جب اٹھا تو اذان کی آواز بھائی علی اصغر کے گھر سے آئی۔ میں سمجھ گیا کہ بھائی صاحب آگئے۔ یہ عید کا موقع تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ان کی طرف گیا تو دیکھا کہ وہ تمام لڑکوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ڈرل (Drill.) کرا رہے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا جعفر کچھ جھینپو قسم کا تھا۔ اس نے جو مجھے آتے دیکھا تو ڈرل بند کردی۔ میں ان بچوں کی ہیئت کذائی اور مجبوری دیکھ کر ہنس دیا اور بھائی صاحب کو سلام کر کے اندر چلا گیا۔ بھائی صاحب جعفر پر برس پڑے کہ اس نے ڈرل کیوں بند کردی۔ جعفر بولا کہ لوگ ہنستے ہیں کہ آپ صبح صبح ہم سے یہ کسرت کیوں کراتے ہیں۔ بھائی صاحب نے جعفر کو اتنے زوروں میں ڈانٹا کہ میں ڈرا کہ کہیں اُسے مار نہ بیٹھیں۔ میں چپکے سے باہر نکلا تو بھائی صاحب جعفر سے کہہ رہے تھے۔

"جو ہنستے ہیں ان سے کہہ دے کہ انھیں تو ایدل پور میں رہ کر گھاس چھیلنا ہے اور ہم لوگوں کو ملٹری میں کپتان ہونا ہے۔ آئی سی ایس ہونا ہے۔"

میں خاموشی سے اپنے گھر چلا آیا۔ مگر بھائی علی اصغر کے یہ الفاظ میرے دل پر گولی کی طرح لگے۔

کبھی کبھی انسان کا ضمیر اور اس کی انا عجیب عجیب طرح سے جاگ اٹھتے ہیں۔ یہ کوئی بات نہ تھی۔ سبھی اپنے بچوں کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لئے اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر مجھے بھائی صاحب کی اپنے بیٹوں سے اس طرح کی گفتگو میں اپنی تذلیل محسوس ہوئی مگر میں کر کیا سکتا تھا۔ غضنفر نے جونپور سے آکر الہ آباد کے کسی اسکول سے پانچواں درجہ پاس کیا تھا اور جعفر غالباً چوتھے درجے میں تھے۔ میں نے غضنفر سے ان کی کتابیں مانگیں۔ اب جو میں نے کورس دیکھا تو سوا انگریزی کے سب کچھ مجھے اس کورس سے بہتر آتا تھا۔ اسی زمانے میں خبر ملی کہ وہ مجھن پور والا اسکول جس کے کھلنے کی خبر تھی، الہ آباد کے کچھ اگروال اُسے جولائی میں کھول رہے ہیں۔ صرف پانچویں اور چھٹی جماعت تک کھولیں گے۔ میں نے اپنے الہ آباد کے مڈل اسکول والے انگریزی کورس کے تجربے اور واقفیت کی بنیاد پر غضنفر کی انگریزی کی کتابوں کو پڑھ

www.taemeernews.com

ڈالا اور پھر جب جولائی میں منجھن پور کا نیا اسکول کھلا تو غضنفر اور جعفر دونوں کا داخلہ بھائی صاحب نے اسی اسکول میں کرا دیا۔ ایک روز میں بھی غضنفر کے ساتھ اسکول چلا گیا اور ان کی تمام کلاسوں میں بیٹھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ میری معلومات سے بہت پیچھے ہیں۔ چنانچہ میں روز اسکول جانے لگا اور بغیر داخلے کے کلاسوں میں بیٹھنے لگا۔ چونکہ اسکول نیا نیا کھلا تھا اس لئے ابھی اس میں کسی طرح کی پابندی نہ تھی کہ کس کا داخلہ ہوا ہے اور کس کا نہیں۔ صرف دو استاد تھے۔ ایک انگریزی کے ایم۔ اے تھے جن کا نام کمل نین تیواری تھا اور دوسرے رودر پال سنگھ۔ سنگھ صاحب اردو بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دن سنگھ صاحب کے کلاس میں گیا تو وہ کورس میں شامل مسدس حالی کے کچھ بند پڑھانے لگے۔ ایک طالب علم سے انھوں نے پڑھنے کو کہا۔ وہ بیچارہ اٹک اٹک کر غلط سلط تلفظ کے ساتھ پڑھنے لگا۔ میں قریب ہی بیٹھا تھا اُسے دُرست کرنے لگا۔ سنگھ صاحب نے مجھ سے پڑھنے کو کہا۔ بھلا یہ مسدس میرے لئے کیا تھا میں نے سب فر فر پڑھ دیا۔ سنگھ صاحب بولے "کیا معنی بھی بتا سکتے ہو؟" میں نے ایک استاد کی طرح معنی بتا دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ حالی کی شاعری پر بھی کچھ تبصرہ کر دیا۔ سنگھ صاحب بڑے متحیر ہوئے اور سارا کلاس بھی گوش بر آواز ہو گیا۔ پھر سنگھ صاحب نے امتحاناً کورس میں شامل مرثیے کا ایک بند مجھ سے پڑھنے کو کہا، جو اس کتاب میں درج تھا۔ میں نے وہ بند بھی اسی روانی سے پڑھ کر مطلب بھی بیان کر دیا۔ سنگھ صاحب بہت خوش ہوئے اور اس واقعے کا تذکرہ انھوں نے کمل نین جی سے کیا۔ کمل نین جی ارتھمیٹک اور انگریزی گرامر کے ماہر تھے۔ یہ ارتھمیٹک بھلا میرے لئے کیا تھی کہ میں مڈل کی چھٹی جماعت تک پڑھ چکا تھا اور انگریزی سوا غضنفر کے اور کسی کو نہ آتی تھی۔ طلبا میں زیادہ تر مڈل پاس کر کے آئے تھے اور ابھی اے۔ بی۔ سی ڈی سیکھ رہے تھے۔ گرامر کا کلاس سب کے لئے برابر اس لئے ہو گیا کہ تیواری جی مڈل پاس طلبا کو انگریزی گرامر کی ہندی بھی بتا دیتے تھے۔ مگر یہ طلبا ناؤن Noun، پرو ناؤن Pronoun کی انگریزی میں تعریف تو نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے اور مجھے اور غضنفر کو یہ تعریفیں Definitions سب انگریزی میں یاد ہو گئیں اور ہم لکھ بھی لیتے تھے۔ غرض کہ جولائی کا پورا مہینہ یونہی میں بغیر داخلے کے اسکول میں پڑھتا رہا۔ مہینے کے آخر میں جب ٹسٹ ہوئے تو میں ہر مضمون میں سب سے زیادہ نمبر لایا۔ یہاں تک کہ میاں غضنفر بھی پیچھے چھوٹ گئے۔ جب بھائی علی اصغر صاحب اپنی

www.taemeernews.com

ملازمت پر سے ایک دن ایڈپور آئے تو انھیں یہ سب معلوم ہوا۔ انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے بُلا کر انھوں نے خود تفصیلات معلوم کیں اور خوش بھی ہوئے۔ مگر یہ نہ پوچھا کہ تمہارے داخلے کا کیا ہوا۔ میں اسکول جا تا رہا۔ جب اگست کا وسط آیا تو ایک دن کمل نین جی نے مجھے الگ بلا کر کہا کہ بھائی اگست کی آخری تاریخوں تک تم داخلہ لے لو ورنہ اس کے بعد پھر ہم بغیر داخلے کے تم کو کلاس میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ میں جس صورت حال سے گزر رہا تھا اس میں عجیب پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ جھکّن میاں مجھے کھیتی میں لگائے تھے۔ ابھی تک انھیں میری نئی کارگزاریوں کا تفصیلی علم نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں اپنے سیلانی مزاج کے باعث منجھن پور کے اسکول میں یونہی ایکٹیوٹی (Activities) کے طور پر جاتا ہوں۔ چند دنوں کا یہ شوق ہے پھر ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ میں ماضی میں کرتا رہا تھا۔ مگر اس سے ان کی کھیتی کے کام کا حرج ہوتا اس وجہ سے وہ بھی مجھ سے آزردہ رہنے لگے۔ داخلے کے لئے اس وقت پانچ روپئے کی ضرورت تھی (آج ان کی قیمت ایک ہزار روپئے ہوئی)۔ مگر یہ کہاں سے آتے۔ علی اصغر صاحب چاہتے تو وہ میری مدد کر سکتے تھے۔ اور انھیں کرنا بھی چاہئے تھا کہ میں بہر حال، ان کا حقیقی بھائی بھی تھا اور ابھی تک میرے حصّے کے کھیت بھی انھیں کے پاس تھے۔ مگر انھوں نے میری کوئی مدد نہ کی۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ جھکّن میاں کے اب اپنے بیوی بچے بھی تھے۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ میرے کھانے پینے اور رہنے کے کفیل تھے۔ میں اب ان معنوں میں ان کا معاون رہ گیا تھا کہ چھوٹے موٹے کام کر دیتا۔ کھیت تیار ہو جاتا تو لوائی وغیرہ دیکھ لیتا۔ دو ایک ایسے موقعے بھی آئے کہ جب ہلواہے کے نہ آنے پر مجھے گھاس بھی چھیلنی پڑی اور ایک مرتبہ اچانک ہلواہے کے بیمار ہو جانے پر مجھے کھیت بھی جوتنا پڑا۔ یہ وہ وقت تھا جب اونچی ذات کے لوگ ہل چلانے کا تصوّر بھی نہیں کرتے تھے۔ مگر میں اور نصیر حسن اپنی آوارہ Vagabond قسم کی زندگی میں یہ سب ٹریننگ تفریحاً لے چکے تھے۔ اور یہ کام اگر ضرورت پڑے تو میں آج بھی کر سکتا ہوں۔ پُر کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالنے اور تالاب میں ڈلیا چلا کر پانی نکالنے کی ٹریننگ بھی ہم دکوں کے پاس تھی اگرچہ اس وقت ٹیوب ویل کیا اس کا تصوّر بھی ہندوستان میں نہیں تھا۔ بھائی علی اصغر نے بات غلط نہیں کہی تھی۔ مگر یہ ہمارا پیشہ تو نہ تھا جو بھائی علی اصغر کا مطلب تھا۔

www.taemeernews.com

نیا سفر

دوسری عالمگیر جنگ اپنے شباب پر تھی۔ فضا میں ہر طرف بمبار گرجتے پھرتے تھے۔ اڑان کی مشقیں جاری تھیں۔ الہ آباد کا بمہرولی ہوائی اڈہ، ہوائی اڑان کے اعتبار سے منجھن پور اور ایدلپور سے زیادہ دور نہ تھا۔ صبح کے وقت جب ہوائی جہاز اپنی مشقوں کے لئے نکلتے تو پہلے گاؤں کے لوگ باہر نکل نکل کر ان جہازوں کو دیکھتے۔ پھر رفتہ رفتہ جب یہ روز کا پروگرام ہو گیا تو سب اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے۔ برٹش گورنمنٹ سپاہیوں کی بھرتی میں بہت دلچسپی رکھتی تھی۔ اُسے توپوں کا ایندھن چاہئے تھا، اور ہندوستانیوں کو نوکریاں۔ عجیب بات تھی کہ صغیر حسن صاحب نے اپنے بیٹے اور اپنے بھائی سلطان حسن ہی کو فوج میں بھرتی نہیں کرایا بلکہ کچھ اور گاؤں کے لوگوں کو بھی بھرتی کرا دیا۔ ایک روز میں صبح کو جب اچانک صغیر حسن صاحب کے یہاں پہنچا تو کچھ فوجی افسر بھی ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ پھر صغیر حسن صاحب سے الگ سے جا کر اپنا مدّعا بیان کیا کہ مجھے دو دن کے لئے آپ کی سائیکل درکار ہے میں اس پر الہ آباد جانا چاہتا ہوں۔ وہ متحیّر ہوئے کہ الہ آباد جو تقریباً بائیس تیئیس میل کے فاصلے پر تھا، سائیکل پر جانا مناسب نہیں۔ مگر میری درخواست پر انھوں نے اپنی سائیکل اور کچھ امرجنسی کا اس کے لئے سامان بھی مجھے دے دیا۔ افسروں کی طرف دیکھ کر مذاق میں یہ بھی کہا کہ تمہارا قد چھوٹا ہے اور ابھی سن بھی کم ہے ورنہ تمہیں بھی آج روانہ کر دیتا۔ میں نے ان سے سائیکل لی اور گھر واپس آیا۔ رات کو میں نے جھکّن میاں سے اپنا پروگرام بتایا کہ میں منجھن پور کے نئے اسکول میں داخلہ لینا چاہتا ہوں اور اس کے لئے بہن کے پاس الہ آباد جا رہا ہوں۔ کچھ پیسے داخلے کے لئے درکار ہیں۔ جھکّن میاں خاموش ہو گئے اور صبح سویرے اٹھ کر میں الہ آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ جنگ کی وجہ سے شیر شاہی سڑک پر ہر طرف جیپ (جو ہندوستان کے لئے بالکل نئی سواری تھی) اور ملیٹری ٹرک رواں دواں تھے میں بچوں جیسی بچکانی مسرت میں کبھی ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتا اور راہگیروں کو متحیّر کرتا، کبھی ٹرک کے

www.taemeernews.com

ساتھ تیز رفتاری سے سائیکل دوڑاتا۔ غرض کہ اسی صورت سے آٹھ بجے صبح الہ آباد شہر میں داخل ہو گیا۔ اور سیدھے بہن کے گھر پہنچا۔ میرے اچانک اتنی صبح پہنچ جانے پر میری بہن اور ان کے گھر والے حیران ہوئے پھر جب میں نے اپنے سائیکل کے ایڈونچر کا ذکر کیا تو انھیں اور بھی حیرت ہوئی۔ پھر میں نے الگ لے جا کر اپنی بہن سے صورت حال بیان کی۔ وہ خاموش ہو رہیں۔ بہر حال اس وقت کے دیہات کے طور طریقوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ بہن یا بیٹی سے روپئے پیسے کی مدد لینا، ایک توہین آمیز بات تھی۔ یہ طریق زندگی مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھا تھا۔ جہاں کوئی شخص اپنی بہن یا بیٹی کے یہاں کا پانی پینا بھی گوارہ نہیں کرتا۔ کچھ لوگ دیہات کے جو روایات کے بے حد پابند ہوتے وہ اس گاؤں کے کسی گھر میں پانی کھانا نہیں پیتے کھاتے، جہاں ان کی بہن یا بیٹی بیاہی ہوتی تھی۔ یہ روائتیں کیسے چلی ہوں گی، ان کے پیچھے کیا اسباب رہے ہوں گے مجھے تو نہیں معلوم، شاید بہت سے ہندوؤں کو بھی نہ معلوم ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ 'پیتو وداہ' کی رسم سے آیا ہو جہاں قبیلہ جاتی دور میں ایک گروہ کے لوگ زبردستی دوسرے گروہ کی لڑکیوں کو اٹھا لاتے اور انھیں اپنی بیویاں بنا لیتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ آپس میں دشمنی ہو جاتی رہی ہو۔ اسی کے ساتھ اُردو کے مشہور محقق پروفیسر مسعود حسن رضوی کا قصہ یاد آیا۔ مسعود صاحب کی بیٹی الہ آباد میں بیاہی تھیں۔ چنانچہ جب مسعود صاحب اپنے یا یونیورسٹی کے کسی کام سے آتے تھے تو اپنی بیٹی کے یہاں ٹھہرنے کے بجائے وہ پروفیسر عبدالستار صدیقی کے یہاں ٹھہرتے اور اپنی بیٹی سے ملنے جاتے تو اس کے یہاں چائے ناشتہ بھی نہیں کرتے تھے تو شمالی ہند اور خصوصاً اتر پردیش کے علاقے میں گنگا جمنی تہذیب کا اثر یہاں تک پہنچا ہے۔ خیر بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ غرض کہ میری بہن نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں مایوس ہو گیا۔ پھر بھی شام کو میں ایک کتاب خرید کر لایا اور بہن کے پاس یہ کتاب رکھ دی کہ علی الصباح مجھے سائیکل سے پھر ایڈپور واپس جانا تھا۔ صبح جب میں جانے کیلئے منھ اندھیرے اٹھا تو بہن نے خاموشی سے دس روپئے کا نوٹ میری کتاب میں رکھ کر مجھے کتاب دے دی اور چپکے سے کہا کہ کتاب احتیاط سے رہنا کہیں گر نہ جائے۔ پھر کتاب کو ایک پرانے اخبار میں لپیٹ دیا کہ بارش کا زمانہ ہے کہیں خراب نہ ہو جائے۔ میں نے کتاب احتیاط سے سائیکل کے کیریر میں دبا لی اور افسردہ ہو کر ایڈپور کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ خیال بار بار پریشان کر رہا تھا کہ اب داخلے کا کیا

www.taemeernews.com

ہو گیا۔ برسات کے دن تھے۔ ہر طرف بادل اٹھ رہے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں بارش ہو گئی تو میں بھیگ جاؤں گا اور کتاب بھی خراب ہو جائے گی۔ مگر میرے ڈرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بارش آ ہی گئی اور پانی ٹوٹ کر برسنے لگا۔ سڑک پر جائے امن کہاں۔ ہر طرف صرف پیڑوں کی قطاریں تھیں۔ آموں کی فصل تھی میں بھاگ کر ایک آم کے رکھوالے کی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ کتاب کیریر سے نکال لی اور سائیکل باہر چھوڑ دی۔ آموں کو تاکنے والا ایک کنجڑا تھا۔ اس نے مجھے ایک مسافر سمجھ کر پناہ دے دی۔ اُس کی جھونپڑی میں زرد زرد پکے ہوئے آموں کا ڈھیر لگا تھا۔ میری جیب میں دو آنے پڑے تھے جس سے میں نے ایک آنے کے بیس آم اس سے خریدے اور وہیں بیٹھ کر کھانے لگا کہ بھوک اپنی شدت سے چمک اٹھی تھی۔ بارش کم تو ہو گئی مگر ختم نہ ہوئی اور میں اس جھم (بوندچھین) بارش میں سائیکل لے کر نکل پڑا۔ کتاب کو میں نے اپنے پاجامے کے اندر کھونس لیا تاکہ کپڑوں سے کتاب کی کچھ بچت ہو جائے۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد بارش بالکل رُک گئی۔ سورج نکل آیا اور میں تیز سائیکل چلاتا ہوا گیارہ بجتے بجتے ایدلپور پہنچ گیا۔

جب گھر پہنچ کر میں نے کتاب کھولی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس میں دس روپئے کا ایک نوٹ رکھا ہوا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ بہن نے اتنی احتیاط کیوں کی تھی اور مجھے بار بار کتاب احتیاط سے رکھنے کی ہدایت کیوں دی تھی۔ ان دس روپیوں نے جیسے میری دنیا ہی بدل دی۔ اسی حالت میں سیدھے اسکول پہنچا اور کمل نین جی سے درخواست کی کہ وہ میرا داخلہ کرلیں۔ داخلہ ہو جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نئی زندگی پالی۔ اور پھر سے زندگی کے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا (افسوس کہ میری اس بہن کا اگست ۱۹۹۴ء میں انتقال ہو گیا۔)

اب میں نے اپنے تمام خواہشوں پر ایک طرح کی پابندی لگالی۔ صرف اسکول جانا، اسکول کا کام کرنا، سبق تیار کرنا بس یہی میرا کام ہو گیا۔ بھائی علی اصغر کے وہ الفاظ کہ "انھیں تو ایدلپور میں صرف گھاس چھیلنا ہے۔" ہر وقت بچھو کی طرح ڈنک اٹھائے میرے سامنے کھڑے رہتے اور اس سچویشن سے لڑنے کے لئے میں ہر وقت تیار رہتا۔ ایدلپور سے منجھن پور کا فاصلہ مشکل سے دو میل کا ہے۔ میں صبح آٹھ بجے اسکول کے لئے پیدل روانہ ہو جاتا۔ یہ وقت ہم پر بڑا کڑا وقت تھا جنگ

www.taemeernews.com

کی وجہ سے تمام چیزیں مہنگی ہو رہی تھیں اور بہت کچھ نایاب تھیں۔ جھکّن میاں نوکری چھوڑ چکے تھے
ان کے پاس صرف دو بیگھہ زمین تھی۔ وہی ان کا سب کچھ تھی۔ دیہات میں ایک کہاوت ہے کہ "ساون
میں تو چڑیا بھی اپاس کرتا ہے" یعنی چڑیوں کو بھی مشکل سے آذوقہ دستیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت
کوئی فصل تیار نہیں ہوتی۔ آج سے پچاس برس پہلے کے ہندوستان میں یہی حالت دیہات کے انسانوں
کی بھی ہوا کرتی تھی۔ غلہ وغیرہ عام آدمیوں کے پاس سے ختم ہو جاتا تھا۔ نچلے طبقے کے لوگوں کا تمام غلہ
یا تو زمیندار کی مالگذاری میں نکل جاتا یا پھر بنیوں کی نذر ہو جاتا کہ سال بھر جو وہ بنیوں سے اُدھار
لے کر کھاتے تھے، اس کا ڈیوڑھا بنیا ان سے وصول کر لیتا اور جب برسات آتی تو کسان اور خاص طور
پر مزدور کسان پھر بنیوں سے اُدھار لیتے اور اگلے سال پھر انھیں سب کا ڈیوڑھا دینا پڑتا۔ جھکّن میاں کے
گھر کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ ہم صبح کو ناشتہ وغیرہ کہاں کر سکتے تھے؟ ہر صبح کو جھکّن میاں کی بیوی میرے
لئے ایک جو کی موٹی روٹی پکا دیتیں جس کے ساتھ کچھ چٹنی اچار بھی رکھ دیتیں جسے میں ایک رومال میں لپیٹ
کر اپنے بستے میں رکھ لیتا (اپنے جدّاعلیٰ کی ناسّی میں) اور اسکول روانہ ہو جاتا۔ غضنفر اور جعفر بھی میرے
ہمراہ ہوتے۔ دوپہر میں ہم ایک مسجد کے قریب بیٹھ کر اپنا کھانا کھاتے اور مسجد سے پانی پی لیتے۔ اور پھر کلاس
شروع ہونے پر اسکول آجاتے۔ ایک دن ایک دلچسپ قصہ ہوا۔ ہم لوگ کھانا کھا کر جیسے ہی مسجد میں پانی
پینے کے لئے گئے، مؤذن اور ان کے ہمکار ہم پر برس پڑے کہ تم لوگ پانی پی کر سب ختم کر دیتے ہو۔ ہمارے
نمازی وضو نہیں بنا پاتے۔ یہاں سے خبردار پانی نہ پینا۔ ہم وہاں سے پیاسے چلے آئے۔ سامنے ایک بنئے کا
گھر تھا۔ ہم نے وہاں جا کر اس بنئے کے بیٹے سے اپنی مشکل بیان کی۔ وہ فوراً اپنے گھر سے ایک بالٹی پانی لے لیا
اور ہم تینوں آدمیوں کو اس نے پانی پلایا۔ ہمیں پانی نہ دے کر فرزندانِ توحید نے نمازیوں کو وضو کرا کے
ثواب کمایا اور وہ بنئے کا بیٹا ہماری پیاس بجھا کر، افسوس کہ جہنم میں جلے گا! پھر ہم روز اسی بنئے کے یہاں
سے پانی پیتے۔ وہ مسجد آج بھی جھن پور تحصیل کے پاس ہے اور حبیب اللہ کی مسجد کہلاتی ہے۔ اب بھی جب کبھی
میرا گزر اُدھر سے ہوتا ہے تو یہ واقعہ مجھے یاد آتا ہے اور پھر ذہن واقعہ کربلا تک جا پہنچتا ہے کہ آخر یہ تک
کچھ تو روایت پہنچی ہی چاہئے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فوج یزید میں کچھ حفاظ قرآن بھی شامل تھے جو اہلبیت
کی اہمیت سے ضرور واقف رہے ہوں گے کہ انھوں نے آیت انما یرید اللہ بھی پڑھی ہوگی۔ مگر خیر یہ

www.taemeernews.com

ایک الگ مسئلہ ہے۔ یہاں اس کا کیا محل۔ بس ایک ذہنی رَو ادھر چلی ہی گئی۔ دو ایک موقعے ایسے بھی آئے جب میں وہ ایک جَو کی روٹی بھی نہ لے جاسکا۔ تب غضنفر نے اپنے ساتھ مجھے کھانے میں شریک کر لیا، کہ غضنفر اپنے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ سلیم الطبع اور متوازن تھے۔ ان میں اُس وقت تک خود غرضی اور عیّاری نہ تھی۔ پھر وہ میرے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔

ستمبر میں سہ ماہی امتحان آیا۔ ہم نے بڑی محنت کی اور امتحان میں شریک ہوئے۔ امتحان کے بعد اسکول دسہرے کی چھٹیوں کے لئے بند ہو گیا۔ میرا ایک ہم جماعت دوست گوردے لال، دسہرہ دیکھنے الہ آباد جا رہا تھا۔ طے ہوا کہ میں بھی الہ آباد ہو آؤں۔ گوردے لال اور میں دونوں الہ آباد کے لئے روانہ ہو گئے اور دس پندرہ دن کے لئے ایدل پور اور منجھن پور ہم سے چھوٹ گیا۔

○

www.taemeernews.com

کوشکِ سُلطاں میں چند دن

الہ آباد کی مجلسوں کے مشہور ذاکر حکیم سید مرتضیٰ حسین، میری بہن کے سسرالی عزیز تھے۔ حکیم مرتضیٰ حسین کی بہن، میری بہن کی نند کی ساس تھیں اور اپنی پوتیوں کی محبت میں ان کا قیام زیادہ تر میری بہن کے گھر محلہ چک ہی میں رہتا تھا (پوتیوں کے والد کا انتقال ہو چکا تھا) حکیم مرتضیٰ حسین جو پہلے الہ آباد کے محلہ پتھر گلی میں رہا کرتے تھے، اب راجہ محمود آباد، محمد امیر احمد خاں کے معالج اور مصاحبین میں چہرہ لکھا کر اب مستقل طور پر محمود آباد میں اقامت پذیر ہو گئے۔ راجہ صاحب نے انھیں ایک مکان عطا کر دیا تھا اور گاہے ماہے حکیم صاحب راجہ صاحب کا علاج بھی کرتے تھے۔ میں جیسے ہی الہ آباد پہنچا حکیم صاحب کی بہن میرے پیچھے لگ گئیں کہ مجھے محمود آباد حکیم صاحب کے یہاں پہنچا دو۔ میری طبیعت کا سیلانی پن یکایک واپس آ گیا۔ اور میں حکیم صاحب کی بہن کو دوسرے دن ساتھ لے کر محمود آباد روانہ ہو گیا اور دوسرے دن محمود آباد جا پہنچا۔ محمود آباد اس وقت گیارہ لاکھ سالانہ آمدنی کی اسٹیٹ تھی مگر یہاں کا اسٹیشن بہت چھوٹا سا تھا۔ آبادی بھی بس ایک قصبے جیسی تھی۔ بس ایک قلعۂ معلّٰی کی عمارت تھی جو دیو ہیکل نظر آتی تھی۔ جس پر اس وقت مسلم لیگ کا ہرا ہلالی پرچم لہراتا تھا کہ راجہ صاحب مسلم لیگ کے ایک بڑے اہم رکن تھے۔ ہم محمود آباد تو پہنچ گئے اور ایک یکّے پر سوار ہو کر چل بھی پڑے مگر جائیں کہاں؟ میں نے خالہ جان (حکیم صاحب کی بہن) سے پتہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ وہ کہیں حکیم فیض آبادی کے مکان میں رہتے ہیں۔ یکّے والا جانتا تھا۔ ہم محمود آباد کی کچہری سے ہوتے ہوئے ایک لق و دق مکان پر پہنچے۔ یہی حکیم فیض آبادی کا مکان تھا۔ مکان اگرچہ بڑے گھیرے میں تھا مگر کچی مٹی کا بنا تھا۔ تاہم خوب چونے سے پتا ہوا تھا اور اچھا لگتا تھا۔ ہم پہنچے تو حکیم صاحب گھر ہی پر تھے۔ اپنی بہن سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ خالہ جان نے میرا بھی تعارف کرایا۔ پھر تھوڑی دیر میں کھانا کھا کر ہم لوگ سو گئے۔

www.taemeernews.com

دوسرے دن ہم حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی مہدی حسین کے یہاں پہنچے جو قلعۂ معلیٰ میں داروغہ توشہ خانہ تھے۔ ان کے دو بچے تھے سبطین اور عباس جو میرے ہم سن بھی تھے۔ وہ بہت جلد مجھ سے گھل مل گئے۔ یکایک مجھ میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں قلعۂ معلیٰ کو اندر سے دیکھوں۔ اور رجواڑوں کے ٹھاٹ باٹ کا بھی نظارہ کروں۔ یہ موقع مجھے دوسرے ہی دن مل گیا۔ اچانک راجہ صاحب کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی اور انھوں نے حکیم صاحب کو طلب کیا۔ حکیم صاحب گئے اور جب واپس آئے تو کسی قدر مشوش تھے۔ پتہ چلا کہ راجہ صاحب کی خواہش ہے کہ جب تک وہ اچھے نہ ہو جائیں حکیم صاحب ان کے قریب ہی قلعے میں قیام کریں۔ حکیم صاحب حقہ پینے کے عادی اور وہاں قلعے میں علی الخصوص راجہ صاحب کے قریب حقے کا کیسے انتظام ہو گا؟ پھر اپنے گھر کی بھی انھیں خبر لینی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور حکیم صاحب کی خدمت کے لئے تیار ہو گیا۔ حکیم صاحب کے ساتھ اب میں قلعۂ معلیٰ روانہ ہوا۔ قلعے کے بیرونی پھاٹک پر اودھ کے نوابین کا شان و شکوہ نظر آیا۔ پھاٹک سے اندر داخل ہوئے تو ایک بڑے صحن کے بیچ میں ایک ٹینک نظر آیا جس میں نیلے کمل کے پھول تیر رہے تھے اور ایک تیز اڑتا ہوا فوارہ اُن کی آبیاری کر رہا تھا۔ پھر دوسرا شاندار گیٹ نظر آیا جہاں سے اندرون قلعہ کے حدود شروع ہوتے تھے۔ ہمیں یہیں کار سے اُتر جانے کو کہا گیا کیونکہ سوا راجہ صاحب اور ان کے خاندان کے کوئی دوسرا وہاں سواری سے نہیں جا سکتا۔ ہمیں امام باڑے کی طرف والی سیڑھیوں سے اوپر لے جایا گیا جہاں راجہ صاحب کا کمرہ تھا۔ ایک وسیع صحن پار کر کے ہم اس قطعے میں داخل ہوئے جو راجہ صاحب اور ان کے بھائی مہاراجکمار کے لئے مخصوص تھا ہمیں چوبدار نے ایک ہال نما کمرے میں بٹھا دیا جو شیشہ آلات سے آراستہ تھا۔ زمین پر ایرانی قالین بچھے تھے اور در چھتیں، مُعَرّق و مُطلّا۔ دیواروں پر محمود آباد کے سابق راجگان کی قدِ آدم تصاویر آویزاں تھیں ان میں راجہ محمد امیر حسن خاں، مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں اور حالیہ راجہ محمد امیر احمد خاں کی آئیل پینٹنگز تھیں۔ بیچ میں راہ داری تھی اور دوسری طرف راجہ صاحب کا کمرہ تھا۔ اصل کمرے میں داخلے سے پہلے ایک چھوٹا سا کاریڈر تھا جسے قدِ آدم ہرے شیشوں سے کور (Cover) کیا گیا تھا ان ہرے شیشوں پر تاجِ برطانیہ کا نقش اسی طرح بنا تھا، جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سکوں پر

www.taemeernews.com

ایک شیر ببر کی تصویر ابھاری گئی تھی۔ راجہ صاحب کی بیماری کے سبب اس حصے میں مکمل خاموشی تھی۔ حکیم صاحب مجھے ہال میں چھوڑ کر ایک لمبے قد کے مسن مگر خوبصورت شخص کی معیت میں راجہ صاحب کے کمرے میں گئے اور تقریباً ۱۵ منٹ بعد اسی خوبصورت سے شخص کے ساتھ واپس آئے۔ شخص مذکور مغربی لباس میں بڑے نستعلیق طریقے سے آراستہ تھا اور بہت ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا تھا۔ اس کی لمبی ناک پر محدب شیشے کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ سجاد حیدر یلدرم تھے جن سے میں اس طرح متعارف تھا کہ میں نے ان کا مشہور انشائیہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" پڑھ رکھا تھا۔ سرکاری نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد یلدرم راجہ صاحب سے ملنے آئے تھے۔ وہ پہلے بھی سکریٹری کی حیثیت سے یہاں رہ چکے تھے۔ میں حکیم صاحب کا پیام لے کر کبھی ان کے گھر جاتا، کبھی کوئی کتاب گھر سے لے آتا، کبھی ان کی بتائی ہوئی دوائیں ان کے گھر سے لے آتا۔ اس طرح تین دن تک میں قلعۂ معلیٰ کے شاہی اپارٹمنٹ میں مقیم رہا۔

ایک شام کو حکیم صاحب کے بھتیجے عباس بھی وہیں آگئے اور مجھے اپنے ساتھ اپنے والد کی سرکاری قیام گاہ پر لے گئے۔ جو قلعۂ معلیٰ میں توشہ خانہ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ جس کے عباس کے والد داروغہ تھے۔ یہ نسبتاً بلند شہ نشین ٹائپ کے چبوترے پر بنی تھی اور قلعے کے جنوبی حصے میں تھی۔ یہ ایک طرح سے شاہی سامان کا اسٹور روم تھا۔ اس وقت سورج غروب کی منزل میں تھا۔ میں جیسے ہی چبوترے پر چڑھا، اوپر کی عمارت سے نیچے کی طرف لٹکتی ہوئی شیر چیتوں کی کھالیں ملازمین سمیٹ رہے تھے جو دن میں دھوپ دکھانے کے لئے پھیلائی گئی تھیں۔ نیچے فرش پر بندوقوں، رائفلوں اور کارتوسوں کا انبار لگا ہوا تھا جو اب سمیٹا جارہا تھا۔ عباس نے بتایا کہ یہ بھی سب دھوپ دکھانے کے لئے نکالے گئے تھے برسات میں کبھی کبھی ان پر پھپھوند لگ جاتی ہے۔ جاڑوں کی آمد آمد تھی۔ ایک طرف رضائیاں اور لحاف پھیلے ہوئے تھے جنہیں اب ملازمین لپیٹ کر کمروں میں رکھ رہے تھے۔ میرے لئے تو یہ سب میر حسن کے پیش کئے ہوئے پرستان کا نظارہ تھا۔ صرف ساز اور باجے نہ تھے۔ یہاں تک کہ ریڈیو بھی کسی جگہ دکھائی نہ پڑا۔ عباس نے اپنے والد مہدی حسین صاحب سے ملایا۔ سن ان کا پچاس کے قریب ہوگا۔ کچھ چڑچڑے سے آدمی معلوم ہوئے۔ میں نے عباس سے کہا کہ مجھے پورا قلعہ گھما دو۔ اس نے ایک ملازم

www.taemeernews.com

ساتھ لیا اور ہم قلعہ دیکھنے کے لئے نکل پڑے۔ ہم نے اس کونے سے شروع کیا جہاں قلعے میں بجلی سپلائی کرنے کا ایک انجن لگا تھا اور جدھر جانا ممنوع بھی تھا کہ وہاں سے خاص باغ کا سلسلہ شروع ہوتا تھا یہ ایک پرائیوٹ اپارٹمنٹ تھا۔ مگر عباس کی معیت میں ہم وہاں گھوم رہے تھے جو داروغہ توشہ خانہ کے بیٹے بھی تو تھے۔ یہیں پر ٹینس کھیلنے کا ایک لان بھی تھا جہاں کچھ مصاحبین ٹینس کی مشق کر رہے تھے۔ اتنے میں اچانک یہ ہوا کہ عباس اور ملازم سر تسلیم خم کر کے آدھے جھک گئے۔ میں نے دیکھا کہ اوپر ایک جوانِ رعنا کھڑا ہے جس کے سرخ و سفید چہرے پر بے حد مہاسے تھے۔ قد قدرے کشیدہ۔ مجھے کیا خبر کہ یہ کون ہے اور عباس وغیرہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ "روستائی" میں بھی ایک مزہ ہے اور میں اس مزے سے دوچار تھا۔ اس جوان رعنا نے توجہ بھی نہ کی کہ یہ کون لوگ ہیں۔ وہ مستقل ٹینس کھیلنے والوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ ہم لوگ آگے بڑھے تو میرے پوچھے بغیر ہی عباس نے بتایا کہ یہ مہاراجکمار آف محمود آباد محمد امیر حیدر خاں تھے۔ میں تو ایک مردِ ناداں تھا۔ پھر مجھے ریاستی تہذیب کے آداب بھی نہیں معلوم تھے اس لئے کسی مواخذے میں پڑنے کے امکانات بھی نہ تھے۔ قلعے کے مشرقی کونے پر شاہی مطبخ تھا۔ جہاں پورے اہل قلعہ کے لئے کھانا پکتا تھا اور جب دوپہر کو رنگین لہنگے پہنے ہوئے عورتیں سروں پر لکڑی کے ہشت پہل خوان رکھے اور پنچ رنگے خوان پوش ان پر ڈھکے ہوئے قلعے کے ہر کونے میں کھانا پہنچانے کے لئے قطار اندر قطار نکلتیں تو یہ سین دیکھنے کے قابل ہوتا۔

تھوڑا گھوم پھر کر ہم لوگ امام باڑے پہنچے۔ بیچ میں ایک سرخ رنگ کا جھاڑ ٹنگا ہوا تھا جس کا قطر پندرہ بیس فٹ سے کم کا نہ رہا ہوگا اور سرخی ایسی جیسے کٹا ہوا قندھاری انار رکھا ہو۔ اس وقت رات کی آمد تھی۔ بجلی کے بلب جلے تو معلوم ہوا کہ جھاڑ سے یاقوت کی چھوٹ نکل رہی ہے۔ ہم ادھر سے پلٹے تو دوسری طرف نکل گئے۔ یہاں ایک بہت وسیع مہمان خانہ تھا۔ جہاں مسلم لیگ کے نمائندے کئی دن سے اس انتظار میں ٹھہرے تھے کہ راجہ صاحب سے ملاقات کریں اور راجہ صاحب بیمار تھے۔ ہم تھوڑی دیر گھوم پھر کر حکیم فیض آبادی والے مکان پر پہنچے۔ حکیم مرتضیٰ حسین کی مطلوبہ کتابیں لیں اور پھر قلعہ معلیٰ میں داخل ہو گئے۔ ایک رات وہیں قیام کیا۔ پھر دوسرے دن اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

www.taemeernews.com

رمضان کا مہینہ تھا۔ شبیں لگ چکی تھیں۔ حکیم صاحب کو راجہ صاحب کی سسرال بلہرہ اسٹیٹ میں انیسویں رمضان کی مجلس پڑھنی تھی۔ چنانچہ رات کو ایک سیلون کار میں حکیم مرتضیٰ حسین اور میں دونوں بلہرہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مجھے فاصلوں کا تو اندازہ نہیں، مگر سڑک کچی اور خاصی خراب تھی بیچ میں کہیں کہیں گڈھے تھے جن کے باعث ہمارے سر کبھی کبھی چھتوں سے ٹکراتے۔ تعجب ہے کہ دو رجواڑوں کے درمیان یہ سڑک اور اتنی شکستہ؟ جب حکم ہوتا یہ سڑک بن جاتی۔ خیر کسی طرح خدا خدا کر کے دس بجے رات میں بلہرہ پہنچے۔ بلہرہ کا قلعہ محمود آباد سے بہت چھوٹا ہے۔ مگر ایک بلندی پر ایستادہ ہے۔ یہ تصور کہاں سے آیا ہوگا کہہ نہیں سکتا مگر کم از کم رؤسائے اودھ اور اودھ سے متعلق تمام زمیندار بھی اپنا مکان الگ بلندی پر بناتے تھے۔ تاکہ عوام سے الگ ان کا تشخص ہو۔ نواب برہان الملک سعادت خاں بھی جب اودھ کے نواب اور صوبہ دار ہوئے تو فیض آباد میں اپنا پہلا رہائشی بنگلہ بلندی پر بنوایا تھا اسی بنگلے کی بنا پر بہت دنوں تک فیض آباد بھی عرف عام میں بنگلہ ہی کہا جانے لگا تھا۔ یہ بات ضمنی تھی مگر ذہن میں آئی تو لکھ بھی دی۔ اس قلعے پر اس وقت کالا جھنڈا لگا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ راجہ ابوالحسن کے سوگ میں رہا ہو کہ چند برسوں قبل ان کا انتقال ہوا تھا یا پھر بیست و یکم کے ایام عزا کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ راجہ بلہرہ کے کوئی بیٹا نہ تھا۔ صرف دو بیٹیاں تھیں جو راجہ محمود آباد محمد امیر احمد خاں اور مہاراجکمار محمد امیر حیدر خاں کو بیاہی تھیں۔ بلہرہ اسٹیٹ کے منیجر اس وقت سید کلب احمد مانی جائسی تھے۔ دوسرے دن مجلس تھی جسے حکیم مرتضیٰ حسین نے پڑھی۔ پھر انھیں کہیں اور بھی دوسرے دن مجلسیں پڑھنی تھیں اس لئے مجھے ایک سیکے پر ایک ملازم کے ساتھ محمود آباد بھیج دیا گیا۔

رمضان کی اکیسویں تاریخ آئی جو شہادت حضرت علیؑ کا دن ہے۔ تو محمود آباد میں بھی ایک ماتمی جلوس نکلا۔ یہ جلوس بالکل شاہانہ جلوس کی طرح اٹھایا گیا۔ آگے آگے ماہی مراتب پھر راجہ صاحب اور ان کا خاندان سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تلواریں کمر سے لٹکتی ہوئیں، ماتمی انجمن کے ساتھ ساتھ حضرت عباس کی درگاہ کو چلے جو قلعے سے تقریباً چار فرلانگ ہوگی۔ راجہ صاحب اور مہاراجکمار اور سب لوگ پابرہنہ قلعے کے دروازے تک تابوت اور علم کے ساتھ ساتھ آئے۔ جلوس کے آخری حصے میں ذوالجناح تھا۔ مشہور تھا کہ محمود آباد کا ذوالجناح، درگاہ حضرت عباس تک پہنچنے سے پندرہ بیس

www.taemeernews.com

گز پہلے بے قابو ہو جاتا ہے اور باگ پکڑنے والوں کو جھٹک کر درگاہ کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ سین میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ سبب کیا ہے؟ کہہ نہیں سکتا۔ جلوس جب قلعۂ معلیٰ سے نکل جاتا ہے تو راجہ صاحب اور ان کے اعزہ غالباً کسی سواری سے درگاہ پہلے پہنچ کر جلوس کی پیشوائی کرتے ہیں۔ جب میں عباس کے ساتھ درگاہ پہنچا تو راجہ صاحب اور مہاراجکمار وہاں پہلے سے موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر ماتم کے بعد جلوس ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔

تین چار دن بعد محمود آباد اسٹیٹ کا اولمپک تھا۔ یہ اولمپک راجہ صاحب کے پشتینی باغ 'لکھ پیڑے' میں ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس باغ میں بہت سے پیڑ گر گئے تھے تو پھر مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں نے بہت سے پیڑ لگوا کر ایک لاکھ پیڑ پورے کر دیئے۔ شاید اسی وقت سے اُسے لکھ پیڑا کہا جاتا ہے۔ یا ممکن ہے کوئی اور روایت بھی ہو جو مجھے معلوم نہیں۔ باغ کے بیچ میں کچھ کھلا تھا۔ ایک میدان نہایت دور تک چلی گئی تھی۔ اس کے ایک کنارے پر ایک چھوٹا سا اسٹیڈیم بھی بنا تھا۔ راجہ صاحب خود بھی اولمپک میں حصہ لیتے تھے۔ میں نے خود انھیں لوہے کا گولہ گھما کر اس اولمپک میں پھینکتے دیکھا ہے۔ عام سپاہی گھوڑے پر سوار ہو کر زمین میں گڑی ہوئی میخ، گھوڑا تیز رفتار سے دوڑا کر برچھی کی نوک سے نکالتے تھے۔ اور بہت سے کھیل تماشے اس اولمپک میں تھے۔ راجہ صاحب کے مصاحبین اور متعلقین کے لئے اسی باغ میں الگ سے خیمے لگتے تھے اور پھر یہ ایک چھوٹا موٹا کیمپ بن جاتا   میں عباس کے ساتھ ان کے والد کے خیمے میں تھا۔ رات میں ہم لوگ اٹھ کر قریب کے خیموں میں جاتے۔ کہیں تلوار پر صیقل ہو رہی ہے۔ کہیں تیر و برسان رکھی جا رہی ہے۔ ایک کیمپ میں کچھ لوگ بیٹھے داستانیں پڑھ رہے ہیں۔ کہیں سحری کا ناشتہ تیار ہو رہا ہے۔ غرض کہ دلچسپ زندگی ان خیموں میں نظر آئی۔ ایک فرزندی نام کا نائی تھا۔ جو صبح اٹھ کر مصاحبین کی اصلاح کرتا یعنی حجامت بناتا تھا۔ میں نے بھی فرزندی سے اپنے بال، ترشوائے۔ یہ سب تو تھا مگر اب غور کرتا ہوں تو محمود آباد کی رعایا کے معاشی حالات بہت بہتر نہ تھے۔ ہر شخص قلعۂ معلیٰ کی طرف نظر رکھتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ظلم و جبر کی داستانیں رجواڑوں میں سنائی پڑتی تھیں محمود آباد کے متعلق کبھی نہیں سنیں۔ یہ خاندان نہایت متدین، بردبار، خدا ترس اور

www.taemeernews.com

متوازن تھا۔ مہاراجہ محمد علی محمد خاں یقیناً عیش پسند تھے۔ مگر ان کی عیش پسندی، شراب اور شاہد بازی سے الگ تھی۔ جہاں تک میں نے سنا ہے یہ عیش پسندیاں بھی شرعی حدود میں تھیں۔ موجودہ راجہ اور مہاراجکمار دونوں بے حد متشرع زندگی بسر کرتے تھے مگر ایسے بھی نہیں کہ ملاّئے مسجدی بن جائیں۔ ان لوگوں نے اپنے بچوں کو بھی مغربی تعلیم سے روشناس کیا۔ ان کے خاندان کے زیادہ تر افراد آکسفورڈ یا کیمبرج کے گریجویٹ ہیں۔ ان کی مذہبی تعلیم گھروں پر ہوا کرتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ لڑکیوں کے لئے کیا صورت ہوتی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد راجہ صاحب خود پاکستان چلے گئے پھر وہاں کی سیاسی الٹ پھیر سے عاجز آ کر عراق و ایران میں کچھ دنوں تک اقامت پذیر رہے زائرینِ حضرت امام حسین کے لئے عراق میں ایک جدید طرز کا مسافر خانہ بھی تعمیر کرایا۔ جہاں ٹھہرنے کا انتظام مفت تھا۔ پھر انگلستان چلے گئے جہاں ہالینڈ پارک میں ایک مسجد تعمیر کرائی جس کا تفصیلی ذکر میری کتاب 'لندن۔ اولندن' میں موجود ہے۔ اور لندن ہی میں ۱۹۷۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مہاراجکمار لکھنؤ ہی میں رہے اور یہیں انتقال کیا۔ ایک مرتبہ الہ آباد میں انھیں تقریباً بیس برس پہلے مرثیہ پڑھتے دیکھا۔ وہ میرے دیکھے ہوئے ۱۹۴۳ء کے مہاراجکمار کی پرچھائیں بھی نہ رہ گئے تھے۔ ایک کثیف سا پاجامہ پہنے اور میلی دلی شیروانی میں منبر پر بیٹھے ہوئے مرثیہ پڑھ رہے تھے ابھی کچھ برس پہلے ان کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔

ع خراب کو شکِ سلطان و خانقاہِ فقیر

O

www.taemeernews.com

پھر وہی شامِ الم

میں اتنے بہت سے شہری تجربے لے کر ایدل پور لوٹا۔ مگر میرے لئے سوا تجربوں کے اور کیا تھا۔ بقولِ فیض صاحب ع بہلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی۔ خیر، دل تو بہل گیا مگر تیرگیِ شامِ غم اُسی طرح میرا انتظار کر رہی تھی۔ گھر کے حالات اسی طرح تھے۔ دوسری سہانی صبح، جو اکتوبر کے آخری ہفتے کی صبح تھی، میں اسکول پہنچا تو ایک خوشخبری ملی۔ ستائیس طلبا کے چھٹے درجے میں میری پوزیشن اوّل تھی اور دوسرے نمبر پر ایک دوسرا طالب علم راج بہادر تھا۔ جو مجھ سے پچاس نمبروں سے پیچھے تھا۔ وہ مڈل پاس لڑکا تھا اور مجھ سے ارتھمیٹک میں پندرہ نمبروں سے آگے تھا جبکہ انگریزی اور اُردو میں میں نے اُسے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ چھوٹی جگہوں میں یہ باتیں بہت جلد مشہور ہوتی ہیں اور اس کے جا بجا چرچے ہونے لگتے ہیں۔ منجھن پور مسلمانوں اور بنیوں کی آبادی کا مخلوط قصبہ تھا جس میں مسلمانوں کی آبادی، بنیوں اور دوسرے ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ مگر چونکہ زمیندار یہاں کے مسلمان تھے اس لئے ہر جگہ مسلمانوں ہی کی تہذیبی ہوا بندھی تھی۔ مگر یہ زمیندار بے حد نرم دل لوگ تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے وہ اعزا جو جابر زمیندار تھے۔ ان کا مذاق اڑاتے کہ یہ لوگ بنیوں کے ساتھ رہ کر خود بھی بنئے ہو گئے ہیں۔ میرے زمانے میں یہ دو بھائی تھے۔ چودھری ذوالفقار حسن اور ذوالفقار حیدر۔ چودھری ذوالفقار حسن کے چھوٹے بیٹے سیّد محمد رضی حیدر، میرے ہم جماعت تھے اور چودھری ذوالفقار حیدر کے ایک بیٹے چودھری احسان حیدر ہیں جن کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ یہاں ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ چودھری لفظ کیا ہے؟ اور اس کی سماجی تعریف کیا ہے؟ کچھ لوگ اسے چھتر دھاری بھی کہتے ہیں اور کچھ چکر دھر اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ بادشاہوں اور راجاؤں پر چھتر کا سایہ کر کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور ظاہر ہے کہ بادشاہ یا راجہ کے معتمدِ خاص ہی کو یہ خدمت سونپی جا سکتی ہے۔

www.taemeernews.com

کچھ لوگ اس لفظ کو فوج سے متعلق کرکے کہتے ہیں کہ جو پہلوان، فوج کا چکر لے کر آگے آگے چلتا تھا وہ چکر دھر کہلانے لگا اور پھر لفظ اپنی شکلیں بدلتے بدلتے چودھری بن گیا۔ پھر یہ لفظ گاؤں کے سب سے سمجھ دار آدمی کے لئے استعمال ہونے لگا۔ جو گاؤں کے اہم مسائل کو بھی حل کرتا اور جھگڑالو پارٹیوں کو سمجھا بجھا کر میل محبت سے رہنے کی تلقین کرتا۔ بہرحال یہ لفظ ایک سماجی امتیاز کے ساتھ ہی جہاں تک مجھے معلوم ہے تقسیم سے پہلے استعمال ہوتا تھا۔ مزے دار بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اُس وقت اِس لفظ کو اپنا خاندانی طرۂ امتیاز سمجھتے تھے اور ہر زمیندار کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا زمیندار کیوں نہ ہو۔ یہ درجہ بندی غالباً زمین داروں نے خود اپنے لئے کرلی تھی۔ پھر تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں میں یہ لفظ نیچی ذات کے لوگوں کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ جیسے دھوبیوں اور ہریجنوں کا سربراہ بھی چودھری کہلاتا ہے۔ پھر گورنمنٹ اداروں میں ہیڈ مالی بھی چودھری کہلاتا ہے۔ تو یہ لفظ چودھری کب وجہ افتخار بن جاتا ہے اور کہاں پست ہوجاتا ہے اس کا فیصلہ کیسے ہو اور کون کرے؟ خیر بات پھر اپنے مستقر سے دور چلی گئی۔

ہاں تو رضی حیدر میرے ساتھ سنبھل پور کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ بے حد سلیم الطبع اور بہت شرمیلے۔ اپنے گھر کی روایت کے مطابق رضی حیدر پان کھا کر اور عورتوں کی طرح بیچ سے سیدھی مانگ نکال کر آتے۔ پھر ایک دن کمل نین جی نے انھیں پان کھا کر کلاس میں آنے سے منع کیا اور تب سے انھوں نے کم از کم اسکول میں پان کھانا چھوڑ دیا۔ رضی حیدر ایک اچھے طالب علم تھے رفتہ رفتہ وہ دوسرے طالب علموں میں گھل مل گئے۔ اگرچہ ابتدا میں انھیں برابر اپنی برتری کا احساس رہتا تھا۔ مگر وہ رئیسوں کے بگڑے ہوئے بیٹے نہ تھے اور اپنی تعلیم کا خیال رکھتے تھے وہ انگریزی بھی دوسروں سے بہتر جانتے تھے کہ ان کے گھر کا ماحول بہت کچھ علمی و ادبی تھا۔ کبھی کبھی ہم میں سے کچھ لوگوں کو اپنی کوٹھی پر بھی ساتھ لے جاتے اور دعوتیں بھی کرتے۔ آموں کی فصل میں آم کھانے کی محفلیں بھی ان کے گھر پر ہوتیں۔ یہ سب میں اس لئے بھی لکھ رہا ہوں کہ کسی کو یہ خیال نہ گذرے کہ پرگنہ کراری اور تحصیل سنبھل پور کے تمام زمیندار محض جاہل اور ناکارے تھے۔ ان میں کچھ روشن خیال لوگ بھی تھے۔ میرا خیال ہے جن لوگوں کا شہروں کی

www.taemeernews.com

سوسائٹی سے سابقہ تھا ان تک علم و ادب کی روشنی پہنچی تھی۔ اور ان لوگوں نے سلیقہ مند لوگوں سے سابقہ بھی رکھا تھا اور اس طرح ان کے بچوں نے علم و ادب سب کچھ حاصل کیا۔ برخلاف ان کے جو دور افتادہ گاؤں کے زمیندار تھے اور جنھیں کچھ سلیقہ بھی نہیں تھا وہ اسی طرح جہالت کی دنیا میں زندہ رہے۔ ان کا قول تھا کہ "جسے گھر میں کھانے کو نہیں ہوتا وہ پڑھتا ہے تاکہ نوکری کر سکے۔ ہم کیوں پڑھیں؟ ہمارے پاس اتنی زمین جائداد ہے، ہمیں کچھ نوکری تو کرنی نہیں ہے۔" افسوس زمانے نے بعد کو ان کے لڑکوں کو معقول نوکری کیسی، معمولی خدمت گزاریوں تک پہنچا دیا۔ اور اُن کی بیٹیاں آج گھروں میں سلائی کر کے یا چھوٹے موٹے کام کر کے کسی طرح گزر بسر کر رہی ہیں۔ وقت کا گھماؤ کتنا عجیب ہوتا ہے؟ اور معاشی بدحالی انسانوں کو کہاں تک پہنچا دیتی ہے۔ رضی حیدر جی لگا کر پڑھتے۔ گھر پر ایک ٹیوٹر بھی رکھ چھوڑا تھا۔ عام طلبا کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن جب منجھن پور کا اسکول اڈسا کے چوراہے پر چلا گیا تو رضی حیدر الہ آباد پڑھنے کے لئے چلے گئے اور انھوں نے گورنمنٹ کالج الہ آباد میں ہائی اسکول تک اپنی تعلیم مکمل کی۔ پھر اُن سے میری ملاقات الہ آباد یونیورسٹی ہی میں ہو سکی۔ بعد کو وہ کراچی چلے گئے۔ اور حبیب بینک میں ملازمت کر لی۔ سُنا ہے کہ اب وہ ریٹائرڈ ہو کر کراچی میں رہ رہے ہیں۔

منجھن پور کے اسکول میں چھ ماہی امتحان ہوا تو میں نے پھر سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور میری پوزیشن پھر اوّل تھی۔ علی اصغر بھائی جب ایدل پور آتے انھیں میرے امتحان کے نتائج پر بڑی حیرت ہوتی۔ وہ غضنفر پر دانت پیستے۔ مگر غضنفر ایک کھلنڈرے قسم کے آدمی تھے۔ تمام سرزنش کو کندھا جھٹک کر گرا دیتے۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ مٹی کا تیل نایاب ہو گیا کہ دیہات میں اسی سے روشنی ہوتی ہے۔ بجلی کا اس وقت دیہات میں کہاں گزر تھا۔ مگر یہ تیل سرکاری ملازمین کو آسانی سے فراہم ہو جاتا تھا۔ علی اصغر بھائی سے میں نے درخواست کی کہ اگر آپ ایک بوتل مٹی کا تیل مجھے بھی دلوا دیں تو مجھے امتحان میں پڑھنے کی آسانی ہو جائے بھائی صاحب نے جواب دیا کہ تم غضنفر جعفر کے ساتھ یہیں بیٹھ کر پڑھ لیا کرو اور ان لوگوں کی بھی پڑھنے میں مدد کر دیا کرو۔ میں تیار ہو گیا۔ امتحان شروع ہوا تو غضنفر کے پرچے خراب

www.taemeernews.com

ہو گیئ۔ دوسرے دن آخری پرچہ ارتھمیٹک کا تھا کہ رات میں بھائی صاحب ایدآپور میں نازل ہو گئے۔ غضنفر کے امتحان کی حالت سنی تو بہت برافروختہ ہوئے اور مجھ سے کہا کہ بھئی تم اپنے گھر میں پڑھا کرو ورنہ یہ لڑکے تم کو بھی خراب کر دیں گے اور اپنے بچوں سے کہا کہ تم گھر کے اندر جا کر پڑھو۔ اب پتہ نہیں کہ انھوں نے اپنے بچوں سے خفا ہو کر یہ فیصلہ کیا یا مجھے نقصان پہنچانے کے لئے اس لئے کہ میرے پاس مٹی کا تیل کہاں تھا جو اپنے گھر جا کر پڑھتا اور یہ بات بھائی صاحب کو اچھی طرح معلوم تھی۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ خیر میں اپنے گھر چلا گیا اور میں نے لکڑیاں اکٹھا کر کے آگ جلائی اور اسی کی روشنی میں ارتھمیٹک کا آموختہ آخر دہرا ہی لیا۔ کچھ نیا تو پڑھنا نہیں تھا صرف آموختہ ہی تو دیکھ لینا تھا۔ جب سالانہ امتحان کا نتیجہ آیا تو میری پوزیشن پھر فرسٹ تھی اور ارتھمیٹک میں مجھے سو نمبروں میں سے چھیانوے نمبر ملے تھے۔ آج بھی یہ نتیجے میرے پاس بڑی احتیاط کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ جنہیں میں کبھی کبھی اپنے بچوں کو بھی دکھاتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ امتحان میں نقل کرنے اور کرانے کے آج کے دور میں ان نتیجوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ جب کہ پڑھنے لکھنے میں بھی کیا فائدہ ہے۔ آج لوگ رقمیں خرچ کر کے بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کر لیتے ہیں۔ یا بدمعاشوں کی مدد سے نقل کر کے فرسٹ ڈویژن پا جاتے ہیں۔ مگر انگریزی عملداری میں یہ باتیں سوچی بھی نہیں جا سکتی تھیں۔ افسوس کہ تعلیم اور علم کی کیسی خواری اس زمانے میں ہوئی۔!! آج جہلا، داؤں پیچ اور چرب زبانی سے بڑے بڑے علمی مراکز کے بڑے بڑے عہدوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنے جہل کو جھاڑ پونچھ کر علم کے مقابلے میں کھڑا کرتے ہیں۔ مگر انگریزی عہدِ حکومت میں بھلا یہ کہاں ممکن تھا؟!

ملکی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ جب جولائی ۱۹۴۲ء میں اسکول کھلا۔ عالمگیر جنگ اپنے شباب پر تھی۔ جاپان نے جرمنی کے ساتھ شامل ہو کر مشرقی ایشیا، خصوصاً فلپائن، ملایا، برما سنگاپور اور رنگون پر متعدد بمباریاں شروع کر رکھی تھیں۔ جاپانیوں کے مشہور جنرل ٹامو یاکی یاماشیٹا (Tomoyaki yamashita) اور جنرل ٹوجو (Tojo) نے ایک تہلکہ مچا رکھا تھا اور ہندوستان میں یہ خیال عام تھا کہ کسی بھی دن جاپانی کلکتہ پر بم گرا کر اُسے تباہ

www.taemeernews.com

کر دیں گے اور اس طرح ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ ہندوستان کے عوام کی ذہنیت اتنی پست ہو چکی تھی کہ عام آدمی اس طرح سوچتا تھا کہ اچھا ہے جاپان کا قبضہ ہندوستان پر ہو جائے تو سلولائٹ کے کھلونے اور دوسرے سامان خوب ملیں گے۔ جاپان اس وقت بچوں کے کھلونے بنانے میں ماہر تھا اور تمام بازار ان کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا جاپان کی محکومی انھیں پہلے ہی سے تسلیم ہو گئی تھی۔ جو سمجھ دار لوگ تھے وہ جاپان اور جرمنی کی کامیابیوں سے اس وجہ سے بھی خوش تھے کہ یہ دونوں انگریزوں کو شکست دے رہے ہیں اور انگریزوں کی عالمی حکومت متزلزل ہو رہی ہے۔ شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے نام سے ایک نظم مشہور ہو گئی جس میں ہٹلر کو اس کی کامیابی پر مبارکباد دی گئی تھی۔ نظم تو ہمیں نہیں مل سکی اور شاید کسی کو نہ ملی مگر اس کے بہت سے شعر شاید پرانے لوگوں کو آج بھی یاد ہوں جس کا ایک مصرعہ مجھے بھی یاد ہے۔ ؎
سلام اے تاجدارِ جرمنی، اے ہٹلرِ اعظم۔ یہیں سے نظم شروع ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ اگر لندن پر حملہ کرنا تو ایک گولہ ہماری جانب سے بھی لندن پر پھینک دینا۔ جوش صاحب نے تو اس نظم کا انکار کیا۔ مگر جس نے بھی یہ نظم لکھی ہو گی اس سے ہندوستانیوں کی نفرت کی انتہاؤں کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ انگریزوں کی مدد اور لڑائی کا چندہ جمع کرنے کے لئے جگہ جگہ حکومت کے کارندے جلسے کراتے اور پروپیگنڈہ ہوتا کہ ہٹلر کا تمام جنگی سامان ختم ہو چکا ہے بس اب اس کا خاتمہ قریب ہے۔
اُدھر ہٹلر نے اپنے نئے بم یو۔ ٹو (U.2) کو انگلینڈ پر پھینک پھینک کر انگریزوں کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ اسی زمانے میں جرمنی کے ایک جنرل گوئبلز (GOEBELS) کا بڑا شہرہ تھا۔ جو پروپیگنڈہ مشینری کا ماہر تھا۔ اس کا ایک قول ہم طالب علموں تک بھی پہنچا تھا کہ "اتنا جھوٹ بولو کہ جھوٹ سچ معلوم ہونے لگے۔" اس پر آج بھی بہت سے لوگ آخر عمل کرتے ہی ہیں۔ گوئبلز کو انسانی نفسیات اور پروپیگنڈے کی اہمیت کا جس قدر اندازہ تھا کسی کو شاید ہی رہا ہو۔ پولینڈ، بلجیم، ڈنمارک، ہالینڈ سب پر ہٹلر کا قبضہ ہو چکا تھا اور اب فرانس اس کے گھیرے میں تھا۔ ہمارے اسکول میں بھی الہ آباد کے کلکٹر ڈکسن (DIXON) صاحب نے ایک میٹنگ کرائی اور ہم لوگوں نے بھی اُردو زبان میں انھیں ہٹلر کے خلاف نظمیں سنائیں۔ ان میں غضنفر کی نظم بہت پسند کی

www.taemeernews.com

گئی۔ نظم مزاحیہ تھی جس کا پہلا شعر مجھے یاد ہے جو یوں تھا۔

پاس نہیں پیڑول بابا   خوب بجاؤ ڈھول بابا

ڈھول میں نکلا پول بابا

اور جانے کیا۔ حکومت اُس وقت وار پروپیگنڈا کے لئے کچھ رسالے بھی چھپواتی جس میں اس طرح کی نظمیں اور مسائے چھپتے جس میں ہٹلر کا مذاق اڑایا جاتا اور انگریزوں اور ان کے حلیفوں کی کامیابیاں بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتیں۔ اسی زمانے میں خبر ملی کہ ہٹلر نے انگریزوں کے شہرۂ آفاق گرجا گھر سینٹ پال پر بھی ایک بم پھینک دیا۔ اس گرجا گھر کو انگریز بڑی اہمیت دیتے تھے۔ یہ لندن میں بنا ہوا غالباً پہلا گرجا گھر ہے۔ ۱۹۸۵ء میں جب میں نے یہ گرجا گھر دیکھا تو یہ چاروں طرف سے آبادی سے گھر چکا ہے اور یہ ویسٹ منسٹر ابی کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ اس وقت انگریز اتنے گھبرا گئے تھے کہ اپنے بادشاہ جارج ششم اور ملکہ کو کنیڈا بھیج رہے تھے۔ ہم لوگ یہ سن کر خوش ہوتے کہ اچھا ہے انگریز پریشان ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اب ہندوستان کو چھوڑ دیں۔ اس موقعے کو دیکھتے ہوئے اگست میں گاندھی جی نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" 'Quit India' Movement چلائی اور ۸ یا ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو خاص طور پر اس تحریک کی ابتدا کرنے کا دن مقرر کیا۔ میں دیہات سے شہر، اپنے کورس کی کتابیں لینے آیا تھا کہ ہر طرف ایک خلفشار شروع ہو گیا۔ کانگریس والنیٹرس اور عام پبلک نے حکومت کی نافرمانی شروع کر دی۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ ڈالے گئے۔ رسیاں باندھ کر ٹیلیفون کے کھمبوں کو زمین بوس کر دیا گیا تھا۔ میں نے محلہ جک سے نکل کر دیکھا تو ہیوٹ روڈ (نیا دو یکا نند مارگ) پر جا بجا گڑھے اور نالیاں کھدی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ ڈاکخانے جلے پڑے تھے۔ لیٹر بکس کے تالے ٹوٹے ہوئے اور راشن کارڈ کے دفتروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا تھا۔ موتی محل سنیما کے قریب کے راشننگ دفتر کے تمام کاغذات سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔ ویسے تو آزادی کے متوالے اور انگریزوں کے مخالفین خوش تھے۔ لیکن نوکری پیشہ طبقہ اور علی الخصوص مسلم لیگ سے متاثر مسلمان جیسے ان باتوں سے خوش نہیں تھے۔ شاید سبب یہ بھی رہا ہو کہ ہندوستان چھوڑ دو تحریک اکانگریس نے چلائی تھی اور اگر یہ کامیاب ہو گئی تو مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریسیوں کا اثر بڑھ جائے گا۔

www.taemeernews.com

ملازم پیشہ تو اپنے آقاؤں کا غلام تھا۔ وہ کیسے اسے پسند کرتا۔ الہ آباد میں تو کم مگر غازی پور اور بلیا کی طرف اس تحریک کا بڑا زور ہوا۔ کچھ چھوٹے موٹے اسٹیشن بھی جلا دیئے گئے۔ ہر طرف دیواروں پر انگریزی، اردو اور ہندی میں "ہندوستان چھوڑ دو" لکھا ہوا تھا۔ پھر خبر ملی کہ کچہری پر طلبا کے ایک جلوس پر گولی چلادی گئی اور ایک طالب علم لال پدم دھر مارا گیا اور بہت سے لوگ زخمی ہوگئے۔ میں نے جیسے تیسے کتابیں خریدیں اور فوراً دیہات واپس ہوگیا۔ شہر کے تمام اسکول کالج اور یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ مگر ہمارا اسکول کھلا رہا کہ یہ ایک نوز ائیدہ پرائیوٹ اسکول تھا۔ اور ابھی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کا اثر دیہات میں نہیں پہنچا تھا۔

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ میرے ساتھ ہوا۔ میری علمی لیاقت کی شہرت منجھن پور جیسے چھوٹے دیہات میں پر لگا کر اڑنے لگی۔ ایک دن کمل نین تیواری صاحب کے پاس ایک صاحب منجھن پور کی بستی سے آئے کہ ان کی بیٹی اُردو مڈل کا امتحان دے رہی ہے۔ مگر دیگر زبان میں اس نے انگریزی لے رکھی ہے کہا کہ اگر آپ ٹیوشن پڑھا دیں تو میرا کام ہو جائے۔ کمل نین صاحب انگریزی کے ایم۔ اے تھے مگر کسی مسلمان لڑکی کو مسلم آبادی میں پڑھانا ان کو عجیب معلوم ہوا اور نامناسب بھی کہ اس وقت ان باتوں کا بہت خیال کیا جاتا تھا اور پھر دیہات میں۔ یہی سب کچھ سوچ کر تیواری جی نے انکار کر دیا۔ پھر ایک دن تیواری جی نے مجھے بلا کر یہ بات بتائی اور کہا کہ کورس بہت معمولی ہے تم اگر ٹیوشن پڑھا دو تو میں طے کرا دوں۔ اور پھر انھوں نے پانچ روپئے ماہانہ پر یہ ٹیوشن طے کرا دیا۔ یہ طے پایا کہ انگلش اور گرامر پڑھا دیا کروں۔ یہ بھی طے ہوا کہ اسکول کے بعد میں یہ کام کیا کروں۔ میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ کورس واقعی بہت معمولی تھا اور میں جی لگا کر پڑھانے لگا۔ لڑکی بہت معمولی شکل و صورت کی تھی اور عمر میں بھی مجھ سے خاصی بڑی تھی۔ میں پڑھاتا رہا۔ تقریباً ایک ماہ تک میں نے پڑھایا ہوگا کہ ایک دن عجیب بات ہوئی۔ جب میں پڑھا چکا تو اس لڑکی نے مجھے ایک پرچہ دیا اور کہا کہ دیکھئے یہ شعر میں نے ٹھیک لکھا ہے؟ شعر یوں لکھا تھا؂

رُکتا جو پکڑ جاتا، طوفان بپا ہوتا　　　بدنام تو میں ہوتی، اور آپ کا کیا ہوتا

www.taemeernews.com

میں نے ایسی دنیا تو ابھی کہاں دیکھی تھی۔ زندگی کا کوئی خاص تجربہ بھی نہ تھا۔ مگر یہ شعر پڑھ کر کچھ کھٹکا۔ میں نے شعر تو درست کر دیا اور ' رقا ' کو ' رقعہ ' بنا دیا۔ مگر وہاں سے واپسی پر میرے دل میں اتھل پتھل ہوئی کہ اس شعر کو مجھے ہی دکھانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ مگر اب میں اپنی تعلیم کو کسی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں عمر کی چودھویں منزل تمام کر رہا تھا اور کسی رومان کا تجربہ اس لئے بھی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ "ایدل پوڑ میں گھاس چھیلنے" والا جملہ ہر وقت مجھ پر کابوس کی طرح سوار تھا۔ میرے لئے ترقی کا راستہ اور "گھاس چھیلنے" سے بچنے کی صورت صرف حصولِ علم ہی میں تھی چنانچہ دوسرے دن سے میں نے لڑکی کو پڑھانا چھوڑ دیا۔ اور کملا تین جی سے کہہ دیا کہ مجھے فرصت نہیں ملتی۔ اسکول کے بعد گھر پہنچنے میں تقریباً رات ہو جاتی ہے۔ اور یہ واقعہ بھی تھا۔ کملا تین جی نے یہی بات لڑکی کے والد سے کہہ دی اور میں واقعی ایک حادثے سے بچ گیا۔

میں نے اپنے سلسلے میں اس طرح کے دو تین واقعات لکھے ہیں۔ جہاں میں براہ راست تو ان واقعات سے وابستہ نہیں ہوں مگر وابستہ ہو سکتا تھا۔ اگر تھوڑی دلچسپی دکھائی ہوتی۔ اب خیال ہوتا ہے کہ کہیں قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں خود کو پارسا ثابت کرنے کے لئے ایسے واقعات کو نامکمل چھوڑ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ایسی صورتیں اس عمر میں بہت سے لوگوں کو پیش آتی ہوں گی۔ کچھ انھیں تسلیم کر کے کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اور کچھ محرومیوں سے ہم کنار ہوتے ہیں اور کچھ میں اقدام کی ہمت نہیں ہوتی اور اس طرح "عصمت بی بی از بے چادری" والی بات ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ ایک طرح سے بیچ کے ہو رہا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے اپنے فطری جذبات کو کچل دیتے ہیں اور پھر یہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بقولِ غالب شہد کی مکھی بن جاتے ہیں اور کچھ شکر کی مکھی۔ انسان اسی طرح اپنی زندگیاں گزارتے آئے ہیں اور اسی طرح گزاریں گے۔ بقول نواب مرزا شوق ؎ ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں۔ یہ بھی دلچسپ نفسیاتی کیفیت انسان کی ہے کہ وہ خود اپنے لئے تو ایسی باتیں روا رکھتا ہے لیکن اگر دوسرے اس منزل میں جاتے ہیں تو وہ ان کی کھوج میں لگ جاتا ہے۔ اب اسے

www.taemeernews.com

چاہے جنس کا جذبہ کہئے، رقابت کہئے یا افسانے کی تلاش اور پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ ؎
عشق سے کون ہے بشر خالی۔

سالانہ امتحان آیا۔ میں نے جم کر امتحان دیا۔ انگریزی کے پچاس نمبروں والے پرچے میں مجھے بیالیس نمبر ملے اور پورے امتحان میں پھر اوّل پوزیشن اونچے نمبروں سے ملی۔ اسکول کی انتظامیہ نے خوش ہو کر مجھے پچھلے سال کی طرح پھر ایک چاندی کا تمغہ عنایت کیا۔ علی اصغر بھائی نے اپنے دونوں بچوں کو اسکول سے اٹھا لیا۔ یہ لوگ لسٹم پشٹم پاس تو ہو جاتے مگر ان کی تعلیمی حالت اطمینان بخش نہ تھی۔ اسی درمیان محرّم کی تقریبات کے درمیان کراری میں کہیں سے منجھن پور کے اسکول اور وہاں کے تعلیمی معیار کا تذکرہ بھائی صاحب اور کچھ لوگوں کے درمیان آیا تو بھائی صاحب کے حاشیہ نشینوں نے منجھن پور کے اسکول کی برائی کی اور کہا کہ عجیب اسکول ہے جہاں بہت سے کُند ذہن لڑکے ٹاپ کر جاتے ہیں (کُند ذہن یعنی راقم) اور علی اصغر صاحب کے بچے جو پہلے سے الہ آباد سے انگریزی پڑھ کر آئے تھے وہ پیچھے کر دئے جاتے ہیں۔ یہ صاحب علی اصغر بھائی کے دوستوں میں بھی تھے اور انھیں کے ساتھ تحصیل میں کام بھی کرتے تھے۔ کراری عجیب و غریب بستی ہے۔ یہاں ہر طرح کا آدمی پہلے بھی مل جاتا تھا اور آج بھی۔ مصاحب سے لے کر عالمِ دین، لٹھ باز، افیونچی، چانڈو باز، علم و ادب کا رسیا اور خالص وضع دار شریف۔ نوابی تو یہاں کبھی بھی نہ تھی۔ مگر زمینداری کے سارے صفات یہاں موجود تھے۔ اس بستی کی تاسیس کسی سیّد حسام الدین یا سیّد ہشام الدین نے کی تھی۔ جو کہا جاتا ہے کہ عہد علائی (۱۲۹۶ء-۱۳۱۶ء) میں اس سرزمین پر وارد ہوا تھا (کراری کی تاریخ آگے آئے گی) اس کے حسب نسب کا تو تاریخی طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا مگر یہ کہ وہ ایک مردِ سپاہی تھا اور لڑنا بھڑنا، جنگ و جدل اس کے کارنامے تھے۔ سو یہ صفت کراری میں اس کی اولاد کے پاس آج بھی موجود ہے۔ بہتر ہوگا کہ دو کلمے داستان کراری سے یہاں پیش کر دئیے جائیں کہ ابھی تک کراری یا سیّد حسام الدین یا ہشام الدین سادات کراری سب کی تاریخیں صرف فسانوں میں ہیں۔ اہل کراری نے کبھی تاریخی طور پر اس کی حیثیت متعین

www.taemeernews.com

کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ یہ بھی ہے کہ یہ قصبہ باوجود اپنے علم و فضل کے کسی سبب سے حکومتوں کے مستقر سے ہمیشہ کٹا رہا اور کبھی بھی لائم لائٹ میں نہیں آیا یا نہیں لایا گیا۔ مغلوں نے اپنی سڑکوں اور شاہراہوں کے گرد و پیش تو مسلمانوں کی بستیوں کو امور سلطنت کی بہت سی نزاکتوں کے تحت آباد کیا تاکہ نقل و حرکت اور فوجی ضروریات میں فوری مدد ملتی رہے اور کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے۔ مگر سادات کو ہمیشہ امور سلطنت سے مجموعی طور پر دور رکھا۔ ہاں مغل سلطنت کو آخری عروج دینے والے شہنشاہ اورنگ زیب کے یہاں متضاد صفات مل جاتے ہیں۔ وہ جو سادات بلگرام کے لئے کہا کرتا تھا کہ "یہ مسجد کی لکڑی کی طرح ہیں جو نہ جلانے کے کام آسکتی ہے اور نہ فروخت کی جا سکتی ہے"۔ اسی اورنگ زیب کو سلطنت دلانے والا اور اس کا مدار المہام 'میر جملہ' تھا جو ایک سید خاندان کا فرد تھا اور عقیدے کے اعتبار سے شیعی مسلک کا پیرو جس پر اورنگ زیب سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ یہ اُس بادشاہ اورنگ زیب کی بد نصیبی ہے کہ اُسے نادان مورخین نے شیعہ دشمن مشہور کر دیا۔ حالانکہ اس کے تین وزیر اسد خاں، ذوالفقار خاں اور نعمت خانِ عالی اور مشیر خاص میر جملہ چاروں شیعہ تھے۔ کبھی کبھی مخالف باتیں عوام الناس کو زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہیں اور جلد مشہور ہو جاتی ہیں۔ مگر کیا کوئی ایک بھی مثال تاریخ اورنگ زیب کی شیعہ دشمنی کے لئے پیش کر سکتی ہے؟ "خشت خشت حیدرآباد رافضی است" جیسے قول کے لئے تاریخی سند چاہئے۔ پھر یہ بات سیاسی بھی ہو سکتی ہے۔ دکن کی شیعہ حکومت اور ابوالحسن تاناشاہ کی تباہی، سب امور سلطنت کی باتیں ہیں۔ شیعہ دشمنی کی نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو اس کی ابتدا اکبر اعظم سے کرنی چاہئے۔ جس نے بیجاپور اور چاند سلطانہ کو تباہ کیا تھا۔ یہ فریب جادو ناتھ سرکار اور اسٹینلی لین پول جیسے مورخین کا پھیلایا ہوا ہے۔ جسے اکثر لوگ اپنی دکان چمکانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اورنگ زیب کی ماں ارجمند بانو بیگم شیعہ تھی اور تاریخ عزاداری میں بڑھیا کے تعزیہ کا احترام اورنگ زیب سے منسوب ہے جہاں اورنگ زیب نے سواری سے اتر کر تعزیہ اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔ رقعاتِ عالمگیری

www.taemeernews.com

میں جو خط اورنگ زیب نے وصیت کے طور پر شہزادہ معظم کو لکھا ہے جہاں خاک کربلا کی اہمیت کا تذکرہ ہے۔[1] اسے لوگ کیوں بھول جاتے ہیں؟ مغلوں میں امور سلطنت کے لئے کوئی کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔

○

---

[1] رقعات میں یہ خط مجھے نہیں ملا مگر عوام میں یہی مشہور ہے۔ (م۔ع)

www.taemeernews.com

کراری ـــــ اپنے تاریخی پس منظر میں

یہ قصبہ کرۂ ارض پر 16' ـ 81° طول البلد شرقی اور 27' ـ 25° عرض البلد شمالی کے درمیان، ضلع الہ آباد، اتر پردیش میں واقع ہے۔ کراری کے نام سے لے کر، اس کے کوائف کے حالات تک کا تفصیلی اور تاریخی ثبوت، سب کچھ پردۂ خفا میں ہے۔ راقم آثم نے اپنے مقدور بھر کوشش کی کہ کچھ تاریخی شواہد کے ساتھ کراری کے تفصیلی حالات معلوم ہو جائیں مگر راقم کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں راقم نے (۱) تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف (۲) ضیاء الدین برنی کی تاریخِ فیروز شاہی (۳) فتوحات فیروز شاہی (۴) فتوح السلاطین از عصامی، مترجمہ آغا مہدی حسین (۵) طبقات ناصری از منہاج الدین سراج (۶) تاریخ مبارک شاہی از یحییٰ بن احمد (۷) تغلق خاندان از آغا مہدی حسین (۸) تغلق خاندان کا عروج و زوال از آغا مہدی حسین لندن ۱۹۲۵ء (۹) خلجیوں کی تاریخ از کشوری سرن لال (۱۰) فیروز تغلق از رمیش چندر چوہری (۱۱) دہلی سلطنت از، آشیر بادی لال (۱۲) قرونہ ترکوں کی تاریخ از ڈاکٹر ایشوری پرساد (۱۳) آئین اکبری از ابوالفضل علامی (۱۴) الہ آباد گزیٹیر ۱۹۱۱ء مرتبہ نیول صاحب (NEVILLE) جیسی کتابیں پڑھیں۔ تقریباً دو سال تک یہ تلاش و تحقیق جاری رہی۔ آخر میں تاریخ متھرا مرتبہ ایف۔ ایس۔ گروز (F.S. GROWSE) فیلو آف کلکتہ یونیورسٹی بھی پڑھ ڈالی۔ یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں نارتھ ویسٹرن پراونسز اور اودھ گورنمنٹ پریس سے شائع ہوئی پھر متھرا گزیٹیر بھی دیکھ ڈالا، مگر سید حسام الدین کا جو حسب کراری کے نسب نامے میں درج ہے وہ کہیں نہیں ملا۔ نہ کمال الدین حکیم نام کا کوئی آدمی، ان تاریخوں میں کہیں ملا۔ ان تاریخوں میں کئی حسام الدین ضرور ملے۔ رمیش چندر چوہری نے دو حسام

www.taemeernews.com

الدین کے نام لکھے ہیں ایک کا نام اعظم ملک (اعظم الملک ؟) حسام الدین ہے اور دوسر ملک حسام الدین اَدھک ہے۔ یہ دونوں محمد تغلق کے امرا میں سے تھے اور امرائے بادشاہ کہلاتے تھے۔ جنہوں نے ۱۳۵۱ء میں فیروز تغلق کی تخت نشینی کی مخالفت کی اور وزیراعظم احمد ایاز خواجہ جہاں کا ساتھ دیا۔ مگر یہ دونوں سید نہیں تھے۔ اکبری ترک یا قرونا ترک تھے اور حکومت کے اہم ستون۔ جلال الدین خلجی کے ایک بیٹے کا بھی نام حسام الدین تھا جسے بعد کو وارکلی خاں کے لقب سے نوازا گیا۔ پھر قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے ایک نومسلم غلام کے بھائی کا نام بھی حسام الدین ملتا ہے جو بعد کو گجرات کا ناظم یعنی کہ گورنر بنایا گیا۔ مبارک شاہ کے غلام کا نام خسرو خاں تھا جو قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کر کے خود بعد کو بادشاہ بن گیا اور امیر المومنین لقب اختیار کیا۔ ایشوری پرساد نے اپنی کتاب "قرونا ترکوں کی تاریخ" میں برنی، تاریخ مبارک شاہی اور اسٹنگاس کے حوالوں سے خسرو خاں اور اس کے بھائی حسام الدین کو حلال خور یا ڈھیڑ لکھا ہے (ص ۹۰۸) ایشوری پرشاد نے قرونا ترک میں ایک حسام الدین ابو رجا کا بھی ذکر کیا ہے جسے دیوگری کی مہم پر بھیجا گیا (قرونا ترک ص ۱۲۱) عصامی کی کتاب فتوح السلاطین میں تغلقوں کے زمانے میں ایک حسام الملک بھنڈاری اور دوسرے حسام الدین مغل کے نام آتے ہیں۔ ۱۳۶۰ء میں فیروز تغلق کی فتوحات میں ایک حسام الملک کا بھی ذکر آتا ہے جو فیروز تغلق کا فوجی مشیر ہے اور بنگالیوں کے خلاف اکڈلا کی مہم پر جاتا ہے۔ اس طرح دور خلجی اور تغلق میں جتنے بھی حسام الدین اور حسام الملک ملے سب کو تلاش کر کے میں نے یہاں پیش کر دیا۔ راقم کا خیال ہے کہ کراری کے نسب نامے میں حسام الدین کا جو حسب بیان کیا گیا ہے، وہ محض سنی سنائی باتوں پر ہے، جنہیں، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ کی تصدیق حاصل نہیں ہے۔ اور جہاں تک میں تلاش کر سکا ہوں ان حسام الدینوں میں ایک بھی سیّد نہیں ہے۔ اور ان کا ظاہر ہے کہ سادات کراری اور زید پور سے کوئی تعلق نہیں۔

سیّد حسام الدین جو سادات کراری کی اصل ہیں، ان کے متعلق سب سے زیادہ

www.taemeernews.com

تفصیلات، سید ریاض حسین نے اپنی کتاب "شجرۂ سادات کراری" ضلع الہ آباد میں درج کی ہیں۔ یہ نسب نامہ ۱۹۲۲ء (انیس سو بائیس عیسوی) میں مرتب ہوا اور ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ ریاض حسین کے مطابق یہ تمام تفصیلات "ملخص تحریرات سید محب اللہ ابن درویش محمد کراروی ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء و سید محمد علی ابن دولت علی کراروی ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء و سید حامد حسین ابن سید علی کراروی ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء و کتاب تحفۃ الانساب از سید محمد جرگا دیں، ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء و شجرات طیبات، سید ظہور الحسن سیتاپوری ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۵ء و بحر الانساب و شجرہ مرتبہ سید زین العابدین ابن وارث علی کراروی نیز تحقیق بزرگان موجودہ سے حالات معلوم ہوئے۔" (شجرہ سادات کراری ص۲)

پھر سید ریاض حسین نے کراری کے حالات پر بھی چند سطریں یوں تحریر کی ہیں:۔

"قبل آبادی کراری موضع کوسم جس کا سابق نام اسکندر پور کوسنبہ تھا، جو کوشامبی کی راجدھانی تھی، آبادی پائی جاتی ہے اور مقام کراری کا جنگل ہونا پایا جاتا ہے۔ سید حسام الدین جو سلسلۂ سادات زید پور سے ہیں، جنھوں نے ۷۶۸ھ سے پیشتر زید پور ترک کیا اور پھر کچھ عرصہ تک متھرا میں بہ عہدۂ گورنری منجانب فیروز شاہ تغلق تعینات رہے اور بوجہ بدظنیٔ بادشاہ مذکور، جو وزرا کی شکایتوں سے پیدا ہوئیں، ملازمت ترک کرکے صوبۂ الہ آباد کی طرف معہ اپنے لشکر کے روانہ ہوئے۔ غرض چلتے چلتے ایک دن واردِ سرزمینِ کراری ہوئے۔"

پھر کوسم کے راجہ مادھو سے جنگ اور اس کے مارے جانے اور کراری کی بستی بسائے جانے کا تذکرہ ہے:۔

"راجہ کے مارے جانے کے بعد اس کی تمام املاک پر قابض اور متصرف ہوئے۔ بعدہٗ واپس پڑاؤ ہو کر جنگل کو کاٹ کر قریب قریب ۷۷۱ھ یا ۷۸۰ھ کے ابراہیم آباد عرف کراری کے نام سے موسوم کیا۔ .... یہی کراری جو شاہی میں قصبہ کراری کے نام سے موسوم تھی اور ہوتی چلی آئی۔" (شجرۂ سادات کراری ص۴)

(تسلسل کے لئے اس باب کے آخری صفحات ا، ب، ج، د، ملاحظہ فرمائیں)

www.taemeernews.com

عام اس کے کہ اس بیان میں بہت سی تاریخی غلطیاں ہیں، یہ بیان کیسے مان لیا جائے؟ خود مصنف طے نہیں کرپاتا کہ یہ واقعہ ۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء کا ہے یا ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء کا۔ اگر یہ واقعہ ۷۱۷ھ/۱۳۱۷ء کا ہے تو یہ دور مبارک شاہ خلجی کا دور ہے اور اگر یہ بات ۷۸۰ھ/۱۳۷۸ء کی ہے تو یہ دور فیروز شاہ تغلق کا ہے۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ لشکر یا تو بادشاہ کے پاس، اس وقت رہتا تھا، یا صوبے دار کے پاس۔ حسام الدین صوبے دار نہیں تھے (تمام صوبے داروں کی فہرست موجود ہے، اس میں سید حسام الدین کا کہیں نام نہیں) پھر خلجیوں اور تغلقوں کے زمانے میں متھرا کوئی صوبہ نہیں، بلکہ متھرا کبھی صوبۂ کوڑا میں ہے اور کبھی صوبۂ گوالیار میں۔ پھر اس دور میں حکومت سے اختلاف کرکے کسی صوبہ دار کے پاس لشکر کا رہنا ممکن نہ تھا۔ جس کی مثالیں دکن میں دیوگیر کے صوبے دار؟ اور کڑا کے صوبے دار ملک چھجو کے انجام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ شاید مصنف نے صرف نسب نامے پر نگاہ رکھی ہے اور تاریخ پر نہیں۔ مگر اسے جو مسالہ، اپنے اسلاف سے ملا، اس نے قلم بند کر دیا۔ اور یہ کام بھی اس وقت اہم تھا۔ متھرا کی تاریخ میں کہیں کمال الدین جھیتم کا بھی نام نہیں ملا۔ ہاں فتوح السلاطین از عصامی میں ایک ملک احمد جھیتم (جھیتم؟) کا تذکرہ ہے جسے بادشاہ نے قاربیگ کا لقب عطا کیا اور گجرات کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ یہی ایک "جھیتم" ملا (ملاحظہ ہو فتوح السلاطین، مترجمہ آغا مہدی حسین ص ۱۶۱، مطبوعہ ۱۹۷۶ء از علی گڑھ یونیورسٹی پریس) یہ 'جھیتم' کیا لفظ ہے کہہ نہیں سکتا۔ جان پلیٹس نے 'جھیتنا' ایک لفظ دیا ہے جس کے معنی 'CRUSH' کے دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے 'جھیتم' کے معنی کچلنے والا یا صف شکن کے ہوسکتے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ یہ خطاب اسی بہادری اور دلاوری سے آیا ہو اور احمد جھیتم یا جھیتم علاؤالدین کے دور کا آدمی ہے، دوسری بات یہ کہ فیروز تغلق بے حد متعصب آدمی تھا۔ وہ کسی شیعہ کو برداشت نہیں کرسکتا تھا (سیرت فیروز شاہی بحوالہ رمیش چندر چوہدری ص ۱۲۰ اور ص ۱۴۶) اور فتوحات فیروز شاہی کے ص ۶ پر درج ہے کہ

"سلطان نے شیعوں کے خلاف سخت اقدامات کئے اور ان کی فرقہ وارانہ تگ و دو کو بالکل ختم کر دیا۔ سب کے سب قید خانے میں ڈال دیئے گئے اور جو بڑے غالی اور متعصب تھے

www.taemeernews.com

سب کو پھانسی دے دی گئی۔ بقیہ کو سخت سزا کا مستوجب قرار دیا گیا۔ اور شارع عام پر سزا دینے کی دھمکی دی گئی اور ان کی کتابیں شارع عام پر جلادی گئیں"۔ عصامی نے اپنی کتاب 'فتوح السلاطین' میں لکھا ہے کہ "بادشاہ نے قرامطہ اور اسماعیلی شیعوں کو 'ملاحدہ' کی فہرست میں شامل کیا ہے اور انھیں 'اباحی' قرار دیا ہے"۔ ایسی صورت میں حسام الدین کا گورنر ہونا کیسا، بادشاہ کی قربت بھی انھیں حاصل نہ ہو سکتی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ صوبہ کڑا کے حدود، دکن میں دریائے جمن اور گوالیار تک تھے۔ اور کڑا ری واسے حسام الدین، بادشاہ سے برگشتہ ہو کر اپنی فوج لے کر تمام ممالک محروسہ پر قبضہ کرتے پھر رہے ہیں اور کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا؟ نہ بادشاہ کو خبر ہوتی ہے اور نہ کڑا کے صوبے دار کو؟ جب کہ دکن میں دیوگیری یا تلنگانہ میں اس طرح کی کوئی مخالفت ہوتی تھی تو فوراً بادشاہ کو خبر ہو جاتی تھی اور شاہی فوجیں فوراً سرزنش کے لئے دکن روانہ ہو جاتی تھیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ خلجی دور میں خود جلال الدین خلجی کا بیٹا ارکلی خاں کڑا کا صوبے دار تھا۔ بعد کو علاء الدین اور ان دونوں سے پہلے ملک چھجو جیسے جنگجو اور مدبر قسم کے لوگ کڑا کے صوبے دار رہ چکے تھے۔ پھر کڑا کا فاصلہ کراری سے دس بارہ میل سے زیادہ کا نہیں ہے۔ یہ بھی جانتے رہنا چاہئے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے یہاں سب سے بڑا مرتبہ 'خان' کا ہوا کرتا تھا۔ اس کے نیچے ملک ہوتے اور پھر دوسرے لوگ۔ ضیاء الدین برنی اور مسالک الابصار کے مطابق 'خان' دس ہزار سواروں کا حاکم ہوتا اور اس کی آمدنی دو

۱ے امیر خسرو نے اپنی کتاب 'خزائن الفتوح' میں، مسلمانوں کے ایک فرقے "اشعاب اباحت" کا ذکر کیا ہے جنھیں 'اباحی' کہا جاتا تھا۔ 'خزائن الفتوح' کا انگریزی میں ترجمہ مشہور مورخ پروفیسر حبیب نے کیا ہے۔ انھوں نے 'اباحی' لفظ کی اس طرح وضاحت کی ہے:۔

"زوجیح محرمات (اباحت) سے یہ مطلب ہے کہ قرامطہ، اسماعیلی اور دوسرے شیعہ روافض ہفتہ امامیہ، جنھیں متعصب سنی متہم کرتے ہیں کہ یہ لوگ ممنوعہ رشتوں سے شادیاں رچاتے ہیں اور خفیہ اجتماع میں ان سے حرام کاری کرتے ہیں۔ یہ الزامات غلط ہیں یا صحیح مگر عام طور پر مانے جاتے ہیں"۔

www.taemeernews.com

دو لاکھ ٹنکا ہوا کرتی (ایک ٹنکا آٹھ دینار کے برابر ہوتا) اور یہ رقم زمینداری طرح کی جاگیر سے ملتی تھی۔ کراری اور نواح کراری میں کوئی 'خان' کے رتبے کا کبھی نہیں رہا۔ مسالک کے مطابق پوری مملکت میں کل اسّی کے قریب 'خان' تھے، مگر کراری میں کوئی خان نہ تھا (خان کوئی ذات نہیں بلکہ فوجی عہدہ ہے) تمام خان صرف صوبے کے مالک ہوا کرتے۔ مگر کراری کے لوگوں کے پاس پھر جائدادیں کہاں سے آئیں؟ پھر دوآبہ سب سے زیادہ زرخیز خطّہ رہا ہے اور ہر دور کے حکمرانوں کی اس پر نظر رہتی تھی۔ اس طرح یہ بات کہ سید حسام الدین کراری (جو دوآبہ ہے) پر قبضہ کریں اور کسی کو خبر نہ ہو اور نہ بعد میں کوئی مواخذہ ہو، یہ بات تاریخی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں۔ نیز یہ بھی کہ اس وقت صوبۂ الہ آباد کہاں تھا؟ جیسا کہ نسب نامے میں تحریر ہے۔ الہ آباد کا نام اور صوبہ دونوں اکبر اعظم کے زمانے میں وجود میں آئے۔ لیکن یہ بات ضرور صحیح ہے کہ کراری کی آبادی، یقیناً خلجیوں یا تغلقوں کے زمانے کی ہے۔ اس کا ایک مضبوط ثبوت یہ ہے کہ کراری میں جو کربلا بنی ہے اس کے پاس ایک قدیم قبرستان ہے۔ اس کی چہار دیواری اور اس چہار دیواری کے کونوں پر بنے ہوئے گنبد نما کھمبے، سب خلجی اور تغلق کے دور کی عماراتوں کی بناوٹ سے بے حد مشابہ ہیں۔ بلکہ خلجیوں کی عماراتوں سے یہ نمونے خاصے ملتے ہیں۔ دلّی کے علائی دروازے کی بُرجیوں کی ان سے بڑی مشابہت ہے۔ ایک اور مقبرہ موضع حسام آباد گڑھوا میں ہے جو کوشامبی کے پورب جانب ہے۔ اس مقبرے میں احاطے کی کچھ جالیاں باقی رہ گئی ہیں جو خلجی یا تغلق دور کی معلوم ہوتی ہیں۔ کراری کے لوگ اس قبر کو سیّد حسام الدین کی قبر بتاتے ہیں مگر میں نے وہاں جا کر تفتیش کی تو وہاں کے باشندوں نے کسی شاہ غلام عالم کی قبر بتائی۔ اس موضع میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ تقریباً ساری آبادی برہمنوں کی ہے۔ یہی مقامی لوگ ہر جمعرات کو یہاں چراغ جلاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کسی بابا کی قبر ہے، جو اس گاؤں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ یہاں ایک چھوٹا سا میلا بھی سال میں لگاتے ہیں۔ منّتیں، مرادیں مانگتے ہیں اور پاتے ہیں۔ اصلیت کیا ہے، کہہ نہیں سکتا۔ قبر پہ کوئی کتبہ نہیں ہے۔ قبر پکد

www.taemeernews.com

اب کوئی تعویذ بھی باقی نہیں رہ گیا۔ جہاں سے قبر شکستہ ہے وہاں گاؤں والوں نے مرمت کر دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کراری کے سید حسام الدین کوئی معمولی جاگیردار رہے ہوں اور تاریخی شخصیت نہ ہوں۔ یہ ایک دلچسپ بات لفظ "حسام" کے متعلق تھی۔ اصل لفظ تو حسام، بہ ضمّ ہائے حطی ہے مگر شاید، اس وقت لوگ ہائے حطی بالکسر بھی بولتے تھے۔ عرفِ عام میں کراری اور تواح کراری میں یہ لفظ آج بھی بہ کسر ہائے حطی بولا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آغا مہدی حسین، جوہری، کشوری سرن لال اور ایشوری پرساد سب نے "حسام" (HISAM) ہی لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ اس زمانے میں یہ تلفظ عام تھا۔ سید ریاض حسین نے کراری کے نسب نامے میں جو بلیا، گرھیا اور خرگوش کے کتے دوڑانے کی بات لکھی ہے اسے محض زیبِ داستان ہی سمجھنا چاہیئے۔ تاہم جس جانفشانی سے انھوں نے یہ نسب نامہ مرتب کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ مگر انھوں نے مادری نسب نامے پر کچھ نہیں لکھا۔ مجھے راجہ مادھو کا نام تو نہیں ملا مگر گوتمی اور ماوڑلئے دریائے جمن، بندیلا راجاؤں کے مختلف خاندانوں کی حکومتیں تھیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں پال خاندان کے بادشاہوں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے جس کا مستقر قنوج تھا۔ بعد کو یہاں گہوارڑ خاندان کے راجپوتوں کی حکومت ہوئی جس کا راجہ جیندر دیو بہت مشہور ہوا۔ پھر یہ علاقے راٹھور، راجپوتوں کے قبضے میں آئے۔ یہ راجپوت حکومتیں، اکبر کے دَور تک چلی آئی تھیں۔ سلیم نے ابوالفضل کا قتل راجہ بیر سنگھ بندیلا کی مدد سے اسی علاقے میں کرایا تھا۔ مسلمانوں کی فتوحات کے دَور میں راجپوت عورتوں سے شادیاں کرنا عام تھا۔ مغل بادشاہوں نے تو یہ شادیاں بھی ہندو رسم کے مطابق کی تھیں۔ گویا یہ آج کی اصطلاح میں قومی ہم آہنگی کی کوشش تھی۔ اب اس میں شرعِ اسلامی کے احکامات کو درمیان میں لانا مناسب نہیں۔ سید حسام الدین اور ان کے سپاہیوں نے بھی یہ شادیاں کس رسم کے مطابق کی ہوں گی؟ کہا نہیں جا سکتا۔ ایک بات اور، کوسامبی کی آبادی، الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی کوسامبی رپورٹ کے مطابق ۱۲۰۰ سنہ قبل مسیح سے لے کر ۶۰۰ سنہ عیسوی تک ہے۔ ایدل پور کے پورب میں تالاب کے بعد جو ٹیلہ ہے۔ اس

مسلسل کے لئے پیچھے صفحہ ۸۹ ملاحظہ فرمائیں

www.taemeernews.com

میں اشوک کے دَور سے لے کر چندر گپت وکرما دتیہ کے دور تک کے برتنوں کے ٹکڑے POT-TERIES مجھے ملے ہیں۔ ایدل پور کا تالاب کسی قلعے کے گرد کھدی ہوئی خندق ہے، جو چوڑی چکلی سلوں جیسی اینٹوں سے بنی تھی۔ یہ اینٹیں آج بھی تالاب کی مٹی کی تہہ میں دبی ہوئی پڑی ہیں جو اکثر ایدل پور والوں کو کھدائی کے وقت ملتی ہیں۔ لیکن کوسمبی یا اس کے قریب کسی گاؤں یا شہر کا نام اسکندر پور نہیں تھا، جیسا کہ ریاض حسین نے لکھا ہے۔ پھر ناموں کی یہ ترکیب مسلمانوں کی حکومت (۱۲۰۵ء) سے پہلے ممکن بھی نہیں۔ پھر ۱۲۰۵ء میں کوسمبی کوئی ایک ریاست یا راجدھانی رہ بھی نہیں گئی تھی۔ کوسم کے گرد و پیش کی کھدائی میں بندیلا اور قنوج کے راجپوتوں کے آثار تو ملے ہیں مگر ایک وسطی دَور (MEDIEVAL) دور کا بھی کھنڈر ملا ہے جس کا ذکر گوبردھن رائے شرما نے اپنی کوسمبی کی کھدائی کی رپورٹ میں درج کیا ہے۔ کراری نام کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی۔ قیاس ہے کہ یہ حیدر کرار (حضرت علیؓ) کے نام پر بسائی گئی ہے۔ میرے بچپن میں کراری کو کرّاری، مشدّد کر کے لکھتے تھے۔ کراری کا ذکر مجھے سوا آئین اکبری کے اور کسی کرانیکل میں نہیں ملا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ص ۱۶۹ پر لکھا ہے کہ کراری، کڑا سرکار کا محال ہے۔ آئین میں اس کا رقبہ 39686 بیگھ (انتالیس ہزار چھ سو چھیاسی بیگھ) درج ہے جس کی سالانہ مالگذاری 141953 (ایک لاکھ اکتالیس ہزار نو سو ترپن) دام لکھی ہے۔ اگر کراری کا نام ابراہیم آباد ہوتا جیسا کہ ریاض حسین نے لکھا ہے تو آئین اکبری میں یہ نام ضرور درج ہوتا۔ ریاض حسین نے اپنے مآخذ صرف نسب ناموں میں بتائے ہوئے حسب اور تفصیلات میں رکھے ہیں۔ کسی تاریخ سے وہ مدد نہیں لے سکے اور نسب ناموں کا مزاج عام طور پر تفاخر ہی ہوا کرتا ہے۔ اس طرح حسب اور اس کے متعلقات کے سلسلے میں مبالغہ آرائی کا تحریروں میں شامل ہو جانا یقینی ہے۔ یہ ہر نسب نامے کا مقسوم ہوا کرتا ہے۔

کراری میں علم و ادب کا ماحول اور مزاج ابتدا ہی سے رہا ہے اور آج بھی اہل علم اس بستی اور اس کے نواحی علاقوں میں موجود ہیں۔ یہاں عالم دین بھی ہوئے۔ عام عالم

www.taemeernews.com

بھی، سائنس داں بھی۔ دینی عالموں میں شیعہ عالموں ہی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سید امجد حسین قبلہ مجتہد، مولوی[1] امتیاز حسین، مولوی نجم الحسن کراروی، مولوی ذیشان حیدر جوادی، مولوی علی عابد مجتہد اور مولوی زہیر قین کراروی خاص ہیں۔ عالموں میں ڈاکٹر جعفر حسین ڈی۔لٹ (ایڈنبرا) ڈاکٹر سید زین العباد نقوی اسلم، ڈاکٹر علی حیدر ڈاکٹر اختر مہدی، ڈاکٹر علی جاوید اور دوسرے حضرات ہیں۔ مشرقی علوم کے ماہرین میں سید زین العابدین (جن کی ایک فارسی مثنوی 'دفتر انتقام' کے نام سے ۱۸۴۷ء میں پٹنہ سے شائع ہوئی) سید منظور حسین نقوی، سید محمود حسن سروش اور چودھری حسن کاظم نقوی المتخلص بہ حسن و عروض، جنھوں نے علم عروض پر ایک جامع اور مبسوط کتاب بہ عنوان سراج العروض ۱۹۵۱ء میں لکھی جس کا ایک حصہ شائع ہوا ہے۔ نئے شعراء میں نواب احسن اور سید محمود کاظم خاص ہیں جن کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ سائنس دانوں میں ڈاکٹر سید ظہور قاسم پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے بحر قطب جنوبی کی تفصیلات کا پتہ لگایا۔ ڈاکٹر ظفر حسنین نقوی [illegible] INASA امریکہ کے خلائی راکٹ میں بے حد اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ افسروں کی فہرست میں عم محترم سید ضامن حسین ڈپٹی کلکٹر تھے پھر سید عباس علی تحصیلدار اور پھر سید محمود احمد عرف میرا کنزرویٹر آف فارسٹ ہیں۔ مددگار حسین رضوی بیمہ کمپنی میں زونل منیجر ہیں۔ سید دانش رضا ٹریژری افسر کے عہدے تک پہنچے۔ منجھن پور کے آغا علی حیدر نے کراچی کے ہائیکورٹ میں جج کا عہدہ حاصل کیا۔ رکسوارہ کے سید شمیم کاظم اور

جن پور سے سید [illegible] حیدر [illegible] رہے۔ یہ [illegible] سے پیدا ہوئے اور سید حسام الدین کے اخلاف میں سے ہیں۔ اب بھلا ایسے صاحبان علم و فن کے درمیان یہ ہیچمداں اپنا کیا ذکر کرے کہ اس نے کون سا ایسا کارنامہ انجام دیا ہے؟ مگر یہ کہ راقم بھی اسی کراری کی خاک سے نسبت رکھتا ہے اور صدر شعبۂ اردو

---

[1] معذرت چاہتا ہوں کہ 'مولانا' کا لفظ میں کسی بھی عالم دین کے لئے استعمال نہیں کرتا کہ یہ لقب مولائے کائنات حضرت علی کا ہے اور وہی سچے معنوں میں مسلمانوں کے مولا ہیں۔ سید محمد عقیل

www.taemeernews.com

الہ آباد یونیورسٹی کے عہدے تک پہنچا۔ یہ عجیب بات ہے کہ کراری میں شعر و شاعری کا ذوق تو ہمیشہ سے رہا، مگر لوگوں کی زیادہ تر دلچسپیاں مذہبی شاعری ہی سے رہی ہیں۔ ہاں جو کراری سے باہر نکل آیا اس نے غزل کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے سید مومن حسین شعلہ اور محبوب حسین تحمل، اور بھی لوگ ہوں گے جن کا مجھے علم نہیں۔ مگر قصیدہ گوئی اور مرثیہ گوئی یہاں کے لوگوں کے محبوب مشاغلِ شاعری رہے ہیں۔ پرانے لوگوں میں قصیدہ گوئی میں میرے والد سید اکبر حسین بھر موضع انذہرہ کے سید محمد حسن اعجاز، سید ابوالحسن توکل، سید محمد ضامن اور سید افتخار حسین کامل کراری خاص شعرا میں سے ہیں۔ قدرے نئے لوگوں میں سید زوار عباس اور سید محمد تقی اکمل اور شباب سونوی اچھے قصیدہ گو سمجھے گئے۔ آج بھی قصیدہ گوئی کے میدان میں مشقِ سخن جاری ہے۔ مگر اس فن میں کوئی سربرآوردہ نام نہیں۔ مرثیہ کہنے والوں میں صغیر سونوی اور حسن کاظم عروض کے نام ہیں۔ کراری کے لوگوں کی ایک ذہنی افتاد یہ بھی رہی ہے کہ وہ کراری سے باہر بہت کم نکلے۔ جو نکلے انھوں نے خاصہ نام کمایا۔ فلم کی دنیا میں سید یعقوب حسن رضوی اور سید سبط حسن رضوی نے بہت سی کامیاب فلمیں بنائیں۔ مشہور آرکی ٹیکٹ سید اختر حسن رضوی بھی کراری ہی کے رہنے والے ہیں جو رضوی بلڈرس کے نام سے مشہور ہیں۔ کراری کی یہی مختصر سی رُوداد ہے۔

www.taemeernews.com

کہانیاں کیا کیا!

علی اصغر بھائی اگرچہ بڑے علم دوست تھے مگر میرا تعلیمی عروج جیسے انھیں پسند نہ آیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے بیٹے ان کی خواہش اور شوق کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کر رہے تھے۔ تنگ آکر انھوں نے غضنفر کو جونپور کے عربی مدرسے ناصریہ میں داخل کر دیا کہ بہر حال علی اصغر بھائی میں مذہب کی لہر بہت تیز تھی اور غضنفر غالباً تقسیم ہند تک وہیں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ 'غالباً' کا لفظ یہاں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ پھر میرا غضنفر سے واسطہ ایک طرح سے ختم ہو گیا۔ عربی میں غضنفر کا ذہن خوب چلا۔ وہ محرم کی مجلسیں وغیرہ سنا کر خوب پڑھنے لگے اور جعفر الہ آباد کے یادگار حسینی اسکول میں ساتویں، آٹھویں درجے میں کہیں پڑھتے رہے۔ پھر اسلامیہ کالج الہ آباد میں بھی پڑھتے رہے اور شاید تقسیم کے فوراً بعد پاکستان چلے گئے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ جب بھائی علی اصغر صاحب ایدل پور آئے اب میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہو رہی تھی۔ مجھے چھکن میاں نے ابھی تک بہت سہارا دیا تھا اور اب مزید سہارا اُن کے بس سے باہر تھا۔ ابھی تک علی اصغر بھائی نے میری آبائی جائداد سے میرا حصہ الگ نہیں کیا تھا بلکہ وہ سب پر قابض و دخیل تھے۔ جیسا کہ زمینداری کی اخلاقیات کا اصول تھا۔ یہ اصول ان کے لئے اُس وقت یقیناً درست ہوتا اگر بھائی صاحب مجھے اپنے ساتھ رکھتے یا میری کسی طرح کی کفالت کرتے۔ مگر یہ انھوں نے کبھی نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب میں اپنے ایڈمیشن کے لئے پانچ روپیوں کی خاطر پریشان تھا، تو اس وقت انھوں نے میری اتنی چھوٹی سی مدد بھی نہ کی۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی مجھ میں بڑھنے لگا کہ بھائی صاحب میرے حصے کی زمینوں پر کم از کم پندرہ برس سے قبضہ کئے ہیں

www.taemeernews.com

اور مجھے کچھ نہیں دیتے۔ آخر ایک دن کراری کے میرے ایک بہی خواہ لیثؔن صاحب جو پیشے میں وکیل تھے اور میری تعلیمی سرگرمیوں سے بہت خوش رہتے تھے۔ میں نے اُن سے شکایتاً یہ تذکرہ کیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک دن بھائی صاحب سے مجھے لے کر گفتگو کی اور انھیں قائل معقول بھی کیا کہ آپ عقیلؔ کے حصّے کی جائداد اُسے دے دیجئے۔ یہ مناسب بات نہیں کہ آپ اس پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ اب بھائی صاحب پر اچانک اس گفتگو کا کیا اثر ہوا اور کیوں اثر ہوا کہہ نہیں سکتا۔ مگر انھوں نے لیثؔن صاحب سے وعدہ کر لیا کہ امسال جولائی میں وہ میرے حصّے کے کھیت اور جائداد سے دستبردار ہو جائیں گے اور واقعی انھوں نے یہی کیا۔ اگر وہ چاہتے تو زمیندارانہ طریقے اپنا کر کچھ مدّت کے لئے اور مجھے محروم کئے رہتے اور کہہ سکتے تھے کہ عقیل میرا بھائی نہیں ہے۔ پہلے وہ ثابت کرے کہ وہ میرا بھائی ہے۔ اور پھر نوبت مقدّمے تک آتی اس کے برخلاف علی اصغر بھائی نے عدالت میں بیان دیا کہ محمد عقیل میرا حقیقی بھائی ہے۔ اور اس کے حصّے کے کھیت اور جائداد میں اس کا نام درج کر دیا جائے اور یہی بیان انھوں نے اپنی تحریر میں لکھ کر مجھے بھی دے دیا۔ جو انھیں کی تحریر میں آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ بعد کو اس میں ایک عبرتناک اور مفسدانہ بات یہ ہوئی کہ ابھی تقریباً بارہ ۱۲ سال پہلے ۱۹۸۲ء میں پاکستان سے مولانا ع۔ رغ کراروی یعنی میاں علی غضنفر جو میرے بھتیجے ہیں جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے ان کے اشارے پر کسی مجہول المعروف ریاض الحسن نے کراچی سے سادات کراری کا ایک شجرۂ نسب شائع کیا جس میں میرا نام میرے خاندانی نسب نامے سے خارج کر دیا۔ گویا یہ بہت بڑا تیر انھوں نے مارا۔ مولانا ع۔ رغ کراروی جو میرے بھتیجے بھی ہیں اور رضاعی بھائی بھی۔ اور اب چونکہ وہ مولوی بھی ہیں اس لئے داخل النسب اور خارج النسب والی حدیث سے بھی ضرور واقف ہوں گے۔ مجھے اس شجرۂ نسب کی خبر بھی نہ تھی کہ ایک دن میرے ماموں زاد بھائی سیّد مومن حسین شعلہ کراروی، وہ کراچی کا چھپا ہوا شجرہ لے کر میرے پاس آئے اور بہت برافروختہ تھے کہ تم خاموش بیٹھے ہو اور دیکھو غضنفر نے کیا حرکت پاکستان میں تمہارے ساتھ کی ہے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ پاکستان

www.taemeernews.com

سے ایسے شجرے کی اشاعت پر میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر ہندوستان میں یہ کام ہوا ہوتا تو مقدمہ ہی دائر ہو سکتا تھا۔ مگر غضنفر میاں مجھے یہاں کہاں ملیں گے۔ پھر میں نے انھیں دولہا صاحب عروج کا یہ شعر سنایا کہ

جو جری ہیں انھیں حاجت نہیں اظہار کی ہے ۔۔۔ نام مردوں کا رقم بارٗھ یہ تلوار کی ہے

پھر میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ جب تمام اہل کراری، اپنی اپنی ماؤں کا نکاح نامہ پیش کریں گے اور اپنے جدّ اعلیٰ سیّد حسام الدین کا بھی جن کی بیوی ایک راجپوت ہندو راجہ کی بیٹی تھیں۔ جیسا کہ کنزالانساب اور دوسری کتاب الانساب میں درج ہے، تو یہ راقم بھی اپنی ماں کے نکاح کا وہ کاغذ پیش کر دے گا جس پر جعفر حسین ملّا (جنھوں نے نکاح پڑھایا تھا۔) لطافت حسین عرف منگو (میاں)، کرامت حسین عرف منگلی (میاں) جو کراری کے مقتدر زمینداروں میں سے تھے اور میری ماں کے اعزّا میں سے تھے) کی گواہیاں درج ہیں علی اصغر بھائی اس کاغذ سے واقف تھے کہ انھیں سیّد ارتضیٰ حسین مرحوم (جو بھائی صاحب تھے اور میرے بھی بہنوئی تھے جن کے بیٹے اب مولوی ذہیر قین صاحب سلمہ ہیں) نے آگاہ کر دیا تھا اور یہ سچ بات ہے کہ علی اصغر بھائی نے کبھی اپنے منھ سے ایسی بات کہیں اور کبھی نہیں نکالی کہ میں ان کا بھائی نہیں ہوں یا میں ان کے نسب نامے میں نہیں ہوں۔ اور وہ یہ بات کہہ بھی کیسے سکتے تھے؟ خیر جو بات بھائی علی اصغر نہ کر سکے وہ میاں ع۔ غ کراروی نے کر دی۔ ع اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند۔ جزاک اللہ! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خاندانی دشمنیاں پھیلانا ع۔ غ کراروی کو یہاں تک لے جائیں گی۔ میں نے میاں ع غ کو ایک خط شکایتاً لکھا تو انھوں نے اس سے اپنی برات کا اظہار کیا۔ اگرچہ جو بھی اس شجرے کو دیکھے گا وہ اُن کی اس میں شمولیت کا اقرار ہی کرے گا کہ پورے شجرے میں بھائی علی اصغر سے لے کر غضنفر، جعفر، ان کے تمام بھائی اور ان سب کی اولاد و احفاد تک کی تصویریں بڑے اہتمام سے چھپی ہیں۔ کچھ اور تصویریں دوسرے لوگوں کی بھی ہیں۔ مگر وہ محض برائے بیت ہیں۔ اس پر بھی میاں غضنفر اس مطبوعہ شجرے کی اشاعت سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے اس پر

www.taemeernews.com

تفصیلی بحث اس لئے کر دی ہے کہ خاموش رہنا اس شرارت کو تسلیم کر لینا ہے۔ اور مشرقی تہذیب میں نام کی نہیں مگر نسب کی اہمیت ابھی اتنی ہے کہ علامہ اقبال کو ابھی تک لوگوں نے نہیں چھوڑا اور انھیں نتھو درزی کی اولاد ثابت کرنے کے لئے میونسپلٹی کے اندراج تک ان کے محققین پہنچ آئے اور نادر شاہ کے بادشاہ ہو جانے کے بعد بھی لوگ اُسے ایک گڈریے کی اولاد ہی کہتے ہیں۔ اگرچہ گڈریہ کوئی قوم نہیں پیشہ ہے۔ جیسے درزی کوئی قوم نہیں بلکہ پیشہ ہے۔ اور نواب ٹونک کو لوگ آخر تک پنڈاری لٹیروں کی اولاد کہتے رہے اور ہزا کزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں، نظام حیدرآباد کو لوگ آج بھی مطعون کرتے ہیں۔ خیر یہ ہمارے خاندانی جھگڑے ہیں۔ اس میں عام آدمی کو کیا دلچسپی ہوگی۔ اور کیوں ہو۔

یہاں ایک دلچسپ سماجی کیفیت بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندوستان کے ہندو سماج میں منو کے اصولوں کے مطابق کوئی فرد دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اور بیوہ کی تو شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ شادی کے موقع پر جو وید مقدس کے منتر پڑھے جاتے ہیں سُنا ہے کہ وہ بیوہ کے لئے نہیں ہیں۔

بیوہ کی زندگی ہندو سماج میں ایک جہنم کی زندگی تھی۔ بیواؤں میں وہ بھی تھیں جو کم سنی میں بیوہ ہو گئیں۔ ایسی بھی تھیں جنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کب وہ سہاگن ہوئیں اور کب بیوہ ہو گئیں پھر بیوہ ہونے میں ان کا کیا قصور تھا؟ آخر بیوہ کی شادی ہندو سماج میں کیوں ممنوع تھی؟ اس کا تو مجھے علم نہیں۔ کیا یہ جنسیات کا کوئی مسئلہ ہے یا لذتیہ کا یا محض چھوا چھوت کا کہ ہندوستانی سماج میں چھوا چھوت کا مسئلہ ہمیشہ سے مضبوط رہا ہے۔ اور چونکہ بیوہ ایک مرد سے وابستہ ہو گئی اس لئے ایک طرح سے وہ جھوٹا برتن بن گئی۔ اب دوسرا آدمی اُسے کیسے چھوئے؟ مگر جو بیوائیں، رسم عروسی کی منزلوں تک بھی نہ پہنچیں ان پر اس قانون کے اطلاق کے کیا معنی؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں میں جہیز کی رسم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیوہ جہیز دوبارہ

www.taemeernews.com

کہاں سے لائے گی؟ اور بغیر جہیز کے شادی کرنے والا خسارے میں رہے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب کنواری لڑکیاں مل رہی ہوں تو کیوں کوئی بیوہ سے شادی کرے یا پھر اسے محض بد شگونی سمجھا گیا ہو کہ شگون اور بد شگونی کا احساس بھی ہندوستانی سوسائٹی میں بہت مضبوط رہا ہے۔ مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو ان کی سماجی زندگی میں یہ طور طریقے نہ تھے۔ خود رسول اکرم نے اپنا پہلا نکاح ایک بیوہ سے کیا۔ اور بھی چند نکاح انھوں نے بیواؤں سے کئے۔ کہ عربوں میں عقد بیوگان عام تھا اور اسلامی دور میں اس پر عمل بھی کیا جاتا رہا۔ حضرت علی نے بھی حضرت ابوبکر کی بیوہ اسماء بنت عمیس سے نکاح کیا۔ شاید آریائی نسل میں کسی سبب سے بیوہ سے شادی پسند نہ کی جاتی رہی ہو؟ کیونکہ اگرچہ ایران مسلمان ہو چکا تھا مگر فارسی زبان میں یہ کہاوت بھی عام تھی۔ " زن بیوہ مکن گرچہ حور است "۔ (مجھے تحقیق نہیں کہ کہاوت ایرانیوں کی ہی ہے یا کسی ہندوستانی فارسی دانشور نے گڑھی ہے)۔ مسلمان جنھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن مالوف بنایا، انھوں نے بہت سے رسم و رواج، یہاں کی سرزمین سے لئے۔ شادی بیاہ کی تقریباً تمام رسمیں اختیار کیں۔ سمکشتا رسم کو کس خوبصورتی سے مسلمانوں نے آرسی مصحف میں تبدیل کیا۔ مرنے کی رسموں میں تیجہ، بارہواں اور چالیسواں سب اسی ہندوستان کی دین ہیں۔ اسلامی ممالک میں جہاں تک مجھے علم ہے، ایسی کوئی رسم نہ پہلے تھی نہ آج ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی سماجی طور پر عقد بیوگان کو مذموم سمجھا۔ ممنوع تو قرار دے نہیں سکتے تھے کیونکہ سنت نبوی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے علی الخصوص اشرافیہ (ELITE CLASS) نے اسے برا سمجھنے میں زیادہ دلچسپی دکھائی کہ اس میں معاشی مسئلہ بھی اس وقت تک داخل ہو گیا تھا اشرافیہ کے لوگ عقد بیوگان کو سماجی طور پر تحقیر کی منزل میں بھی لے آئے اور بیوہ سے عقد کے بعد جو اولادیں ہوتیں انھیں یہ کہہ کر متعارف کرتے کہ " یہ دوسری بیوی سے ہیں "۔ اودھ شاہی میں بھی 'خاص محل' کی عزت و توقیر دوسری بیویوں سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ " یہ دوسری بیوی سے ہیں " والے تعارف میں ایک کراہیت کا تاثر بھی ہوتا اور کم تر درجے کا بھی۔ اور سننے والا بھی اسے فراخ دلی سے نہ لیتا۔ ایسا بھی ہوا کہ کچھ مسلمانوں نے غیر مسلم عورتوں کو مسلمان کر کے

www.taemeernews.com

اُن سے عقد کر لیا۔ مگر چونکہ یہ غیر کفو تھیں لہٰذا انھیں سماجی برابری، برادری میں کبھی نہ ملی۔ اس میں ہندو سوسائٹی کا "سوت" والا جذبہ بھی شامل تھا۔ یہاں ایک دلچسپ قصّہ یاد آیا۔ شیعہ خاندان کی ایک ناخواندہ اور روایت پرست خاتون حضرت امام حسین کے روضے کی زیارت کے لئے کربلائے معلیٰ گئیں۔ جب قبر امام مظلوم کی زیارت کر چکیں تو لوگ حضرت عباس کے روضے کی زیارت کے لئے تیار ہوئے مگر یہ خاتون وہاں نہ گئیں کہ حضرت عباس، بی بی فاطمہ کی "سوت" کے بیٹے تھے اور اگر میں وہاں جاؤں گی تو بی بی فاطمہ ناراض ہو جائیں گی۔ تو دوسری شادی، اور خصوصاً بیوہ سے شادی کی نفرت مسلمانوں میں کہاں تک پہنچی اس کا اندازہ اسی روایت پرست قصّے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ناول نگار محمد علی طبیب نے گورا نام کا ناول انیسویں صدی میں ہندوؤں میں بیواؤں کے شادی کے مسئلے پر لکھا ہے۔ مگر بیچ بیچ میں مسلمانوں کے بھی عقدِ بیوگان سے اجتناب کی طرف اشارہ کرتے جاتے ہیں۔

> "خیر، تم تو ہندو ہو، مسلمانوں کو دیکھو۔ مذہبی حیثیت سے ان کے یہاں مرنے والے کی عورت کے سوگ کا زمانہ چند مہینے اور چند دنوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ بیوہ عورتوں کے نکاح کو کس قدر معیوب سمجھتے ہیں اور جو شاذ و نادر دوسرا عقد کر لیتی ہیں گو وہ اپنے مذہبی حیثیت سے بُرا نہیں کرتیں مگر پھر بھی جس نظر سے وہ دیکھی جاتی ہیں، سبھی جانتے ہیں۔" (گورا۔ از طبیب ص۱۲)

مسلمان زمینداروں نے ہندوؤں کی اس رسم کو پسند کیا اور عقد بیوگان سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ اس میں تقسیم جائداد کا مسئلہ بھی در پیش تھا اور یہ بھول گئے کہ اولادِ رسولؐ، ایک بیوہ حضرت خدیجہ کی اولاد سے بڑھی اور پھیلی اور تطہیرا کی منزلت پر فائض ہوئی۔ چنانچہ "ہم گروہ انبیا اپنا وارث نہیں چھوڑتے" والی جعلی حدیث کی طرح زمینداروں نے بھی عملی طور پر یہ روایت بنائی کہ "ہمارے یہاں بیٹی کا حصّہ نہیں ہوتا۔" ادھر میں بڑے بیٹے کے علاوہ دوسرے بیٹے جائداد کی وراثت سے محروم کر دیئے گئے۔ یہ اسلامی روایت یا اصول کچھ بھی نہ تھا۔ مگر صاحبان

www.taemeernews.com

جائداد کو یہ اصول موافق (۱ ۷ ۲ ۸ ۲) آتا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اسلامی اصولوں اور قرآن کو طاق پر رکھ دیا اور اس بے اصولی کو اصول بنا کر اس پر عمل کرنے لگے۔ عقد بیوگان کے زمیندار اس لئے اور مخالف بن گئے کہ اگر بیوہ بہن یا بیٹی ان کے گھر میں رہے گی تو ان کے حصے کی جائداد (اگر انھیں کچھ دیا گیا تو) بھی زمینداروں کے پاس ہی رہے گی۔ اور اگر دوسرا نکاح ہو گیا تو دوسرا شوہر جائداد میں حصہ لے سکتا ہے۔ غرض کہ مسلمانوں میں اسلامی شرع کے مطابق عقد بیوگان تو جائز رہا مگر عملی طور پر مسلمانوں نے بھی اسے سماجی منظوری نہ دی۔ پھر اس نامنظوری میں ایک وجہ افتخار بھی نکلتی ہے۔ میں ایک بیوہ کے دوسرے شوہر کی اولاد ہوں۔ تو مجھے میاں غضنفر وغیرہ کیسے برداشت کرتے۔ پھر یہ بھی کہ میں نے اپنی جائداد کا حصہ بھی ان کے باپ سے لے لیا۔ چنانچہ اپنے طور پر انھوں نے شہ دار Master Stroke یہ کیا کہ میرا نام شجرۂ نسب سے نکلوا دیا۔ مگر کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں؟ میری ماں کوئی مجہول النسب خاتون نہ تھیں۔ نہ کوئی غیر مسلم عورت تھیں، نہ کسی "میرن اور چمیلیا" کی اولاد تھیں بلکہ کراری کے محلہ بارہ دری کے ایک سیّد خاندان کی بیٹی تھیں جن کا تذکرہ ابتدائی صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ جو مومن حسین شعلہ جیسے نسّاب کی پھوپھی تھیں اور جن کا نسب نامہ بھی اسی کراچی سے چھپے ہوئے نسب نامے میں بھی درج ہے۔ اگرچہ یہ جھگڑا عام آدمی کے دلچسپی کا نہیں ہے۔ مگر تکمیل حجت کی خاطر میں اپنا اور اپنی والدہ کا نسب نامہ بھی درج کئے دیتا ہوں۔ دیکھنا ہے کہ میاں عین غین کراروی میرے خلاف کیا ثبوت لاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو میرے خلاف میاں عین غین کراروی کے حلیف بنے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں نسّاب حضرات، خاندان رسالت کے ان لوگوں کو کس خانوں میں رکھیں گے جنہوں نے افریقہ کی نوبیہ کنیزوں سے شادیاں رچائی تھیں؟ کہ ان میں بڑی بڑی مقتدر اور معصوم ہستیاں بھی ہیں۔ پھر تو ابولہب و ابوجہل زیادہ مقتدر ہوں گے یا حضرت بلالِ حبشی اور حضرت سلمان فارسی؟

○

www.taemeernews.com

نسب نامہ پدری

سید محمد عقیل ابن سید اکبر حسین ابن سید علی اشرف
ابن سید محمد مسیح ابن سید یحیٰی ابن سید عطاءاللہ ابن
سید غضنفر ابن سید عبدالحیٔ جہادؔ ابن سید حسام الدین
ابن سید ضیاءالدین ابن سید یعقوب ابن سید امام الدین
ابن سید حیدر ابن سید محمد ابن سید فیروز ابن سید
قطب الدین ابن سید امام الدین ابن سید فخرالدین
ابن سید حسام الدین ابن سید کمال الدین حکیم ابن
سید بدرالدین ابن سید تاج الدین شہید ابن سید
یحیٰی ابن سید عبدالعزیز ابن سید ابراہیم ابن سید

www.taemeernews.com

محمود ابن سید زید ابن سید عبداللہ زربخش ابن سید

یعقوب ابن سید ابوعبداللہ احمد ابن سید ابوالحسن

ابن سید موسیٰ ابن سید احمد (نقیب قم) ابن سید محمد

اعرج ابن سید احمد ابن سید موسیٰ مبرقع ابن امام محمد

تقیؑ ابن امام علی الرضاؑ ابن امام موسیٰ کاظم ابن امام

جعفرؑ صادق ابن امام محمد باقرؑ ابن امام علیؑ زین العابدین

ابن امام حسینؑ ابن علی ابن ابی طالب

وحضرت فاطمہ زھراؑ بنتِ سرورِ انبیا

حضرت محمدؐ ابن عبد اللہ۔

www.taemeernews.com

نسب نامہ مادری

ابتدائی کرسی شجرۂ سادات کراری مرتبہ سید ریاض حسین مطبوعہ ۱۹۲۷ء
میں ملاحظہ ہو۔

سید درویش محمد

غلام امام الدین

سید محمد منیر

سید غلام رسول

سید صادق علی

سید درویش علی

سید امیر علی — سید مشرف علی — سید اشرف علی — صاحب علی

سید اکبر علی بلاقی + شفاعت النساء

احمد حسین — یاد حسین — غلام رسول — جماعت النساء — شفاعت النساء (بیوہ)

+ سید اکبر حسین (ایدل پور)

سید محمد عقیل

www.taemeernews.com

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو میں اپنی بہن کے یہاں الہ آباد چلا آیا۔ اس وقت میرے بہنوئی سید اختر حسین کا تبادلہ بلسی ضلع بدایوں کا ہو گیا۔ اختر حسین بھائی کورٹ آف وارڈس میں ضلع دار تھے۔ یہ محکمہ اس وقت دیسی ریاستوں کی نگرانی کا محکمہ ہوا کرتا تھا۔ جس کا کام یہ تھا کہ جن ریاستوں کے ورثاء نابالغ ہوں، یا ریاست کسی سبب سے عارضی طور پر حکومت کی تحویل میں چلی جائے تو کورٹ آف وارڈس اس ریاست کی نگرانی کرتا تھا اور لگان و مالکانہ وغیرہ وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کراتا۔ اس کا مقامی افسر ضلع دار ہوتا تھا۔ تبادلہ ہوا تو میرے بہنوئی اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جب اپنی ملازمت میں دو تین دن کیلئے دورے پر چلے جائیں گے تو گھر میں کون رہے گا۔ میرے الہ آباد پہنچ جانے پر میری بہن نے مجھ سے کہا کہ فی الحال تم میرے ساتھ چلو اور جب تک تمہاری چھٹی ہے میرے ساتھ ملازمت پر رہنا۔ پھر جب تمہارا اسکول جولائی میں کھلے تو تم چلے آنا۔ میں تیار ہو گیا اور ایک شام ہم لوگ بریلی پسنجر ٹرین سے بریلی کیلئے روانہ ہو گئے۔ میرے سیلانی مزاج کو گھومنے کا ایک اور موقع ملا۔ بریلی سے ہم گاڑی بدل کر اوجھیانی اسٹیشن پہنچے۔ جہاں سے ہمیں بلسی اسٹیٹ جانا تھا۔ جس کا فاصلہ اسٹیشن سے دس بارہ میل رہا ہوگا۔ ہم یکوں پر سوار ہو کر بلسی کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ مئی کی ابتدا تھی اور موسم گرم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مگر یہ راستہ مجھے بہت اچھا لگا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی ندی بھینسور نام کی تھی جس میں کہیں کہیں پانی بھرا تھا اور ایک جنگل کی پٹی اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تقریباً ڈھائی گھنٹوں میں ہم بلسی اسٹیٹ کی لق و دق کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ایک نظر میں کوٹھی اور اس کا گرد و پیش مجھے بہت متاثر کن لگا۔ چاروں طرف قلمی آم کے باغات اور بیچ میں وہ فلک نما کوٹھی کھڑی تھی۔

بلسی کی مختصر تاریخ مجھے بتائی گئی کہ یہ نواب کلب علی خاں والئی رام پور کے چھوٹے

www.taemeernews.com

بھائی نواب حیدر علی خاں کا علاقہ ہے۔ ان کے بیٹے نواب چھمّن خاں تک کوٹھی کا ٹھاٹ باٹ قائم تھا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کا بیٹا نبّہ خاں غالباً عین جوانی میں فوت ہو گیا۔ نواب چھمّن خاں نے ایک معمولی عورت ــــ کو بھی حرم میں داخل کر لیا تھا۔ اس سے دو بیٹے تھے ایک کا نام کچھ فرخ نواب جیسا لوگوں نے بتایا اور ایک بہن بھی۔ نبّہ صاحب کے مرجانے کے بعد یہی لوگ ریاست کے مالک ہو گئے۔ مگر چونکہ نابالغ تھے اس لئے ریاست بلسی، کورٹ آف وارڈس میں چلی گئی۔

ہم کوٹھی میں داخل ہوئے تو کوٹھی کا تمام عملہ ہمارے استقبال کے لئے وہاں حاضر ہوا اور ہمارا تمام سامان اوپر کے حصّے میں پہنچا دیا گیا۔ کوٹھی اتنی وسیع تھی کہ ہم لوگ ایک کمرے اور ایک لق ودق دالان میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے چند جھینگے ایک کونے میں بھنبھنا رہے ہوں۔ بہرحال رات ہم نے اوپر کی وسیع چھت پر بسر کی۔ صبح ہوئی تو بھائی اختر حسین اپنے چپراسیوں کے ساتھ کسی سرکاری کام سے داتا گنج تحصیل روانہ ہو گئے۔ ناشتہ وغیرہ کر کے میں تن تنہا کوٹھی اور باغ کا جائزہ لینے کے لئے باہر نکلا۔ نیچے کے تمام کمرے جن میں کوٹھی اور نواب صاحب کا اثاثہ رکھا تھا سب مقفّل تھے۔ کیا دیکھتا۔ کوٹھی کے سامنے اور قریب ہی اچھے لان اور چمن بنے ہوئے تھے۔ مگر پانی کی کمیابی کے باعث گرمی کی تمازت سے خشک ہو چکے تھے۔ آم کے باغوں کی طرف نکلا تو معلوم ہوا کہ آموں کے جنگل میں آ گیا ہوں۔ تقریباً پانچ سو بیگھے کے قلمی آم کے باغ کوٹھی کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ مور یعنی طاؤس اور دوسری چڑیاں، شاخوں پر پھدکتیں تو مجھے اپنا دیہات یاد آتا۔ ہر شاخ پر آموں کی کیریاں لٹک رہی تھیں اور پورے باغ کی فضا جیسے سبز ہو رہی تھی۔ گھومتے گھومتے تھک گیا اور ایک درخت کے نیچے ابھی سستانے کو بیٹھا ہی تھا کہ ایک طرف سے شور ہوا "بھاگو بھاگو رینیا آ گیا، رینیا آ گیا" کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کر گدن نما بھینسا اپنے تن و توش کے ساتھ میری طرف بھاگتا چلا آ رہا ہے اور اس کے پیچھے آم کے رکھوالوں کا ایک ہجوم، بلّم کاندھے لئے اسے دوڑا رہا ہے۔ رینیا میرے اتنے قریب پہنچ گیا کہ بھاگنے کا کوئی امکان نہ رہ گیا کہ وہ ارنا بھینسا ایک جھپٹ میں مجھ تک

www.taemeernews.com

پہنچ جاتا اور پھر کیا ہوتا خدا معلوم۔ یہاں میری دیہات کی ٹریننگ کام آئی اور ٹیلیک کر اسی آم کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ جس کے نیچے بیٹھا تھا۔ رینپیا (RANPAR) بے حد غصّے میں تھا۔ وہ جانے کیا سمجھا کہ آم کے تنے پر اپنی سینگوں اور ماتھے سے ٹکر مارنے لگا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو خوف ہی سے نیچے ٹپک پڑتا۔ مگر میری رانبس کروسو والی زندگی مجھے بچا لے رہی۔ لطف کی بات اور خطرے کی بھی بات یہ ہوئی کہ وہ آم کے تاکنے والے بھی بھاگ گئے۔ اب میں تھا اور پیڑ میں ٹکر مارنے والا رینپیا۔ میں دھیرے دھیرے اور اوپر چڑھ کر آم کے تنے کے ایک بڑے کٹاؤ میں روپوش ہو گیا۔ رینپیا تقریباً آدھ گھنٹے تک پیڑ میں ٹکر مارتا رہا۔ پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ وہ ایک سمت کو بدھار گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ اور جب وہ کافی دور نکل گیا تو میں پیڑ پر سے نیچے اترا اور سیدھا کوٹھی کی طرف بھاگا۔ بعد کو پتہ چلا کہ رینپیا اَرنا بھینسے کی نسل سے ہے۔ نواب چھمّن صاحب کو جانوروں کو لڑانے کا بھی شوق تھا اور موسیقی کا بھی۔ جب نواب کا انتقال ہو گیا اور اسٹیٹ ایک طرح سے گورنمنٹ کی تحویل میں چلی گئی تو تقریباً تمام جانور مر گئے۔ صرف یہ رینپیا رہ گیا جو چھٹوا سانڈ کی طرح ہو گیا ہے۔ یہاں چاہتا ہے۔ گھومتا پھرتا ہے۔ لوگوں کے کھیت کھلیان سے اپنا پیٹ بھرتا ہے اور اسی طرح کوٹھی کے باغوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پچھلے سال اس نے آم کے رکھوالوں میں سے دو کی جانیں لے لیں۔ میرے گھر پہنچنے تک یہ خبر کوٹھی میں پہنچ گئی کہ مجھے رینپیا نے گھیر لیا ہے۔ اور اب کوٹھی میں رہنے والے دو چار چپراسی، ہوری مہتر اور گدھا خاں چوکیدار، سب لاٹھیاں لئے ہوئے میری طرف آتے دکھائی پڑے۔ مجھے سلامت پاکر ان لوگوں نے اپنے حلقے میں مجھے لے لیا اور اس طرح میں کوٹھی میں واپس لوٹا۔ پھر لوگوں نے رینپیا کے دو ایک اور واقعات سنائے۔

نیچے اختر بھائی کا ایک آفس نما کمرہ تھا اور اس سے ملحق ایک ڈرائنگ روم تھی جسے گول کمرہ کہا جاتا تھا کہ اس کمرے کا اگلا حصّہ مدوّر تھا۔ یہ نواب چھمّن صاحب کا ملنے کا کمرہ کبھی رہا ہوگا۔ کوئی اور اس وقت میرے علاوہ تو کوٹھی میں تھا نہیں اس

www.taemeernews.com

لئے میں نیچے کے تمام کمروں میں پھرتا پھرتا۔ اختر بھائی کا کمرہ کھول کر اس میں بیٹھتا۔ کبھی گول کمرے کے صوفوں پر لوٹ لگاتا۔ کبھی ٹھنڈا پاکر اسی میں دوپہر کو سو بھی جاتا۔ اسی گول کمرے سے ملا ہوا ایک کمرہ اور تھا۔ جھانک کر دیکھا تو اس میں طرح طرح کے آلات موسیقی پڑے تھے۔ میں انھیں بھلا کیا سمجھتا۔ صرف سارنگی اور ہارمونیم تو سمجھ میں آئے باقی دیگر آلات میرے لئے اجنبی تھے۔ ایک دن میں نے گدھا خاں (نواب چھمن صاحب کا دیرینہ ملازم جو اب اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں رہتا تھا) سے ان آلات موسیقی کی تفصیل پوچھی تو انھوں نے نواب صاحب کے فن موسیقی کی مہارت کے عجیب و غریب کارنامے سنائے۔ ایک طوائف موتی جان کا بھی تذکرہ کیا۔ جس کے کسی راگ کے گانے پر ایک دن بقول گدھا خاں پانی برسنے لگا تھا۔ جب موتی جان ناچتی تو ناچنے میں اسے ایسی مہارت تھی کہ پاؤں کی پازیب کا اگر وہ چاہتی تو صرف ایک گھنگرو بجتا تھا باقی گھنگرو خاموش رہتے۔ ایک دن موتی جان نے دیپک راگ گا دیا تو آگ لگتے لگتے بچی۔ اگر نواب صاحب نے پہلے سے پانی کا انتظام نہ کر لیا ہوتا تو کوٹھی بھسم ہو جاتی۔ موتی جان صبح بھیروں راگنی گا کر نواب چھمن خاں کو نیند سے بیدار کرتی تھی اور اسی طرح کے بہت سے عجیب و غریب قصے ، گدھا خاں سناتے۔ وہ تقریباً ستر کے پیٹے میں تھے اور جب یہ سب باتیں سناتے تو وہ الف لیلیٰ کے خود ایک کردار معلوم ہونے لگتے۔ پھر انھوں نے موتی جان کے عزیز دولہا خاں کا تذکرہ کیا جو بلسی کی آبادی میں کہیں رہتا تھا۔ وہ اب بھی کئی طوائفوں کا سرپرست تھا۔ کوٹھی میں اگر کوئی رنگین مزاج ضلع دار یا سربراہ کار (کورٹ آف وارڈس کے محکمے میں یہ ایک افسر ہوتا تھا) آجاتا تو دولہا خاں کی بن آتی۔ پھر کوٹھی میں آئے دن مجرا ہوتا اور دیگر دلچسپیاں اور محفلیں ہونے لگتیں

جون کا پہلا ہی ہفتہ تھا کہ اچانک بارش شروع ہو گئی پہلے ایک موسلا دھار بارش ہوئی پھر دوسرے تیسرے ساون لگنے سے جھالے پڑنے لگے۔ اسی عالم میں ایک دن ایک رتھ (ایک سواری گاڑی جس میں بیل جتے ہوتے ہیں) آکر کوٹھی کے پورٹیکو میں رکا۔ اس میں سے پہلے اختر بھائی اور ان کے ساتھ ان کے افسر سربراہ کار صاحب برآمد ہوئے۔ انھیں فوراً گول کمرہ کھلوا کر

www.taemeernews.com

اس میں بٹھا دیا گیا۔ پھر پیچھے کے متصل متعدد کمروں میں سے ایک کمرہ جو چمن کی طرف کھلتا تھا وہ صاف کرایا گیا۔ اسی میں سربراہ کار صاحب کا سامان وغیرہ رکھوا دیا گیا۔ سربراہ کار صاحب خاصے تومند اور گورے چٹے آدمی تھے۔ محمد الیاس خاں ان کا نام تھا۔ تقریباً پینتالیس پچاس کے پیٹے میں رہے ہوں گے۔ گدھا خاں نے مجھ سے چپکے سے کہا کہ میاں اب دیکھئے گا۔ کوٹھی میں دو ایک دن جشن رہے گا۔ دولہا خاں کی اب چاندی ہوگی۔ یہ سربراہ کار صاحب بڑے رنگین مزاج ہیں۔ شام ہوتے ہوتے ایک دبلا پتلا شخص باہر گول کمرے میں سربراہ کار صاحب کے پاس آیا۔ جس کی عمر بھی چالیس کے قریب ہی ہوگی۔ اُسے دیکھتے ہی سربراہ کار صاحب کھل اُٹھے اور اس سے گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ میں اختر بھائی کے کمرے میں بیٹھا دولہا خاں اور سربراہ کار صاحب کی باتیں سُن رہا تھا۔ دولہا خاں بولا، "ارے صاحب، آج کل بدایوں میں حسن بانو اور رام کلی کی ہوا بندھی ہوئی ہے۔ کیا گاتی ہیں دونوں حضور! حضور حکم دیں تو ابھی بدایوں چلا جاؤں اور دونوں کو کار میں بٹھا کر لے آؤں۔" سربراہ کار صاحب کی باچھیں کھل گئیں دولہا خاں، اختر بھائی کے پاس آیا۔ سربراہ کار صاحب کی خواہش بیان کی اور کہا کہ اگر آپ گوکل داس رستوگی کو خط لکھ دیں تو مجھے بدایوں جانے کے لئے کار مل جائے گی۔ میں اُٹھ کر اوپر چلا آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اختر بھائی میرے سامنے باتیں کرنے سے رُک رہے تھے۔

رات کا پچھلا پہر رہا ہوگا کہ کوٹھی میں ایک کار کے آنے کی آواز سنائی دی۔ میں جاگ گیا اور سمجھ گیا کہ بدایوں کی سواریاں آگئیں۔ مجھے بھی ان سواریوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر اس وقت تو اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا۔ چھت کے کنارے سے جھانک کر دیکھا تو اندھیرے اور لالٹین کے ملگجے اجالے میں پہلے ایک عورت کار سے اتری، پھر دولہا خاں اور اس کا کوئی ساتھی سب گول کمرے میں چلے گئے اور پھر نسوانی اور مردانے قہقہوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں طوائفوں اور مجروں کی تہذیب اور طور طریقے نہیں دیکھے تھے۔ اس دنیا میں میری صورت ایک دیہاتی ہونق سے زیادہ نہ تھی۔

www.taemeernews.com

ابھی دھندھلکا ہی تھا کہ نیچے سے گانوں اور تانوں کی سحر انگیز آوازیں آنے لگیں۔ میں دم بخود انھیں آوازوں میں محو چپ کا لیٹا تھا کہ اختر بھائی اوپر آئے۔ بہن کو جگا کر ان سے کچھ باتیں چپکے چپکے کیں اور پھر نیچے چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں بہن اٹھیں اور جلد جلد ناشتے وغیرہ کا انتظام کرنے لگیں۔ اب سورج نکل آیا تھا۔ مگر مدھم سروں میں گانے کی آوازیں نیچے سے آرہی تھیں۔ کون ہے؟ حسن بانو یا رام کلی؟ مگر بول مجھے آج بھی یاد ہیں۔ "پیہرا پیا کی بولی نہ بول" اور جب گانے والی تانیں اور بلیڈیاں لیتی تو دل کھینچنے لگتا تھا۔ یہ میری عمر ہی کا اثر ہوگا۔ اس لئے کہ فن موسیقی سے تو میں بے بہرہ تھا۔ مگر بلبل کی آواز کا اثر تو سبھی پر ہوتا ہے۔ گدھا خاں کا بیٹا بھاگا ہوا اوپر آیا اور بہن سے اس نے چائے کے لئے کہا۔ بہن نے بیڈ ٹی ٹائپ کی چائے ایک ٹرے میں رکھ کر روانہ کر دی۔ اب مجھے فکر پیدا ہوئی کہ کیسے نیچے جا کر اس محفل کی ایک جھلک ہی دیکھ لوں۔ یہ بھی کہ یہ کون ہے، حسن بانو یا رام کلی؟ اور یہ موقع جلد ہی آگیا۔ پھر ناشتہ جب باقاعدہ جانے لگا تو اتنا تھا کہ گدھا خاں کا بیٹا اکیلے ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اور اندرون خانہ کوئی مرد چپراسی نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ میں فوراً لڑکے کا مددگار بن کر ناشتہ کا بقیہ سامان نیچے پہنچانے گیا۔ گول کمرے میں سربراہ کار صاحب اور بدایوں سے آئی ہوئی مغنیہ بیٹھی تھی۔ سربراہ کار صاحب مغنیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے مغنیہ کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ (بعد کو معلوم ہوا کہ مغنیہ حُسن بانو تھی) حسن بانو ایک نہایت معمولی شکل و صورت اور سانولی رنگت کی لڑکی تھی اور میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک کے نشانات بھی تھے۔ مگر ایک نمک بھی تھا جو دیکھنے والے کو متوجہ کر لیتا تھا۔ تاہم اس کی آواز میں غضب کا جادو تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھی تو اُس کے بال بکھر کر کمر تک آگئے۔ آج کا وقت ہوتا تو میں شور واحدی کا مصرعہ ع رات کے گیسو تا کمر آئے۔ ضرور پڑھ دیتا۔ ہم نے ناشتہ رکھا اور گدھا خاں کے لڑکے کو وہیں چھوڑ کر میں اوپر واپس چلا آیا۔

تھوڑی دیر میں ابر کے سیاہ ٹکڑے آسمان میں تیرنے لگے اور دیکھتے دیکھتے پورا آسمان

www.taemeernews.com

بادلوں سے ڈھک گیا اور رم جھم شروع ہو گئی۔ بارش کے ساتھ ایک مرتبہ جو بادلوں کا کڑکا ہوا تو ساری امرائی کے مور ایک ساتھ مل کر اس طرح چلائے کہ معلوم ہوا کہ سیکڑوں تڑومیاں ایک ساتھ بجنے لگیں۔ اُدھر نیچے سے حسن بانو کے گانے کی ہلکی ہلکی آوازیں اوپر آنے لگیں۔ بہن باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مشغول تھیں۔ میں چپکے سے ان سیڑھیوں پر چلا گیا جو گول کمرے کی طرف جاتی تھیں مگر باہر سے مقفل کر دی گئی تھیں۔ وہاں سے گول کمرے کا نظارہ بھی صاف دکھائی دیتا اور گانا بھی صاف سنائی پڑتا تھا۔ دولہا خاں سربراہ کار صاحب کے پاس ہی جما بیٹھا تھا۔ پان پر پان چبا رہا تھا اور حسن بانو ساون گا رہی تھی۔ "جھولا کن نے ڈارو امریاں"۔ کبھی کبھی اٹھ کر رقص میں آجاتی تو سربراہ کار صاحب اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پھر اپنے پاس کھینچ لیتے۔ عجب فلمی سین تھا۔ پھر سربراہ کار صاحب ایک لمبے صوفے پر لیٹ گئے اور حسن بانو ان کے پہلو میں بیٹھ کر کوئی گیت گنگنانے لگی۔ دولہا خاں بیٹھا مستقل پان چبائے جا رہا تھا اور کچھ جملے بھی حسن بانو کے لئے کہہ دیتا جو صاف سمجھ میں نہ آتے۔ دولہا خاں چرب زبان تو تھا ہی مگر صحبتیں بھی دیکھے تھا۔ وہ کبھی کبھی اَدَق زبان میں رنڈی بازوں کے فقرے بھی کہہ جاتا جو کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ کچھ فحش نقلیں بھی مسخرے پن سے کر رہا تھا میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی اور میں فوراً اوپر چلا آیا۔

نوابی تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ مگر نوابوں کی جگہ جو زمینداروں نے لے لی تھی، سماج میں انھیں کے لٹکے جھٹکے چل رہے تھے۔ حسن بانو اور دولہا خاں کے طبقے نے انھیں کے انداز پر خود کو ڈھال لیا تھا۔ اب ملازمت کی وہ صورت بھی باقی نہ تھی کہ طوائفیں، ایک رئیس کی پابند ہو کر زندگی گزار دیں۔ شاید اب ان طوائفوں کی دُہری زندگی ہو گئی تھی۔ بازار بھی اور رئیسوں کے ڈرائنگ روم بھی۔ اور جب رئیس نہ ملیں تو سربراہ کار صاحب جیسے عیاش، ملازم پیشہ ہی سہی۔ حسن بانو کا قیام تین دن تک کوٹھی میں رہا۔ یہ تین دن میری بہن کے لئے مصیبتوں کے دن تھے کہ کھانا اور ناشتہ بھیجتے بھیجتے ان کی حالت غیر ہو گئی۔ مگر میرے لئے یہ ایک نئی زندگی دیکھنے کا موقع تھا اور کچھ دلچسپی کا بھی۔ یہ دُور کا جلوہ خاصہ پُر لطف تھا۔ اختر بھائی بھی خاصے جز بز

www.taemeernews.com

تھے مگر کیا کرتے افسر کا معاملہ تھا۔ کوئی اور آدمی ہوتا تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر خاصے پیسے کھڑے کر لیتا۔ معاملات اور وصول تحصیل میں خوب گھپلے کرتا کہ افسر کو تو اس نے خوش کر دیا۔ اب جتنی چاہے رشوت لے اور جتنے چاہے گھپلے کرے۔ مگر اختر بھائی اس قماش کے آدمی نہ تھے وہ صرف نذرانے سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ جس کی اجازت ریاستوں میں تھی اور یہ کھلا ہوا کاروبار تھا۔ ہاں یہ پتہ نہ چل سکا کہ حسن بانو کے اخراجات کس نے ادا کئے۔ اختر بھائی نے، گوکل پرساد رستوگی نے یا خود سربراہ کار صاحب نے۔ یہاں افسروں کی ایک سیکالوجی بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جب ڈپٹی کلکٹر صاحب یا کلکٹر صاحب کبھی کسی تحصیل کا دورہ کرتے ہیں تو یہ فرض کر کے چلتے ہیں کہ گیسٹ ہاؤس کا سارا خرچ تحصیلدار کو اٹھانا ہے۔ چنانچہ خوب اللّے تللّے خرچ کرتے ہیں۔ جو عیاش طبع ہوتے ہیں اُن کے دوسرے طرح کے شوق بھی ماتحتوں کو پورے کرنے پڑتے ہیں (معلوم نہیں اگر کوئی عورت افسر ہوتی ہوگی تو کیا کرنا ہوتا ہوگا؟) اور جب یہ افسر جانچ INSPECTION پوری کر کے واپس جانے لگتے ہیں تو محض اپنی دیانت داری دکھانے کے لئے اپنے ماتحت تحصیلدار سے اپنے ٹھہرنے اور کھانے پینے کے اخراجات کا حساب بھی طلب کرتے ہیں تاکہ وہ ادائیگی کر دیں۔ اور تین چار دن کے اخراجات سَو روپئے سے زیادہ نہیں ہوتے (آج کل کچھ زیادہ ہو جاتا ہوگا) جس کی افسر صاحب ادائیگی کرتے ہیں۔ اور رسید لے کر رخصت۔ جب کہ ان کے ٹھہرنے میں سادہ افسر پر بھی کئی سَو روپے خرچ آتے ہیں اور رنگین افسر؟ اس کا تو حساب ہی کیا۔ شراب سے لے کر کال گرل تک کا اندازہ کوئی بھی کر سکتا ہے۔ اب ہوشیار ماتحت، افسر پر اتنا خرچ کر کے کبھی کبھی لاکھوں کے وارے نیارے کر لیتا ہے اور ایماندار ماتحت ہر تیسرے یا چھٹے مہینے تبادلے کی مصیبت اٹھاتا ہے اور کبھی کبھی تو رشوت نہ لیتے ہوئے بھی رشوت کے کیس میں ملوّث ہو جاتا ہے۔

حسن بانو تیسرے دن بدایوں واپس چلی گئی اور اپنی یادوں کے نقوش، کم از کم مجھ پر چھوڑ گئی۔ اسی بلسی کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ایک انیکسی (ANNEXE) جیسی عمارت لمبی سی، کوٹھی کے دکھن میں بنی تھی۔ اس میں نواب چھمّن صاحب کے دو تین مصاحب رہا کرتے

www.taemeernews.com

تھے۔ اب ایک قطعے میں ایک مُلّاجی تھے۔ اگرچہ اس کوٹھی میں کوئی مسجد تھی نہ کوئی عبادت خانہ۔ ملّاجی کو ایک دوسرا کام سپرد کیا گیا تھا۔ نواب حیدر علی خاں نے کبھی یورپ کا سفر کیا تھا۔ انھیں مصوّری سے خاص شغف تھا۔ اٹلی کے شہر فلورنس میں کسی نے انھیں رسولِ اکرم کی ایک آئیل پینٹنگ دکھائی۔ یہ تصویر ایک بسٹ تھی جو تقریباً قدِ آدم اونچی تھی۔ نواب حیدر علی خاں یہ تصویر دیکھتے ہی عقیدت سے اس کی صنّاعی پر لہلوٹ ہوگئے اور انیسویں صدی کے اواخر میں یہ پینٹنگ انھوں نے پچاس ہزار میں خریدلی۔ بڑے احترام سے اسے ہندوستان اور پھر ملسی لے آئے۔ اپنی کوٹھی میں ایک بہت بڑا کمرہ اس پینٹنگ کے لئے مخصوص کیا۔ اس میں ایک بڑا پالنا ڈالا گیا اور یہ تصویر اسی پالنے میں لیٹنے والے انداز میں لٹادی گئی۔ ماہ رجب اور ربیع الاوّل میں یہ پینٹنگ زیارت کے لئے نکالی جاتی اور غالباً گھر والے ہی اس کی زیارت کرتے ہوں گے۔ اس وقت ایک محفلِ میلاد بھی منعقد ہوتی۔ اس تصویر پر ہمہ وقت سفید رنگ کی ایک دبیز چادر پڑی رہتی تھی اور کمرہ ہر وقت مقفل۔ ملّاجی کا کام یہ تھا کہ وہ ہر شام مغرب کے وقت اگر بتی، لوبان اور بخور رکھ آتے۔ شمعیں روشن کرتے اور وہیں مغرب کی نماز ادا کرکے کمرہ پھر مقفل کرتے اور چلے جاتے۔ ایک دن میں نے ملّاجی سے تصویر کی زیارت کرانے کی تمنّا کی۔ مگر ملّاجی ٹال گئے۔ پھر میری بہن نے اختر بھائی سے تصویر کی زیارت کرنے کے لئے کہا۔ اور پھر ایک دن ہم لوگ نہا دھوکر تصویر کی زیارت کے لئے تیار ہوئے۔ اگر بتیاں، لوبان اور بخور جلائے گئے اور صلوات پڑھ کر ہم لوگوں نے ملّاجی کی مدد سے تصویر نیچے اتاری اور اس پر سے غلاف اتارا۔ یہ تصویر تقریباً چار فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی رہی ہوگی۔ ہلکے صندلیں اور گہرے سبزی مائل رنگوں سے تصویر بنائی گئی تھی۔ چہرہ بنانے میں صندلیں رنگ کا استعمال زیادہ کیا گیا تھا۔ زلفیں سیاہ اور جسم کے لباس پہ سبزی گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ چہرے کے نقوش تیکھے تھے اور چہرہ سُتا ہوا کتابی تھا۔ داڑھی نہ بہت لمبی تھی اور نہ بہت چھوٹی۔ داڑھی کے بال اوپر سے کچھ کم مگر نیچے آکر تراش ایسی تھی جیسے پتلی ہوتی چلی گئی ہو۔ بال نہ بہت گھنے نہ بہت چھدرے۔ مگر رُخِ مبارک پر نظر

www.taemeernews.com

پڑتے ہی خوف کے بجائے محبّت اور احترام کا جذبہ دیکھنے والوں کے دلوں میں بیدار ہوتا اور یہی جی چاہتا کہ بس یہ چہرۂ انور دیکھتے ہی رہیئے۔ ہم حیرت میں تھے اور ہمارے منھ سے صلوٰۃ و درود، غیر ارادی طور پر نکل رہے تھے۔ میری بہن جذبات سے مغلوب ہو کر رونے لگیں۔ مگر ہم لوگ محبّت اور حیرت کے درمیان مُہر بلَب تھے۔ آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو مجھ میں جیسے وہی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اب قارئین چاہے جس طرح اس کی تاویل کریں مگر یہی حقیقت ہے۔ تصویر میں عجب کیفیت تھی اور اس کا تجربہ وہیں ہو گیا کہ جب تصویر ڈھکنے کی بات آتی تو سب یہی کہتے کہ نہیں ابھی دیکھنے دیجئے۔ مصوّر جو بھی رہا ہو مجھے نہیں معلوم مگر اُسے آنحضرتؐ کے چہرے کی پوری تفصیلات معلوم تھیں۔ یہاں تک کہ پیشانی مبارک پر وہ سبز رگ بھی بہت ہلکے سبز رنگ سے ابھاری گئی تھی جو آنحضرتؐ کے ماتھے پر نمایاں رہتی تھی اور جس میں کبھی کبھی درد ہوتا تو آپؐ بے چین ہو جاتے تھے۔ اس بڑی تصویر پر چھوٹی تصویریں (MANIATURER) بھی رکھی تھیں۔ ملّا جی نے بتایا کہ یہ نواب چھمّن صاحب اور اُن کے بیٹے ننّہے خاں کی کوششیں ہیں۔ مگر ان میں وہ بات کہاں؟! بڑی تصویر بھی اصل کہاں رہی ہوگی۔ مگر مصوّر نے اس خیالی تصویر کو بھی مصوّری اور حقیقت کے کمال تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ تصویر کے چوکھٹوں پر اصلی سونے کا کام بنا ہوا تھا۔ مگر اس میں اس کا خیال رکھا گیا تھا کہ چوکھٹے کا رنگ، چہرۂ کتابی کے صندلیں رنگ پر غالب نہ آنے پائے۔ یہ سب تو اب میں اپنے چشمِ تصوّر کی بنیاد پر لکھ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے اس کی کیا تمیز تھی۔ آخر ملّا جی نے تصویر پر غلاف چڑھا کر اسی طرح پالنے میں لٹکا دیا۔ معلوم نہیں اب وہ تصویر کہاں ہوگی اور کس کے قبضے میں۔ کوٹھی کا کیا حال ہوگا؟ مگر اب یہ کون بتائے۔

بلسی اسٹیٹ کے وارث کہاں گئے؟ پاکستان چلے گئے یا ہندوستان ہی میں؟ کچھ معلوم نہیں۔ کوٹھی کی انیکسی ANNEXE میں صرف تین یا چار مکان تھے۔ یہ مکان بھی لق و دق تھے۔ ان میں الگ الگ تین خاندان رہتے تھے۔ ایک مکان غالباً خالی تھا۔ ایک میں ملّا جی اور ان کا خاندان رہتا تھا۔ ایک میں کوئی ٹھیکے دار صاحب اور تیسرے میں احمد جان نام

www.taemeernews.com

کے آدمی۔ احمد جان کے مکان میں ایک شاگرد پیشہ بھی تھا۔ جس میں ایک بیوہ بڑھیا رہتی تھی کبھی یہ بڑھیا بھی کسی مڈل کلاس گھرانے کی رہی ہو گی۔ اس کی ایک پوتی بھی تھی جو اسی کے ساتھ رہتی تھی اور جو بلسی کے کسی گرلس اسکول میں چوتھے یا پانچویں درجے میں پڑھتی تھی اور وہ انھیں گھروں میں چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی تھی اور سب لوگ ان کی کفالت بھی کر دیتے تھے۔ لڑکی کا نام انوری تھا۔ ہمارے یہاں بھی انوری اور اس کی دادی کبھی کبھی آنکلتیں۔ انوری کا سن مشکل سے دس سال کا رہا ہو گا مگر اس کے حالات نے اُسے نہایت پختہ کار اور ہوشیار بنا دیا تھا۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ تھا اور باتیں کرتے وقت اس کی آنکھوں میں ایک خاص پُر اسرار چمک ہوتی تھی۔ وہ سب کو سلام بھی ایک خاص انداز سے کرتی تھی۔ ماتھے پر داہنے ہاتھ کی انگلیاں اس وقت تک چپکائے رہتی جب تک کوئی جوابِ سلام نہ دیتا۔ میری بہن اس کی تمیز اور تہذیب کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتی تھیں۔ جب بھی آجاتی بغیر کہے میری بہن کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ مگر بڑے لئے دیئے انداز میں۔ میری بہن بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اکثر اس کو اپنے کپڑے دے دیا کرتیں اور انوری اس چھوٹی سی عمر میں ایسی سگھڑ ہو گئی تھی کہ وہ ان بڑے کپڑوں کو کاٹ کر اپنے جسم کے مطابق بنا لیتی۔ کبھی کبھی بہن ان کو جاتے وقت کچھ روپئے بھی بطور امداد دے دیا کرتیں۔ بہن کو انوری سے ایک سہارا یہ بھی تھا کہ اکثر جب ان کا ننھا بچہ بہت پریشان کرتا تو انوری بہن کے برابر پلنگ بچھا کر رات میں رہ بھی جاتی اور منّے کو بہلایا کرتی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ایسی سلیقہ مند لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ہو گی کہ پچاس برس کا زمانہ گزر گیا۔ مگر جس گھر میں بھی ہو گی اس نے اپنے سلیقے سے واقعی اُسے روشن کر رکھا ہو گا۔

ملّا جی کے گھر کا حال تو نہیں معلوم۔ بس انھیں بھینسیں پالنے کا شوق تھا اور وہ دودھ بیچتے تھے۔ ہمارے یہاں بھی دودھ بھجوا دیتے اور دام دینے پر بھی پیسے نہیں لیتے تھے۔ شاید اس کا سبب یہ بھی رہا ہو کہ کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں بہت گھاس ہوتی تھی۔ تمام ضلع دار جو بھی بلسی اسٹیٹ میں آتے اور کوٹھی میں رہتے سبھی کمپاؤنڈ کی گھاس بیچ دیا کرتے تھے۔ مگر

www.taemeernews.com

اختر بھائی نے گھاس نہیں بیچی اور اُسے ملّا جی کی بھینسوں کا چارہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ یہ بغیر پیسے کا دودھ اسی گھاس کا بدلہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہاں صرف ایک سیر دودھ کا خرچ تھا جو اس وقت بلسی میں دو آنے میں مل جاتا تھا۔ مگر خیر، دوسرا گھر ٹھیکے دار صاحب کا تھا اس گھر میں مَیں کبھی کبھی چلا جاتا تھا۔ ٹھیکے دار صاحب کا ایک بیٹا میری عمر کا سلیم نام کا تھا۔ اور دو بیٹیاں۔ ایک کا نام عشرتی اور دوسری کا قیصری۔ یہ خاندان بہت متوازن اور شریف تھا۔ سلیم کسی اسکول میں پڑھتا تھا اور اکثر میرے ساتھ بلسی قصبے سے خرید و فروخت کے لئے جاتا تھا۔ ہمارے یہاں میلاد شریف یا مجلس ہوتی تو یہ لوگ بڑی عقیدت سے شریک ہوتے۔ یہ لوگ حنفی مسلک کے ماننے والے تھے۔ عشرتی کی آواز بہت اچھی تھی اور جب وہ قصیدۂ میلادِ آنحضرتؐ ؎

کوثر سے وضو کر کے زمزم سے نہا ڈالیں ؛ پھر مولدِ حضرتؐ کے اوصاف سنا ڈالیں

پڑھتی تو ایک سماں بندھ جاتا۔ عشرتی کی رنگت سرخ سفید تھی اور جب وہ میلاد پڑھتی تو اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ ان تین چار گھروں میں میلاد کی محفلیں خوب ہوا کرتیں اور مجلس تو صرف ہمارے گھر میں ہی کبھی کبھار ہو جایا کرتی۔ سب لوگ بڑی محبت اور یگانگت سے رہتے تھے اور یہی ہم لوگوں کا ایک طرح سے محلّہ سا بن گیا تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے مسلمان گھروں میں جو خاندانی اور تہذیبی یگانگت تھی وہ دیکھنے کے قابل تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی ان میں رخنے بھی پڑ جاتے تھے۔ مگر ان کی صورت بہت کچھ وقتی اور مقامی ہوا کرتی۔ جیسے کبھی کبھی لکھنؤ میں شیعہ سنّی فسادات کا ہو جانا۔ اب اس میں انگریزوں کی سیاست بھی ہو سکتی ہے کچھ اودھ کے نوابوں اور شیوخ کی پرانی دشمنیاں بھی۔ اور کچھ مسلمانوں کی اپنی افتادِ طبع بھی۔

۱۰ر جولائی کو مجھن پور میں میرا اسکول کھلنے والا تھا۔ اس درمیان میں اختر بھائی کے والد اور ان کی والدہ بھی بلسی پہنچ گئے۔ اب مجھے واپس آنے کا بہانہ بھی مل گیا اور پھر میں ایدلپور واپس چلا آیا۔

www.taemeernews.com

کہاں سے ہم کہاں

جیسے اچانک کوئی اچھا خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ کھل جائے اور آدمی الف لیلیٰ کے ابوالحسن کی طرح کچھ دنوں تک اپنے ہوش میں نہ رہے۔ یہی صورت ایدل پور پہنچ کر میری ہوئی کہاں وہ بلسی کی کوٹھی، حسن پانو کی وہ تانیں، بدایوں کے پیڑے اور کہاں ایدل پور کا یہ کنج عزلت اور "کوردہ"۔ دیہات کی بے کیف زندگی۔ چھپّر کے ہر طرف مکان، گلیوں میں کیچڑ اور رات کو کاٹنے والے بڑے بڑے مچھر۔ غرض کہ کئی دن تک ایک بے کیفی کا عالم طاری رہا۔ اسی عالم میں اسکول جاتا رہا۔ مگر وہاں کی فضا بھی بدلی بدلی نظر آئی۔ اسکول، منجھن پور سے اٹھ کر "مرحلہ" کے چوراہے پر آبادی سے دور چلا آیا۔ "مرحلہ" مغلوں کے زمانے میں مسافروں کے دم لینے کی جگہ تھی مگر اب ویران ہو چکی تھی۔ میرے بچپن میں کچھ فقیر یہاں بیٹھے رہتے تھے اور آنے جانے والوں کو پانی پلاتے اور انھیں سے کچھ یافت ان فقیروں کو بھی ہو جاتی تھی۔ مگر اب یہ مرحلہ بالکل غیر آباد تھا۔ ہاں برسات کے دنوں میں کچھ خانہ بدوش یہاں آکر اپنا خیمہ ڈیرہ نصب کر دیتے تھے۔ اور برسات بھر اسی جگہ اپنی گزران کرتے۔ یہاں پڑاؤ کرنے کا ایک سبب اور بھی تھا۔ یہاں سے قریب اُس وقت ایک جنگل تھا۔ اس جنگل میں لومڑی، سیار اور گوہ (Wild Lizard) بکثرت پائے جاتے تھے۔ برسات کے دنوں میں جب ان جانوروں کے بلوں میں پانی بھر جاتا تو یہ نکل کر بھاگتے اور ان خانہ بدوشوں کا شکار ہوتے۔ ان کی کھالیں خانہ بدوش اتار کر بڑی قیمتوں میں بیچتے۔

نئے اودسا اسکول میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ کمل نین تیواری جی نے اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور ملٹری سروس جوائن کر لی۔ ٹھاکر رُدر پال سنگھ، فتح پور کے گورنمنٹ اسکول میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ اب اودسا اسکول میں دو ہائی اسکول پاس اساتذہ پڑھاتے آئے ہیں

www.taemeernews.com

جن کی لیاقت معلوم ؟ میرا دل اب اس اسکول سے اچٹنے لگا۔ ایک تو ایسی چمکدار زندگی کا تجربہ لے کر آیا تھا۔ دوسری طرف اُوگھڑ اساتذہ کی معیت، صحبت نا ملائم معلوم ہوئی۔ میں ڈرنے لگا کہ کہیں وہی کرارذالیم اسکول سا حشر نہ ہو۔ مگر وہ "گھاس چھیلنے" والا جملہ پھر بچھو کے ڈنک کی طرح کھڑا ہو جاتا۔ غرض کہ اسی کشمکش میں تھا کہ ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ اسکول کے وقفے کے دوران پانچویں درجے کی طرف جا نکلا۔ تختۂ سیاہ پر انگریزی میں جملے (Sentence) کی تعریف یوں لکھی تھی۔ A SENTENCE IS A SET OF WORDS.

یہ تعریف ایک استاد نے لکھی تھی اور بعد کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی اس مختصر تعریف پر بہت نازاں تھے کہ میں نے کتنی مختصر تعریف جملے کی تیار کی ہے۔ میں نے اس تعریف کو نامکمل سمجھا اور اس کے آگے مزید یوں بڑھا دیا WHICH MAKES A COMPLETE SENSE وقفے کے بعد جب کلاس لگا تو استاد کمرے میں آئے اور اپنی اس مایۂ ناز تعریف کے آگے یہ اضافہ دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے۔ پوچھا کہ یہ کس کی حرکت ہے؟ لڑکوں نے میرا نام بتا دیا۔ میں اپنے درجے میں پڑھ رہا تھا کہ چپراسی آیا اور مجھے بلا کر لے گیا۔ استاد نے مجھے قہر کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ DEFINITION تم نے لکھی ہے؟" میں نے اقرار کیا۔ استاد بگڑ کر بولے کہ جو تعریف میں نے لکھی تھی اس میں کیا غلطی تھی؟ کیا وہ مکمل تعریف نہیں ہے؟ میں اپنی شہری زندگی کے تجربے سے تو بیباک ہو ہی گیا تھا۔ میں نے استاد کی میز پر سے چاک اٹھائی اور بڑے اعتماد سے تختۂ سیاہ پر گیا اور اس طرح کے کچھ اُلٹے سیدھے (JUMBLED) الفاظ لکھے۔ GO CAN TANK JUNGLE BUCKET، اور استاد سے مخاطب ہو کر میں نے پوچھا۔ "کیا یہ سٹ آف ورڈس (SET OF WORDS) نہیں ہے؟ مگر کیا یہ جملہ SENTENCE ہے؟ استاد کی سٹی گم ہو گئی۔ ان کی مختصر تعریف پر جتنی انکی پذیرائی طلبا کے درمیان ہوئی تھی سب پر اوس پڑ گئی۔ مزید یہ کہ پورے کلاس کے سامنے وہ میرے سوال کا جواب نہ دے سکے۔ اب وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے بڑے زور سے گرجے۔ "تم کو میرے کلاس میں بغیر میری اجازت کے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تمہارے خلاف تادیبی کاروائی

www.taemeernews.com

کی جائے گی۔ نکل جاؤ (GET OUT)۔ یہ سب تو انھوں نے کیا مگر طلباء میں ان کی رتی اتر گئی۔ اسکول میں اس واقعے کا ہر طرف چرچا ہوا۔ چھوٹی جگہوں میں باتیں بڑی تیزی سے پھیلتی ہیں۔ اسکول کے سکریٹری منشی نانک سرن سنگھ تھے جو منجھن پور کے ایک سربرآوردہ وکیل بھی تھے۔ ان کا لڑکا بھی اسی کلاس میں پڑھتا تھا جس کلاس میں یہ واقعہ ہوا تھا۔ اس نے یہ واقعہ گھر جاکر اپنے باپ سے بیان کیا۔ نانک سرن سنگھ ایک پڑھے لکھے آدمی تھے اور بے حد معقول اور لبرل۔ وہ ایک دن اسکول آئے اور مجھے بلاکر اصل واقعہ دریافت کیا۔ میں نے جو بات تھی ان سے بیان کر دی۔ انھوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا مگر استاد کو الگ بلاکر بہت ڈانٹا۔ اس دن سے وہ استاد مجھ سے خفا رہنے لگے۔ پھر ایک دن انھوں نے مجھے دفتر میں بلایا۔ اسکالرز رجسٹر میرے سامنے نکال کر ڈال دیا اور کہا، تم نے اس رجسٹر میں اپنی تاریخ پیدائش بدل دی ہے۔ میں نے وہ رجسٹر دیکھا تک نہ تھا۔ پھر انھوں نے کہا دیکھو یہ تاریخ پیدائش میں OVER WRITING ہے۔ اور یہ تمھیں ہی ہو سکتے ہو۔ پھر ایک باضابطہ نوٹس میرے نام جاری کر دی۔ میں عجیب مشکلوں میں پھنس گیا۔ یہ بھی کہا کہ تمہارا کیس انسپکٹر آف اسکول کے پاس جائے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے میرا کیس واقعی سکریٹری کے پاس بھیج دیا اور ہر طرف مشہور کر دیا کہ عقیل نے جعل بنایا ہے، اب پتہ چلے گا۔ میں اسکول سے گھر آیا اور دوسرے دن الہ آباد روانہ ہو گیا۔ ایجوکیشن کے محکمے میں بھلا میرا کون تھا۔ یونیورسٹی میں اعجاز صاحب تھے جو میرے بھائی علی اصغر صاحب کے دوست تھے۔ اور چھکن میاں کے سسرالی عزیزوں میں سے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے ساری روداد بیان کی۔ انھوں نے اپنے ایک دوست عظیم الدین کو ایک خط مجھے لکھ کر دیا کہ تم ان سے مل لو۔ عظیم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول تھے۔ میں عظیم الدین صاحب سے دفتر میں ملا۔ انھوں نے تسلی دی اور کہا کہ رپورٹ آنے دو۔ اوّل تو وہ اسکول پرائیوٹ ہے۔ ہم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ رپورٹ ہم تک کیوں آئے گی۔ اور یہی ہوا۔ سکریٹری نے رپورٹ روک دی۔ مگر اودسا اسکول سے میرا جی کھٹا ہو گیا کہ معلوم نہیں وہ استاد آئندہ پھر میرے لئے کیا مسالہ تیار کر دیں۔ اب اعجاز صاحب نے رائے دی کہ تم الہ آباد کے کسی اسکول میں نام لکھا لو اور میرے ساتھ رہو۔ میں کشمکش میں پڑ گیا۔ دوسری مشکل

www.taemeernews.com

یہ کہ اعجاز صاحب کے بنگلے سے کوئی اسکول قریب نہ تھا اور نہ میرے پاس کوئی سائیکل تھی۔ اور سائیکل خریدنا میرے بس میں نہ تھا جو اس وقت چالیس روپئے میں آتی تھی۔

اگست ۱۹۴۴ء کی آخری تاریخیں تھیں جب میری بہن بلسی سے الہ آباد آئیں اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ بھائی اختر حسین کو راجہ ڈَیَہ کی اسٹیٹ میں جگہ مل گئی اور وہ مستقل طور پر الہ آباد میں اقامت پذیر ہو گئے۔ میں نے فوراً ماڈرن ہائی اسکول، الہ آباد میں داخلہ لے لیا اور آٹھویں درجے میں نام لکھا کر پڑھنے لگا۔ ماڈرن اسکول اس وقت دوسرے درجے کے اسکولوں میں تھا۔ مگر دو تین استاد یہاں بہت اچھے تھے جنہوں نے میری تعلیمی زندگی پر اچھا اثر ڈالا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ششماہی امتحان ہوا تو میں سب سے آگے تھا۔ انگریزی اور اردو میں میں نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اور سالانہ امتحان میں میں نے وہ دس روپیہ مہینہ کا وظیفہ بھی جیت لیا جو آٹھویں درجے میں اوّل آنے والے طالب علم کو اس وقت محکمۂ تعلیم کی طرف سے ملتا تھا۔ (آج کے لحاظ سے یہ دس روپئے دو ہزار روپیوں کے برابر ہوئے) اب میرا قیام محلہ چک میں پھر مستقل ہو گیا۔ جہاں علمی و ادبی ماحول کے ساتھ سخت مذہبی ماحول تھا۔ بلکہ ایک طرح سے علمی و ادبی دلچسپیاں بھی مذہب ہی کے راستے سے یہاں کے لوگوں میں پہنچی تھیں۔ مثال کے طور پر یہاں غالب اور اقبال کے بجائے انیس و دبیر پر باتیں ہوتیں۔ ملّا کاشی اور حسن کاشی کے فارسی میں آئمہ کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے۔ تیرہ رجب کی محفلیں حضرت علی کے یوم ولادت کی بڑے زور شور سے ہوتیں۔ محرّم میں مجلسوں کی شان ہی نرالی تھی (جو آج بھی باقی ہے) نہج البلاغہ اور حدیث کسا پڑھی جاتی اور محرّم میں تو ایک جشن کی صورت ہوتی۔ ایک بزرگ خادم حسین تھے جو مجھے بھی اکثر اپنے ساتھ شہر الہ آباد کی مجلسوں میں محرّم اور اربعین میں لے جاتے اور انھیں کی معیت میں میں نے شہر الہ آباد کے محلّوں میں اتنی مجلسوں میں شرکت کی ہے کہ آج بھی مجھے شہر الہ آباد کی تمام مجلسوں کی جگہیں اور ان کے اوقات یاد ہیں۔ خادم میاں (سب لوگ انھیں یہی کہتے تھے) ایسی محبت اور اتنے پیار سے ہم بچوں یا نیم جوانوں کو اپنے ساتھ مجلسوں میں لے جاتے کہ ان کا کہنا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ رسول پور کی مہندی ہو یا کٹرہ کے ٹومیاں

www.taemeernews.com

کے یہاں کا تابوت۔ وہ ہر جگہ شرکت کرتے اور ہم تقریباً ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا مزاج بنانے میں ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ جہاں صوفیہ کی خانقاہیں ہوتی ہیں وہاں گردوپیش کی دنیا تقریباً خانقاہی مزاج کے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ عقیدت نہ رکھنے والوں پر بھی وہاں کی نشست و برخاست، طور طریقوں، یہاں تک کہ بولنے میں جملوں کی ترتیب اور لفظیات سب اسی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں بھی چک کے امام باڑے والے ماحول سے متاثر ہونے لگا۔ اسکول میں عقلی اور توجیہی مزاج اور گھر میں چاروں طرف مذہبی ماحول جہاں روایت پرستی کچھ زیادہ حاوی تھی۔ ابھی میں اسی کشمکش میں تھا کہ مجھ پر ماڈرن اسکول کے دو اساتذہ کا اثر تیزی سے ہونے لگا۔ تعلیم نے میرے ذہن کے عقلی اور توجیہی دریچے کھولنے شروع کر دیئے۔ ایک استاد میرے انگریزی کے استاد پنڈت شیو پرساد پانڈے تھے اور دوسرے تاریخ کے استاد منشی جوالا پرساد جو شاعر بھی تھے اور سرخوش تخلص کرتے تھے۔ پانڈے جی اس دور کی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے استادوں میں سے تھے جو اپنے موضوع میں تو ماہر تھے ہی مگر جن کا نظریہ یہ بھی تھا کہ طلبا کو پڑھنے لکھنے کے ساتھ حالات زمانہ کی طرف بھی آنکھیں کھلی رکھنی چاہیئے۔ وہ اصلاً غازی پور یا شاید بلیا کے رہنے والے تھے۔ جہاں ہندوستانی سیاست کی لہر سب سے تیز تھی اور "ہندوستان چھوڑدو" تحریک میں یہ علاقے بہت آگے آگے رہ چکے تھے۔ پانڈے جی بڑے گمبھیر اور مُتفکّر قسم کے آدمی تھے۔ ان میں عام استادوں کی طرح لپ جھپ نہیں تھی۔ بڑی محنت اور تندہی سے انگریزی ادب اور انگریزی گرامر پڑھاتے تھے اگرچہ ان کے پڑھانے میں بڑی یکسانیت ہوتی کہ بعض اوقات طلبا کو نیند بھی آنے لگتی۔ مگر جو گوشِ ہوش سے سنتے انھیں اس میں علم کا گہراپن اور معلومات کا خزانہ ملتا۔ ان کی تدریس میں نہ اچھل کود (MANNERISM) ہوتی اور نہ آواز میں اتار چڑھاؤ۔ مگر ان کے علم سے پورا اسکول متاثر تھا۔ وہ دیکھنے میں تو کھدّر دھاری تھے مگر اندر سے بے حد ماڈرن۔ گاندھی جی کی اصول پرستی کے وہ قائل تھے پھر کیا تبدیلی آئی کہہ نہیں سکتا کہ رفتہ رفتہ وہ بائیں بازو کی سیاست کی طرف مڑتے گئے

www.taemeernews.com

یہاں تک کہ کمیونسٹ خیالات سے ان کی دلچسپی ہو گئی اور شاید کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی ہو گئے۔ چند طلبا پر اُن بائیں بازو کے خیالات (LEFTISM) کا خاصہ اثر ہوا۔ جن میں مان دھاتا سنگھ، اور راقم الحروف خاص تھے۔ مان دھاتا سنگھ نے بعد کو سیاست میں بڑی ترقی کی۔ وہ پہلے یو۔پی کے اساتذہ کے لیڈر رہے۔ پھر اسمبلی کے ممبر بھی ہو گئے۔ میری دلچسپی عملی سیاست سے نہیں، نظریاتی صورتوں سے تھی جو مجھے دھیرے دھیرے مارکسزم اور ترقی پسند ادب کی طرف لے گئی۔

منشی جوالا پرساد فنا فی العلم قسم کے انسان تھے۔ پڑھاتے تو وہ ہم لوگوں کو تاریخ تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ فارسی اور اردو ادب پر بھی اپنے لکچر کے درمیان گفتگو کرنے لگتے۔ جس دلچسپی سے وہ تاریخ پڑھاتے تھے اس دلچسپی سے تاریخ پڑھانے والا مجھے یونیورسٹی تک کوئی نہیں ملا۔ اگرچہ میرے استادوں میں ڈاکٹر ایشوری پرساد اور ڈاکٹر رام پرساد ترپاٹھی جیسے استاد بھی تھے۔ اور ڈاکٹر تاراچند بھی کبھی کبھی ہمارے کلاس یونیورسٹی میں لے لیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اساتذہ علم کا خزانہ تھے۔ مگر منشی جوالا پرساد جس طرح طلبا میں گھل مل کر اور طلبا میں اپنے موضوع سے دلچسپی پیدا کر کے پڑھاتے تھے اس طرح کا فن یونیورسٹی میں کسی کو نہیں آتا تھا۔ انگلستان کی تاریخ کے تو منشی جوالا پرساد ماہر تھے۔ معرکے کے تاریخی جملے اکثر اس طرح پیش کر دیتے جیسے تمام واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ الفرڈ دی گریٹ جب پڑھاتے تو DANES کے خلاف اس کا یہ جملہ بھی سناتے کہ اس نے کہا کہ اگر آج میں ان کو چوتھ (DANEGELT) دے دوں گا تو کل وہ پھر انگلینڈ پر حملہ کریں گے۔ جملہ تھا:-

"TO GIVE THEM MONEY IS TO INVITE THEM AGAIN"

یہ جملہ آج بھی اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ پڑھاتے وقت وہ فارسی تاریخوں کے اصل متن بھی فارسی میں سناتے جاتے تھے۔ افغانستان کی جنگ پہ بھیجتے ہوئے شاہجہاں نے داراشکوہ کو بلند اقبال کا لقب دیا۔ مگر غالباً عبدالحمید لاہوری

www.taemeernews.com

نے لکھا کہ "فدے اقبال مساعدت نہ کرد"۔ یا شیواجی کے مرنے کی خبر آئی تو شہنشاہ اورنگ زیب نے کہا، "کافر بہ جہنم رفت"۔ اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس سے شیواجی کے مرنے کی تاریخ بھی نکلتی ہے۔ یا جب پٹ دی ینگر PITT THE YOUNGER انگلینڈ کا وزیر اعظم تھا اس وقت انگریز کینیڈا اور جرمنی دونوں جگہ لڑ رہے تھے۔ پٹ نے جرمنی میں اپنی ساری قوت لگاتے ہوئے کہا کہ I WILL WIN CANADA IN GERMANY اور یہی ہوا۔ اسی طرح کے بہت سے دلچسپ جملے وہ سنایا کرتے جو آج بھی مجھے یاد ہیں۔ اپنے انگلستان کے سفر میں مجھے ان کے تاریخی جملوں اور واقعات کی تفصیلات نے بڑی مدد دی۔ میرا سفرنامہ لندن۔ او۔ لندن انھیں واقعات سے مزید دلچسپ ہوا۔

منشی جوالا پرساد کے پڑھانے کا انداز نرالا تھا۔ تاریخ پڑھاتے پڑھاتے بیچ میں کہیں رک جاتے اور کہتے NOW WE SHALL ENJOY اور ENJOYMENT یہ ہوتا کہ وہ نظیری یا عرفی کا کوئی شعر تختۂ سیاہ پر لکھ دیتے اور سب سے معنی پوچھتے اور قبل اس کے کہ کوئی معنی بیان کرتا وہ خود ہی معنی بیان کرتے لگتے اور پھر وہ شعر میں ایسی ایسی بارکیاں نکالتے کہ عقل حیران رہ جاتی کہ یہ تاریخ کے استاد ہیں یا فارسی کے۔ مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے تختۂ سیاہ پر نظیری کا ایک شعر لکھا ؎

اگر سرمہ برائے نور سازند ز خاک پائے بیجاپور سازند

پھر سرمہ، نور، خاک اور بیجاپور اور پھر نظیری پر وہ گفتگو کی کہ تاریخ کا کلاس، فارسی ادب کا کلاس بن گیا۔ پھر پلٹ کر بیجاپور کے ساتھ چاند سلطانہ، اکبر اور مغلوں کی اندرونی اور بیرونی پالیسی تک بات جا پہنچی۔ پھر شیواجی، اورنگ زیب، ٹیپو سلطان، جنرل آرتھر ویلزلی نظام سب کو لپیٹ لیا۔ جوالا پرساد جی، اردو کے شاعر بھی تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وہ سرخوش تخلص بھی کرتے تھے۔ مگر اُن کے پڑھنے کا عجیب انداز تھا۔ وہ پہلا مصرعہ تو بہت ٹھہر کر پڑھتے مگر دوسرا مصرعہ اتنی جلدی پڑھ جاتے جیسے بڑی عجلت میں ہوں اور بس یہ مصرعہ پڑھ کر چل دیں گے۔ ہم لوگ ان کے اس طرز ادائیگی کی نقلیں اتارتے تھے اور خوش

www.taemeernews.com

تھے۔ ان کے دو شعر ہم نے یاد کر لئے تھے۔

بشر کو زندگی بار گراں معلوم ہوتی ہے　　یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہا معلوم ہوتی ہے
محبت ہر رگ و پے میں دوا معلوم ہوتی ہے　　کہا بتلائیں ہم تم کو کہاں معلوم ہوتی ہے

ان کی شاعری تو بس یونہی برائے شعر گفتن تھی۔ مگر اردو ادب پر ان کی نظر گہری تھی۔ کلاس میں کبھی مصحفی، کبھی ثاقب اور کبھی جوش ملیح آبادی کے اشعار وجد میں آکر سنانے لگتے۔ ایک عجیب انداز تھا۔ شعر پڑھ کر وہ خود ہی خوش ہوتے اور اس کی پروا نہ کرتے کہ آپ ان کے ساتھ شریک ہیں یا نہیں۔ لباس ہمیشہ انگریزی پہنتے مگر کبھی ان کے لباس پر کلف استری طرح کی کوئی چیز نہ ہوتی۔ ٹائی کی گرہ عموماً ڈھیلی ہوتی مگر جوتے ضرور پالش سے چمکتے ہوتے۔ اکثر اپنے لباس کے لئے کہتے کہ "میں فیشن کا غلام نہیں، فیشن میرا غلام ہے۔" یہ ان کا بڑا مشہور جملہ تھا۔ یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ ان کا سیاسی نظریہ کیا ہے؟ اگرچہ اس زمانے میں ہر وقت کانگریس اور مسلم لیگ کی باتیں اور پاکستان یا تقسیم ہند کی باتیں ہوا کرتیں۔ مگر وہ اپنی دھن میں رہتے اور کبھی ان موضوعات پر کلاس میں کوئی بات نہ کرتے۔ اس زمانے میں آئے دن طلبا اسٹرائک کیا کرتے۔ کبھی I.N.A ڈے ہے تو کبھی ڈائرکٹ ایکشن ڈے ہے۔ مگر وہ اپنا پڑھانے میں غرق رہتے۔ اگر لڑکے ان کے کلاس میں اسٹرائک کرانے کے لئے گھس آتے تو وہ ڈسٹر اور چاک اٹھا کر آفس میں جا کر بیٹھ جاتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتے۔ میں نے کیا کسی نے بھی انھیں ہندو مسلم پالٹکس پر کبھی باتیں کرتے نہیں سنا۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی بڑی عزت کرتے تھے اور انھیں بہ حیثیت دانشور پیش کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کے بڑے قائل تھے۔ ان کی ایک پہچان اور تھی اور وہ یہ کہ ہر دو چار جملوں کے بعد THAT'S GOOD VERY GOOD ضرور کہتے۔ کلاس میں کبھی ان کو بیٹھ کر پڑھاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا بلکہ "چلنا چلنا مدام چلنا" جیسے ان کا شعار تھا۔ کلاس میں ہمہ وقت ٹہلتے رہتے۔ وہ زمانہ انگریزی کا تھا۔ تاریخ بھی وہ صرف انگریزی میں پڑھاتے اور ہم لوگ جوابات بھی انگریزی ہی میں لکھتے تھے۔ ہر طالب علم پر ان کی نظر رہتی۔ مگر کبھی کسی کی نہ سرزنش کرتے اور نہ کسی کو منہ

www.taemeernews.com

لگاتے۔ ان کے لئے طالب علم صرف طالب علم ہوتا اور بس۔ وہ تاریخ، نوٹس وغیرہ لے کر نہیں پڑھاتے تھے۔ مدتوں سے پڑھاتے پڑھاتے سب کچھ زبانی یاد ہو گیا تھا۔ مگر یہ ضرور چاہتے تھے کہ طلبا، جو کچھ وہ پڑھاتے ہیں اسے نوٹ کرتے جائیں۔ پوائنٹ کی شکل میں ہی سہی۔ ایک دن سب نوٹ کر رہے تھے۔ ایک طالب علم محمود جسے ہم لوگ مذاق میں "گھگھر" بھی کہا کرتے، ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جوالا پرساد جی نے اس سے پوچھا، "تم کیوں نوٹ نہیں کرتے" طالب علم نے جواب دیا کہ میرے پاس یہ نوٹس پارسال کے لکھے ہوئے ہیں (لڑکا ایک سال کا فیل شدہ، FAILURED تھا) جوالا پرساد جی نے فوراً کہا "اگر پارسال والے نوٹس کام آتے تو تم پاس نہ ہو گئے ہوتے۔" سادگی سے یہ کہہ کر وہ پھر پڑھانے لگے۔ ایسے استاد اب کہاں ہوتے ہیں؟ اب میر کا شعر پڑھئے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ۔۔۔ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اور اب آگے بڑھئے۔

اسی زمانے میں ایک قدرے سنکی طالب علم ادبی دلچسپیوں کے باعث میرے قریب آیا۔ جس نے آگے چل کر دنیائے شاعری میں بڑا نام کمایا۔ یہ تھے سید مصطفےٰ حسین زیدی جو بعد کو تیغ الہ آبادی اور پھر پاکستان میں مصطفےٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے تیغ مجھ سے ایک سال آگے تھے یعنی جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، اس وقت وہ ہائی اسکول میں تھے۔ تیغ بے حد جھکّی اور سنکی قسم کے آدمی تھے۔ میری اور ان کی دوستی کی بنیاد اُردو ادب۔ خصوصاً نئے اردو ادب سے استوار ہوئی۔ پھر لوکل قسم کے مشاعرے بھی اس بندھن کو مضبوط کرتے گئے۔ تیغ کی جھک اور ہر دوسرے تیسرے آئے دن کا جھگڑا اور ناراضی نے ان کو اسی ماڈرن اسکول میں ایک .... (NICK-NAME) دیا۔ اور یہ بدنام "بگڑ" تھا۔ "بگڑ" لفظ کی وضاحت تو مشکل ہے مگر یوں سمجھئے کہ وہ جو کسی کی نہ مانے، نہ پرواکرے، نہ کسی اصولوں کا قائل ہو۔ نہ کسی ضابطۂ حیات پر عمل کرے۔ بے حد جھگڑالو اور سنکی سو لچر ٹائپ۔ مگر اس لفظ میں نفرت

www.taemeernews.com

نہیں بلکہ محبت ہے۔ اور ایک طرح سے درگزر کرنے کا خیال بھی۔ یہ صورت مصطفیٰ زیدی کی اسکول ہی میں نہیں خود اس کے گھر میں بھی تھی۔ ناخن بے حد بڑھے ہوئے اور ان میں کالا میل جما ہوا۔ بال پیچھے کی طرف اتنے بڑھ جاتے کہ چوٹی گوندھنے کی حد تک جب پہنچنے لگتے اور اُن میں سے جوئیں ٹپکنے لگتیں (اس وقت تک بال بڑھانا مردوں کا فیشن نہ تھا) تو تیغ کے بھائی یا والد ان کو زبردستی پکڑ کر نائی کی دکان پر لے جاتے اور جب تک اصلاحِ گیسو، ہو جاتی وہ لوگ وہیں بیٹھے رہتے۔ اور جب اس حجامت کے بعد وہ اسکول آتے تو جیسے اُوز کتری ہوئی بھیڑ لگتے۔ ایک بغیر بریک کی سائیکل پر کھڑکھڑاتے ہوئے اسکول آتے اور اس قدر تیز چلاتے کہ اکثر پیدل چلنے والوں سے لڑ جاتے۔ اپنی اس حرکت پر کبھی کبھی وہ پیدل چلنے والوں سے پٹ بھی جاتے، مگر باز نہ آتے۔ ایک دن دیکھا کہ اپنی براؤن رنگ کی سینڈل پر سفید کھریا والی پالش چڑھائے چلے آرہے ہیں۔ "ارے بھئی یہ کیا؟" "بس میرا جی چاہا" کہہ کر کھوکھلی ہنسی ہنستے۔ تیغ اردو اور انگریزی میں تو بہت اچھے تھے مگر علم الحساب ان کے بس کا نہ تھا۔ انھیں گھر پر دو استاد ٹیوشن پڑھانے آتے۔ مولوی نور الحسن عرف مولوی منقی اُردو پڑھاتے اور مہاراج بہادر سریواستو، ارتھمیٹک (یہ دونوں استاد ماڈرن اسکول میں تھے)۔ مگر میتھمیٹکس MATHEMATICS میں پچاس نمبروں میں سے دس بارہ نمبر سے زیادہ امتحان میں انھیں نہ ملتے۔ ان کا مدِمقابل علی عباس نام کا ایک طالب علم تھا جو ہمیشہ ان کو ڈاؤن کر دیتا کیونکہ علم الحساب میں اس کا جواب نہ تھا۔ تیغ اس سے بہت چڑھتے تھے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ علی عباس نے ہائی اسکول امتیاز کے ساتھ فرسٹ ڈیویژن میں پاس کیا۔ اور تیغ کا ہائی اسکول میں سکنڈ ڈویژن آیا۔ علم الحساب میں وہ فیل ہوتے ہوتے بچے تھے۔ تیغ کے والد سید لخت حسنین ریٹائرڈ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر تھے۔ وہ بھی تیغ کو بہت سنبھالنے کی کوشش کرتے۔ مگر تیغ کسی کے بس کے نہ تھے۔

اسی زمانے میں تیغ نے اپنی شہرت کا ایک اور طریقہ سوچا۔ پرنسپل سے مل کر ایک مشاعرے کا پلان بنایا۔ ایک دن ایک چھپا ہوا کارڈ لے کر وہ میرے پاس آئے جس میں ایک

www.taemeernews.com

مشاعرے کا اعلان تھا۔ جس میں تیغ سکریٹری تھے اور مجھے انھوں نے اسسٹنٹ سکریٹری بنا دیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ شبنم تخلص بھی مجھے عطا کر دیا تھا۔ اسکول کے نوٹس بورڈ پر جیسے ہی یہ کارڈ اطلاعاً لگا، اسکول میں ہر طرف دھوم مچ گئی۔ سب طلبا مذاقاً کہتے پھرتے، "سنو بھائی، بگو، شاعر بن گیا۔ مشاعرہ کرا رہا ہے اور یہ عقیل کو اس نے کہاں پھنسا لیا؟ لیجئے وہ بھی شاعر ہو گئے۔" تیغ پتہ نہیں کہاں سے ایک دقیانوسی مصرعۂ طرح بھی لے آیا تھا جو اس میں درج تھا طرح کا مصرعہ تھا۔ عمر طاری ہے اختصار مگر انتظار ہے۔ اس زمانے میں مشاعرے زیادہ تر مقامی ہوا کرتے۔ جس کا الٰہ آباد میں بڑا رواج تھا۔ بڑے مشاعرے صرف مسلم بورڈنگ ہاؤس (کہیں کہیں محمڈن بورڈنگ ہاؤس بھی ملتا ہے) میں ہوا کرتے یا کسی رئیس کی کوٹھی پر۔ عوامی مشاعروں کا رواج نہ تھا۔ الٰہ آباد سے باہر کے شعرا میں جوش، جگر، احسان دانش، اور حفیظ جالندھری کا طوطی بول رہا تھا۔ جوش، مجاز اور ساغر نظامی کو میں نے نجی نشستوں خصوصاً آغا علی خاں رئیس دریا آباد کی نشستوں میں سنا تھا۔ جہاں سر تیغ بہادر سپرو، پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن اور بسمل الٰہ آبادی بھی ہوتے۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرے کی شان ہی الگ تھی جہاں صفی، ثاقب، عزیز اور جوش، جگر، اصغر، سبھی ہوتے۔ اس وقت آج کی طرح شعرا کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ صرف آنے جانے کا کرایہ تین فرسٹ کلاس کا ملا کرتا تھا قیام و طعام تو مہمانداری میں شامل ہی تھا۔ ہم لوگ بھلا اس کی استطاعت کہاں رکھتے تھے۔ مگر یہ مقامی مشاعرہ اچھا ہو گیا۔ اور ہم لوگوں کی محنت سوارت ہو گئی۔

ہائی اسکول کا امتحان ہوا تو تیغ سکنڈ ڈیویژن میں پاس ہوئے۔ ان کے گھر والے بہت مایوس ہوئے اور فیصلہ کیا کہ تیغ کو الٰہ آباد سے ہٹا دیا جائے۔ تیغ کے ایک بھائی سید احمد رضا کانپور میں انکم ٹیکس آفیسر تھے یا ٹریژری آفیسر۔ تیغ کے باپ نے انھیں وہیں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ اور تیغ کا داخلہ ایگریکلچر کالج کانپور میں ہو گیا اور وہ وہیں پڑھنے لگے۔

۱۹۴۶ء کے ہائی اسکول امتحان میں شرکت کے لئے میرا نمبر (Roll No.) آیا۔ ہم نے زوروں کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مارچ کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ میری آنکھوں میں اچانک

www.taemeernews.com

درد ہونے لگا۔ دو گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ایسا درد ہوتا کہ برداشت نہ ہوتا۔ دوا علاج کرتا رہا۔ مگر کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ خیال ہونے لگا کہ میں امتحان نہ دے سکوں گا۔ ڈویژن خراب ہو جائے گا اس لئے ڈراپ کر دینا چاہئے۔ اسی حیص بیص میں تھا کہ مارچ کا آخری ہفتہ آگیا اور اسی میں امتحان ہونا تھا۔ آخر فیصلہ کیا کہ امتحان دے دو، دیکھا جائے گا۔ اب صورت یہ تھی کہ خود تو پڑھ نہ سکتا تھا۔ کسی سے پڑھوا کر سنتا اور یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ ساجد علی جعفری نام کا ایک کھلنڈرا سالڑکا میرا ہم جماعت تھا۔ وہ اصلاً تو ایورگرین تھا مگر پڑھنے میں بھی ایسا برا نہ تھا۔ اس کے والد عاشق حسین میرے علی اصغر بھائی کے ساتھ ملازمت میں تھے اور وہ خود بھی مجھ سے مانوس تھا۔ ایک دن اس نے تجویز رکھی کہ اگر میں اس کے گھر منتقل ہو جاؤں تو وہ مجھے پڑھ کر سنائے گا اور اس طرح اس کی بھی تیاری ہو جائے گی۔ میں ساجد علی کے گھر منتقل ہو گیا۔ ہم لوگ رات میں جم کر پڑھتے۔ صورت یہ تھی کہ میں ساجد علی کو امپارٹنٹ (important) ابواب بتاتا جاتا اور وہ مجھے پڑھ کر سناتا جاتا۔ میں سُن کر یاد کر لیتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کا گھر بہت چھوٹا تھا اور وہ محلہ، گدھے والوں کا محلہ تھا۔ جب ہم رات کو زور زور پڑھتے ہوتے تو گدھوں کے جی میں جانے کیا آتی کہ سب یک آواز ہو کر پندرہ بیس منٹ تک رینکتے رہتے۔ چی پوں۔ چی پوں، اور تھوڑی دیر رک رک کر رات بھر مغازلے کرتے رہتے۔ بہر حال انھیں حالات میں امتحان سے گزرے۔ نتیجہ آیا تو ماڈرن اسکول کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تین طلبا فرسٹ کلاس پاس ہوئے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ ہماری یو۔ پی میں پوزیشن بھی تھی۔

ہندوستان ایک عجیب خلفشار کے دور سے گزر رہا تھا۔ کیبنٹ مشن آکر واپس جا چکا تھا نئے دن اسکولوں میں اسٹرائک ہوتی رہتی۔ لال قلعے میں I.N.A. کا مقدمہ چل رہا تھا اور پانڈے جی کی صحبتوں میں ہم تمام ملکی حالات سے باخبر ہوتے رہتے۔ آئی۔ این۔ اے کے مقدمے میں کیپٹن شاہنواز، سہگل، عبدالرشید اور ڈھلوں اور بہت سے فوجی جوانوں کی طرف سے جواہر لال نہرو وکیل کی حیثیت سے عدالت کے سامنے حاضر ہوئے۔ الہ آباد کی سڑکوں پر ہم

www.taemeernews.com

طلبا نے آئی۔ این۔ اے کی حمایت میں بڑے بڑے جلوس نکالے۔ اگرچہ عالمی جنگ مئی ۱۹۴۵ء میں جرمنی کے ہتھیار ڈال دینے پر ختم ہو گئی اور جو کچھ مشرق میں جاپان کی مہمات سے جنگ کا بقایا تھا اسے چھ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر امریکہ نے ختم کر دیا مگر ابھی جنگ کے اثرات باقی تھے۔ فوجی جوان اب بھی عزت و احترام سے دیکھے جاتے کہ یہ جنگ آزما لوگ ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس بیکاری کی فراوانی والے ملک میں کم از کم باکار تو ہیں۔ بازار پر جنگ کے اثرات حاوی تھے۔ حکومت جیسے تذبذب میں تھی کہ معلوم نہیں انگریزوں کو رہنا پڑے گا یا جانا ہی پڑے گا۔

ہر چیز تقریباً کنٹرول سے ملتی تھی۔ یہاں تک کہ کپڑے اور زندگی کی تقریباً ساری ضروریات پر کنٹرول تھا۔ گیہوں، الہ آباد میں کنٹرول سے ایک روپئے کا پانچ سیر بکنے لگا تھا۔ جب کسی کا کوئی عزیز لام پر سے واپس آتا تو اپنے عزیزوں کے لئے کچھ پنیر، مکھن اور مچھلی کے ڈبے وٹامن کی گولیاں چھوڑ جاتا۔ کچھ خاکی کپڑے بھی۔ کپڑا کم از کم الہ آباد شہر میں جنس نایاب تھا۔ کنٹرول میں بے حد معمولی کپڑے ملتے اور وہ بھی ایک نئے انداز سے یعنی پیمائش کے بجائے کپڑے والے انھیں تول کر وزن کے حساب سے بیچتے۔ گرم کپڑوں میں سے صرف ایک کوٹ کا خاکی رنگ کا کپڑا پرمٹ لینے کے بعد اس طرح ملتا کہ دکاندار دکان کے پٹ بند کئے رہتے۔ پہلے آپ کا پرمٹ اور دام لے لیتے پھر اندر سے ایک کوٹ کا کپڑا دراز سے دے دیتے۔ مگر یہ بھی بہت خوش قسمت لوگوں کو ہی ملتا تھا۔ ورنہ دکاندار کہہ دیتا کہ ابھی کپڑا نہیں آیا اور پھر اسے بلیک مارکٹ میں بیچ لیا کرتا۔ پھر یہ ہوا کہ اچانک ایک پیلے رنگ کا چمڑے کی طرح کا چیمڑا کپڑا بازار میں ہر طرف بھر گیا۔ یہ پیراشوٹ کا کپڑا تھا۔ یہی نائیلون کے کپڑے کی ابتدا تھی۔ لوگ اسے عام طور سے خرید کر قمیص بناتے اور عورتیں شلوار۔ یہ کپڑا پانچ آنے گز بکا کرتا۔ مگر جب بہت زیادہ تعداد میں یہ کپڑا مارکیٹ میں آ گیا تو ثقہ اور متمول حضرات اس کپڑے کو ذلیل نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر صرف رکشے والے اور قلی کباڑی قسم کے لوگ اسے اپنا تن ڈھاکنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ ایک نیم فوجی ملازمت شروع کی گئی جسے سوک گارڈ CIVIC GUARD کہتے تھے۔ چوراہوں پر پولیس کے بجائے سوک گارڈ ہی ٹریفک کنٹرول کرتے۔ پولیس والے سب فوجی

www.taemeernews.com

علاقوں میں چلے گئے۔ ان کے لئے حکومت نے ایک سلیٹی رنگ کا کپڑا بنوایا جسے ملیشیا (MILL T/A) کہتے تھے۔ یہ کپڑا عام طور سے مل جاتا تھا۔ یہ کپڑا نسبتاً سستا تھا اور آسانی سے مل جانے کے باعث عام آدمی اسی کو پہننے لگا۔

جنگ کا جب مکمل خاتمہ ہوگیا تو پہلی دفعہ یہ خبر عام ہوئی کہ انگلینڈ میں چرچیل الیکشن ہار گئے اور وہاں لیبر لیڈر مسٹر اٹلی ATTLEE پرائم منسٹر ہوگئے اور یہ بھی کہ ہندوستان میں اب عام انتخابات ہوں گے اور یہ طے کیا جائے گا کہ اگر ہندوستان کو آزاد کیا جائے تو کسے حکومت دی جائے۔ مسلم لیگ کو یا کانگریس کو۔ اور یہ بھی کہ ہندوستان کو تقسیم کرکے پاکستان بنا دیا جائے۔ یہ خیال بھی دھیرے دھیرے مضبوط ہو رہا تھا کہ اگر پاکستان بنا بھی دیا گیا تو ہندوستان میں ایک وفاقی نظام یا کنفیڈریشن کا نظام بنایا جائے گا اور دونوں مل کر پورے برصغیر کا نظام چلائیں گے۔ کم از کم ہم طلبا کے درمیان اسی طرح کی باتیں ہوا کرتی تھیں اس سے زیادہ کا ہمیں شعور بھی نہ تھا۔ ابھی ملک اسی حیص بیص میں تھا کہ چھٹ پٹ فسادات ہونے لگے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر ہندو مسلم کشیدگی ہو جاتی اور پھر فسادات ہونے لگتے ڈان اور امرت بازار پتریکا اپنے اپنے ڈھنگ کی خبریں چھاپتے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے میں بہت آگے جا چکی تھی۔ اس کے ترجمان ڈان میں معمولی فسادات کو بڑھا چڑھا کر چھاپا جاتا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کی جا سکیں۔ الہ آباد کے محلہ صمد آباد کے کنارے پر ایک گلزار بلڈنگ ہے۔ یہاں روز شام کو مسلم لیگ کے جلسے ہوتے اور تقاریر کے بعد اس طرح کے نعرے لگتے۔

"لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان"، "ماریں گے مر جائیں گے، پاکستان بنائیں گے"۔ "بٹ کلیجی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے"۔ "سینے پہ گولی کھائیں گے، پاکستان بنائیں گے"۔

مگر الہ آباد کے کانگریسی حلقے خاموش تھے۔ محمد علی پارک اور پرشوتم داس پارک میں جو کانگریس کی میٹنگیں ہوتیں ان میں متوازن تقریریں ہوتیں۔ ان میں مطالبۂ پاکستان کو فضول اور

www.taemeernews.com

مسلمانوں کے لئے بے فیض ثابت کیا جاتا۔ کم از کم یو۔ پی اور بہار کے مسلمانوں کے لئے۔ مسلمانوں کا بھی ایک خاص طبقہ کانگریس کے ساتھ تھا۔ مگر اس میں پچھڑی ذات کے لوگ زیادہ تھے۔ پھر یہ نیشنلسٹ مسلم کہلانے لگے اور کانگریس میں ان کی ایک الگ شناخت بن گئی۔ یہ لوگ زیادہ تر مختار احمد انصاری، رفیع احمد قدوائی اور مولانا آزاد کی قیادت پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے الیکشن کے لئے اپنا ایک جھنڈا بھی الگ بنا لیا تھا جو کالی اور سفید پٹیوں سے بنایا گیا تھا۔ سبب کیا تھا کہہ نہیں سکتا۔ یہ لوگ سب کے سب کانگریس کے ساتھ تھے۔ شاید مسلم لیگ میں زیادہ تر قیادت اونچے طبقے (Elite Class) کے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور کانگریس مسلمانوں کے نچلے طبقے کو اس لئے اہمیت دیتی تھی کہ وہی تعداد میں بھی زیادہ تھے اور انھیں کے پاس ووٹ زیادہ تھے۔ کسی کو اس وقت اندازہ نہ تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ شاید مسلمان زیادہ دور تک دیکھ نہیں رہے تھے۔ بس ایک نشہ سا تھا یا جیسے جناح صاحب نے مسلمانوں کو طلسم بند کر رکھا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو تمام ہندوستان کے مسلمان، پاکستان نہیں جا سکیں گے۔ اسی زمانے میں پنڈت نہرو نے نیتاجی سبھاش چندر بوس کا سلام "جے ہند" اپنا لیا تھا اور اپنی میٹنگوں کے خاتمے پر "جے ہند" ضرور کہتے (جو آخر تک کہتے رہے) کانگریسی طلبا نے بھی اسے نعرہ بنا لیا۔ اس کے جواب میں مسلم لیگ نے "تقسیم ہند"، "جے ہند" کا جواب نکالا۔ جب کانگریسی طلبا آپس میں ملتے تو "جے ہند" ضرور کہتے۔ اور مسلم لیگ سے متاثر طلبا فوراً "تقسیم ہند" کہتے۔ دیواروں اور اسکول کی کھڑکی دروازوں پر دونوں نعرے ایک ساتھ اس وقت اکثر لکھے ہوئے ملتے۔ آج کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر مطالبۂ پاکستان منظور نہ ہوتا تو ہندوستان کی کیا صورت ہوتی؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ جن صوبوں میں مسلم اکثریت تھی وہاں مسلمانوں کی صوبائی حکومتیں بن جاتیں اور ایک وفاقی قسم کا ڈھانچہ چل سکتا تھا۔ معلوم نہیں پھر بھی اسی طرح کے ہنگامے ہوتے یا مل جل کر کسی طرح کام چلتا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ سمجھ لوگوں میں آجاتی۔ عارضی حکومت میں ایک تجربہ کیا تو گیا تھا مگر وہ قابل عمل شاید اس لئے نہ ہو سکا کہ پاکستان کا معاملہ یقیناً کھٹائی میں پڑ جاتا۔ اگر عارضی حکومت چل گئی

www.taemeernews.com

ہوتی۔ اور مسلم لیگ یہی نہیں چاہتی تھی۔ اُسے کسی صورت میں بھی پاکستان بنوانا تھا، ورنہ اس کی ساری مسلم سیاست زمیں بوس ہو جاتی۔ ہم طلبا بھلا ایسی گہری باتیں کیا سوچ سکتے تھے۔ صرف جو بیانات اخباروں میں چھپتے انھیں کوئے کر پورے ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کرنے لگتے یہ بھی تھا کہ اب طالب علم، طالب علم نہیں رہ گیا تھا بلکہ ہر ہندو کو کانگریسی اور ہر مسلمان کو مسلم لیگی سمجھا جانے لگا تھا۔ صرف پانڈے جی میں ہم لوگ توازن پاتے جو کبھی کبھی انگریزوں کی پالیسی اور صحیح سیاست سمجھانے کی کوشش کرتے اور اس تفرقے کو صرف انگریزوں کی ہندوستان نہ چھوڑنے کی چال بتاتے۔ مگر ان کی سنتا کون تھا۔ مسلمان طلبا انھیں کانگریسی سمجھتے اور ہندو انھیں مسلمانوں کا طرفدار۔ عجب افراتفری کا عالم تھا!

اب صحیح تاریخیں تو یاد نہیں۔ غالباً جولائی ۱۹۴۵ء میں جرمنی کی شکست اور خود سپردگی (Surrender) کے بعد ہی انگلینڈ میں عام انتخابات ہوئے اور حیرت کی بات یہ ہوئی کہ لارڈ ونسنٹ چرچل جس کا خاندان پشتوں سے تاج برطانیہ کے حواریوں میں تھا اور جو جنگ کے وزیر کی حیثیت سے برطانیہ کو جنگ کے بھنور سے کامیابی کے ساتھ باہر نکال لایا تھا، عام انتخابات میں وہ اور اس کی پارٹی الیکشن ہار گئی۔ اور کلیمنٹ اٹلی نام کا لیبر پارٹی کا سربراہ حکومت برطانیہ کا وزیر اعظم بن گیا۔ ہندوستان میں اٹلی کی جیت کی بڑی خوشیاں منائی گئیں کیونکہ چرچل ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اگر چرچل الیکشن جیت گیا ہوتا تو ہندوستان کو آزاد ہونے میں مزید دس پندرہ سال لگ جاتے۔ اٹلی نے آتے ہی مشرق میں انگریزی کلونیل پالیسی کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا اور یہ بھی کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر دے گا۔ ہم طلبا کیا، ہندوستان کے بہت کم سیاست داں یہ اندازہ کر سکے ہوں گے کہ نوآبادیات کو واگزار کرنے کی پالیسی برطانیہ کی جنگ سے تھکی ہوئی اور منتشر شدہ معاشی صورت حال کی وجہ سے وجود میں آئی تھی جس سے ان نوآبادیات کی آزادی کے مستقل تقاضے مستزاد ہو گئے۔ اس پالیسی کے تحت ایسی نوآبادیات کے علاقے بھی آزاد ہوئے جہاں کوئی تحریک آزادی نہیں چل رہی تھی۔ مثلاً سری لنکا (سیلون) یا برما (میانمار) ملایا، سنگاپور اور بورنیو، سراوک اور کچھ افریقہ کے ممالک بھی جنگ ختم

www.taemeernews.com

ہوئی تو فوجی اپنے گھروں کو ملٹری بوٹ، خاکی لباس اور چند خالی بھرے ڈبوں کے ساتھ لوٹنے لگے۔ ان کے افسروں کو تو فوج میں ضم کر لیا گیا۔ مگر عام سپاہی کو پنشن بھی نہ دی گئی کیونکہ یہ ایمرجنسی بھرتی میں آئے تھے۔ اور اب پھر ایک مرتبہ بیکاری کی لہر برصغیر میں آ گئی۔

○

جولائی ۱۹۴۶ء میں ماڈرن اسکول کے زیادہ تر طلبا نے الہ آباد کے مشہور کالج ایونگ کرسچین کالج میں داخلہ لیا۔ میں بھی انھیں طلبا میں سے ایک تھا۔ کالج میں داخلے کے بعد کالج کی پہلی اسمبلی ہوئی۔ دیکھا مصطفٰے زیدی بھی نئے طلبا میں شامل ہیں۔ ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ ایگریکلچر کالج کانپور میں مصطفٰے زیدی نہیں چل سکے۔ یہ نہ بتایا کہ فیل ہوئے یا چھوڑ کر چلے آئے۔ پہلی مرتبہ ہم نے انھیں قاعدے کا لباس Properly Dressed پہنے دیکھا۔ معلوم نہیں یہ کانپور کا اثر تھا یا کرسچین کالج الہ آباد کی ڈسپلن کی شہرت کا سبب یا یہ خیال کہ یہ کالج ایسا ہے جہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ اس لئے لڑکیوں کے استہزا سے بچنے کے لئے بھی لڑکے حتیٰ المقدور بہتر لباس پہن کر آتے تھے۔ شاید کچھ اس لئے بھی کہ لڑکیوں میں ان کا درخور قائم ہو۔ بہرحال ٹین ایج (Teen-age) کے جو بھی لٹکے ہو سکتے ہیں ایونگ کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں میں نمودار ہو جاتے تھے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ شاید یو۔پی میں یہ پہلا کالج تھا جہاں انٹر کلاس ہی میں لڑکے لڑکیاں بغیر کسی رکاوٹ کے مل سکتے تھے۔ جو بھی صورت رہی ہو، مصطفٰے زیدی المتخلص بہ تیغ الہ آبادی اپنی وضع قطع کے "بگڑپن" کو دھیرے دھیرے چھوڑ چکے تھے اور اب مناسب کپڑوں میں ملبوس ہو کر کالج پڑھنے آنے لگے۔ ان کے پاس اب ایک نئی سائیکل بھی تھی۔ فرصت کے اوقات میں ہمیں اپنے کچے پکے اشعار بھی سناتے۔ ایک بیاض بھی ان کے ہاتھ میں ہوا کرتی جس میں اپنے بھائی احمد رضا کی مذہبیت کے خلاف کئی نظمیں لکھے ہوئے تھے۔ کچھ جوش کے انداز کی بھی نظمیں تھیں اور کچھ بے تکی نظمیں بھی، جو ان کے خیال میں آزاد نظمیں تھیں اور ن۔م۔راشد کے انداز کی۔

ایونگ کرسچین کالج، عجیب و غریب کالج اس دور میں تھا۔ کالج کے منتظمین نے سمجھ بوجھ

www.taemeernews.com

کر اسے مخلوط تعلیم کا کالج بنایا تھا کہ یہاں داخلہ لینا ہر ماڈرن اور نوجوان طالب علم کے لئے ایک حسین خواب ہوا کرتا۔ یہ کالج امریکی امداد سے چلتا تھا اور شاید آج بھی اس کی مجلس منتظمہ میں کچھ اثر امریکہ کا ہے۔ یہ کالج الہ آباد شہر کے مشرقی کونے پر، دریائے جمنا کے بالکل کنارے پر بنا ہوا ہے۔ قریب ہی جمنا پر لوہے کا بہت لمبا ریلوے کا پل بنا ہوا ہے جس کے ذریعہ پورب ہندوستان دکن سے ملتا ہے۔ اس لئے اس پل پر سے گاڑیوں کی بڑی آؤ جاؤ رہتی ہے۔

ابتدا میں جب طلبا اس کالج میں آتے ہیں تو انھیں کلاس، گاڑیوں کے شور و غل سے گونجتے نظر آتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ وہ جب اس شور و غل کے عادی ہو جاتے ہیں تو ریلوں کی یہ آمد و رفت انھیں پریشان نہیں کرتی۔ کالج میں اس وقت کئی اچھے ہوسٹل تھے جن کی صفائی اور طلبا کا رہن سہن قابل دید تھا۔ پاکستان کے مشہور اردو کے نقاد ممتاز حسین نے اسی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہ پرسٹن ہال نام کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ (جیسا کہ انھوں نے خود بتایا جب وہ ۱۹۸۹ء میں مولانا آزاد سیمینار الہ آباد یونیورسٹی میں آئے تھے۔ وقت نکال کر وہ اس کالج کو دیکھنے بھی گئے اور بڑی دیر تک برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑے کالج کے در و بام دیکھتے رہے۔ افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے) پاکستان کے دوسرے مشہور دانشور سید سبط حسن بھی ایونگ کرسچین کالج کے طالب علم تھے۔ اسکاربرو (انگلستان) میں رہنے والے اردو کے مشہور دانشور اور افسانہ نگار، ڈاکٹر مصدّقہ کریم نے بھی اسی کالج سے تعلیم حاصل کی ہے وہ ٹرنر ہوسٹل میں رہا کرتے تھے اور میرے اوائیل کے ہم جماعت تھے۔ کرسچین کالج کا برادرانہ برتاؤ Brothger-Hood اپنی مثال آپ تھا۔ جب کہ الہ آباد کے ہر کالج میں ایک سیاسی تناؤ کی صورت طلبا کے درمیان رہتی تھی، ہم کرسچین کالج میں آپسی میل و محبت اور یگانگت کی باتیں کرتے تھے۔ شام کو یہاں کے ٹکر ہال (Tooker Hall) میں تہذیبی جلسے ہوتے ڈرامے ہوتے اور سب اس میں شریک ہوتے۔ خود ہوسٹل میں اتنے طلبا ہوا کرتے کہ رات میں بھی کالج پر ایک تہذیبی کالج کا گمان ہوتا تھا۔ لڑکیاں بھی رات کے ان جلسوں میں شرکت کرتیں اور بے حد میل جول کا ماحول رہتا تھا۔ انگریزی کے اساتذہ میں سے ہر سال

www.taemeernews.com

یا دوسرے سال امریکہ سے دو اُستاد امریکی لہجے میں ہمیں انگریزی پڑھانے آتے۔ اُردو کے استاد مولانا انوار الحق تھے۔ مولانا بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ اُردو جی لگا کر پڑھاتے۔ ان کے کلاس میں ایک تازگی اور زندہ دلی کا احساس ہوا کرتا۔ وہ نہ تو زاہدِ خشک تھے اور نہ رند مشرب بلکہ اپنے اردو کلاس کو زندہ دلی سے پڑھانے کی فکر کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے فرمودات پر تنقید کی اجازت بھی دیتے تھے۔ مگر آپ سے اگر انھیں اتفاق نہ ہوتا تو کہتے، "آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں اور میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ بیٹھ جائیے۔" اس پر کلاس تبسم ریز ہو جاتا۔ جب طلبا مولانا کو محض چھیڑنے کے لئے زیادہ سوالات کرتے تو فوراً کہتے، "لاحول پڑھیئے اور آگے بڑھیئے"! اور طلبا فوراً بحث روک کر سبق میں سے آگے پڑھنے لگتے۔ کورس میں میر انیس اور مرزا دبیر کے دو مرثیئے تھے۔ مرثیہ پڑھاتے وقت مولانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور اکثر مرثیئے میں مصائب کا حصہ چھوڑ دیتے اور کہتے کہ مجھ میں مصائب پڑھانے کی تاب نہیں ہے۔ جس نے بھی مولانا سے کرسچین کالج میں اردو یا فارسی پڑھی ہے وہ انھیں کبھی بھول نہیں سکتا۔ برسات میں اُمس کی گرمی ہوتی تو مولانا قمیص کے بغیر ہی شیروانی پہن کر چلے آتے۔ ایسی صورت میں شیروانی کے بٹن گلے تک بند رکھتے۔ ہم لوگ ان کی اس عادت سے واقف تھے۔ چنانچہ کہتے کہ کہ مولانا بڑی گرمی ہے۔ بٹن کھولیئے، تو مولانا بٹن کیسا، شیروانی کے ہک تک بند کر لیتے اور کہتے حضرت شیروانی پہننے کے بھی کچھ آداب ہیں اور آپ لوگ اُن آداب سے واقف نہیں۔ شیروانی کے سب بٹن بند ہونے چاہئیں۔ غرض کہ مولانا کالج کی دلچسپ ہستیوں میں سے تھے۔ ہم سب طلبا ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اُن کا تمام خاندان پاکستان منتقل ہوا تو مولانا بھی پاکستان چلے گئے۔ پھر نہ معلوم ہوا کہ ان پر پاکستان میں کیا گزری۔ یقیناً وہ کافی پریشان ہوئے ہوں گے کہ وہ نہ دنیا دار آدمی تھے اور نہ Wordly Wise بھلا پاکستان میں ایسا آدمی کتنے دنوں تک چلا ہو گا!

○

www.taemeernews.com

خبر تحیر عشق سن

محدثہ چک تو میں نے ہائی اسکول ہی کے درمیان یعنی ۱۹۴۵ء کی جولائی میں چھوڑ دیا تھا۔ اب میرا قیام دریا آباد کے مشہور رئیس آغا علی خاں کے یہاں ہو گیا۔ ان کی کوٹھی محمود منزل ایک لق و دق عمارت تھی جہاں باہر مہمان خانہ بھی تھا۔ دریا آباد پہنچنے کی صورت یہ ہوئی کہ میرے بہنوئی نے کورٹ آف وارڈس کی ملازمت چھوڑ کر راجہ ڈیہ کی ملازمت کر لی تھی مگر یہ ملازمت زیادہ دنوں چل نہ سکی۔ آخر انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور گنگا کے اُس پار اپنے زمینداری کے موضع ککرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ الہ آباد کے مکان میں ان کے دوسرے بھائی رہنے لگے۔ جب میں جولائی کے مہینے میں ایدلپور سے واپس آیا تو پھر قیام کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ایسے میں ایک دن اعجاز صاحب (پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی) سے میں نے اپنی مشکل بیان کی۔ انھوں نے کچھ دیر تامل کیا پھر تانگا منگایا اور مجھے ساتھ لے کر دریا آباد پہنچے اور آغا علی خاں صاحب سے میری مشکل بیان کر کے میرے قیام کی سفارش کی۔ آغا علی خاں رئیس ہونے کے ساتھ ساتھ علم دوست بھی تھے۔ ان کی کوٹھی میں آئے دن علمی ادبی جلسے ہوا کرتے۔ یہاں تک کہ سر تیج بہادر سپرو کے ساتھ مل کر انھوں نے الہ آباد کی مشہور انجمن روح ادب کی تاسیس دسمبر ۱۹۴۱ء میں باقاعدہ ڈھنگ سے کی۔ جب کہ انجمن کے جلسے ۱۹۳۶ء سے مقامی طور پر محمود منزل میں ہوا کرتے تھے۔ اس وقت اس کے سکریٹری سیّد واصف حسین ہوا کرتے تھے۔ آغا علی خاں صاحب نے میرے رہنے کا انتظام اپنے مہ خانے میں کرادیا۔ اور کچھ دنوں میں میں ان کے گھر کا ایک فرد جیسا بن گیا۔ اگر اعجاز صاحب نے ری مدد نہ کی ہوتی تو پھر میرا سلسلہ تعلیم ختم ہو سکتا تھا۔ کرسچین کالج، دریا آباد سے مشکل ے دو تین فرلانگ ہے اور یں دریا آباد سے پیدل چل کر کالج پہنچ جاتا۔

یہ وقت سیاسی طور پر بے حد بے یقینی کا دور تھا۔ ملک کی تقسیم کی کارروائیاں انگریز

www.taemeernews.com

کر رہے تھے۔ ہر طرف سے کشت و خون اور فرقہ وارانہ فساد کی خبریں آرہی تھیں کیبنٹ مشن جس کے ایک اہم رکن سر اسٹیفورڈ کرپس تھے۔ جسے برطانیہ کے نئے وزیر اعظم اٹلی نے کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرانے کے لئے مارچ ۱۹۴۶ء میں بھیجا تھا، وہ ناکامیاب ہو چکا تھا۔ شملہ کانفرنس تو پہلے ہی ناکامیاب ہو چکی تھی۔ غرض کہ ہر طرف بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ مسلم لیگ نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو "یوم سیاہ" اور ڈائرکٹ ایکشن منانے کا اعلان کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ملک میں ہر طرف فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ انگریزوں نے کانگریس اور مسلم لیگ میں کتنی کشیدگی پیدا کرنے کی مصالحت کرانے کے پردے میں کوشش کی ان سب کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بنگال، پنجاب اور بہار میں ہندو مسلم فسادات میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ کپورتھلہ ریاست جہاں مسلمانوں کی تقریباً اکثریت تھی، مسلمانوں سے خالی ہو گئی۔ یہی صورت امرتسر کی بھی ہوئی۔ بنگال کے مشرقی حصوں میں پنجاب کا حال سن کر زبردست دھماکہ ہوا جس کی بدترین شکل نواکھالی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کے اعلان پر کرسچین کالج کی سیکولر فضا بھی مسموم ہونے لگی؛ اور ۱۶ اگست کو جب دس بجے کالج لگا تو مسلم طلبا کی بہت بڑی تعداد برگد کے درخت والے میدان میں (برگد کا درخت Glory of the campus کہلاتا ہے) سیاہ بلّے لگا کر الگ کھڑی ہو گئی۔ مگر مصطفٰے زیدی، مصطفٰے کریم، میں اور ماڈرن اسکول کے اور دو چار طلبا جن پر مارکسزم کا اثر ہو چلا تھا اس گروہ میں شریک نہ ہوئے۔ ملک میں جو خلفشار ہو رہا تھا اس سے تو ہم سبھی متاثر تھے، مگر کسی پارٹی میں بغیر سمجھے بوجھے شامل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ پھر کالج کا ماحول روز بروز خراب ہونے لگا۔ آئے دن الٰہ آباد کی فضا میں تناؤ رہتا اور کالج بند ہو جاتا۔ اکتوبر میں سہ ماہی امتحان ہوا تو میری پوزیشن پھر اوّل تھی۔ مولانا نے مجھے اردو میں سو نمبروں میں سے اسّی دیئے تھے اور انگریزی میں بہتّر نمبر تھے محی الدین کی دوسری پوزیشن اور تیغ کی تیسری پوزیشن تھی۔ یہ بات تیغ کو بہت کھلی اور یہیں سے اس کی طبیعت میں میری طرف سے بگاڑ شروع ہوا۔ تیغ نے مجھ سے اور...

www.taemeernews.com

محی الدین نے سے ملنا ملانا چھوڑ دیا۔ اور اس نے سائنس کے طلبا سے دوستی بڑھائی۔ خصوصاً مصطفیٰ کریم اور بھیور گنپت سنگھ سے جو ٹرنر ہوسٹل میں رہتے تھے۔ وقفے کے اوقات (- Pe ہاف ٹائم) میں تیغ وہیں چلا جاتا اور انھیں لوگوں کو اپنی نظمیں سناتا اور اپنے ادبی کارناموں کا اظہار کرتا۔ تیغ میں ایک اور مزاجی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے سے کمزور طلبا سے خوب گھل مل جاتا اور ان پر اپنی لیاقت کا خوب رعب جماتا۔ کبھی کبھی پڑھنے پڑھانے میں ان کی مدد بھی کر دیتا۔ شاید اس سے اس کی انا کو تسکین ملتی ہوگی۔ آرٹس میں اس کے دوستوں میں سے ایک سید نوح رضوی تھے جو اس کے ہر وقت کے ساتھی اور رازدار بھی بن گئے۔ اب کلاس کے علاوہ شاذونادر ہی ہم لوگوں سے تیغ کی ملاقات ہوتی۔ اب وہ ہر وقت نوح کو لئے لئے اپنے ساتھ پھرا کرتا۔ آرٹس بلڈنگ کے آخری کونے پر کالج کی لائبریری اور ریڈنگ ہال تھا۔ میں اور محی الدین خالی اوقات میں ہوتے تو لائبریری میں بیٹھ کر نئی نئی کتابیں پڑھتے یا جمنا کے کنارے لگی ہوئی بنچوں پر بیٹھ کر جمنا کا نظارہ کرتے۔ ایک دن ہم لوگوں نے تیغ کو گرلس ہوسٹل کی طرف جاتے دیکھا۔ پہلے خیال ہوا کہ یونہی کسی کام سے گیا ہوگا۔ پھر وہ روز اسی وقتِ معینہ پر گرلس ہوسٹل کی طرف جاتا دکھائی پڑتا۔ اب ہم لوگوں کو فکر پیدا ہوئی کہ معاملہ کیا ہے؟ (ہم لوگ بھی تیغ کی دوادوش پر نظر رکھا کرتے) ایک دن نوح کو پکڑا کہ معاملہ کیا ہے؟ نوح نے یہ راز کھولا کہ سروج بھٹناگر نام کی ایک لڑکی ہوسٹل میں رہتی ہے۔ جناب اس سے عشق کرنے لگے ہیں۔ وہ سائنس کے کلاس میں پڑھتی ہے اور اسی وقت اس کا کلاس آف ہوتا ہے تو وہ لڑکی ہوسٹل آتی ہے۔ جنابِ محض اس کو دیکھنے کے لئے ہوسٹل کی طرف جاتے ہیں۔ اسی زمانے میں کالج میں ایک اور لڑکی کے چرچے تھے۔ نام تو اب اس کا یاد نہیں مگر لڑکے اسے وی۔ ٹو۔ بم کہتے تھے۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ تھی کہ اس لڑکی کا سینہ غیر معمولی طور پر ابھرا ہوا تھا۔ کچھ اسے دیکھ کر ایک فلم "من کی جیت" کا وہ گانا گانے لگتے جسے جوش صاحب نے لکھا تھا۔ وہی "ہو بچی" والا۔ وی۔ ٹو ایک بم تھا جسے ہٹلر نے زدوبار، انگلستان سے انگلینڈ پر پھینکنا شروع کیا تھا اور جس سے انگلینڈ میں تباہی مچ گئی تھی ذرا

www.taemeernews.com

طلبا کی فینٹیسی (Fantasy) دیکھئے کہ انھوں نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا! اسی طرح گلوریا ٹموتی، اپنی سادگی کے لئے مشہور تھی۔ مگر سنا کہ وہ ایک پالیٹکس کے لکچرر ڈبلو، پی۔ ڈائس کی منظورِ نظر تھی اور اس کے عشق کی کہانیاں بھی کالج میں گشت کرتی رہتی تھیں۔ ہم ٹین ایج کے لڑکوں کو ان کہانیوں میں بڑا مزہ آتا۔ گویا ہم لوگ بھی اسکینڈلس (Scandals) میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ویسے ہمارا گروپ، پڑھنے والوں کا گروپ مشہور تھا جس میں محی الدین، علی منیم عثمانی، امیر حسن مرحوم (جو بعد کو آئی۔ اے۔ ایس ہوگئے) اور ممبر پبلک سروس کمیشن ہو کر ریٹائر ہوئے) ساجد علی اور عقیل عباس نام کا ایک لڑکا تھا۔ مگر ہمیں بھی ایسی باتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ مگر بس "اپنا حصہ دور کا جلوہ" ہی تھا۔

تیغ کے مزاج میں اپنے متعلق اسکینڈل پھیلانے کی عجیب وغریب عادت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ کرے لوگ بھی ان باتوں یا حرکتوں کو جانیں تا کہ اس کا چرچا ہر محفل میں ہوتا رہے۔ اور اس کے متعلق غلط باتیں پھیلیں تو اور اچھا ہے۔ وہ شاید انسانوں کی یہ نفسیات خوب سمجھتا تھا کہ انسان خراب باتوں کو جلدی شہرت دیتے ہیں اور انھیں ایسی باتوں کے پھیلانے میں مزہ آتا ہے اور اپنے لئے وہ یہ ٹکنیک آخر وقت تک استعمال کرتا رہا۔ مجھ سے اور محی الدین سے وہ اب برائے نام ملتا۔ مگر یہ ضرور چاہتا تھا کہ اس کے تمام اسکینڈل ہم تک پہنچتے رہیں۔ تا کہ ہم لوگوں کو اس معاملے میں اپنی محرومی کا احساس ہوتا رہے کہ ہم کسی سے عشق نہ کر سکے اور تیغ اس میں بازی مار لے گیا۔ وہ شاعری تو کا نپور ہی سے کرتا ہوا آیا تھا۔ کرسچین کالج کی فضا میں اسے اور موقع ملا۔ اس زمانے میں تیغ نے اختر انصاری کے آبگینے کے انداز کے قطعات لکھنے شروع کئے۔ کالج کی ایک محفل میں سنائے بھی۔ مگر اس میں ایک نظم منصور معجز کی بھی اپنے نام سے پڑھ دی۔ کچھ دنوں میں کوئی آج کل رسالہ لایا جس میں یہ نظم چھپی تھی۔ تیغ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ہم سبھوں نے اس کے قطعات کی بڑی تعریف کی اور واقعی وہ اچھے قطعات تھے جو ہم ٹین ایج کے لڑکوں کے دلوں کو چھوتے تھے۔ مولانا انوار الحق، تیغ کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ تیغ سے ہم لوگوں کی کیا لڑائی تھی؟ سوا اس کے کہ ہم لوگوں نے

www.taemeernews.com

اچھے نمبر حاصل کر کے اس کی انا کو چوٹ پہنچائی تھی۔ مگر علم تو کسی کی میراث نہیں۔ اب وہ در پردہ امتحان کی تیاریاں کرتا، اور مولانا کے گھر پر بھی حاضری دیتا۔ اور بھی اساتذہ سے اس نے روابط قائم کئے اور علمی تیاری کے ساتھ ساتھ وہ سوشل بھی ہونے کی کوشش کرتا اور اساتذہ پر اچھا امپریشن ڈالنے کا انتظام کرتا تاکہ فرسٹ ایر کا امتحان ہوم اکزامینیشن ہوتا اور اچھے نمبروں کا ملنا بہت کچھ اساتذہ کی صوابدید پر ہوا کرتا۔ فرسٹ ایر کا سالانہ امتحان ہوا تو تیغ کی پوزیشن اوّل ہو گئی۔

جولائی میں کالج دوسرے سال کے لئے کھلا تو نورج ایک بیاض لے کر ہم لوگوں کو دکھانے آئے کہ دیکھو تیغ کا مجموعۂ کلام چھپ رہا ہے۔ مجموعے کا اس وقت تک کوئی نام نہیں تھا۔ یا کم از کم اس بیاض پر نہیں لکھا تھا۔ مگر حسب ذیل انتساب درج تھا:۔

"اس چاند کے نام۔ جو کالج کے افق پر طلوع ہوا اور جے پور کی وادیوں میں گم ہو گیا۔"

یہ چاند سُروج بھٹناگر تھی۔ سروج ایک سانولے رنگ کی میانہ قد لڑکی تھی۔ جس کا نکھار یقیناً جاذبِ نظر تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جو جوڑے کاجل کی لکیروں سے مزیّن رہتی تھیں اور اس کی ہنسی یقیناً دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ دوسرے سال وہ کالج نہیں لوٹی اور شاید جے پور ہی میں رہ گئی۔ اُسے قطعی خبر نہ تھی کہ تیغ صاحب اس سے عشق کرتے ہیں۔ انتساب میں اس کے نہ آنے ہی کا اشارہ ہے۔ دوسرا سال آیا تو ایک دن دیکھا کہ تیغ ایک پنجابی لڑکی کے ساتھ سائنس بلاک سے باتیں کرتا چلا آرہا ہے۔ لڑکی خاصی قبول صورت تھی۔ گداز جسم، کھلتی ہوئی رنگت اور بے جھجک طلباء سے مل کر اکثر باتیں کرتی نظر آتی تھی۔ ادب اور سیاست پر بھی باتیں کر لیتی۔ تیغ نے ہم لوگوں کو دیکھا مگر اس طرح پوز کیا جیسے وہ ہمیں دیکھ نہیں رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں اگنور (Ignore) کرنے کا تاثر دینا چاہتا ہو۔ لڑکی کا نام سرلا کپور تھا۔ سرلا ایک کھلے ذہن کی لڑکی تھی اور ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس عشق میں کتنی اصلیت تھی۔ پھر ایک دن "زنجیریں" کے نام سے تیغ کا پہلا مجموعہ چھپ کر آیا۔ اور اس پر انتساب میں لکھا تھا، "س" کے نام اور پھر ایک طویل نظم "جس کی ہر ہر ادا تھی کالج میں"۔

www.taemeernews.com

والی نظم۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب 'مصطفےٰ زیدی کی کہانی' میں لکھا ہے کہ یہ لڑکی سروج تھی۔ یہ صحیح ہے۔ مگر حامد بیگ کی یہ بات صحیح نہیں کہ لڑکی کا نام 'سروج بالا سرن' تھا۔ اس کا نام 'سروج بھٹنا گر' تھا۔ پھر دوسری کتاب میں ایک اور نظم" ایک ہم جماعت خاتون سے" لکھی۔ یہ نظم دوسرے مجموعے "روشنی" میں شامل ہے۔ جو ۱۹۴۹ء میں چھپا۔ یہ نظم سرلا کپور کے لئے تھی۔ "روشنی" کے مقدمے کی آخری سطریں یوں ہیں :۔

"اور جن ہستیوں کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے، وہ ملیا۔ سروج بھٹنا گر، سرلا کپور، پریم کمار جین اور میں خود۔"

مناسب ہوگا کہ پریم کمار جین کا بھی ذکر اسی جگہ کر دیا جائے۔ یہ لڑکا یونیورسٹی میں تیغ کا ہم جماعت تھا۔ پریم کمار جین ایک چھریرے بدن کا خوبصورت سا لڑکا تھا۔ جو بی۔ اے کلاس میں تیغ کے ساتھ پڑھتا تھا۔ وہ کسی اچھے افسر کا بیٹا تھا اور قطعی اس ڈھنگ کا نہ تھا جیسا کہ شاید تیغ اسے سمجھتے تھے مگر اسی زمانے میں تیغ پر فراق کے تتبع کا بھوت سوار ہوا۔ اس لئے پریم کمار جین کا اسکینڈل انھوں نے پھیلایا۔ پریم کمار جین انگریزی کے کلاس میں مہرو ترا صاحب کے سمینار سیکشن میں تھا جس کا کلاس انگلش ڈپارٹمنٹ کے نیچے کے کمرے میں لگتا تھا اور تیغ کا کلاس اوپر کی منزل میں ایک دوسرے استاد کے سیکشن میں تھا۔ اور تبادلہ ہو نہیں سکتا تھا۔ تیغ کسی ڈاکٹر سے سرٹیفکٹ لے آیا کہ انھیں قلبی تکلیف ہے اس لئے ان کا اوپر چڑھنا مناسب نہیں۔ اس سرٹیفکٹ کی مدد سے تیغ نے اپنا تبادلہ مہرو ترا صاحب کے کلاس میں نیچے کرالیا اور پریم کمار کے مقابل اس کلاس میں بیٹھ کر اُسے تکا کرتا تھا۔ جین کو کیا خبر کہ کیا معاملہ ہے۔ جب تیغ کی کتاب "روشنی" جین کے نام انتساب کے ساتھ چھپی تو دوستوں نے جین کو خبر کر دی۔ پریم کمار جین کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو آپس میں مار پیٹ کی نوبت آگئی۔ طلبا نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ جب 'روشنی' کا دوسرا ایڈیشن پاکستان سے چھپا جس پر کوئی تاریخ اشاعت درج نہیں ہے، تو تیغ نے پہلے ایڈیشن کا انتساب وغیرہ سب نکال دیا۔ اور وہ سطریں بھی جن میں "بے اعتنائیوں" کا تذکرہ تھا۔

www.taemeernews.com

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔ اس سے ایک دن قبل پاکستان وجود میں آیا۔ ۱۶ یا ۱۷ر اگست کو الہ آباد کے پرشوتم داس ٹنڈن پارک میں کانگریس کی ایک بڑی میٹنگ ہوئی جس میں پنڈت نہرو، تارا پنڈت (زینت تارہ سہگل) اور کیپٹن شاہ نواز نے تقریریں کیں۔ نہرو جی نے پاکستان کن حالات میں بنا اور اب ہندوستانیوں کو ملک کے اتحاد کے لئے کیا کرنا چاہئے، کے موضوع پر تقریر کی۔ جب تقریر ختم ہوئی تو پبلک "ہندوستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہوئی نکلی۔ پولیس کے بازوؤں پر ترنگے کی پٹیاں بندھی دیکھ کر عام آدمی کو جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ پولیس بھی ہندوستانی ہوگئی ہے؟ عام آدمی نے پولیس کو ہمیشہ برٹش راج کے لئے کام کرتے دیکھا تھا۔ یہ اچانک تبدیلی اس کے لئے ناقابل یقین سی تھی۔ لوگوں پر انگریزوں کا خوف ایسا تھا کہ جیسے یقین نہ آتا ہو کہ ہندوستان آزاد ہوگیا۔ جہلا میں یہ بھی مشہور ہوگیا کہ دلی میں نہرو جی راج گدی پر بیٹھ گئے ہیں اور اب ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت ہوگی اور پاکستان میں مسلمانوں کی۔

انتقالِ مکانی شروع ہوچکا تھا۔ بہت سے لوگ جو پہلے سے ذہن بنائے بیٹھے تھے کہ پاکستان چلے جائیں گے وہ پہلے ہی ہفتے میں پاکستان روانہ ہوگئے جب گاڑیاں ایک ہفتے کے لئے پاکستان اور ہندوستان دیکھنے کے لئے فری یعنی مفت میں چل رہی تھیں کہ جس کا جی چاہے لاہور یا بنگال گھوم آئے۔ اس وقت کسی کے ذہن میں شاید مار کاٹ کا تصور نہیں تھا۔ نہ ابھی تک الہ آباد جیسے شہر میں یا یو۔پی کے کسی شہر میں پنجاب کی مار کاٹ کی خبریں آرہی تھیں اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ عین تقسیم کے وقت عوام کے ذہن میں اور شاید حکومت کے ذہن میں بھی کسی طرح کے خلفشار کا تصور نہیں تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ پاکستان ہی نزاعی مسئلہ تھا اور جب پاکستان بن گیا تو اب سب لوگ امن چین سے رہیں گے۔ ورنہ ایک ہفتے کے لئے گاڑیاں مفت کیوں چلتیں؟ اور لوگ تفریحاً لاہور، کراچی یا بنگال کیوں جاتے؟ یا پاکستان زندہ باد" کے نعرے ہندوستان کی سرزمین پر کیوں لگائے جاتے؟ میرا خیال ہے کہ ماحول میں تناؤ اس وقت پیدا ہوا جب پنجاب سے لٹے پٹے قافلے ہندوستان آنا شروع ہوئے

www.taemeernews.com

اور ہندوستان خصوصاً پنجاب کی سرحد پار کرتے ہوئے مہاجرین اور شرنارتھیوں کی گاڑیوں پر حملے شروع ہوئے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ پہلی ہی کھیپ میں الہ آباد کا ایک خاندان عازم پاکستان ہوا۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا باپ بھی تھا جس کا جالندھر اور امرتسر کے درمیان کہیں ٹرین میں انتقال ہوگیا۔ گاڑی سے یہ پورا خاندان اُترا اور اسٹیشن ماسٹر نے جو ایک سکھ تھا ان لوگوں کو دفن میں مدد دی اور پھر دوسری گاڑی روک کر انھیں بٹھا کر لاہور روانہ کیا۔ اگرچہ یہ بات ناممکن سی تھی۔ مگر خیال ہوتا ہے کہ اگر لوگ اپنی اپنی جگہوں پہ جمے بیٹھے رہتے اور انتقال مکانی نہ ہوتا بلکہ جو جہاں رہ رہا تھا رہتا ہوتا تو شاید تقسیم کے وقت یہ خونریزی نہ ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقسیم کرنے اور ہونے والوں کے ذہن میں بھی نقلِ مکانی کا خیال اس طرح کا نہ تھا۔ ورنہ پہلے سے اس کا انتظام کیا جاتا۔ حکومتیں اس کے لئے تیار ہوتیں اور منتقل ہونے یا منتقل کرنے کا کام منظم ڈھنگ سے کیا جاتا۔ تقسیم کی تمام کارروائیوں میں جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں کسی موقعے پر نقلِ مکانی اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال پر کسی سیاسی لیڈر نے غور نہیں کیا تھا۔ نہ ہندوستان میں اور نہ پاکستان میں مگر خیر۔

انتقالِ مکانی شروع ہوا تو روز معلوم ہوتا کہ آج فلاں خاندان پاکستان جارہا ہے کل فلاں۔ لوگ روز اپنے عزیزوں کو پاکستان کے لئے گاڑیوں میں رخصت کرنے جاتے۔ کچھ ہندو بھی اپنے گہرے دوستوں کو رخصت کرنے آتے۔ اس آؤ جاؤ میں انسان کا مہم جویانہ مزاج بھی شامل تھا اور یہ بھی کہ پاکستان ایک ایل ڈوریڈو Eldorado ہے۔ اور وہاں پہنچ کر یو۔ پی کے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ابتدا میں پاکستان واقعی Eldorado بنا بھی۔ چند ہی دنوں کے بعد پنجاب، سرحد اور بہار سے قتل و غارت کی خبریں آنا شروع ہوگئیں۔ اور تقسیم ہند دھیرے دھیرے ایک بھیانک خواب بننے لگی۔ پھر نقل مکانی بھی تیز ہونے لگا۔ جو لوگ پاکستان پہنچ گئے تھے وہ اپنے عزیزوں کو خط لکھتے کہ فوراً چلے آؤ۔ یہاں بہت مزہ ہے۔ ملازمتیں بھی خوب ہیں اور ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائدادیں بھی۔ چنانچہ وہ لوگ جو یہاں

www.taemeernews.com

بھی کرائے کے مکانوں میں رہتے تھے اور روز مارتے کھاتے رہتے، سب پاکستان جانے کے لئے تیار ہو گئے اور جلد جلد اپنا چھوٹا موٹا سامان اپنے عزیزوں کو سونپ کر پاکستان جانے کی دھن میں ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ نوکری پیشہ تو پہلے ہی اپنے حق خود اختیاری کے تحت پاکستان میں اپنی ملازمت منتقل کر چکے تھے۔ مگر اب نقل مکانی کرنے والوں کے لئے پنجاب کا راستہ تقریباً بند ہو گیا تو لوگ بمبئی کا رخ کرنے لگے۔ جہاں سے بذریعہ پانی کے جہاز، کراچی روانہ ہونے لگے۔ الہ آباد کے بڑے بڑے مسلمان تاجر تو پہلے ہی بذریعہ ہوائی جہاز کراچی روانہ ہو چکے تھے۔ ریل گاڑیاں اور پانی کے جہاز صرف متوسط طبقے کے لئے تھے۔ ایک بات پر اور نظر ڈال لینی چاہئے۔ آخر تمام مہاجر صرف سندھ ہی کیوں گئے؟ پنجاب اور ملتان کے علاقے میں کیوں نہ ٹھہرے؟ اس میں کچھ تو شاید کراچی پہنچے ہوئے عزیزوں کے بلاوے کو بھی دخل تھا۔ اور کچھ امرتسر وغیرہ سے گزرنے میں سکھوں کا خوف بھی ہو سکتا تھا۔ راجستھان کا راستہ جو کھوکھراپار اور مونا باؤ کی طرف سے جاتا تھا اس پر کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا پھر یہ چھوٹا راستہ بھی تھا۔ یو۔ پی اور بہار والوں کے لئے ادھر سے کرایہ بھی سستا پڑتا تھا اور ادھر کے لوگ بھی سیدھے اور امن پسند تھے۔ کیونکہ پوری نقل مکانی میں اس راستے سے مہاجروں پر کوئی افتاد نہیں پڑی۔ نہ ہی بمبئی کے راستے سے کوئی خاص مارکاٹ کی خبر ملی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی نئی حکومت، مہاجروں کو پنجاب سے الگ ہی رکھنا چاہتی رہی ہو۔ ویسے ہی جیسے مغربی پنجاب اور سرحد سے آئے ہوئے لوگ مشرقی پنجاب جموں اور نواحی علاقوں میں بسنے کے بجائے دلی، لکھنؤ، اجمیر، الہ آباد اور یو پی کے دوسرے شہروں میں پھیلتے گئے۔ اگرچہ تہذیبی رشتے اور طور طریقے ان کے لئے پنجاب میں بہتر تھے۔

الہ آباد کے اسٹیشن پر پاکستان جانے والوں کا ایک ہجوم رہتا۔ پہلے تو کوئی پابندی نہ تھی پھر پاکستان جانے والوں کی تلاشیاں لی جانے لگیں۔ بہانہ یہ تھا کہ یہ لوگ اسلحے لے کر جاتے ہیں اور راستے میں فساد کر کے اسلحے استعمال کرتے ہیں۔ تلاشی کی ابتدا کانگریس کے والنیٹروں نے کی۔ جانے والوں کو جلی کٹی باتیں بھی سناتے اور جھگڑا بھی کرتے۔ جانے والے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیتے۔ پھر یہ کہ جانے والے سب طرح کا گرہستی کا سامان لے جاتے۔ چمٹا، توا کے ساتھ باورچی خانے

www.taemeernews.com

میں استعمال ہونے والی چھری چاقو بھی ان کے پاس ہوتے۔ جیسے کانگریس کے والنٹیر اسلحہ اور ہتھیار لے کر ان سے پہلے تو چھین لیتے۔ پھر کچھ دنوں بعد یہی چھری چاقو گرفتاری کے لئے اسلحے بن گئے غرض کہ الہ آباد کا اسٹیشن ان دنوں رات میں ایک میدان حشر ہوتا۔ ایک خاندان اپنا راشن کارڈ اور کچھ آٹا دال چاول ایک تھیلے میں رکھ کر لئے جا رہا تھا، شاید راستے کے لئے۔ والنٹیرز نے اسے بھی چھیننا شروع کیا کہ ہمارے ملک کا آٹا دال چاول پاکستان کیوں لئے جا رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ راستے میں کھانے کے لئے ہے۔ مگر والنٹیرس نے ایک نہ سُنی اور سب چھین لیا۔ مگر ابھی تک روپیہ پیسہ نہیں چھینتے تھے۔ والنٹیرڈوں کی زیادتیوں سے لوگ پریشان ہو گئے۔ آئے دن اسٹیشن پر جھگڑا ہوتا۔ اب حکومت نے والنٹیر ہٹا کر پولیس لگا دی۔ پولیس نے سامان تو نہیں چھینا۔ مگر ایک دوسری صورت کچھ دنوں بعد رونما ہوئی۔ پی۔ ایس۔ اے اور پولیس کے سپاہی جانے والوں کے سامان میں اپنے کارتوس رکھ دیتے اور پھر جانے والوں کو پکڑ کر اُن سے روپئے وصول کرتے۔ آخر مجسٹریٹ تعینات کئے گئے۔ تب جا کر اسٹیشن سے یہ صورتیں ختم ہوئیں۔

راستے میں گاڑیوں میں جھگڑے اور جھڑپیں ہونے لگیں۔ مسلم مسافروں کو چلتی گاڑی میں ڈبوں سے پھینک دیا جاتا۔ جب یہ صورتیں بہت بڑھیں تو حکومت نے ایک نئی صورت اختیار کی: ہر ٹرین کے آخیر میں دو تین ڈبے الگ سے لگا دیئے جاتے جس پر لکھا ہوتا "صرف مسلمانوں کے لئے" اور یہ عبارت انگریزی میں ہوا کرتی۔ اس وقت تک تمام سرکاری احکامات انگریزی ہی میں جاری ہوتے۔ اس صورت کو دیکھ کر الہ آباد کے ایک شاعر منظر شاہجہاں پوری نے ایک نظم 'شعور آزادی' لکھی جس میں ایک شعر تھا ؎

"اب ریل بھی ہندو ہوتی ہے، ڈبے بھی مسلماں ہوتے ہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر ہے خام شعورِ آزادی"

بلوائیوں کو اب اور آسانی ہو گئی۔ پہلے انھیں مسلمانوں کو ساری گاڑی میں ڈھونڈنا پڑتا تھا اور اب سب ایک ہی جگہ انھیں مل جاتے اور ان کا قتل عام ہونے لگتا۔ ان کی حفاظت کے لئے اگرچہ پولیس ساتھ ہوتی مگر ایسے موقعے پر وہ یا تو اِدھر اُدھر ہو جاتی یا چُپ چاپ یہ قتلِ عام

www.taemeernews.com

دیکھتی رہی۔ ابھی تک پولیس نے تو دمار نا شروع نہیں کیا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا۔ کہیں کہیں پولیس اسی احساس ذمہ داری سے ہوا میں فائر کر کے بلوائیوں کو بھگا بھی دیتی تھی۔ یو۔ پی میں اس وقت پنڈت گوبند ولبھ پنتھ کی حکومت تھی۔ وہ ان واقعات کی روک تھام کی کوئی فکر نہیں کرتے تھے۔ جیسے حکومت کا یہ مسئلہ ہی نہیں تھا۔ شاید وہ ہندی کے پروموشن میں فکرمند ہو گئے تھے۔ دفتروں میں کس طرح ہندی کا چلن ہو، یہ مسئلہ ان کے لئے زیادہ اہم تھا۔ انسانوں پر کیا بیت رہی ہے اس کی انھیں فکر نہ تھی۔ انھیں دنوں کرسچین کالج کے ایک جلسے میں جئے پرکاش نرائن آئے جنہوں نے ملکی حالات پر تشویش ظاہر کی اور لوگوں کو ضبط و تحمل سے کام لینے کی تلقین کی۔ مگر اسی درمیان پنت جی نے الہ آباد میں ایک تقریر کی جس میں صوبے کو بہتر بنانے کے پروگرام بتائے مگر اس صورت حال پر کوئی تبصرہ نہ کیا جو ملک کو تباہ کر رہی تھی۔ غرض کہ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ شہر کے بہت سے مسلمان جو عازم پاکستان تھے، سڑکوں پر اپنا سارا سامان لاکر جمع کر دیتے اور اُسے کھٹیری اَونے پونے خرید لیتے۔ خاص طور پر تانبے پیتل کے برتن۔ نئی بستی کی سڑک نوراللہ روڈ اور سبزی منڈی کی سڑکوں پر دونوں طرف برتنوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور خریدنے والے کتنے ہوتے؟ مسلمان انھیں اس لئے نہ خریدتے کہ کیا معلوم کب انھیں بھی پاکستان جانا ہی پڑ جائے۔ جو لوگ پاکستان پہنچ جاتے، اکثر ہندوستان کے مسلمان ان کی قسمت پر رشک کرتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے نوجوانوں کو پاکستان بھیج دیتے اور خود یہیں رہ جاتے کہ اپنی زمین جائداد بیچ کر بعد کو پاکستان جائیں گے۔ پھر یہ صورت ہوئی کہ کوئی کسی سے تذکرہ نہیں کرتا تھا اور جب لوگ صبح کو اٹھتے تو معلوم ہوتا کہ آپ کا پڑوسی اپنا گھر کسی کے سپرد کر کے یا خاموشی سے اَونے پونے بیچ کر پاکستان روانہ ہو گیا۔

تقسیم کے وقت الہ آباد میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ حالانکہ لاہور اور پیشاور و لائل پور کے شرنارتھی جب الہ آباد آئے تو انھوں نے یہاں بھی دلی، بھرت پور اور کپورتھلہ جیسی فسادی فضا پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر الہ آباد کے ہندو اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں الہ آباد میں کوئی جھگڑا یا کوئی اتھل پتھل اس طرح کی نہیں ہو پائی جیسی اوپر کی جگہوں میں ہوئی جس کا

www.taemeernews.com

تذکرہ کیا گیا) اس وقت ایک ہوا اور چلی۔ سکھوں کو چونکہ تلوار رکھنے کی اجازت ہوا کرتی اس لئے تلوار رکھنے کے شوق میں بہت سے ہندو گردواروں میں جاجا کر سکھ ہونے لگے۔ محلہ دریاآباد کے کئی نائی اور نچلے طبقے کے ہندو، سکھ ہو گئے۔ اب وہ صافہ باندھے اور تلوار لئے سڑکوں پر اکڑ کر چلتے دکھائی دیتے۔ ایک دن ایونگ کالج میں دیکھا کہ ایک ہندو دوست صافہ باندھے تلوار لئے کالج چلا آرہا ہے۔ مگر کالج کے پرنسپل نے اس سچ درج پر روک لگا دی، کہ کوئی ہتھیار لے کر کالج میں نہ آئے۔ دیہات میں بھی لوگ اسی لالچ میں سکھ ہونے لگے۔ غالباً برہمنوں نے حکومت کو اس طرف متوجہ کیا کہ ہندو دھرم کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ چنانچہ حکومت نے تلوار پر سے لائسنس ہٹا لیا۔ اب کوئی بھی تلوار رکھ سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ سود مند ثابت ہوا اور ہندوؤں نے سکھ ہونا چھوڑ دیا۔ تعجب ہوتا تھا کہ تلوار حاصل کرنے کے لالچ میں لوگ اپنا مذہب بدل رہے تھے؟ تلوار حاصل کرنے کا شوق شاید اس لئے بھی پیدا ہوا تھا کہ اس سے مسلمانوں کا قتل ہو گا۔ غلام قوموں کی دبی ہوئی نفسیات کیسے کیسے رُخ اختیار کرتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے!

ایونگ کرسچین کالج میں ایک طرح سے خزاں شروع ہو گئی تھی۔ روز معلوم ہوتا کہ فلاں دوست چلا گیا۔ مگر کالج کی تہذیب اور یگانگت کا مزاج نہیں بدلا۔ اساتذہ بھی نارمل تھے اور طلبا بھی۔ کم از کم کالج کیمپس میں تو اس طرح کا خیال کسی کو نہ آتا کہ کالج میں مار کاٹ شروع کی جائے۔ تیغ سے کبھی نقلِ مکانی یا پاکستان کے متعلق کچھ باتیں ہوتیں تو وہ سر جھٹک کر یہ باتیں کاٹ دیتا۔ جیسے وہ ان باتوں کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتا ہو۔ ایک دن وہ ایک نظم لکھ کر لایا۔ عنوان تھا "ایک ریفیوجی لڑکی" مگر اس نظم میں کہیں اس کے لٹے پٹے ہونے کا تذکرہ نہیں تھا۔ نہ حالات کا تجزیہ تھا۔ محض اس کے حسن اور لباس وغیرہ کی تعریف تھی۔ یہ نظم غالباً "پریت لڑی" یا "مستانہ جوگی" میں چھپی تھی۔ مگر تیغ کے کسی مجموعے میں یہ نظم شامل نہیں ہے۔ پھر غالباً جنوری کا مہینہ تھا کہ سکھوں کا ایک جلوس الہ آباد میں نکلا۔ کوتوالی کے سامنے زیادہ تر دکانیں مسلمانوں کی تھیں۔ یہاں پہنچ کر جلوس بے قابو ہو گیا۔ کچھ شرپسند سکھ مسلمانوں کی دکانیں توڑنے اور جلانے لگے۔ ایک جوتے کی دکان "سراج بوٹ ہاؤس" کے پٹرے وغیرہ توڑ کر کچھ جوتے نکال لئے گئے اور آگ

www.taemeernews.com

لگادی گئی کہ پولیس نے فائرنگ شروع کر دی اور کچھ سکھ زخمی ہوئے۔ مجمع تتر بتر ہو گیا اس طرح الہ آباد ایک بڑے حادثے سے بچ گیا۔ بس تھوڑی سی دکانیں ادھ جلی رہ گئیں کہ فائر بریگیڈ نے آکر آگ پر قابو پالیا۔

مارچ ۱۹۴۸ء تک الہ آباد کا ماحول بالکل نارمل ہو گیا۔ ہم لوگوں نے بڑے سکون سے امتحانات دیئے۔ نتیجہ آیا تو آرٹس فیکلٹی میں ہم تین فرسٹ ڈیویژن پاس ہوئے۔ مصطفٰے زیدی محی الدین اور راقم الحروف اور تینوں کی یو۔ پی میں پوزیشن تھی۔ تیغ ہم دونوں سے نمبروں کے لحاظ سے بہتر تھا۔ اس زمانے میں تیغ مجھ سے خاص طور پر چڑھا ہوا تھا۔ اس کی انقلابیت اور دہریے پن سے شہر کے لوگ الگ چڑھے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں اس کی وہ بدنام نظم غالباً 'الوارث' بمبئی میں چھپی جس کا عنوان تھا "انسان پیدا ہو گیا" پھر ایک نظم اس کے جواب میں ابوالمجاہد زاہد نے لکھی اور تیغ کو "اہرمن عصر نو" لکھا۔ الہ آباد کے ایک مشاعرے میں جب تیغ نے اپنی نظم "انسان پیدا ہو گیا" سنائی تو لوگوں نے آوازے کسے "شیطان پیدا ہو گیا"۔ کیونکہ اس نظم میں ایک بند قابل اعتراض تھا۔ (کتاب روشنی، مطبوعہ ۱۹۴۹ء ہندوستانی ایڈیشن میں یہ پوری نظم شائع ہوئی۔ میں یہ بند لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا) ہادی حسن نام کے ایک طالب علم نے کالج کے بورڈ پر ایک اوٹ پٹانگ قسم کی نظم تیغ کے خلاف لکھ کر لگادی جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

ع شاعر انقلاب ہیں بیٹا اپنے ابا کے باپ ہیں بیٹا

تیغ کو خیال گزرا کہ اس میں کہیں سے میرا بھی ہاتھ ہے اور وہ مجھ سے بے حد خفا ہو گیا۔ یہاں تک کہ بول چال بند ہو گئی۔

ہم یونیورسٹی پہنچے تو ہماری شہرت اور لڑائیاں بھی ہم سے پہلے یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پہنچ چکی تھیں۔ یونیورسٹی کی فضا اب کالج سے نسبتاً وسیع تھی۔ سارے ہندوستان سے اس وقت طلبا اس آکسفرڈ آف دی ایسٹ میں پڑھنے آتے تھے۔ یو۔ پی کے کم از کم پندرہ پوزیشن ہولڈر بی۔ اے سال اول کے کلاس میں موجود تھے۔ یونیورسٹی میں ملک گیر شہرت یافتہ اساتذہ اس وقت تعلیم

www.taemeernews.com

تھے، اور ان میں سے زیادہ تر ہمارے استاد تھے۔ انگریزی میں فراق گورکھپوری، ہرنبس رائے بچن جو بچن جی کے نام سے جانے جاتے۔ تاریخ میں ڈاکٹر ایشوری پرساد، ڈاکٹر تاراچند (جو کبھی کبھی کلاس لیتے کہ اب وہ یونیورسٹی میں ملازم نہ رہ گئے تھے) ڈاکٹر رام پرساد ترپاٹھی، اُردو میں ڈاکٹر اعجاز حسین، اکنامکس میں پروفیسر جمشید کیخسرو مہتا، فارسی میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور پروفیسر نعیم نعیم الرحمان۔ تاریخ کے پروفیسر سر شفاعت احمد خاں کا کچھ ہی دنوں پہلے شملہ میں قتل ہو چکا تھا۔ غرض کہ یونیورسٹی اس وقت اپنے عروج کی آخری منزل پر کھڑی تھی۔

یونیورسٹی پہنچ کر ہمارے مطالعے میں بھی بڑی وسعت آئی۔ ترقی پسند ادب بھی اپنے عروج کی آخری منزلوں میں تھا۔ مجھے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تحریریں یہیں جم کر پڑھنے کو ملیں۔ کرشن چندر، عصمت اور منٹو ہمارے پسندیدہ افسانہ نگار تھے۔ یہیں ہمیں بیدی کے افسانوں کا مجموعہ 'دانہ و دام'، 'گرہن'، خواجہ احمد عباس کے مجموعے 'زعفران کے پھول'، 'پاؤں میں پھول' اور 'میں کون ہوں؟' پڑھنے کو ملے۔ عصمت کی 'چوٹیں'، 'کلیاں' اور ان کا ناول 'ٹیڑھی لکیر' ہم کالج کے زمانے ہی میں پڑھ چکے تھے۔ ڈراما 'دھانی بانکیں' اور 'شیطان' یونیورسٹی میں پڑھا۔ احمد عباس کا افسانہ 'سردارجی' الہ آباد ہی کے ایک ہندی رسالے مایا میں چھپا جس پر الہ آباد کے سکھوں نے احتجاج کیا۔ انھیں میں سے کسی نے خواجہ احمد عباس پر الہ آباد کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا کہ اس افسانے میں سکھوں کی توہین کی گئی ہے۔ ہم لوگ مقدمے کی تاریخ پر کچہری جاتے اور اس افسانے پر بحثیں سنتے۔ خواجہ احمد عباس میور روڈ پر اسد اللہ کاظمی، ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اکثر شام کو ان سے ملنے جاتے۔ مگر وہ رامانند ساگر کے ناول "اور انسان مر گیا" پر مقدمہ لکھ کر ترقی پسندوں سے جھگڑا کر چکے تھے چنانچہ ترقی پسندوں کے اس وقت کے ترجمان "نیا ادب" میں خواجہ صاحب پر بھی اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے خاصی لے دے ہوئی تھی۔ تاہم خواجہ صاحب سو فی صد ترقی پسند تھے الٰہ آباد میں اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین زوروں پر تھی۔ یہاں اُردو ہندی کے ملے جلے اجلاس ہوتے جن میں بابا ناگرجن، رام بلاس شرما، سمترانندن پنت، پی۔ سی۔ گپت، امرت رائے،

www.taemeernews.com

سری کرشن داس، بھیرون پرساد گپت، دشینت کمار اور کملیشور (جو ابھی طالب علم تھے) ہوا کرتے۔ اُردو والوں کا پلّہ نسبتاً کمزور تھا پھر بھی فراق صاحب، ڈاکٹر اعجاز حسین، رام پرتاپ بہادر، شمشیر بہادر سنگھ (شمشیر اس وقت اُردو والوں ہی کے ساتھ تھے) دیوندر اسّر، نسیم انصاری، نافع رضوی، فاروق جنون، عابد کاظمی، تیغ اور راقم الحروف ان جلسوں میں شامل ہوتے۔ کبھی کبھی باہر سے وامق صاحب، احتشام حسین، مجاز، مسعود اختر جمال اور سردار جعفری آجاتے تو اردو کا پلّہ بھاری ہو جایا کرتا۔ مگر سب اُردو ہندی والے مل کر ترقی پسندی کے ادبی اور تہذیبی جلسوں کے لئے کام کرتے۔ اسی وقت تقسیم سے وابستہ فسادات پر مشتمل افسانوں اور نظموں کا ایک ریلا آیا۔ کرشن چندر کی کتاب "ہم وحشی ہیں" چھپی تو ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ لوگ 'پشاور ایکسپریس' اور 'امرتسر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' پڑھتے اور آنسوؤں سے روتے۔ خواجہ احمد عباس کا افسانہ 'سردار جی' بھی اسی قسم کا افسانہ تھا جس میں ایک سردار اپنے پڑوسی مسلمان کی جان بچانے میں سکھوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ساحر کا ایک شعر ہم لوگ پڑھتے اور سر دھنتے۔ شعر تھا۔

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو اب بھی ہے مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

کچھ ہی پہلے فراق صاحب کی رباعیات کا مجموعہ "روپ" شائع ہوا تھا۔ 'روپ' کا ترقی پسندوں میں بڑا چرچا تھا۔ فراق صاحب نے عجیب طرح سے 'روپ' کی رباعیاں لکھیں۔ جو یقیناً اردو شاعری میں احساسات کا ایک نیا تجربہ تھا۔ ان رباعیات کے لکھنے میں فراق صاحب نے ہندی اور سنسکرت شاعری کے مزاج سے بڑی مدد لی۔ ان کے لکھنے میں خاصی کھکھیڑ انھوں نے اٹھائی۔ کچھ اچھے ہندی اور سنسکرت کے طلبا کو جو ان کے شاگرد بھی تھے، یونیورسٹی سے پکڑ لاتے اور کالی داس کی شکنتلا، کمار سمبھو، رتو سنگھار پڑھواتے، مطلب سنتے اور جو خیال یا بیان انھیں پسند آجاتا اسے اپنے اشعار اور رباعیوں میں ڈھال لیتے۔ یہ باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ فراق صاحب سنسکرت بالکل نہیں جانتے تھے اور ہندی بھی نہ روانی سے پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ کچھ اردو والے بھی فراق صاحب کی ہندی اور سنسکرت ادب پر گفتگو سے

www.taemeernews.com

سمجھتے تھے کہ وہ ہندی اور سنسکرت کے پنڈت تھے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ آج تو فراق صاحب کے بہت سے جھوٹے سچے "جانوگو" پیدا ہو گئے ہیں جو فراق صاحب کی شاعری ان کے اطوار و عادات کے ماہر اپنے کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس صورت کے جاننے والے اب بہت کم لوگ الہ آباد میں رہ گئے ہیں۔ فراق صاحب کا تمام ہندی کا کام اس وقت محمود احمد ہنر، کرتے تھے جو ہندی کے اچھے جاننے والے تھے اور کچھ دنوں تک گاندھی جی کے ساتھ بھی کام کر چکے تھے

انگریزی کے شعبے میں چند بہت اچھے اساتذہ تھے جو اپنی علمی ادبی دلچسپیوں میں ایک خاص مہارت کے لئے مشہور تھے۔ ڈاکٹر دستور، شیکسپیئر کے المیوں کے اسپشلسٹ (ماہر) سمجھے جاتے اور مہرو ترا صاحب کو مکمل شیکسپیئر پر مہارت تھی۔ پروفیسر ستیش چند دیب ایک قاموسی قسم کے استاد تھے۔ ان کا اصل میدان تو ناول تھا مگر انھیں انگریزی ادب کی ہر شاخ پر عبور حاصل تھا یہی نہیں وہ شاہنامہ اور فارسی ادب پر بھی دسترس رکھتے تھے کہ ان کے والد (بقول خود ان کے) فارسی ادب کے استاد تھے۔ راقم الحروف نے جب مثنوی پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھنا شروع کیا تو ایک دن انگریزی کی بیانیہ شاعری پر ان سے مشورہ کرنے گیا۔ انھوں نے بیانیہ شاعری پر جو باتیں کیں وہ تو الگ رہیں، فارسی کی بیانیہ شاعری اور شاہنامے پر اس طرح باتیں کیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ فرانسیسی ادب پر بھی ان کی عمیق نظر تھی۔ وہ فرانسیسی روانی سے بول تو نہیں سکتے تھے مگر فرانسیسی لکھنے پڑھنے میں انھیں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی تھی۔ پروفیسر احتشام حسین بھی دیب صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ کسی فرانسیسی ادیب نے احتشام صاحب کو فرانسیسی زبان میں خط لکھا احتشام صاحب اسے دیب صاحب کے پاس لے کر گئے تو انھوں نے فر فر پڑھ کر مطلب سمجھا دیا۔ راقم الحروف جب اپنی کتاب "نئی علامت نگاری" لکھ رہا تھا تو دیب صاحب سے برابر مشورے کرتا۔ وہ فرانسیسی شعراء پر اسی طرح باتیں کرتے اور علامت نگاروں سے متعلق کتابیں بتاتے جیسے وہ انگریزی کے شعراء پر باتیں کرتے تھے۔ میں نے انھیں کے کہنے پر دو سال نام لکھا کر الہ آباد یونیورسٹی میں باقاعدہ فرانسیسی بھی اسی زمانے میں پڑھی۔ فراق صاحب یقیناً بڑے طباع اور زرخیز ذہن کے مالک تھے۔ مگر انگریزی ادب پر سوا رومانوی دور کے شعراء کے اور کسی

www.taemeernews.com

دَور پر فراق صاحب کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ وہ قاموسی ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ انھیں قاموسیت سے ایک طرح کی چڑھ تھی۔ رومانوی شعرا اور خود فراق صاحب کی شاعری میں ایک طرح کی مماثلت بھی تھی۔ اسی لئے وہ صرف رومانوی شعرا کو پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ہاپکنس کی شاعری پر ان سے کچھ باتیں کرنی چاہیں تو وہ بگڑ کر بولے، "ہاپکنس بھی کوئی شاعر ہے؟ صرف نادلٹی اور ہئیتی تجربوں سے کوئی اچھا شاعر ہو جاتا ہے؟ اس طرح تو میراجی بھی اُردو کے بڑے شاعر ہوئے،" اور پھر بولے، "جو خلیق لگانے کو شاعری کا موضوع بنائے اور اسے اپنا شاہکار سمجھے وہ شاعر ہے؟" (اس بیان پر میراجی کی نظم "لب جوئبارے" کی طرف اشارہ ہے) فراق صاحب کا ذہن بے حد ایجاد (Fertile) قسم کا تھا۔ وہ بہت سی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنی شاعری میں اس طرح سمو لیتے تھے کہ وہ انسانی زندگی کے تجربات کا نادر نمونہ معلوم ہونے لگتیں۔ یہ باتیں بھلا دیب صاحب کے بس میں کہاں تھیں۔ دیب صاحب ہر دَور کے انگریزی ادب پر معلومات کا ایک خزانہ تھے اور طلبا کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ۔ فراق صاحب ایک تخلیقی ذہن کے مالک تھے اور انگریزی شعرا کی بہت سی باتوں کو اردو شاعری میں اس طرح جذب کر لیتے کہ وہ خیال بس انھیں کا ہو جاتا۔ ان کے بہت سے مشہور اشعار پر انگریزی کے رومانوی شعرا کی پرچھائیاں ہیں۔ جب ہم اُن کا یہ مشہور شعر پڑھتے ہیں۔

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست   سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

تو اس میں کیٹس کے اس شعر کی گونج سنائی دیتی ہے۔

"Where to think is to be full of sorrow."

اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن کا تذکرہ میں فراق صاحب کے سلسلے میں کسی مضمون میں کر چکا ہوں۔

بی۔ اے کے امتحانات ہوئے۔ ہم نے پوری تیاری سے امتحانات میں شرکت کی۔ لیکن جب نتیجہ آیا تو محی الدین اور میں دونوں سکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ مارک شیٹ دیکھی

www.taemeernews.com

تو میرے دُو نمبر فرسٹ کلاس کے لئے انگریزی میں کم تھے اور تیغ فرسٹ ڈیویژن میں کامیاب ہوا۔ اس کے ۶۱ فی صد نمبر تھے۔ اس وقت بیک پیپر (Back Paper) کا رواج نہ تھا۔ تیغ نے انگریزی میں اچھے نمبر پائے تھے اور کا پیاں فراق صاحب کے پاس تھیں۔ مجھے اُردو میں سب سے زیادہ نمبر ملے۔ ایک سو پچاس نمبروں میں ایک سو اٹھائیس نمبر تھے۔ میں نے اس وقت تک کا بی۔ اے کا ریکارڈ توڑ دیا تھا اور یہ ریکارڈ پروفیسر احتشام حسین کا تھا۔ پھر یہ ریکارڈ ابھی پچھلے برسوں تک قائم تھا (اب معلوم نہیں کہ کیا صورت ہے کہ اب بی۔ اے تین سال کا کورس ہو گیا ہے) مجھے گولڈ مڈل ملا۔ جولائی آئی تو تیغ اور میں نے انگریزی میں ایم۔ اے جوائن کیا۔ اس سال عجب اتفاق ہوا کہ اردو کے کلاس میں کوئی داخلہ نہ ہوا۔ اردو پڑھنے والے سب پاکستان چلے جا رہے تھے اور جو بچ رہے تھے وہ یہ سمجھ کر اردو سے کنارہ کش ہو گئے کہ اب اردو کا کیا مستقبل رہ گیا ہے۔ پنڈت پنت اور جمہوریہ ہند کی حکومتوں نے اردو کے تمام راستے اتر پردیش میں بند کر دئے تھے جس سے اردو تعلیم و تعلّم کو کافی دھکا پہنچا تھا۔ اردو پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں دونوں کا تعلیمی سماج میں کوئی درخور نہ رہ گیا تھا۔ مجھے انگریزی پڑھتے ہوئے مشکل سے دو تین مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن میرے استاد اور رہنما ڈاکٹر اعجاز حسین آئے اور مجھے اُردو میں ایم۔ اے جوائن کرنے کو کہا۔ اس میں اردو کے شعبے کے اور کچھ اساتذہ کی بھی صلاح شامل تھی کہ شعبۂ اُردو اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ بغیر کسی داخلے کے خالی پڑا تھا۔ آخر اعجاز صاحب کے زور دینے پر مجبور ہو کر میں نے انگریزی چھوڑ دی اور اردو میں چلا آیا۔ اس واقعے کا ذکر اعجاز صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح حیات 'میری دنیا' میں بھی کیا ہے۔ اس وقت تک اگرچہ انگریز جا چکے تھے مگر انگریزی کی ہوا بندھی ہوئی تھی اور انگریزی کے طلبا اور اساتذہ سب انگریزی کے آگے دیسی زبانوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دیب صاحب نے میں نے بتایا تو وہ افسوس کرنے لگے۔ وہ اعجاز صاحب کے بھی استاد رہ چکے تھے۔ مگر اردو کی صورتِ حال کے پیشِ نظر خاموش رہے۔ یہ ستمبر ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔

ملکی حالات ابھی تک پُرسکون نہیں ہوئے تھے۔ ریاست حیدر آباد، جمہوریۂ ہند کے زیر نگیں

www.taemeernews.com

آچکی تھی۔ مگر کشمیر میں قبائلیوں کے حملے سے جنگ جاری تھی۔ کشمیر کے محاذ سے روز طرح طرح کی خبریں آیا کرتیں۔ بریگیڈیر عثمان، ہندوستان کی طرف سے محاذ سنبھالے ہوئے تھے۔ اور ہندوستانی فوج بڑی جگر داری سے قبائلیوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ابھی تک دونوں طرف سے نقل مکانی جاری تھی۔ اچانک ایک دن میرے ایک بھانجے باقر میاں (شاعر باقر نقوی لندن) میری قیام گاہ پر آئے اور بہن کا پیغام کہا کہ انھوں نے بلایا ہے۔ ہم لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ شام کو محلہ چیک گیا تو معلوم ہوا کہ کئی لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ ان میں میرے بہنوئی اور ان کا پورا گھر بھی ہے میری بہن بضد ہوئیں کہ میں بھی ان کے ساتھ پاکستان چلوں کہ اب میں بی۔ اے پاس کر چکا تھا۔ پاکستان میں مجھے اچھی ملازمت مل سکتی تھی۔ میں خاموش رہا دراصل تقسیم ہند نے مجھ پر بے حد خراب اثر ڈالا تھا۔ اور انسان کی اس آگ اور خون کی ہولی نے مجھے مذہب سے جیسے متنفر کر دیا تھا۔ اس طرح پاکستان کو میں نفرتوں سے وجود میں آیا ہوا ملک سمجھتا تھا۔ انسان کی اتنی تذلیل اور اس کے خون کی اتنی ارزانی، شاید سرزمین ہند پر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب ایک ہی ملک کے رہنے والے، ایک ہی ماحول اور تہذیب کے پروردہ جیسے جانوروں سے بھی بدتر ہو گئے تھے۔ پنجاب، لاہور، بہار، نواکھالی، امرت پور، کپورتھلہ، بمبئی، اور دلی میں جو کچھ ہوا وہ انسانیت کے نام پر ایک کلنک تھا۔ ہر طرف سے داستان در داستان ظلم اور مظلومیت کی کہانیاں آ رہی تھیں۔ اسی زمانے میں میں نے منٹو کی کہانی 'کھول دو' اور قدرت اللہ شہاب کی کہانی 'یا خدا' پڑھی تھی اور بیدی کی لاجونتی، کرشن چندر کی 'پشاور ایکسپریس' بھی۔ یہ سب پڑھ کر انسانوں کے ظلم کی داستانیں جیسے میرے سامنے متشکل ہو گئی تھیں۔ ہم ڈھونڈھ کر ایسی کہانیاں پڑھتے۔ اور انسان کی بے بسی اور سیاست دانوں کی نادانیوں پر آنسو بہاتے۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ میں نے اپنی بہن سے پاکستان جانے سے انکار کر دیا اور وہ لوگ کھوکھراپار کے راستے سے پاکستان چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان کی کیا درگت بنی یہ ایک الگ کہانی ہے۔

یونیورسٹی میں، کرسچین کالج کی طرح کیمپس کی فضا نہ تھی۔ طلبا اپنے پیریڈ کے پروگرام

www.taemeernews.com

سے آتے اور چلے جاتے۔ صرف کلاس ہی میں ملاقاتیں ہوتیں۔ ہم میں سے کچھ لائبریری میں بیٹھ کر کبھی کبھی اپنے موضوعات پر نوٹس تیار کرتے اور پھر گھر چلے آتے۔ ایم۔ اے اُردو کے کلاسوں میں میرا جی نہ لگتا۔ سچ بات یہ ہے کہ انگریزی کے درجوں کی سی نہ یہاں بلندی تھی نہ دیب صاحب، دستور صاحب اور فراق صاحب جیسے اساتذہ۔ پھر زبانوں اور موضوعات کی اپنی ایک تہذیب اور دنیا ہوتی ہے۔ الہ آباد کے انگریزی شعبے کی بھی ایک الگ علمی اور ادبی روایت رہ چکی تھی۔ یہاں اُردو کے چند مشاہیر بھی تعلیم پا چکے تھے۔ یہاں احمد علی اور محمد حسن عسکری جیسے لوگ بھی رہ چکے تھے اور شعبۂ اُردو میں سوا اعجاز صاحب کے کوئی قابل ذکر آدمی نہ تھا۔ دیب صاحب جیسا علم کا ذخیرہ بھلا کس کے پاس تھا۔ اور نہ فراق صاحب جیسی طباعی۔

آج، اَب جب غور کرتا ہوں تو اعجاز صاحب کا مجھے شعبۂ اُردو میں لے آنا کم از کم میرے حق میں اچھا ہی ہوا۔ ملک کے حالات ایسے بدل گئے تھے، تعصب کا ایسا زہر پھیل چکا تھا کہ اگر میرا فرسٹ ڈیویژن بھی انگریزی میں آتا تب بھی مجھے شعبۂ انگریزی میں جگہ نہ ملتی۔ الہ آباد یونیورسٹی اس معاملے میں سخت متعصب یونی ورسٹی ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے۔ آج تک یہاں سائنس کی فیکلٹی میں کوئی مسلمان کسی شعبے میں تقرر نہیں پا سکا (ایک مسلمان بڑی مقدمہ بازی کے بعد حال ہی میں ہوم سائنس میں داخل ہوا جس کے خلاف روز معرکہ آرائی رہا کرتی ہے) پھر انگریزی کا شعبہ اور مسلمان؟ یہ بات کہتے ہی لوگ ہنسنے لگتے تھے۔ مسلمانوں کے لئے صرف عربی فارسی اور اُردو ہی مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ ہاں تاریخ کے شعبے میں ایک مسلمان ضرور ہمیشہ رکھا گیا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ تاریخ اور خصوصاً عہد وسطیٰ یعنی مسلمانوں کے دَور کی تاریخ کے تقریباً تمام اصل مَتن فارسی میں ہیں۔ اس لئے اس متن سے مدد لینے کے لئے ایک مسلمان کا ہونا ضروری سمجھا گیا۔ اگرچہ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام مسلمان فارسی جانتے ہوں۔ تاہم ایک سے زیادہ کا تقرر کبھی یہاں نہیں کیا گیا۔ یہ روایت آج بھی چل رہی ہے۔ پھر تقریباً اٹھارہ، بیس برس کا ایک عرصہ ایسا بھی گزرا ہے۔ جب کوئی مسلمان شعبۂ تاریخ میں نہیں رہا۔ سب سے پہلے مسلمان سر شفاعت احمد خاں آئے جو مسلمان کم اور صاحب زیادہ تھے۔ پھر پانچ

www.taemeernews.com

سات برس کے وقفے کے بعد ڈاکٹر اظہر انصاری آئے۔ ان کے جانے کے بہت دنوں بعد میرے ایک شاگرد نعیم الرحمان فاروقی کا تقرر ہوا جو پھر بڑی مقدمہ بازیوں کے بعد عدالت کے فیصلے سے شعبے میں پروفیسر ہو پائے۔ ہاں تو بات شعبۂ انگریزی کی ہو رہی تھی۔ تاریخ کی بحث تو ضمنی آپڑی۔ انگریزی کا شعبہ جب سے قائم ہوا ہے ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۹ء میں کچھ دنوں کے لئے پروفیسر احمد علی کا تقرر اس شعبہ میں ہوا۔ یہ وہی پروفیسر احمد علی تھے جن کی کتاب Twilight of Delhi عالمی شہرت کی حامل رہی۔ پھر دوسرا تقرر امرناتھ جھا نے اپنے محبوب شاگرد اقبال احمد کا کیا۔ یہ کسی لیاقت کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ اقبال احمد کرکٹ اور ٹینس کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔ جھا صاحب اقبال احمد کے فین (Fan) بن گئے اور پھر ان کا تقرر بھی شعبۂ انگریزی میں کر دیا۔ اس وقت وائس چانسلر کا بہت پاور ہوا کرتا۔ نہ سلیکشن کمیٹی ہوتی اور نہ کسی طرح کی رکاوٹ۔ اقبال احمد بعد کو پاکستان اور پھر کینیڈا چلے گئے اور وہیں ان کا حال ہی میں انتقال ہو گیا۔ تیسرا تقرر میری بیٹی ڈاکٹر رکشاں کا تقریباً پچپن برس بعد ۱۹۸۳ء میں شعبۂ انگریزی میں ہوا جو اس کے تعلیمی ریکارڈ کی بنیاد پر ہوا۔ جس کا تقرر کرنے والے پروفیسر گوبند چند پانڈے، وائس چانسلر تھے، جو یونیورسٹی کے حلقے میں جن سنگھی رجحانات کے حامل بتائے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ خیر یہ سب تو ضمنی باتیں ہیں۔

شعبۂ اردو میں میری طبیعت نہ لگتی مگر لشتم پشتم پڑھتا رہا۔ کبھی میں جاتا تو استاد غائب کبھی استاد رہتا تو میں غائب۔ پھر تیغ سے یونہی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی کہ اب مجھ سے کچھ تعلقات بہتر ہو گئے تھے۔ شعبۂ اردو میں اعجاز صاحب نے ایک ادبی کلب، تھرس ڈے کلب کے نام سے قائم کر رکھا تھا۔ جس میں طلبا اور اساتذہ مقالے پڑھتے اور اس پر بحث و مباحثے ہوتے۔ اس میں تیغ بھی شامل ہوا کرتے۔ میں نے اپنا پہلا مقالہ تھرس ڈے کلب میں انگریزی میں پڑھا عنوان تھا:۔

"The real meaning of self in Iqbal's Poetry".

اس کی تحریک مجھے نکلسن کے ترجمے 'Secret of the Self' سے ہوئی تھی۔ اور اس لیے

www.taemeernews.com

کچھ روح اقبال مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں سے بھی اختلاف کیا گیا تھا اور اقبال سے بھی۔ بعد کو اعجاز صاحب بہت خفا ہوئے کہ یہ اردو کی محفل ہے یہاں مقالے اُردو میں پڑھنے چاہئے ہیں۔ تیغ نے کہا کہ اس مقالے میں احتشام حسین کے مقالے 'اقبال بہ حیثیت فلسفی اور شاعر' سے مدد لی گئی ہے جس کا حوالہ کہیں نہیں ہے۔ یہ بات محض اعتراض برائے اعتراض تھی جو کچھ بن پڑا میں نے اس کا جواب بھی دیا۔ اسی طرح شعبۂ اردو میں دن گزرتے گئے۔

شعبۂ اردو میں اس وقت اساتذہ کے ٹیوٹوریل (Tutorial) کلاسوں کے لئے اوپری منزل میں ایک پرانی بلڈنگ کے دو کمروں کو پارٹیشن کرکے چار حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک میں ڈاکٹر حفیظ سیّد صاحب، دوسرے میں مسیح الزماں صاحب اور تیسرے میں ڈاکٹر رفیق حسین صاحب کلاس لیتے تھے اور ایک کمرہ خالی تھا۔ یہ نسبتاً اندر کی طرف تھا اور ایک طرح کا گوشۂ تنہائی تھا۔ غالباً نومبر کا مہینہ تھا۔ وہ دن جمعرات کا تھا۔ ہم لوگ نیچے تھرس ڈے کلب کے شرکا کے انتظار میں کھڑے تھے کہ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ اوپر سے تیغ اترتا آرہا تھا اور اس کے ساتھ ایک گدبدی سی لڑکی بھی تھی۔ لڑکی ان کی ہم جماعت تھی اور اس کا نام سروج بالاسرن تھا۔ جیسا کہ تیغ نے بتایا۔ لڑکی کا رنگ خاصہ صاف تھا، نقشے موٹے موٹے اور بدن مائل بہ فربہی۔ اور چہرے پر کوئی خاص جاذبیت بھی نہ تھی۔ یقیناً یہ سرلا کپور سے کم تر تھی۔ تیغ ہم لوگوں کو دیکھ کر خاصے جھینپے مگر سچویشن بچانے کے لئے کہا کہ انھیں بھی میں آج تھرس ڈے کلب میں لایا ہوں۔ خیر کلب کی میٹنگ شروع ہوئی۔ تیغ اور سروج تھوڑی دیر بیٹھے رہے۔ پھر معذرت کرکے چلے گئے کہ انھیں لائبریری میں کچھ کام ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ تیغ اور مس سرن کے قصے اِدھر اُدھر سننے کو ملتے رہے۔ مگر یونیورسٹی کی دنیا ایک وسیع دنیا ہوتی ہے۔ وہاں کسے پروا۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب 'مصطفیٰ زیدی کی کہانی' میں لکھا ہے کہ سر[...] لاسرن، جسٹس شنکر سرن کی بیٹی تھی۔ یہ بات درست نہیں ہے سروج دہرہ دون کے ایک پنجابی خاندان کی بیٹی تھی جس کا ایک بھائی الہ آباد میں اس وقت ڈپٹی کلکٹر بھی تھا۔ بس اس کی یہی حقیقت ہے۔ ممکن ہے تیغ نے اپنے دوستوں سے اسے جسٹس

www.taemeernews.com

شنکر سرن ہی کی بیٹی بتایا ہو۔ بہرحال سال تمام ہوا اور امتحانات آگئے۔ میرے لئے بھلا ایم اے اردو کے امتحانات کیا تھے۔ نتیجہ سنر فی صدی سے زیادہ تھا۔ تیغ کے ساتھ بہت سے اچھے لڑکے انگلش ایم اے کلاس میں تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں انگلش میں ایم۔اے میں شاید ہی کوئی فرسٹ کلاس پاتا ہو اور یہ روایت اس سال بھی دہرائی گئی۔ سب کے نمبر سکنڈ کلاس کے تھے۔ اسی میں سے میرٹ (Merit.) بنا کرتی یعنی ڈویژن تو سب کا سکنڈ کلاس کا تھا مگر پہلے سات طلبا میرٹ میں لئے جاتے تھے۔ تیغ کی ساتویں پوزیشن تھی اور فرسٹ ایک طالب علم ستیش کمار سنگھ تھا۔ جو بعد کو الہ آباد یونیورسٹی میں لکچرر بھی ہو گیا تھا۔ مگر پھر وہ ایڈمنسٹریٹو سروس میں I.A.S. ہو گیا۔ اس نے سب کو شکست دیدی۔ بعد کو اس نے آئی۔اے۔ایس سے بھی استعفیٰ دے دیا اور امریکہ جاکر ہارورڈ یونیورسٹی سے ایم۔اے کرکے وہیں کچھ دنوں کے لئے استاد بھی ہو گیا۔ ستیش کمار سنگھ کی پوزیشن بی۔اے۔ میں بھی تیسری تھی اور تیغ کی ساتویں۔

تیغ صاحب کا عشق زوروں پر تھا۔ دوسرا سال آیا تو ستمبر ۱۹۵۱ء میں یہ خبر سننے میں آئی کہ تیغ نے سروج کے عشق میں افیون کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسپتال کے ڈاکٹروں نے انھیں بچا لیا۔ مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے کہ وہ (تیغ) جنوری ۱۹۵۱ء میں پاکستان چلے آئے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے مارچ ۱۹۵۱ء میں ایم۔اے پرلیوس کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی میں دیا اور فروری یا مارچ ۱۹۵۲ء میں پاکستان گئے۔ وہ جنوری ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر زیڈ احمد کے الکشن میں کام کرتے تھے اور الکشن کی میٹنگوں میں نظمیں پڑھتے تھے۔ یہاں ایک دلچسپ بات کی طرف اشارہ کرنے کا جی چاہتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ تیغ نے جن لڑکیوں سے ہندوستان میں عشق کئے ان سبھوں کے نام "س" حرف سے شروع ہوتے تھے اور وہ عورت جو پاکستان میں ان کی قاتل بنی اس کا نام 'ش' (شہناز) سے شروع ہوتا تھا۔

○

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

کی فکر تھی۔ معلوم نہیں وامق صاحب کو یہ بات یاد ہے یا نہیں، مگر مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ میں اس وقت بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا۔ وامق صاحب کی اس وقت دو نظمیں الہ آباد میں بہت مشہور ہوئی تھیں۔ ایک 'تقسیم پنجاب' دوسری 'مینا بازار'۔ پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھی، وامق صاحب سے 'تقسیم پنجاب' نظم کی فرمائش ضرور کرتے اور جب وامق صاحب یہ مصرعہ پڑھتے کہ "اب یہ دو آب ہے، سہ آب ہے، پنجاب نہیں" تو سب لوگ ایک افسوس کے لہجے میں اُسے دہرانے لگتے تھے۔ شاید "چیخیں" مجموعے میں بھی یہ نظم شامل ہے۔

غالباً ۱۹۴۹ء کی تاریخیں رہی ہوں گی جب مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرہ ہوا۔ اس میں جگر صاحب، جذبی، ساحر، وامق، راہی معصوم رضا، مسعود اختر جمال، نوح ناروی اور کچھ مقامی حضرات بھی شامل تھے۔ جگر صاحب نے اپنی وہ نظم نما غزل (یا غزل نما نظم کہہ لیجئے) پڑھی جس کا مطلع تھا:۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل　　شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اور جب یہ شعر پڑھا:۔

دہلی و دہرہ دون و ڈلہوزی و بہار　　انساں ہے اور ماتم انساں ہے آج کل

تو لوگ آبدیدہ ہو گئے۔ جذبی نے اپنی نظم "بڑے ناز سے آج ابھرا ہے سورج" سنائی پھر ایک غزل بھی جس کا مطلع تھا:۔

زمین آسماں چاند سورج ستارے　　ہمارے ہیں لیکن نہیں ہیں ہمارے

ساحر جب آئے تو حسب معمول ان سے 'تاج محل' کی فرمائش کی گئی۔ ساحر نے کہا کہ میں آپ کو ایک نئی نظم سناتا ہوں۔ اس وقت انھوں نے اس کا نام "آہنگ انقلاب" بتایا تھا۔ نظم شروع ہوتی تھی:۔

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے　　یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں　　افق سے تابہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں

(بعد کو یہی نظم 'تلخیاں' میں 'لہو نذر دے رہی ہے حیات' کے نام سے شائع ہوئی) اور پھر 'شکست

www.taemeernews.com

زنداں" سنائی۔ یہ وہ وقت تھا جب لوگ انقلابی نظمیں سننا پسند کرتے تھے۔ اگرچہ ہندوستان ایک طرح کے انقلابی دَور سے گزر چکا تھا لیکن ہندوستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھ رہی تھی کہ ابھی انقلاب نہیں آیا۔ یہ جو کچھ ہوا ہے انقلاب کی طرف ایک قدم ہے۔ اسی زمانے میں سیّد احتشام حسین الہ آباد یونیورسٹی کسی سرکاری کام سے آئے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ان کی طرف آٹوگراف بک بڑھا دی۔ احتشام حسین نے اس پر لکھا:-

"روس میں انقلاب آیا، چین میں انقلاب آیا۔ سوچئے کہ ہندوستان میں انقلاب کب آئے گا؟"

قریب قریب یہی عبارت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ الفاظ اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ وہ طالب علم سب کو یہ عبارت دکھا رہا تھا۔ اس وقت جو الیکشن ہوا اس میں کمیونسٹ پارٹی کے جلوسوں میں یہ نعرہ لگتا تھا:-

"دیش کی جنتا بھوکی ہے، یہ آزادی جھوٹی ہے" اب ذرا فیض کا وہ شعر دیکھئے:-

ع یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

پھر سردار جعفری کا شعر:-

تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے

یہاں تک کہ ابھی شاعری کے میدان میں نئے نئے آنے والے شاعر راہی معصوم رضا کی ایک نظم "پڑاؤ" کافی پسند کی گئی۔ جو اس طرح شروع ہوتی تھی:-

ع تھکے ہوئے مسافرو! یہاں نہ ڈیرے ڈالنا۔

اور شعراء نے بھی اسی طرح کے شعر سنائے۔ مظفر شاہجہاں پوری کی نظم "شعورِ آزادی" بھی خاصی مشہور ہوئی۔ اور ایک غزل کا ایک شعر بھی:-

اس طرف روس، اُدھر چین و ملایا، برما اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

اس وقت ایک عام خیال تھا کہ امروز و فردا میں ہندوستان سُرخ انقلاب سے گزرنے والا ہے۔ راقم الحروف نے بھی شعبۂ اردو کی ایک نشست میں ایک غزل پڑھی تھی۔

www.taemeernews.com

جس کا ایک شعر اس طرح تھا:۔

برما و ملایا کے میداں لینن کے ترانے گاتے ہیں

لہراؤ بغاوت کے پرچم، اب دامنِ جاناں کیا ہوگا

ایک دوسری غزل کے دو شعر اور پیش ہیں:۔

آدمی اس دورِ آزادی میں کیا کیا بن گیا　　　آپ بھی تو تختِ شاہی سے اتر کر دیکھئے!

بھوک، قحط و مفلسی میں گم ہے نبضِ کائنات　　　کب تلک اُس شوخ کی زلفِ معنبر دیکھئے!

تو یہی موڈ اس وقت طلبا سے لے کر تمام سیاسی پنا صنوں پر بھی طاری تھا کہ بس بہت جلد ہندوستان میں کمیونسٹ انقلاب آنے والا ہے۔ الہ آباد کے جنوبی حلقے سے ڈاکٹر زید احمد کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ سے الیکشن لڑے۔ ان کا جلوس جب الہ آباد میں پارٹی آفس سے نکلتا تو ایک سرا اس کا ہیوٹ روڈ (وویکانند مارگ) کے چوراہے پر ہوتا تو دوسرا کوتوالی کے پاس سے خاص کھنہ کی طرف مڑتا ہوتا۔ پورے شہر میں ہر طرف سُرخ جھنڈے لہراتے ہوتے۔ یہاں تک کہ ان جلوسوں کی تصویریں امریکہ سے شائع ہونے والی شہرۂ آفاق میگزین 'نیشنل جاگرفک' میں بھی اس وقت شائع ہوئیں اور پھر ایک دن امریکی حکومت نے سرتیج بہادر سپرو کے بنگلے کو کرائے پر لے کر اس میں کوئی سوشل سروس ڈپلوما کورس کھولا۔ بہت سے امریکی مرد، عورت تعلیم دینے کے لئے الہ آباد میں اس بنگلے میں رہنے کے لئے آئے اور کئی برسوں تک یہ کورس چلایا گیا۔ گویا کمیونسٹ خیالات کا استیصال کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی۔ امریکہ کو سب سے زیادہ سُرخ خطرہ الہ آباد میں نظر آنے لگا۔ کمیونسٹ پارٹی الہ آباد میں ہار گئی۔ اور یہ ہار بنائی ہوئی Manipulated ہار تھی۔ اسی زمانے میں کیرالا میں کمیونسٹ حکومت بن گئی اور بنگال بھی تیزی سے کمیونزم کی طرف جارہا تھا۔ اب مظفر شاہجہاں پوری کے اُس شعر کو دیکھئے جو پچھلے صفحے میں لکھا گیا ہے تو اندازہ غلط نہیں تھا۔ مگر امریکہ کی مشینری بھی تیزی سے کام کر رہی تھی۔ ایسی صورت میں انقلابی نظموں کا پسند کیا جانا لازمی سی بات تھی۔ غزل کی سطح پست ہو چکی تھی۔ اگر کوئی شاعر رومانی نظم پڑھتا تو معذرت کے ساتھ یا معذرتی انداز میں۔ یہاں تک کہ فراقؔ صاحب بھی جو اپنے کو شاعرِ جمال کہتے تھے، اُمریکی بنجارہ نامہ

www.taemeernews.com

اور "دھرتی کی کروٹ" جیسی نظمیں لکھنے لگے۔ فراق صاحب نے ایک دن یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کو اپنے گھر پر بلایا اور ایک نشست میں اپنی نظم "آدھی رات" سنائی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نظم احساسات اور رعنائیِ خیال کے لحاظ سے بے حد حسین نظم ہے۔ مگر لوگ سراہا کر رہ گئے۔ مگر جب انھوں نے "دھرتی کی کروٹ" سنائی تو سننے والوں کو اس وقت یہ نظم بہت پسند آئی کچھ لوگ ہنسے، کچھ نے سراہا۔ اس نظم میں شاعری تو کیا ہے مگر "خیال" بدلتے ہوئے ہندوستان اور اس کے مستقبل کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے۔ مثال کے لئے چند اشعار پیش ہیں۔

(۱)

دنیا جسے "آج" کہتی ہے ــــ سنگم کہیں جگوں کا ہے
بیتا ہوا کل اوروں کا تھا ــــ آنے والا کل اپنا ہے
انگڑائی توڑتا ایشیا ــــ بند آنکھیں ملتا افریقہ
دمن، ذلت، حبشی امریکہ ــــ گہری نیند سے چونک اٹھے ہیں

(۲)

کاریگر مزدور کسان ــــ کڑیل اور بگڑیل جوان
کاندھے سے کاندھا جوڑیں گے ــــ دنیا پر دھاوا بولیں گے

○

فراقؔ صاحب کے اوپر کے اشعار چاہے جتنے غیر شاعرانہ ہوں، ان کی شاعری میں جو بھی سقم ہو، مگر یہ یقیناً ہے کہ ان کی نظر وقت کی رفتار اور دنیا کی بدلتی ہوئی صورتوں پر رہتی تھی اور "دھرتی کی کروٹ" اس کی اچھی مثال ہے۔ فراق صاحب بند اور گھٹی ہوئی فضا کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری میں ایک کھلی ہوئی بسیط فضا کا احساس ہوتا ہے اور اسی لئے ان کے یہاں اکثر اصولِ شاعری ٹوٹ بھی جاتے ہیں۔ اب "آدھی رات" نظم کے بھی کچھ اشعار دیکھئے ہیں:۔

گلوں نے چادرِ شبنم میں منھ لپیٹ لیا ــــ لبوں پہ سو گئی کلیوں کی مسکراہٹ بھی

www.taemeernews.com

ذرا بھی سُنبل تر کی لٹیں نہیں ہلتیں — سکوت نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
اب انقلاب میں شاید زیادہ دیر نہیں — گزر رہے ہیں کئی کارواں دھندلکے میں

یہ نظم آزادی سے کچھ ہی پہلے کہی گئی تھی۔

الہ آباد میں شعر و ادب کے دو مستقر تھے۔ شاعری میں فراق صاحب اور عام ادب میں اعجاز صاحب (یہاں میرا مطلب سنجیدہ ادبی صورتوں سے ہے ورنہ تو الہ آباد میں بہت سی ادبی انجمنیں تھیں اور آج بھی ہیں۔ جہاں مشاعرے ہوتے رہتے ہیں) اعجاز صاحب نے اُسی زمانے میں ایک ادبی رسالہ "شعاعِ اردو" کے نام سے نکالا۔ اردو کا ایک اور ادبی رسالہ ۱۹۲۵ء میں اعظم کریوی، آغا علی خاں محمود اور طالب الہ آبادی نے اکبر کے نام سے نکالا تھا مگر کچھ دنوں تک نکلنے کے بعد یہ بند ہو چکا تھا (راقم الحروف کے پاس ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء کی اکبر کی فائلیں ہیں) یہ رسالہ اکبر الہ آبادی کی یاد میں نکالا گیا تھا۔ اور انجمن دارالادب الہ آباد کا یہ رسالہ تھا جس کے مالک سید سجاد حسین شاہ پوری تھے۔ ایڈیٹر اعظم کریوی اور چیف ایڈیٹر آغا علی خاں محمود تھے۔ شعاعِ اردو بعد کو کارواں میں بدل گیا۔ ہم بھی اسی رسالے میں اپنی کچی پکی تحریریں اور ریویو چھپواتے اور کبھی کبھی اعجاز صاحب کی غیبت میں اداریہ بھی لکھتے۔ اسی زمانے میں افسانہ نگاروں کی بھی ایک نئی کھیپ آئی۔ بلونت سنگھ، محمود احمد ہنر اور اطہر پرویز نے مل کر ایک رسالہ کٹرہ الہ آباد سے 'فسانہ' نام کا نکالا۔ جس میں پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ کچھ نئے لوگ بھی آئے۔ ان میں سعید سہروردی اور صالحہ [illegible] ... یہ تیغ تھے کلیم تخشب محی الدین عرفان اور صدیقہ بیگم سیوہاروی خاص تھے۔ صدیقہ بیگم [illegible] سے خاص ہی۔ ان کے دو مجموعے "پلکوں میں آنسو" اور "ہچکیاں" بھی شائع ہوئے۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی، اطہر پرویز کی بیوی تھیں۔ وہ پس پردہ ہی افسانہ لکھتی تھیں۔ نہ کبھی کسی ادبی محفل میں انھیں کسی نے دیکھا اور نہ وہ کسی علمی ادبی مذاکرے میں کبھی شریک ہوئیں۔ نہ کبھی کسی سے ان کی گفتگو ہو سکی۔ الہ آباد میں عام خیال یہ تھا کہ اصلاً یہ اطہر پرویز ہی تھے جو صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام سے لکھتے تھے۔ واللہ اعلم۔ پھر محی الدین عرفان نے اسی زمانے میں اپنا رسالہ

www.taemeernews.com

جھنکار" الہ آباد سے نکالا۔ ایک اور رسالہ تجر الہ آبادی نے "پروین" کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ پھر حسن منزل سے نکہت نام کا ایک رسالہ نکلا جس کے ایڈیٹر عباس حسینی تھے۔ اس میں تیغ الہ آبادی اور اسرار ناروی (ابن صفی) بھی لکھنے لگے۔ مگر بہت جلد اسرار ناروی، ابن صفی کے نام سے جاسوسی دنیا لکھنے لگے۔ نکہت نکلتا تو رہا مگر عباس حسینی کی دلچسپیاں جاسوسی دنیا سے ہو گئیں۔ اب عباس حسینی جاسوسی دنیا کے ساتھ رومانی دنیا بھی نکالنے لگے۔ اگرچہ ان رسالوں کی ادبی سطح بلند نہ تھی مگر عوام میں بیحد مقبول ہوئے۔ اور بہر حال کچھ نہ کچھ تو ان تمام رسالوں نے ادبی مذاق سنوارنے میں مدد دی ہی۔ رومانی دنیا میں کچھ اچھے لکھنے والے بھی آئے جن میں ابن سعید اور شاہد اختر نے اچھے رومانی ناول لکھے۔

الہ آباد ہمیشہ سے ہندی کے ادیبوں کا گڑھ رہا ہے۔ اس وقت بھی اُردو کے مقابلے میں ہندی کا ادب بہتر تھا۔ اور ہندی کے مشاہیر ادب بھی الہ آباد میں اقامت پذیر تھے۔ تاہم انجمن ترقی پسند مصنفین میں اردو، ہندی دونوں کے ادیب بڑے شغف سے شرکت کرتے تھے۔ پرانے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں سری کرشن داس اور ایلا چند جوشی کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ ان کے بعد دوسری نسل میں بھیروں پرساد گپت اور امرت رائے تھے جو بڑی لگن اور محنت سے ادب کی تخلیق میں منہمک تھے۔ امرت رائے اور ایلا چند جوشی منٹو روڈ پر نالے کے پاس رہتے تھے۔ اور وہیں سری کرشن داس بھی تھے۔ امرت رائے کی ایک کتابوں کی دکان بھی زیرو روڈ پر تاج محل ہوٹل کے نیچے ہوا کرتی تھی۔ جہاں سے پریم چند کا 'ہنس' بھی ٹیڑھے میڑھے نکل رہا تھا۔ مگر ان قدرے پرانے لوگوں کے بعد کی نسل نسبتاً طاقتور تھی اور ایک خاص تیور کے ساتھ ادب کے میدان میں اتر رہی تھی۔ کملیشور تو میرے ساتھ ہی یونیورسٹی میں تھے اور مارکنڈے مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔ امر کانت نے بھی اسی وقت لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ سب لوگ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بڑی باقاعدگی سے آتے۔ مگر ان کی تحریروں اور مباحثوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اپنا راستہ الگ بنانے کی فکر میں ہیں۔ انجمن کے جلسے کبھی امرت رائے کے گھر پر ہوتے، کبھی بھیروں پرساد گپت کے گھر پر، اسٹینلی روڈ پر ہوتے۔

www.taemeernews.com

کبھی اعجاز صاحب کے یہاں، کبھی پی بی سی گپت اور پہاڑی کے یہاں۔ پی سی گپت کا شمار ہندی کے اچھے نقادوں میں ہوتا تھا۔ اس وقت کملیشور، مارکنڈے اور راقم الحروف صف نعال ہوتے۔ اسی وقت ایک صاحبزادے بھی آئے جو ہندی میں غزل کہنے کی مشق کر رہے تھے۔ یہ زبان تو ہندی اردو کی ملی جلی استعمال کرتے مگر بحریں سب فارسی غزلوں کی ہوتیں۔ یہ دشینت کمار تھے۔ خوب لہک کر غزلیں اردو مشاعروں کے شعرا کی طرح پڑھتے۔ ہندی کی شعری دنیا میں یہ ایک نئی آواز تھی۔ انھیں جلسوں میں شمشیر بہادر اور ترلوچن شاستری بھی آتے اور اپنی تخلیقات پیش کرتے۔ دشینت کمار اور شمشیر بہادر نے ہندی کی شاعری میں اردو طور طریقوں سے بڑا نام کمایا۔ انھیں دنوں فاروق مجنوں نام کے اردو شاعر نے "لائٹ آف ایشیا" کا اردو اشعار میں ترجمہ کیا جو خاصہ اچھا تھا۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے کا یور روڈ کے ایک بنگلے میں ہونے لگے۔ یہیں میں نے پہلے پہل ناگ ارجن اور رام بلاس شرما کو دیکھا اور ان کی نئی ہندی شاعری پر تقریریں سنیں۔ یہیں ایک دن اردو کے ایک نئے شاعر اپنا نیا شعری مجموعہ لئے ہوئے آئے اور کافی دیر تک اپنی نظمیں سناتے رہے جو ایک طرح کی تجرباتی شاعری تھی۔ یہ حسن شہیر تھے اور مجموعہ 'صبح زنداں' تھا۔ پھر بعد کو حسن شہیر نے نئے ڈھنگ کی تجرباتی شاعری میں خوب ہاتھ پیر نکالے۔ "انگاروں کے گیت" اور "موت کی شہنائی" کے نام سے ان کے دو اور مجموعے اسی درمیان شائع ہوئے۔ انگاروں کے گیت' پر آل احمد سرور صاحب کا مقدمہ بھی تحریر تھا۔ انجمن کے ادبی حلقوں میں سرور صاحب کے مقدمے پر سب کو بڑی حیرت تھی۔ تیغ کا مجموعہ 'روشنی' بھی آچکا تھا۔ مگر تیغ اب ہم لوگوں سے کٹنے لگے تھے۔ سبب معلوم نہ ہو سکا۔ حسن شہیر جب تک الہ آباد میں رہے برابر نشستوں میں آتے رہے۔ اب تو وہ شعر و شاعری سے تائب ہو چکے ہیں۔ لمبی سی داڑھی رکھ لی ہے اور اللہ والے ہو گئے ہیں۔ شعر و شاعری کو خرافات تصور کرنے لگے ہیں۔

؏ 'زندی و خراباتی در عہد شباب اولیٰ' والا جذبہ ان میں پیدا ہو گیا ہے۔

ہم لوگ ایم۔ اے سال دوم میں تھے کہ الہ آباد میں انڈین پیوپلز تھیٹر (IPTA) کا

www.taemeernews.com

ایک اجلاس ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں ہوا۔ الہ آباد میں اپٹا سے دلچسپی لینے والوں میں نمی چند جین اور ان کی بیوی ریکھا جین خاص تھیں۔ نمی چند جین کی ادب سے دلچسپیاں اس وقت منظر عام پر نہ تھیں۔ وہ الہ آباد کے سول لائنز میں پبلیشنگ ہاؤس چلاتے تھے اور پہاڑی کے ساتھ مارکسی ادب پر دھواں دھار بحثیں کرتے تھے۔ اب تو نمی چند جین ہندی کے بڑے نقاد ہو گئے ہیں۔ مگر اس وقت ہندی ادب میں ان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔ اپٹا کے لئے باہر سے آنے والوں میں پریم دھون اور حبیب تنویر تھے۔ ابھی حبیب تنویر کا آگرہ بازار نہیں آیا تھا اور نہ ڈرامے سے ان کی کوئی خاص دلچسپی تھی۔ وہ ڈراما اور شاعری کے درمیان معلق تھے۔ الہ آباد تو وہ ایک مشاعرے کے لئے آئے تھے۔ یہ یاد نہیں کہ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرے کے لئے یا کسی اور مشاعرے کے لئے۔ مگر انھوں نے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرے میں شرکت کی تھی اور ایک نظم بڑے زور شور سے پڑھی تھی جس کا ایک شعر یاد ہے :۔

آج تیرے آنچل کی نرم سرسراہٹ میں برق ہی کے تیور ہیں
اور مجھ کو یہ بجلی اونچے اونچے محلوں پر آج ہی گرانی ہے

پھر وہ مشاعرے کے بعد ہی کلیم تخشب کے ساتھ مانک پور شکار کھیلنے چلے گئے۔ دوسرے دن واپس آکر اپٹا میں شرکت کی۔ اپٹا میں ریکھا جین نے بہترین رقص پیش کیا تھا اور پریم دھون نے ایک خاص دھن میں اپنا تانگے والا گانا "چل میرے گھوڑے چلا چل" پیش کیا تھا اور پھر ایک گیت بھی جس کا ٹکڑا تھا :۔

" آج ہڑتال۔ ہڑتال۔ آج چکا بند" بیچ میں اور کئی مصرعے تھے مگر یہ چند مصرعے اور یاد آرہے ہیں :۔

ظلم کا چکا، آج چلے گا نہ چلے گا — آج کوئی بوائیلر چلے گا نہ چلے گا
آج ہڑتال۔ ہڑتال۔ آج چکا بند

اور جب پریم دھون " آج ہڑتال۔ ہڑتال" کہتے تو پورا مجمع ان کے ساتھ پرزور آواز میں کہتا " آج چکا بند" اور اس " آج چکا بند" کہنے پر پوری فضا گونج اٹھتی تھی۔ اس مجمع میں

www.taemeernews.com

زیادہ تر نوکری پیشہ، قلی اور مزدور تھے۔ اور پریم دھون کی اس آواز کو لوگ اپنے دل کی آواز سمجھتے تھے۔ اپٹا (IPTA) نے دو ایک پروگرام اور دکھائے۔ راجہ اندر کا ایک دربار سجایا گیا اور اس میں بھوک، بیکاری، افلاس، سب پریاں بن کر آئیں اور اپنی اپنی فریاد ناچ ناچ کر راجہ اندر کو سنائیں اور راجہ اندر سب کو تسلی دیتے کہ ہم نے اعلان کیا ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر اناج اگائیں، ترکاری لگائیں۔ تبھی غلّے اور کھانے پینے کا مسئلہ ختم ہوگا اور سب کو کام بھی مل جائے گا۔ یہ نقل اس بیان کے لئے تھی جو وزیر اعظم نہرو نے کہیں دیا تھا۔ ریکھا جین، عذرا فاروق، کلاوتی آغا اور کشور انصاری پریاں بنی تھیں۔ ریکھا جین بڑی اچھی آرٹسٹ تھیں۔ انھوں نے بمبئی کے اپٹا میں بھی کام کیا تھا۔ جب وہ پری بنیں تو واقعی لوگ ان پر لہلوٹ ہو گئے۔ ہم طالب علموں کا تو کہنا ہی کیا۔ ہمارے تو دن ہی تھے لہلوٹ ہونے کے۔ انھیں ریکھا جین کو میں نے چار سال پہلے دلّی میں دیکھا تو انگلی پر ڈالنے لائق ہو گئی تھیں۔ الہ آباد میں اپٹا کی یہ پہلی اور آخری مقبولیت تھی۔ ہندی تھیٹر بھی انھیں دنوں الہ آباد میں خاصا مقبول ہوا۔ سری کرشن داس نے الہ آباد کے اس وقت کے ایک کلکٹر جگموہن رینا کی بیوی کے ساتھ مل کر ایک رنگ منچ کی تشکیل کی۔ یہ تھیٹر "رنگ شالہ" کے نام سے موسوم ہوا۔ اسٹیج اور تھیٹر کا شوق رکھنے والے بہت سے فن کار ان کے گرد جمع ہو گئے اور رنگ شالہ کا رنگ کچھ دنوں تک خوب چوکھا رہا۔ سری کرشن داس اچھے آرگنائزر اور ڈرامہ نویس بھی تھے۔ انھوں نے اعجاز صاحب کو بھی اپنے ساتھ لپیٹا۔ اعجاز صاحب نے بھی ان کے لئے دو ایک ڈرامے لکھے۔ مگر اعجاز صاحب کے ڈرامے رنگ شالہ میں چلے نہیں۔ پھر اعجاز صاحب نے یونیورسٹی کے اردو اسوسی ایشن کے لئے کچھ اور ڈرامے لکھے جو اسٹیج بھی ہوئے اور بعد کو ادبی ڈرامے کے نام سے کئی مرتبہ شائع ہوئے۔

ہندی میں نرالا، پنت، مہادیوی ورما اور رام کمار ورما چھایا وادیوں کا ایک گروپ الگ تھا جو بعد کو ایک اسکول بن گیا۔ مگر ۱۹۵۰۔۵۱ء تک یہ مزاج باسی ہو گیا۔ ہندی کی نئی نسل نے چھایا وادیوں کو توڑ کر رکھ دیا کہ یہ حقیقت سے گریزاں ہیں۔ چھایا وادی، زندگی کی

www.taemeernews.com

تیز گامی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس کا ایک عجیب سین دیکھنے میں آیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے کسی ڈرامے کا افتتاح ہو رہا تھا۔ مہادیوی ورما نے ایک تقریر اپنے ڈھنگ کی کی جب تقریر ختم ہوئی تو وجے دیو نارائن ساہی مجمع سے اُٹھے اور انھوں نے کہا کہ دیوی جی نے جو کچھ کہا ہم کچھ نہیں سمجھے۔ یہ کیا بھاشا بولتی ہیں اور کس کے لئے۔ اس پر کچھ ہنگامہ ہوا اور دیوی جی روٹھ کر چلی گئیں۔ وجے دیو نارائن ساہی ہم لوگوں کے گروپ کے آدمی تھے۔ وہ خود کو سوشلسٹ کہتے تھے مگر یہ سوشلزم، رام منوہر لوہیا والی سوشلزم تھی۔ ساہی تھے تو شاعر مگر انھوں نے ہندی کی نئی تنقید میں بھی نئی نسل کو راہ دکھائی۔ مگر ترالا، پنت، مہادیوی اور بچن جیسا شاعر پھر الہ آباد میں ہندی میں کوئی اور پیدا نہ ہوا۔ ہاں کہانیوں کا جو نیا منچ سجا اس میں نئے لوگوں نے راستے پیدا کئے اور آج بھی اس راہ میں ترقی کر رہے ہیں۔ مارکنڈے، کملیشور اور امرکانت کے بعد اور شیکھر جوشی نے کہانیوں کی دنیا کی توسیع کی۔ شاعری کی ہندی دنیا سست پڑ گئی۔

اردو دنیا میں الہ آباد میں شعری بساط تقریباً اسی وقت بچھی جب دلّی میں شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ مگر الہ آباد نے شعری دنیا میں کوئی خاص ترقی نہ کی۔ اکبرؔ الہ آبادی کے علاوہ کسی اور کو عروج حاصل نہ ہوا۔ عجیب بات ہے کہ فراقؔ نے الہ آباد ہی سے شاعری شروع کی اور الہ آباد ہی میں ان کی شاعری نے جوانی اور بڑھاپے سب کی منزلیں طے کیں۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے کو گورکھپوری ہی لکھتے رہے۔ یہی صورت قریب قریب اصغرؔ گونڈوی کی بھی ہوئی۔ میرے سامنے الہ آباد میں چھوٹی چھوٹی انجمنیں اُردو کی قائم تھیں جن کا مقصد صرف مقامی مشاعرے کرنا رہ گیا تھا۔ ان میں خوب جھگڑے بھی ہوتے اور خوب شاعری بھی۔ نوحؔ ناروی کی انجمن سفینۂ ادب تھی۔ پھر ایک انجمن ان سے اختلاف کر کے ان کے شاگرد بسملؔ الہ آبادی نے نہالِ ادب کے نام سے قائم کی۔ نوح صاحب کے شاگردوں کی ایک فوج تھی جس میں ہر طرح کے لوگ ہوتے۔ شاگردوں کا باقاعدہ ایک رجسٹر رکھا جاتا جس میں ہر پیشے کے لوگ شامل تھے سائیکل کا پنکچر جوڑنے والے، کپڑے رنگنے والے رنگریز، آوارہ گھومنے والوں سے لے کر تاجر پیشہ

www.taemeernews.com

فقرا اور مساکین سے لے کر امرا و شرفا جن میں بسمل صاحب، پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن، منواجی، رئیس الہ آباد سب شامل تھے۔ بسمل، گلشن، جدت، سراج اور راز کافی مشہور ہوئے قریب قریب سبھی کے دیوان شائع ہوئے۔ راز ملک گیر شہرت کے حامل ہیں۔ مگر مشاعروں کے شاعر ہیں۔ استاد نوح ناروی کو کبوتر پالنے کا بڑا شوق تھا۔ الہ آباد کے رئیس منواجی بھی کبوتر پالتے تھے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شوقِ کبوتر بازی استاد کو منواجی سے قریب لے گیا یا ذوقِ شاعری، منواجی کو استاد کے قریب لایا۔ مگر ایک وقت وہ آیا کہ استاد اپنے شاگرد کی کوٹھی محلہ کیٹگنج میں اٹھ آئے۔ اگرچہ حسن منزل میں استاد نوح کی اپنی خود کوٹھی تھی۔ یہ شوقِ کبوتر بازی بھی خوب ہے۔ خان بہادر کلب عباس جو بعد کو الہ آباد میں ٹرابیونل کے جج بھی ہو گئے تھے۔ انھیں بھی کبوتر بازی کا بڑا شوق تھا۔ کبوتروں پر انھوں نے ایک کتابچہ بھی لکھا تھا۔ جب وہ جج تھے، راقم الحروف نے انھیں خود دیکھا ہے کہ الہ آباد کے گدڑی بازار میں جہاں کبوتروں کی خرید و فروخت ہوتی اور کچھ مشتاقان کبوتر اکٹھا ہوتے، کلب عباس صاحب بھی آتے۔ ہم ابرار رضوی کی پرانی کتابوں کی دکان پر ہوتے تو یہ سین دیکھا کرتے۔ جو کبوتر پسند آجاتا اس کی ٹانگیں بندھوا کر اپنی شیروانی کی جیب میں رکھ لیتے (کوئی اسے مبالغہ نہ سمجھے اور بھی چشم دید گواہ ابھی موجود ہیں) سید احتشام حسین، کلب عباس صاحب کے عزیزوں میں سے تھے۔ وہ گڑیا تالاب پر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کلب عباس صاحب ان سے ملنے آئے تو ایک کبوتر ان کی شیروانی کی جیب سے جھانک رہا تھا۔ اب اسے کیا کہا جائے۔ اپنا اپنا شوق ہے الہ آباد کے ایک رئیس نے جب اپنی فورڈ کار خریدی تو اسے دکان سے لینے کے لئے نورجہاں نام کی اپنی طوائف کو دیہات سے لے کر آئے کہ سب سے پہلے کار پر وہ بیٹھے گی۔ نام تو اس کا نورجہاں تھا مگر وہ چہرے مہرے سے طلسم ہوش ربا کی تاریک شکل کش لگ رہی تھی۔ اب یہاں بھی اپنا اپنا شوق والی بات صادق آتی ہے۔ شوقِ کبوتر بازی اصلاً رئیسوں کا شوق تھا۔ خود واجد علی شاہ کا ایک بہت بڑا کبوتر خانہ تھا۔ انگلستان میں بھی یہ شوق رہ چکا ہے آج بھی ٹرافالگر اسکوائر میں کبوتروں کی وہ بہتات ہے کہ جب وہ دانہ چگنے کے لئے نیچے آتے

www.taemeernews.com

ہیں تو ہمیں ہندوستان کا مزہ آتا ہے، اور یہ سب کبوتر پالے ہوئے کبوتر ہیں۔ انگریز جب کوئی شوق کرتا تھا تو اسے عزت (Glorify) دے کر کرتا تھا۔ چنانچہ کبوتر کو امن و آشتی کا پرندہ (Bird of Peace) کہہ کر پالنا شروع کیا۔ اور ہندوستانیوں کے شوق کبوتر بازی کو مذموم کرکے پیش کیا۔ اَودھ کے خلاف ایک الزام یہ بھی تھا کہ بادشاہ کبوتر اڑاتا ہے اور رات بھر مشاعرے کرتا ہے۔ میجر سلیمن صاحب کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

بارہ دائروں کا یہ شہر الٰہ آباد ایک رنگا رنگ تہذیب اور زندگی کا حامل ہے۔

الٰہ آباد اسٹیشن پر ایک مزار ہے جسے لائن بابا کا مزار کہا جاتا ہے۔ اس مزار پر ہر جمعرات کو باقاعدہ قوالی کی محفل سجتی ہے۔ اب تو باقاعدہ پختہ اور شاندار مزار بن گیا ہے۔ مگر میری طالب علمی کے زمانے میں یہاں صرف چونے سے رنگی ہوئی ایک قبر ہوا کرتی تھی۔ ہم لوگ بھی قوالی سننے اور شیرینی لینے اکثر یہاں جاتے۔ یہاں حاضرین میں ہندو، مسلم، عیسائی سب پہلے بھی ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ اکثر ہندو حضرات اپنے سفر کے آغاز سے پہلے بابا کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ کچھ ششٹانگ ڈنڈوت کرکے بابا سے اپنے منگل مے سفر کی دعا مانگتے ہیں۔ یہی صورت لکھنؤ کے اسٹیشن پر لچھمن پیر بابا کے مزار پر بھی ہوتی ہے۔ جہاں شرفی صد ہندو حضرات اور ان کی عورتیں اور بچے ہوتے ہیں جو ہاتھوں میں بتاسے کے بُندے اور پھول کی چنگیاں لئے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ ونے کٹیہار اور اشوک سنگھل کو یہ جلوہ بھی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا دیکھنا چاہیئے۔ اور پھر الٰہ آباد تو اس تہذیب کا سنگم ہے۔ ایک مرتبہ میرے دوست جاوید وششٹ (افسوس کہ حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا) ایک قصیدہ خوانی کی محفل میں شرکت کے لئے الٰہ آباد آئے۔ رات میں انھوں نے قصیدہ پڑھا اور صبح مجھ سے سنگم نہانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم لوگ ناؤ سے سنگم گئے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر وحید اختر (اردو کے مشہور شاعر اور علی گڈھ یونیورسٹی کے پروفیسر) اور اردو کے مشہور شاعر رضا امروہوی بھی تھے وحید اختر تو ناؤ ہی میں لیٹے رہے اور سنگم کا نظارہ کرتے رہے۔ مگر ہم لوگوں نے جاوید وششٹ کے ساتھ سنگم پر اشنان کیا۔ جب پنڈتوں نے وششٹ جی سے مورتی پر پھول چڑھانے کو کہا

www.taemeernews.com

تو دشسٹ جی نے کہا کہ تم پیسے لے لو۔ مگر میں مورتی پوجا نہیں کرتا۔ میں مُوَحِّد ہوں۔ پھر ہم لوگ بھا بھا مٹو، گنگا نہانے بھی ساتھ ساتھ گئے۔ الہ آباد کی خانقاہوں میں ہندو بھی آتے ہیں اور مسلمان گنگا بھی نہاتے ہیں۔ یہی ہماری ملواں اور گنگا جمنی تہذیب ہے۔ اب چاہے ہندو اس کے لیئے ناک بھوں چڑھائیں یا مسلمان چیں بہ جبیں ہوں۔ یہ سب کچھ اس تہذیب میں ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ محرّم میں چوک الہ آباد کے ہندو تعزیوں پر پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ تعزیوں پر سے اپنے بچوں کو وارتے ہیں اور اونچے مچان باندھ کر دس محرّم کو اس پر بیٹھ کر ریوڑیاں بھی عوام میں تقسیم کرتے ہیں اور یہ سرکاری آدمی نہیں ہوتے۔ یہ سب برٹش حکومت میں بھی ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔ وِدتے کٹیہار، اشوک سنگھل اور میرا دوست مُرلی منوہر جوشی سب کوشش کر کے دیکھ لیں مگر کم از کم الہ آباد کا ہندو اپنی روایات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور مسلمان میلے جانا اور گنگا میں نہانا نہیں چھوڑیں گے کہ یہی الہ آباد کی تہذیب ہے۔

جو لوگ الہ آباد سے باہر رہتے ہیں۔ وہ عام طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ الہ آباد میں تین دریا ملتے ہیں۔ صفی لکھنوی نے بھی یہی لکھا کہ ؎ "تیرا دامن تین تربینی کا ہے اک انجمن" اور ناسخ نے غزل میں کہہ دیا ؎

تین تربینی ہیں دو آنکھیں مری — اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

مگر اصلاً صرف دُو دریا گنگا اور جمنا ملتے ہیں اور تیسرا دریا سرسوتی تو کسی کو دکھائی نہیں دیتا (شاید وہ یونیورسٹی اور مدرسوں میں تحلیل ہو گیا ہے کہ علم ظاہری آنکھوں سے کہاں دکھائی دیتا ہے) مگر عام عقیدہ یہی ہے کہ یہ سنگم تین دریاؤں کا ہے۔ مگر یہ تو سب بادی النظر میں ہے۔ تہواروں پر اشنان وغیرہ سب بادی النظر میں ہیں۔ اصل سنگم تو تہذیبوں اور مذہبوں کا ہے۔ ہمیشہ سے یہاں میلوں کے موقع پر مختلف مذاہب کے ماننے والے آتے رہے ہیں اور اپنے اپنے مَتوں کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ بدھ مت کے ماننے والے، جین مت کے ماننے والے، سناتن دھرم کے پجاری، کون یہاں نہیں آتا؟ اسلام کی تبلیغ تو یہاں کبھی نہیں ہوئی اور نہ آج ہوتی ہے مگر اسلامی لٹریچر کی دوکانیں جماعتِ اسلامی کے کارکن لگاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اور انھیں میلے کی انتظامیہ باقاعدہ اسٹال الاٹ کرتی ہے اور کوئی ان کے کام میں حارج نہیں ہوتا۔ آچاریوں اور شنکراچاریوں کی دھارمک سبھائیں لگتی ہیں۔ جہاں ہندو دھرم کا بکھان ہوتا ہے۔ مختلف مسئلوں پر سیمینار نما بحثیں ہوتی ہیں۔ ایک عام خیال ہے کہ سادھو سنت سب محدود علم رکھتے ہوں گے۔ یا محض سنسکرت یا ہندی کے واقف کار ہوتے ہوں گے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ان میں کچھ بہت پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یونیورسٹی کے پروفیسر بھی ان میں ہوتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے کئی پروفیسروں کو میں جانتا ہوں جو ریٹائرمنٹ کے بعد سادھو ہو گئے۔ ان میں پروفیسر ست پرکاش (پروفیسر اور صدر کیمسٹری) اور پروفیسر رگھوبر، مٹھولال شاستری اور ڈاکٹر مُرلی دھر خاص ہیں۔ میرے استاد، ڈاکٹر ایشوری پرساد جو تاریخ کے عالم تھے۔ وہ بھی سادھو ہو گئے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی تو سنت پرم پرا کا پرچار بھی کرتے تھے۔ اور سادھو سبھا کا دانشور طبقہ بھی ایک بنائے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ تو مجھے بھی اس دانشور طبقے میں شامل ہونے کی ترغیب دی مگر میں نے انکار کر دیا کہ دنیا میں اور بہت سے کام ہیں۔ پھر اس زمانے میں میری مارکسزم زوروں پر تھی۔ کہاں مارکسزم اور کہاں سادھو ازم؟! ان میں کچھ ہائی کورٹ کے جج بھی ملے۔ میرے ایک بزرگ دوست باقر ایڈووکیٹ بھی اکثر سنگم پر سادھوؤں کی سمیلن میں شریک ہوتے اور مذاہب کی روحانیت پر تقریریں بھی کرتے۔ یہاں کوئی کسی کی معقول بات کا برا نہیں مانتا۔ جو لوگ مغرب میں رہتے ہیں وہ سنگم کی ان صورتوں کو لندن کے ہائیڈ پارک کے اسپیکر کارنر سے سمجھ سکتے ہیں۔ پتہ نہیں لندن میں ہائیڈ پارک کی (Hyde park) کی یہ روایت کب سے چلی ہوگی۔ مگر سنگم پر اس روایت کا تاریخی ثبوت اشوک کے وقتوں یعنی قبل مسیح سے ملتا ہے۔ کسی من چلے نے یہ بھی کہہ دیا کہ اکبر نے سنگم پر قلعہ بھی اسی شوق میں بنوایا تھا کہ دینِ الٰہی کا بھی پرچار کیا جائے یہ ہو بھی سکتا ہے ورنہ پورا شہر چھوڑ کر ایک جنگل میں دریا کے کنارے الگ تھلگ جا کر قلعہ بنانے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندو رانیوں کی سنگم سے عقیدت نے اکبر کو اس قلعے کو یہاں بنانے کی رائے دی ہو۔ کہ

www.taemeernews.com

کہ اندرون قلعہ سے دریا میں نہانے کے لئے سیڑھیاں بھی بنی ہیں اور جالی دار پردے کی دیواریں بھی ہیں جہاں رانیوں کا اَن واس ہوا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت یہیں سنگم پڑتا رہا ہو۔ مہاراجہ بنارس کے رام نگر والے قلعے میں بھی اسی طرح کا اہتمام گنگا نہانے کے لئے کیا گیا ہے جس کا استعمال آج بھی ہوتا ہے۔ یہ بات الہ آباد کے باہر رہنے والوں کو جاننا چاہئے کہ سنگم کسی ایک متعین (Fixed) مقام پر ہمیشہ نہیں پڑا کرتا کہ دریائے گنگا اپنا رُخ بدلتا رہتا ہے۔ اس طرح سنگم کبھی قلعے کے پاس پڑتا ہے اور کبھی قلعے سے کافی فاصلے پر جہاں جھونسی کی مشہور تاریخی آبادی ہے۔ مگر جمنا اپنا رُخ نہیں بدلتا۔ قلعے کی سیڑھیاں جمنا تک بھی اندرون قلعہ سے بنی ہوئی ہیں اور گنگا کے رُخ پر بھی۔ بھلا اکبر کے وقتوں میں الہ آباد کی آبادی یہاں تک کہاں پہنچی ہو گی۔ سوا اس کے کہ صبح و شام صرف اشنان کرنے والے جمع ہو جاتے ہوں گے اور کچھ سنت سادھو وغیرہ بھی۔ سنگم کی واحد پہچان یہ ہے کہ جہاں دونوں دریا ملتے ہیں۔ ان کا پانی اور ان کا رنگ بالکل الگ الگ رہتا ہے اور دور سے صاف ہرا اور مٹیلا پانی صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ بات ان لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے سنگم نہیں دیکھا ہے۔ جہاں ملن ہوتا ہے ایک لکیر سنگم سے دریا کے کنارے تک کھینچی ہوئی نظر آتی ہے جو دونوں پانیوں کو الگ الگ دکھاتی ہے۔ ایک اور دلچسپ بات۔ جب گنگا میں باڑھ پہلے آجاتی ہے اور جمنا پر پانی کا دباؤ بہت پڑتا ہے تو دریائے جمنا کا پانی پلٹ آتا ہے اس طرح دریا الٹا بہنے لگتا ہے۔ اگرچہ یہ صورت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ مگر دس بیس برس میں ایسا ہونا ضرور ہے۔ آج سے تقریباً دس برس پہلے دریائے جمنا ایسی ہی صورت سے دوچار ہوا اور تقریباً تین دن تک الٹا بہتا رہا۔ پنڈتوں نے اسے انہونی بات اور کرامت کہہ کر خوب پوجا پاٹ کی اور عام آدمی سے کہا کہ ضرور کوئی مصیبت آنے والی ہے جبھی دریا الٹا بہہ رہا ہے۔ خوب تین دن تک دریا کنارے جگ ہوتا رہا اور پنڈتوں نے خوب کمائی کی۔

میلے کا تصور بھی ملنے ہی سے چلا ہو گا۔ جہاں سب لوگ آپس میں ملیں، وہی میلا ہے مگر عام ہندوستانی کے ذہن میں میلے کا تصور بھیڑ بھڑکے اور طرح طرح کی چیزوں کی دکانوں

www.taemeernews.com

اور خرید و فروخت کے ساتھ آتا ہے۔ مگر سنگم کے میلے میں سب طرح کی دکانوں کے مزے ہوتے ہیں۔ حکومت اسی ریت کے میدان میں ایک پورا شہر خیموں کا بسا دیتی ہے جو کمبھ نگر کے نام سے کمبھ کے موقعوں پر مشہور ہو جاتا ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق، چالیس پچاس لاکھ آدمی کمبھ کے موقعے پر یہاں اکٹھا ہو جاتا ہے جو ہر بارہ سال کے بعد ایک مرتبہ سنگم پر لگا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تعداد کچھ لوگوں کو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہو۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ایک بہت بڑی تعداد انسانوں کی چلتی پھرتی ہوئی (Mobile) آبادی ہوتی ہے۔ انسانوں کا اتنا بڑا اجتماع اگر کہیں ہو سکتا ہے، تو وہ حج بیت اللہ کے موقعے ہی پر ہو سکتا ہے۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ وہاں بھی ریت کا میدان ہے اور یہاں سنگم پر بھی یہی صورت ہے۔ حج بیت اللہ کے موقعے پر بھی بیس بائیس لاکھ مسلمان ضرور اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ ایک اور مزے دار بات الہ آباد میں ہے کہ شہر کی آبادی اس مجمعے میں شامل نہیں ہوتی۔ میلے والوں کے آنے جانے کا شہر پر بہت کم اثر پڑتا ہے کہ دونوں کے راستے الگ رکھے جاتے ہیں۔ پھر بھی شہر کی سڑکوں پر کمبھ کے زمانے میں دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ میں نے ابھی تک کے تمام کمبھ میلے دیکھے ہیں۔

ایک کمبھ میلے کے زمانے میں ایک مرتبہ میری بہن لندن سے ہم لوگوں سے ملنے آ گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی بہن کے بیٹے کی جرمن بیوی بھی تھی۔ وہ لوگ یہی سمجھے کہ جیسے عام طور پر میلا لگتا ہے کچھ اسی طرح کا ہوگا۔ ایک شام ہم لوگ دو موٹر کاروں میں لد پھند کر میلے پہنچ گئے۔ جرمن بہو کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے انسانوں کا اتنا بڑا مجمع دیکھا۔ وہ تصویریں پر تصویریں کھینچے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا کیمرے میں قید کر لوں۔ ایک سادھو جو کانٹوں پر لیٹا ہوا تھا اور اوپر سے ایک کانٹوں کا ٹھنا اوڑھے ہوئے تھا، اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ سمجھی کہ یہ کوئی روبوٹ (Robot) ہے۔ میں نے کہا یہ گوشت پوست کا انسان ہے۔ اس کو پیسے دو اور اس کا ہاتھ چھو کر دیکھ لو۔ اس نے ایسا ہی کیا تو اس کی حیرت اور بڑھ گئی۔ سادھو کو پیسے دیتے دیکھ کر ایک تانتا جرمن بہو کے پاس

www.taemeernews.com

آیا اور جب اس تانترک نے جرمن بہو کے ہاتھ میں دبی ہوئی مٹی کو بیلے کا پھول بنا دیا تو قریب تھا کہ جرمن بہو بے ہوش ہو جائے۔ وہ تانترک کو پیسے دے کر وہاں سے بھاگی کہ کہیں تانترک اُسے بھیڑ یا بکری نہ بنا دے۔ اس نے انگریز مصنفین کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ ہندوستان جادوگروں، سادھوؤں اور سپیروں کا دیش ہے۔ یہاں راجے مہاراجے بھی رہتے ہیں اور سادھو اور جادوگر بھی۔ ایک طرف ایک سادھو اپنے بدن پر اژدہے کا بچہ لپیٹے تھا۔ وہ ادھر ڈر کے مارے نہیں گئی اور اچھا ہی ہوا کیونکہ آگے ناگھا (مادر زاد ننگے) سادھوؤں کا ایک گروہ بیٹھا تھا۔ جہاں عورتیں ان سادھوؤں پر ہار پھول چڑھا رہی تھیں۔ ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کا ایک رُخ یہ بھی ہے۔

ہم آگے بڑھے تو کھڑتال بجا بجا کر ایک نابینا انگریز پادری حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سنا رہا تھا اور پمفلٹ بھی انگریزی اور ہندی میں بانٹ رہا تھا۔ پھر ہارمونیم پر ایک بھجن گانے لگا جس کے بول تھے۔

ع میرا یسوع مسیح گڈریا

I am shepherd and you are my sheep

ہم لوگ ادھر سے گنگا تٹ پر چلے گئے جہاں اتنی سردی کے باوجود رات میں لوگ گنگا میں کود کود کر نہا رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت کو دیکھا کہ نہا کر کانپتی ہوئی نکلی اور بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کپڑے کیوں نہیں بدلتی اور سردی میں کانپ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں چاند اپنی بسنتی نقاب اٹھا کر نمودار ہوا اور پھر ایک شور ہوا۔ سیکڑوں مرد عورت چاند کو نکلتے دیکھ کر پھر گنگا میں کود گئے۔ ہر طرف کھڑتالوں اور گھنٹوں کا شور بلند تھا اور نہانے والا مجمع تیزی سے پانی میں کود رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ پورنماشی کی چاندنی میں گنگا جی میں نہانے کا کئی گن ثواب ملتا ہے۔ جرمن بہو کے لئے یہ سب خواب اور حیرت کی دنیا تھی۔ ہم وہاں ایک بجے رات تک ٹہلتے رہے۔ یہاں سردی کا احساس اس لئے بھی کم تھا کہ گنگا سے پانی کی بھاپ اٹھ اٹھ کر فضا کو گرم بنائے تھی اور کچھ مجمع کی

www.taemeernews.com

بھی گرمی تھی۔ عامی اسے گنگا جی کا چمتکار سمجھتا ہے۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں الہ آباد کے سول لائنز میں کرسمس بڑے زور شور سے منایا جاتا تھا۔ اس وقت شہر کے تمام بڑے افسر صرف انگریز ہوا کرتے۔ کرسمس میں چھوٹے درجے کے اہل کار اور معمولی افسر بھی صاحب کے گھر ڈالی لے کر کرسمس کے دن جاتے تھے۔ اور صاحب کو کرسمس کی مبارک باد "ہے پی کرسمس" کہہ کر دیتے تھے۔ کم پڑھے لکھے لوگ "ہے پی کشمش" کہتے تھے۔ ان کو کرسمس 'کشمش' ہی سمجھ میں آتا تھا۔ ڈالی لگانا اس وقت کی خاص رسم تھی جسے آج کی نسل نہیں جانتی۔ تبھی تو اکبر الہ آبادی نے اپنے ڈھنگ کا وہ مشہور شعر اسی اشارے کے ساتھ کہا تھا۔

رہزنِ دل بن گئی ہیں، اب یہ کھٹیھڑ والیاں　　　میں لگاؤں گا گُلِ داغِ جگر کی ڈالیاں

ان ڈالیوں میں پھول پھل بھرے ہوتے تھے۔ اور صاحب اس سے خوش ہوتے تھے۔ تمام سول لائنز جہاں تقریباً نوے فی صد انگریز رہا کرتے کرسمس کے موقعے پر دلہن کی طرح سجا ہوتا ہر سڑک پر غبارے اور پھولوں کی جھڑیاں سجائی جاتی تھیں۔ یہاں ایک دلچسپ نکتہ اور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے ہر بڑے اور چھوٹے شہر میں 'سول لائنز' کی تاسیس ضرور کی۔ جہاں عموماً انگریز عملہ اور اس کا خاندان رہتا تھا۔ اور یہ بھی کہ یہی مقام مہذب (Civil) لوگوں کے رہنے کا ہے۔ باقی پورا شہر غیر مہذب لوگوں کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی عیسائی بھی عام محلوں میں رہنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے۔ پھر وہ متمول طبقہ یا نوکری پیشہ جو انگریزوں کی طرح رہنا چاہتا ہو، اُسے شہروں کے عام محلوں کو چھوڑ کر سول لائنز ہی میں سکونت اختیار کرنا چاہیے۔ خیر یہ بھی ایک ضمنی بات آ پڑی۔

الہ آباد کے سول لائنز کے مغربی کونے پر ایک گرجا گھر، آل سینٹس کیتھیڈرل نام کا ہے۔ ایسا خوبصورت گرجا گھر، سوا ویسٹ منسٹر ایبے کے میں نے لندن میں اور کہیں نہیں دیکھا انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اگرچہ اب اس گرجا گھر کا وہ رکھ رکھاؤ نہیں رہا۔ مگر یہ اب بھی

www.taemeernews.com

معماری کا حسین نمونہ ہے۔ اس کے مغربی دروازے کی طرف اوپر چوکٹ وُدار روشن دان بنا ہے۔ اس کی مثال مجھے صرف پیرس کے گرجا گھر 'نوتری دام' ہی میں دکھائی دی! الٰہ آباد میں انگریزوں کی بنائی ہوئی کوئی عمارت اتنی خوبصورت نہیں ہے۔ ہاں اس کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کا میور کالج اور اس کا ٹاور ہے جو یقیناً آکسفرڈ یونیورسٹی کے ٹاور سے زیادہ خوبصورت ہے اور میور کالج جیسی بلڈنگ بھی آکسفرڈ کے کسی کالج کی نہیں ہے۔ کیمبرج کا بھی کوئی کالج اتنا شیک اور خوبصورت نہیں بنا۔ الٰہ آباد کے چوک میں بھی ایک گرجا گھر مسلمانوں کی مسجد کے مقابلے میں بنایا گیا مگر یہ گرجا گھر قطعی خوبصورت نہیں بلکہ بھدا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ گرجا گھر اسی جگہ بنایا گیا جہاں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سیکڑوں بے گناہوں کو ایک نیم کے پیڑ میں لٹکا کر پھانسیاں دی گئی تھیں۔ ان نیم کے پیڑوں میں سے ایک نیم کا پیڑ آج بھی باقی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی گرجا گھر پر اکبر الٰہ آبادی نے وہ ذو معنی مصرعہ کہا تھا جو یوں ہے۔ ع الٰہی خانۂ انگریز گرجا (مجھے محقق نہیں کہ یہ مصرعہ اکبر کا ہے۔ مگر میں نے بزرگوں سے یہی سنا ہے)۔ یہ بیان واقعہ بھی ہے اور بد دعا بھی۔ ایہام میں بھی تو مزہ ہے۔ جس کا مزہ آج کل فلمی گانے والے بھی اٹھا رہے ہیں۔

۱۸۷۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کی بنیاد، میور کالج کی شکل میں رکھی گئی۔ اور اس تعلیمی ادارے کو مشرق کی آکسفرڈ Oxford of the East کا نام دیا گیا۔ واقعی الٰہ آباد کے میور کالج اور آکسفرڈ میں کافی مشابہت ہے۔ دونوں پتھر کی عمارتیں ہیں اور دونوں کی بناوٹ میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ یہاں کا اندر کا لان بھی آکسفرڈ یونیورسٹی کے لان ہی کی طرح بنایا گیا ہے۔ مگر اس کی طرح الٰہ آباد یونیورسٹی میں دیکھ ریکھ کہاں! لیکن کمرے میور کالج کے بہتر ہیں۔ مگر آکسفرڈ کی بوڈلین لائبریری کا آڈیٹوریم اور اندرونی حصہ میور کالج کی لائبریری سے اچھا ہے۔ تاہم آکسفرڈ میں کوئی ہال دربھنگہ جیسا خوبصورت نہیں۔ افسوس کہ آج میور کالج کا یہ ہال بھی طلبا کی دست

www.taemeernews.com

دستبرد کا شکار ہو گیا۔ سارے رنگین شیشے طلبا نے توڑ ڈالے۔

خالص دیسی تعلیم کے کالج یا مدرسے الہ آباد میں نہیں ہے۔ مسلمانوں نے تو اپنی مذہبی تعلیم کے لئے کچھ مدرسے کھولے۔ مگر ہندوؤں نے خالص سنسکرت کی تعلیم کا کوئی پاٹھ شالہ الہ آباد میں کبھی نہیں کھولا۔ نہ آزادی سے پہلے ایسا کوئی معقول اور مشہور پاٹھ شالہ تھا اور نہ آج ہے۔ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ سنسکرت کا علم حاصل کرنے کا مرکز ہمیشہ سے بنارس رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شاید یہاں کے پنڈتوں نے اپنا سارا زور صرف سنگم اور گنگا جی پر لگا رکھا ہے۔ ابھی کچھ برس پہلے گنگا ناتھ جھا کے نام پر ایک سنسکرت کے ریسرچ کا انسٹی ٹیوٹ کھولا گیا ہے۔ مگر سنسکرت کی ابتدائی تعلیم کا الگ سے کوئی انتظام نہیں۔ ہاں مسلمانوں کے تعلیمی مدرسے پہلے بھی کچھ قائم تھے اور آج بھی ہیں۔ جن میں شاہ وصی اللہ کا مدرسہ، مدرسۂ سبحانیہ، مدرسہ مسجد اعظم خاں محلہ دریاآباد۔ جو غالباً الہ آباد کا سب سے پرانا مذہبی مدرسہ ہے جسے دریاآباد کے اعظم خاں نے بنوایا تھا۔ جن کا تعلق نواب ارادت خاں کے خاندان سے تھا۔ اس مدرسے میں آج بھی بہار اور بنگال کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر الہ آباد کے بہت کم طلبا یہاں آتے ہیں۔ یہ طلبا علوم جدیدہ خصوصاً مغربی علوم سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ روشن باغ محلہ میں حال ہی میں ایک مدرسہ غریب نواز کھل گیا ہے جہاں طلبا کی ایک بڑی تعداد تعلیم پا رہی ہے۔ ایک اور مدرسہ شیعی مسلک کا انوار العلوم کے نام سے حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ اس میں بھی زیادہ تر باہر ہی کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں بھی مغربی علوم کو تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔ علم فقہ، علم حدیث اور شیعی مسلک کے دوسرے شعبوں کی تعلیم یہاں دی جاتی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مغربی علوم بھی ان لوگوں کو سکھائے جاتے کہ یہاں کے طلبا مولوی بننے کے علاوہ بھی کارزارِ حیات میں کچھ کارنامے دکھا سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ حصولِ زر کے لئے اس وقت مولوی بننے سے بہتر کوئی اور پیشہ نہیں۔ مگر دنیا کی قومیں صرف پادری اور مولوی بن کر ہی زندہ نہیں رہیں۔

www.taemeernews.com

ہاں پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپ میں بھی پادری، ڈین اور کارڈینل ہونا ہی ہر عیسائی کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ شاید ہندوستان اور برصغیر کے مسلمان ابھی پندرہویں اور سولہویں صدی میں زندہ ہیں۔ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اس کمپیوٹر اور روبوٹ (Robot) کے دَور میں ان کا کتنا حصّہ ہوگا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دینی تعلیم تو عربی، فارسی ہی کی مدد سے ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے ان مدرسوں میں مشرقی علوم پر زیادہ زور ہے۔ مگر عالم، اگر متدیّن اور باعمل بنتا ہے تو علم اور تعلیم کا صحیح مصرف بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر عالمِ دین بھی ایک عامی کی طرح بے ایمانیوں اور دھوکہ دھڑی کا شکار ہو جائے تو پھر مذہبی علم بھی کتنی عاقبت سنوارے گا؟ یہاں ایک قصّہ بیان کرنے کا جی چاہتا ہے۔ میرے جاننے والوں میں ایک بزرگ کسی ڈاکخانے میں کام کرتے تھے۔ ریٹائر ہوئے تو ایک دن میرے پاس آئے اور کہا کہ ایک شعر سن لیجئے۔ میں حیران کہ انھیں کیا سوجھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ شاعری کرتے ہیں۔ بولے کہ نہیں۔ مگر میرے ایک مولانا عزیز نے مجھے شاعر بنا دیا ہے۔ جنہوں نے میری جائداد کا بہت سا حصّہ ہڑپ کر لیا ہے۔ میں نے انھیں کے کردار پر یہ شعر کہا ہے۔ شعر یوں تھا۔

منبر سے دَم بھرتے ہیں وہ محبت اہلِ بیت کی
اور پیروی کرتے ہیں خود آلِ ابو سفیان کی

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے کہا حضرت یہ شعر کہاں ہوا۔ بولے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ میں نے مولانا کا کردار تو اس میں واضح کر دیا۔ تو بہ روپیہ جمع کرتے ہیں۔ دوسروں کی جائداد غصب کرتے ہیں اور سود پر روپیہ چلاتے ہیں۔ پھر مجلسیں بھی پڑھتے ہیں اور ہر وقت قَالَ اللّٰہ وَقَالَ الرّسُول بھی کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھئی یہ ان کا انفرادی کردار ہے۔ اس میں دینی تعلیم کہاں سے آتی ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ اُن کو قرآن کی یہ آیت سنا دیجئے۔

www.taemeernews.com

"جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور راہ خدا میں نہیں دیتے انھیں سخت ترین عذاب کی بشارت دے دو۔"

اگر ان میں کچھ ایمان کی رمق ہے تو راہ راست پر آجائیں گے۔ کہ قرآن حکیم کا حکم ہر مسلمان کے لئے ہے۔ جب تک وہ اپنے کو مسلمان کہتا ہے۔ معلوم نہیں کہ پھر کیا ہوا۔

۱۹۵۲ء میں میں نے اردو میں ایم۔اے پاس کیا۔ میرا فرسٹ ڈیویژن تھا اور پوری یونیورسٹی میں تمام فیکلٹی میں دوسری پوزیشن تھی۔ مجھے کوئن امپرس وکٹوریہ میڈل ملا۔ مجھے اتنے نمبر ملے کہ اس وقت تک کا اردو میں یونیورسٹی کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ اور یہ ریکارڈ بی۔اے کی طرح پھر سید احتشام حسین ہی کا تھا۔ مگر اس سے کیا۔ سید احتشام حسین نے علم و ادب کی دنیا میں وہ ترقی کی کہ میں تو ان کا پاسنگ بھی نہیں۔ اب تو وہ وقت لگا ہے کہ تمام حقیر و فقیر بھی کوس لمن الملک الیوم بجاتے پھرتے ہیں۔ وہ ٹٹ پونجیے جو صحیح اشعار کیسے صحیح نثر بھی نہیں پڑھ سکتے وہ بھی اپنا شمار ادیبوں اور ناقدینِ ادب میں کر رہے ہیں۔ اور اپنا درجہ احتشام حسین سے بھی اس لئے بڑھاتے ہیں کہ احتشام حسین نے "صرف مضامین ہی لکھے ہیں۔ کوئی مکمل کتاب وہ کہاں لکھ سکے" مگر تیز زمانہ سب سے بڑا پارکھ ہوتا ہے۔ صحیح فیصلے وہی کرتا ہے۔

جولائی آئی تو میرے اساتذہ نے مجھے بھی ریسرچ جوائن کرنے کی صلاح دی۔ اب گائیڈ کا مسئلہ در پیش ہوا۔ ابھی تک اعجاز صاحب ہی میری زندگی اور تمام علمی ادبی دلچسپیوں کے گائیڈ تھے۔ مگر اب مشکل یہ آپڑی کہ اس وقت کے چلن کے مطابق، صرف صدر شعبۂ اردو ہی ریسرچ کا گائیڈ عموماً ہوا کرتا۔ پھر اردو میں طلبا کی قلت۔ میں اکیلا ریسرچ کرنے پر آمادہ۔ میں نے درخواست دی کہ "اردو ادب کی سماجی تاریخ" پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ انگریزی کا جو تھوڑا بہت مجھے چسکہ لگا تھا اس کے تحت میں اردو ادب کی تاریخ کو ٹریویلین کے طرز پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں صدر شعبہ، پروفیسر ضامن علی سے ملا۔ اور جب میں نے ان سے اپنا مدعا اور موضوع بیان کیا تو وہ یہ موضوع

www.taemeernews.com

سُن کر تقریباً ششدر رہ گئے۔ کہ یہ کیا موضوع ریسرچ کے لئے ہوا؟! بھلا شعر و ادب کی سماجی تاریخ کیا ہو سکتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے تمہیں کمیونسٹ والوں (وہ کمیونسٹ کو ہمیشہ کمیونسٹ والا ہی کہتے تھے) نے بہکا دیا ہے۔" ضامن علی صاحب بے حد مہذب اور کڑھے ہوئے آدمی تھے۔ ادب کے معاملے میں بھی ان کے اپنے کچھ نظریات تھے۔ یہ موضوع ان کو نہایت غیر ادبی لگا۔ اور بولے کہ ابھی غور کر لو، پھر کوئی اچھا سا موضوع لے کر کام کر ڈالو۔ غرض کہ یہ مسئلہ اسی طرح اگست ستمبر تک چلتا رہا۔ پھر ایک دن انھوں نے حکم دیا کہ اُردو مثنویوں پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے۔ یہی موضوع لے لو اور اسی پر کام کر ڈالو۔ بہرحال چند ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد اعجاز صاحب نے یہی رائے دی کہ یہی موضوع لے لو ورنہ ریسرچ نہیں ہو سکتی۔ مجبوراً کچھ کتر بیونت کے بعد موضوع طے ہوا "اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۰ء تک" اور اس پر میں نے کام شروع کیا۔ ریسرچ میں اب سیناپسس کا مسئلہ درپیش ہوا۔ کم از کم پانچ چھ سیناپسس میں نے اعجاز صاحب کی مدد سے بنائیں۔ مگر ضامن علی صاحب کو کوئی پسند نہ آتی اور خود وہ کچھ بتاتے نہ تھے۔ آخر کسی طرح مارچ کے مہینے میں انھوں نے سناپسس پاس کی اور میں نے کام شروع کر دیا۔ مگر ضامن علی صاحب آٹے دن بیمار رہنے اور میں جو کچھ کام کرتا، اعجاز صاحب کو خاموشی سے دکھا دیتا۔ اور پھر یہ کام اعجاز صاحب ہی کی نگرانی میں پورا ہوا۔ اور ۱۹۵۵ء میں مجھے ڈی۔ فل کی ڈگری مل گئی۔ ضامن علی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور اب اعجاز صاحب، صدر شعبۂ اُردو تھے۔ اعجاز صاحب نہ صرف میرے استاد تھے بلکہ میرے مربی اور محسن بھی تھے۔ علمی اعتبار سے زمانہ جس طرح چاہے ان کا محاسبہ کرے۔ مگر بہ حیثیت انسان اعجاز صاحب کا جواب مشکل سے ملے گا۔ میرے علم و ادب کے شوق کو مہمیز کرنے میں جتنی مدد اعجاز صاحب نے کی ہے اتنی کون کر سکتا تھا؟ یونیورسٹی میں بھی انھیں کی مدد سے شعبۂ اردو میں جگہ ملی اور میرا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی انھیں کی رہنمائی میں مکمل ہوا۔ جگہ کی صورت یہ ہوئی

www.taemeernews.com

کہ جنوری ۱۹۵۲ء میں جب کرسمس کی چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھلی تو ضامن علی صاحب بیمار تھے۔ انھوں نے بیس دن کی چھٹی لی۔ اُس زمانے میں یونیورسٹی تعلیم و تدریس کے معاملے میں بے حد مستعد رہا کرتی تھی۔ ابھی انگریزوں کو گئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ ضابطے اور نظام سے سب کام چل رہے تھے۔ اس لئے کلاس کا نہ ہونا سخت معیوب اور بدانتظامی میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ بیس دن کی چھٹی پر اعجاز صاحب نے میرا نام تقرر کے لئے ڈین کو بھیج دیا کہ درس و تدریس کی ساری ذمے داری پہلے بھی ڈین ہی کی ہوا کرتی تھی۔ اعجاز صاحب چاہتے تو میرے بجائے کسی دوسرے کا نام بھی بھیج سکتے تھے۔ مگر انھوں نے میری لیاقت اور میرے حالات کا لحاظ کیا اور ایک اچھے طالب علم کی مدد کی۔ اس طرح شعبۂ اردو الہ آباد میں میرا پہلا تقرر بیس دن کے لئے ہوا۔ مگر پھر ضامن علی صاحب کی علالت طول کھینچتی گئی۔ وہ برابر چھٹی لیتے گئے اور ادھر میری ملازمت میں توسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں ضامن علی صاحب نے یونیورسٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ میں اس صورت میں مستقل تو نہیں ہوا مگر میری عارضی ملازمت کسی سلیکشن کمیٹی ہونے تک پکی ہو گئی۔ یہ میرے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔

○

www.taemeernews.com

نیا اُفق اور نئی منزلیں

میرا قیام محمود منزل دریا آباد ہی میں تھا۔ نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں ایک رئیسِ شہر تھے۔ اپنے نام کی رعایت سے انھوں نے اپنے مکان کا نام محمود منزل رکھا تھا۔ وہ نواب میر اسحاق ارادت خاں کی اولاد میں سے تھے۔ نواب ارادت خاں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں الہ آباد کے صوبے دار بھی رہ چکے تھے اور یہ عہدہ ارادت خانی المعروف میر محمد باقر ارادت خاں اوّل سے ملا تھا۔ جنھیں نواب شاہنواز خاں نے اپنی مشہور تاریخ مآثر الامرا میں ساداتِ ... کے سادات میں سے لکھا ہے۔ ارادت خاں پنج ہزاری خطاب تھا۔ اسی خطاب کی رعایت سے میر اسحاق اور میر ہدایت، سبھوں نے ارادت خاں خود کو کہلانا زیادہ پسند کیا۔ اور "میر" ان کے ناموں سے چھوٹ گیا۔ شاید ان جنگ جویوں کو 'میر' لفظ میں مظلومیت زیادہ نظر آئی ہو گی اور 'خان' میں بہادری کا اعلان۔ چنانچہ حسب نسب پر غالب آ گیا۔ تاہم میر ہدایت ارادت خاں تک 'میر' کا لفظ نام کا جزو بنا رہا۔ کس منزل پر ان کے خاندان والوں نے 'میر' کا لفظ چھوڑ دیا کہہ نہیں سکتا۔ اب ارادت خاں کی پوری نسل کو لوگ 'خوانین' سمجھتے ہیں اور یہ لوگ بھی بڑے افتخار کے ساتھ اپنے ناموں میں 'خان' کے لفظ کو جزوِ نام بنائے ہوئے ہیں۔ یہ 'بہادری' کے اظہار کا خبط یہاں تک بڑھا کہ اسی خاندان کے ایک فرد نے ایک مجلس میں یہاں تک پڑھ دیا کہ اپنی بہادری کی وجہ سے افغانستان کے بہت سے پٹھان یزید کی فوج میں بھی ملازم ہو گئے تھے۔ (افغانستان کے پٹھانوں کا فوجِ یزید میں شامل ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت مجھے نہیں ملا۔ نہ کسی مقتل میں اس کا تذکرہ ہے اور نہ کبھی کسی سے ایسی روایت سننے میں آئی۔)

آغا علی خاں ایک بُردبار، متوازن اور علم دوست انسان تھے۔ انگریزوں کے

www.taemeernews.com

زمانے میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ گورنر جنرل آف انڈیا نے 'خان صاحب' کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ پھر وہ بہت دنوں تک الہ آباد کے آنریری اسپیشل مجسٹریٹ بھی رہے۔ پھر ممبر کورٹ آف وارڈس اور یو۔پی زمیندار اسوسی ایشن کے نائب صدر تاحیات رہے۔ ہر ایک سے اخلاق اور جھک کر ملنے کی ایسی عادت تھی جس نے انھیں پورے صوبے میں ہر دل عزیز بنا رکھا تھا۔ جیسا کہ اس دور کے رئیسوں کا طور طریقہ تھا۔ خانصاحب آغا علی خاں بھی اپنے گھر پر اکثر شعری نشستیں کرتے۔ وہ خود بھی شاعر تھے اور دریا آباد میں اُن کے گرد روایتی قسم کے شعرا کا ایک جمگھٹ رہا کرتا۔ اسی ذوق و شوق نے اُن سے الہ آباد کی مشہور انجمن 'روح ادب' کی تاسیس بھی محمود منزل میں کرائی جو بعد کو سر تیج بہادر سپرو کی سرپرستی میں ترقی کرتی رہی۔ جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ راقم الحروف نے جوش، فراق، شفق، ثاقب اور نئی نسل کے شعرا میں مجاز اور مجروح کو یہیں نشستوں میں شامل ہوتے دیکھا ہے۔ مجروح صاحب نے اس زمانے میں ایک گیت نما نظم لکھی تھی جس کا ٹکڑا تھا "گائے جا پپیہے گائے جا" جسے وہ بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ سناتے تھے۔ یہ غالباً ۴۱-۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ مجاز نے :-

تو اسنجانِ سنگم کو خبر دو — کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

اسی محمود منزل میں پڑھی تھی۔

آغا علی خاں صاحب کے یہاں کچھ خصوصی نشستوں کے علاوہ نجی محفلیں بھی شام کو ہوا کرتیں۔ جن میں شرکت کرنے والے زیادہ تر دریا آباد ہی کے شعرا ہوتے جن میں، شاداں، محسن اور استاد ناظم عرف نجم میر صاحب خاص ہوا کرتے۔ شاداں صاحب مدتوں لاہور اور بمبئی میں رہے۔ لاہور میں علامہ اقبال کی صحبتوں میں بھی انھیں بیٹھنے کے موقعے ملے تھے۔ چنانچہ اقبال کی زمینوں میں بھی انھوں نے کچھ غزلیں کہی تھیں۔ وہ ایک کھلے ذہن کے جہانیانِ جہاں گشت قسم کے آدمی تھے۔ مشرقِ وسطیٰ اور ایران وغیرہ آنکھیں کھول کر گھومے تھے۔ ان کا شعری ذوق بہت صاف ستھرا تھا۔ سیاہ رنگت فربہ بدن اور

www.taemeernews.com

بے حد خوش مزاج۔ شعر سمجھ بوجھ کر کہتے۔ بہت کم شعر سناتے مگر محفل آرائی کا اچھا ذوق تھا۔ ہم لوگوں سے ہمارے ہم سنوں جیسا برتاؤ کرتے مگر اپنی بزرگانہ منزل بھی قائم رکھتے ہمارے اور ان کے درمیان شعر و شاعری کے علاوہ وجہ اشتراک ٹینس (Tennis) بھی تھی جس کے وہ بڑے شوقین تھے۔ فربہ بدن ہونے کی وجہ سے ٹینس میں زیادہ دوڑ تو نہ سکتے۔ مگر ٹینس اپنے ڈھنگ سے لاب (LOB) کر کے کھیلتے۔ آغا علی خاں صاحب خود بھی ٹینس کے شوقین تھے۔ محمود منزل کے ایک کونے میں ٹینس کورٹ بھی تھا جس پر ٹینس کا کھیل ختم ہونے کے بعد کبھی کبھی شعر و سخن کی محفل بھی جم جایا کرتی۔ محمود منزل کے ٹینس کورٹ پر ہندوستان کے کئی مشہور کھلاڑی اس وقت کے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ جن میں غوث محمد اور سُمنت مسرا خاص ہیں۔ اور بھی بہت سے ہندوستان کے شہرت یافتہ ٹینس کے کھلاڑی آتے رہتے تھے۔ راقم الحروف نے بھی یہیں سے ٹینس کھیلنا سیکھا اور بعد کو یونیورسٹی کے ٹینس کورٹ پر مدتوں ٹینس کھیلتا رہا۔ اگرچہ میں ٹینس میں اوسط درجے ہی کا کھلاڑی ہمیشہ رہا۔ یونیورسٹی میں میرے دوست شیام کمار سیٹھ جو فلاسفی کے شعبے سے ریڈر ہو کر ریٹائر ہوئے، سب سے اچھے کھلاڑی تھے۔ ایک اور اچھا کھلاڑی بھاسکر مسرا بھی تھا۔ سیٹھ صاحب اور بھاسکر مسرا کا کھیل میں کوئی جواب نہ تھا۔

آغا علی خاں صاحب شعر و شاعری کے ساتھ تہذیبی جلسوں کے بھی بڑے شوقین تھے۔ سر تیج بہادر سپرو سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ اس طرح مشاہیر شعرا سے لے کر کانگریس کے لیڈروں تک سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ جواہر لعل نہرو کی چیرمینی کے زمانے میں الہ آباد میونسپلٹی کے میونسپل کمشنر بھی رہ چکے تھے۔ اگرچہ وہ سیاسی آدمی نہ تھے مگر ان کا جھکاؤ ہمیشہ کانگریس کی طرف رہا۔ شاعر تو وہ روایتی قسم کے تھے۔ مگر شعر فہمی اور ادب نوازی کا ان کو اچھا سلیقہ تھا۔ ان کے مرنے پر ہر آدمی کی زبان پر یہی تھا کہ آج دریا آباد سے اخلاق اٹھ گیا۔

محمود منزل کی شعری محفلوں میں جو مستقل طور سے شرکت کرتے ان میں محسن زماں

www.taemeernews.com

خاں، استاد ناظم عرف نجم میر صاحب اور حکیم نذیر حسن عرف مولوی ڈنا خاص تھے۔ محسن خاں اصلاً مزاحیہ شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے ہمیشہ خود کو سنجیدہ غزل کا شاعر بنانے کی فکر کی مگر یہ بات بھی ہے کہ ان کا ذہن مزاحیہ رنگ میں خوب چلتا تھا۔ پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن نے ایک مرتبہ ایک سنجیدہ مشاعرے کے لئے طرح کا مصرعہ دیا۔

ع زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے۔

اس مصرعے پر محسن خاں نے مزاحیہ رنگ میں کچھ اشعار مشاعرے میں پڑھ دیئے۔ دو اشعار یاد ہیں۔ غزل پر عنوان یوں لگایا کہ یہ غزل بہ زبان افیون ہے۔ شعر یوں ہیں:

چسکی پینے کے لئے رہنے کو گھر دیتی ہے　　بیوی اچھی ہے مگر بیٹھ کے دھر دیتی ہے

کھاکے افیون جو پینک میں ڈھنگ جانا ہو　　"زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے"

ایک "بومیہ" مشاعرے کا مطلع تھا۔

چمن میں شور ہے محشر بپا ہے تھانے میں　　گھسا ہے بوم جو بلبل کے آشیانے میں

استاد ناظم اور محسن خاں میں خوب چوٹیں چلتی تھیں۔ استاد ناظم اپنے ایک خاص فن کے یقیناً استاد تھے۔ بے ربط، انوکھا اور دلچسپ خیال نظم کرنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا استاد انھیں اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ اس لقب سے بے حد خوش ہوتے۔ یہاں تک کہ اپنے سونٹے پر بھی 'ناظم استاد' کسی سے کندہ کرالیا تھا۔ انھیں سنجیدہ شاعری کا بہت زیادہ درک نہیں تھا۔ مگر محفل گرم رکھنے کے لئے اچھا مسالہ تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں راقم ان کا مداح نمبر ۱ اور میرے دوست آغا صاحب فتح پوری مداح نمبر ۲ تھے۔ ان دنوں ان کا حسب ذیل قطعہ بہت مشہور ہوا تھا جو اب بھی اہل الہ آباد کو یاد ہے۔ قطعہ یوں ہے:

تھا موسم بہار شجر جھوم رہے تھے　　ساحل پہ حسینوں کے پرے گھوم رہے تھے

دریا پہ نظر آیا جو پریوں کا اکھاڑا　　ناظم بھی کھڑے توم تنا توم رہے تھے

اس قطعے میں جمنا کے گھاٹ پر ایک میلے کا اشارہ ہے۔ جہاں ایک خاص موقعے پر عورت

www.taemeernews.com

مرد سب نہاتے ہیں۔ 'پریوں کا اکھاڑا' نہاتی ہوئی عورتیں ہیں۔ اور "توم تنا توم" کوئی موسیقی کا اشارہ ہے۔ ایک اور قطعہ اسی طرح کا یوں ہے۔

کبھی انھیں نے یہاں ہم کو آکے دیکھ لیا — کبھی ہمیں نے وہاں اُن کو جاکے دیکھ لیا

پھر مجمع کو مخاطب کرکے بڑے ڈرامائی انداز میں کہتے

"پھر جب مشکل پڑی اور معشوق نے آنا بند کردیا۔ تب؟!"

پتنگ بنایا، شبک آئینہ لگایا ہے — تمہارا عکس اسی میں اُڑا کے دیکھ لیا

استاد ناظم کو جب میں نے دیکھا تو ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی رہی ہوگی۔ دھان پان آدمی تھے، مگر سرخ و سفید رنگت۔ چہرے پر سائیکل کے ہینڈل کی طرح مڑی ہوئی سفید مونچھیں تھیں۔ ایک خاص لہراتی ہوئی بلغمی آواز میں اشعار پڑھتے تھے۔ ہر وقت پان کی گلوری منہ میں دبی ہوتی۔ مگر اس عمر میں بھی بغیر جھینپے کے سب کچھ پڑھ لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک نشست تھی جس میں قافیے شکار، کنار وغیرہ تھے۔ نجم میر صاحب نے مطلع غزل کا پڑھا۔

بنگلہ جو اپنا اے دل دریا کنار ہوتا — دریائی عورتوں کا کیسا شکار ہوتا!!

محفل زعفران زار بن گئی۔ لوگ سروقد کھڑے ہوگئے اور یہ شعر استاد ناظم سے اتنی بار سامعین نے پڑھوایا کہ استاد تو دبے دم ہوگئے۔ اس عمر میں ایسے جوان شعر کہنا اور پھر انھیں سنجیدگی سے پیش کرنا نجم میر صاحب کا کمال تھا۔ "دریائی عورتوں" سے ان کی مراد جل پریاں تھیں اور شکار تو دریا کنارے ہوتے ہی ہیں۔ یہ سب رعائتیں بھی تھیں۔
پروفیسر ضامن علی کے یہاں ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ ہم لوگ طلبا کی حیثیت سے سننے چلے جاتے
ایک مشاعرے کا مصرعہ طرح تھا۔ ع کب تلک اس شوخ کی زلف معنبر دیکھئے
نجم میر صاحب نے بلغم میں پھنسی پھنسی آواز میں ایک کانپتے ہوئے لحن کے ساتھ اپنی بیت الغزل یوں پیش کی ؎

جی دہلتا ہے فضا میں باز دہری دیکھ کر — نامہ لے کر آتا ہے شاید کبوتر دیکھئے!

www.taemeernews.com

جس نے کبوتر بازی نہیں کی ہے وہ اس شعر کے رموز و نکات نہیں سمجھ سکتا۔ کبھی کبھی استاد ناظم کوئی باریک شعر بھی کہہ جاتے تو بڑا حرج ہوتا۔ مثلاً ایک محفل میں انھوں نے دَم، زمزم اور رَم کے قافیوں میں ایک شعر یوں نظم کر دیا ؎

عرق آلودہ رُخ پر اس طرح کاکل میں بل کھاتے
کہ افعی چاٹنے کو جس طرح شبنم نکلتا ہے

مگر ان کے حریف ایسے شعروں کے لئے کہتے کہ یہ کسی استاد کی غزل سے اُڑایا ہوا شعر ہے ہم نے استاد کی استادی دیکھنے کے لئے ایک مصرعہ انھیں دیا۔ جس کے قافئے اور ردیف تھے۔ صنم چھپا چھپ، قدم چھپا چھپ۔ دوسرے دن استاد ناظم غزل لکھ لائے۔ مطلع تھا

ہو جتنی قوت بھی تجھ میں ناظم، چلائے جا تو قلم چھپا چھپ
جواب نامہ دیا ہے ہم نے وہ کھا رہا ہے قسم چھپا چھپ

کچھ اور شعر اس غزل کے یوں تھے ؎

کوئی تو احرام باندھتا ہے، کوئی مدینے کو جا رہا ہے
مسافر آئے ہیں منزلوں سے وہ چومتے ہیں حرم چھپا چھپ

اور بیت الغزل یوں پیش کی ؎

میں شیر بن کر جو اس پہ لپکا مثال آہو کے وہ بھی بھڑکا
نہیں ہے بھولے وہ چوکڑی کو، وہ کرتا جاتا ہے رَم چھپا چھپ

آغا فتحپوری اور میں دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ استاد مسکرائے اور بولے کہ ابھی تم لوگ بچے ہو۔ یہ سب راز و نیاز کی باتیں ہیں ابھی تمہارے سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ اور استاد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ہم دونوں چھوٹے تھے اور استاد ناظم کی عمر اور سِن و سال کا تذکرہ تو میں نے پہلے ہی کر دیا ہے۔

آغا علی خاں صاحب کی نشستوں میں ایک عامل اور حکیم، مولوی نذیر حسن، دانا تخلص، ہوا کرتے تھے۔ وہ چھڑوں یعنی آزادوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حلیہ یہ تھا

www.taemeernews.com

ان کا عجیب و غریب ہوا کرتا۔ بر میں ایک میرزئی یا شلوکہ، کمر میں تہبند اور سر پر ایک سبز قصابہ، ہاتھ میں ایک سونٹا۔ آنکھوں پر ہمہ وقت ایک چشمہ۔ کیا غضب کا حافظہ اس شخص نے پایا تھا۔!! میں نے جب دیکھا تو ان کی عمر اسّی سال سے کچھ تجاوز کر چکی تھی۔ ان کا اصل وطن کراری تھا۔ مگر مدت ہوئی انھوں نے وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا اور اسی ہیئت گذائی سے کبھی رنگون، کبھی گجرات کبھی بمبئی جا نکلتے اور سب ان کا اسی بھیس میں بے حد احترام کرتے۔ اپنی اسی ہیئت پر انھوں نے ایک رباعی بھی کہہ رکھی تھی۔ جو یوں ہے:۔

یہ شان و شکوہِ خسروانی دیکھو — یہ ہیئتِ فتح و کامرانی دیکھو
عمامۂ سبز ہے، سیادت کا نشان — سادات کی مختصر نشانی دیکھو

حافظے کا یہ عالم کہ منبر پر جا کر دو دو، تین تین گھنٹے زبانی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مرثیے سناتے۔ درمیان میں اپنے مرثیے بھی انھیں میں شامل کر دیتے تو کسی کو پتہ نہ چل پاتا کہ کہاں سے میر انیسؔ کا مرثیہ ختم ہوا اور کہاں سے مولوی دلّنا نے اپنا مرثیہ شامل کر دیا۔ مزاج میں بے حد بذلہ سنجی تھی۔ کچھ مزاحیہ طرز کے مطلعے مرثیوں کے کہہ رکھے تھے۔ مثلاً

۱ع جب توشکِ فلک نے لپیٹا لحافِ صبح
۲ع جب رن میں ابن سعد کی بگھی الٹ گئی
۳ع جب نہر پہ اعدا نے سنگھاڑے توڑے نہ کانٹے جو لگے آنکھوں میں بھڑکے گھوڑے
۴ع اعدائے دیں جو مہوے کی لپسی لگا چکے
۵ع فوجِ یزید آتی ہے شکرم میں بیٹھ کر۔

ایک اور بیت یہ تھی:۔

اپنے سائے سے بھڑکتا ہے عجب گھوڑا ہے! — موت کی دھار کو سمجھا ہے کہ یہ کوڑا ہے

کچھ لکھ کر رکھا نہیں تھا۔ سب کچھ زبانی یاد تھا۔ اسی وجہ سے ان کا سارا کلام انھیں کے ساتھ دفن ہو گیا۔ چورانوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔ وہ بھی ایک یکّے کے حادثے میں۔ اپنی

www.taemeernews.com

مفلوک الحالی کے متعلق بھی ایک شعر کہہ رکھا تھا جس میں ساری رعائتیں تھیں۔ شعر یوں تھا ؂

پیس ڈالا آسیائے چرخ نے مولوی دتّا کو داتا جان کر

ع پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ (میرؔ)

(۷)

یونیورسٹی میں ملازمت ملتے ہی میری دنیا بدل گئی۔ خیالات اور شہرت کو پَر لگ گئے اس وقت یونیورسٹی کی ملازمت انتظامیہ کی کسی ملازمت سے کم نہ تھی۔ بلکہ انتظامیہ کی ڈپٹی کلکٹری سے بدرجہا بہتر سمجھی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ الہ آباد یونیورسٹی کے دو حضرات جو تقریباً ایک دو سال ڈپٹی کلکٹر رہے، اپنی ملازمت چھوڑ کر یونیورسٹی کی ملازمت حاصل کر کے یونیورسٹی آگئے۔ ایک صاحب انگریزی کے شعبے میں آئے اور ایک پولیٹیکل سائنس میں یوں تو فراقؔ صاحب نے بھی یہی کیا۔ مگر ان کا راستہ دوسرا تھا۔ راقم الحروف بھی اپنی ترنگ میں آئی۔ اے۔ ایس کا فارم بھر کر امتحان میں بیٹھ گیا۔ مگر جب انٹرویو کا موقع آیا تو اعجاز صاحب نے فرمایا کہ تمہیں اب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی ہے اسے چھوڑ کر کلکٹر اور کمشنر ہوتے کہاں جاؤ گے۔ جو مزہ پڑھنے لکھنے میں ہے وہ "صاحب" بننے میں کہاں؟! پھر کہا کہ الہ آباد میں کتنے ریٹائرڈ کلکٹر اور کمشنر رہ رہے ہیں۔ تم کتنوں کو جانتے ہو؟ یا کون کتنوں کو جانتا ہے؟ چھوڑو ان چکروں کو۔ استاد کی یہ باتیں میرے دل میں بیٹھ گئیں اور میں نے سب خیال ترک کر کے وہ پیشہ اختیار کر ہی لیا۔ جس کے لئے سیانوں نے کہا تھا کہ۔

ع لعنت ہزار بار بہ کارِ مدرّسی۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ واقعی پڑھنے لکھنے میں جو مزہ ہے اُسے پڑھنے لکھنے والے ہی جانتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پیشے میں بھی اب بہت سے جعلئے دَر آئے ہیں جو بہت سے جعل بنا بنا کر عالم بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ مگر خیر یہ تو کم و بیش ہر پیشے میں ہوتا ہی رہتا ہے۔

اب یونیورسٹی میری نظروں میں دوسری تھی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صدر شعبہ تھے اور

www.taemeernews.com

دوسرے اساتذہ میں دو۲ استاد ڈاکٹر رفیق حسین اور مسیح الزماں صاحب (جو اس وقت تک ڈاکٹر نہیں ہوئے تھے) تھے۔ اعجاز صاحب نے ٹائم ٹیبل میں رد و بدل مناسب نہ سمجھا اور مجھے وہی تمام کلاس دے دیئے جو ضامن علی صاحب پڑھاتے تھے۔ جس میں ایم۔ اے اور بی۔ اے کے کلاس تھے۔ ایم۔ اے کلاس میں مجھے اقبال پڑھانا تھا جو میرا محبوب موضوع تھا۔ اور تاریخ ادب اردو۔ یہ سب تفصیل لکھتے وقت مجھے تھوڑا تذبذب بھی ہے کہ عام قاری کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر کسی استاد کی حیثیت انھیں باتوں سے متعین ہوتی ہے اور شخصیت سازی میں بھی یہ ساری صورتیں معین ہوتی ہیں۔ ایم۔ اے کلاسوں نے مجھے بے حد مستعد کر دیا کہ مبادا کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ لیکن پھر یہی مستعدی۔ میری فطرت ثانیہ بن گئی جو تعلیم و تدریس کی آخری منزل تک قائم رہی۔

مسیح الزماں صاحب اور میری عمر میں تقریباً پانچ چھ سال کا فرق تھا۔ وہ چوک کے قریب محلہ سبزی منڈی میں رہتے تھے اور مجھے ان سے تقریباً ڈیڑھ کیلو میٹر آگے دریاآباد جانا ہوتا تھا۔ ہم لوگ تقریباً تین بجے اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار ہو کر شعبے سے چلتے باتیں کرتے ہوئے چوک تک آتے پھر اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہو جاتے۔ مسیح الزماں صاحب بے حد ذہین اور اس سے زیادہ زمانہ شناس آدمی تھے۔ میری ملازمت کے بعد وہ مجھے شاگرد سے زیادہ اپنا دوست سمجھنے لگے تھے۔ ہم لوگوں میں اب سب طرح کی باتیں ہوا کرتیں۔ موضوع تدریس تو اہم تھا ہی۔ مجھے وہ کتابوں کے نام بھی بتاتے اور کبھی کبھی لائبریری سے میرے لئے کتابیں نکلوا کر بھی لے آتے جن کی مدد سے میں طلبا کے لئے اسباق تیار کرتا اس وقت تک میں لباس کے معاملے میں بہت زیادہ باشعور نہیں تھا۔ مسیح الزماں صاحب ہی نے مجھے یونیورسٹی کے استاد کے باقاعدہ لباس کی طرف متوجہ کیا اور پھر میں نے یونیورسٹی کے اساتذہ کے شایان شان لباس سلوائے اور انھیں کی طرح ایک خوش پوش استاد بن گیا۔ اعجاز صاحب نے اپنی کتاب "میری دنیا" میں اسی خوش پوشی کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔ کلاس پڑھانے سے پہلے مجھے اعجاز صاحب نے ایک نصیحت کی اور کہا کہ اب تم

www.taemeernews.com

استاد ہوگئے ہو تو استاد کے کردار کا ہمیشہ لحاظ رکھنا۔ ہمارے شعبے کی روایت رہی ہے کہ طالب علم ہماری اولاد کی طرح ہوتا ہے۔ تمہارے کلاس میں لڑکے لڑکیاں سب ہوں گے۔ اس کا خیال رکھنا۔ استاد کی یہ نصیحت میں نے گرہ میں باندھ لی اور جیسے میں نے ملازمت سے سبکدوشی تک یاد رکھا اور اس پر عمل پیرا رہا۔

مسیح الزماں صاحب ایک زود رنج مگر زندہ دل آدمی تھے۔ زندہ دل کئی معنوں میں۔ لیکن یہ زندہ دلی عام آدمی پر عیاں نہیں ہوتی تھی۔ دور سے تو وہ خاموش اور لیئے دیئے قسم کے آدمی نظر آتے تھے۔ تاہم جب کوئی ان سے قریب ہوجاتا تب وہ اس سے کھلتے تھے۔ میں دھیرے دھیرے ان کے بہت قریب ہوتا گیا۔ ہم لوگوں میں اب سب طرح کی باتیں ہوتیں۔ یونیورسٹی کے ٹائم ٹیبل، ٹیکسٹ وغیرہ سے لے کر یونیورسٹی کے اساتذہ کے کچھ اسکینڈل وغیرہ سب کا ذکر ہوتا۔ انھیں دنوں ایک ڈسمل چند پانڈے کیس ہوا تھا۔ مسیح صاحب کو کہیں سے ان خطوط کی نقلیں مل گئی تھیں جو پانڈے لڑکیوں کو لکھا کرتا تھا اور جن کی بنیاد پر وہ یونیورسٹی سے برخاست ہوا تھا۔ ہم لوگ مسیح صاحب کے کمرے میں بیٹھ کر یہ خط پڑھتے اور ان کے مشمولات پر تبصرے بھی کرتے۔ پھر شعبۂ اردو میں مسیح الزماں صاحب نے تہذیبی جلسے کرنے شروع کئے۔ میں تو ایک کرم کتابی تھا۔ بھلا ان کی ان دلچسپیوں میں کہاں تک چل سکتا تھا۔ مگر وہ مجھے اپنے ساتھ لیئے رہتے۔ ہم لوگوں نے سب سے پہلے ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت تک صرف شعبہائے انگریزی اور ہندی ڈرامے اسٹیج کرتے تھے۔ شعبۂ اردو اور عربی فارسی کو مولویوں اور بے ذوق لوگوں کا شعبہ سمجھا جاتا تھا۔ بھلا یہاں ڈرامہ کہاں ہے! یہ لہو و لعب کی چیزیں، استغفر اللہ۔ مگر مسیح الزماں صاحب کی انتھک کوششوں سے ہم لوگوں نے خواجہ احمد عباس کا ایک ڈرامہ "احساس اور ایٹم بم" تیار کیا۔ سب سے بڑی مشکل زنانے رول میں پڑی۔ کوئی لڑکی رول کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ آخر ایک طالب علم فضل عباس نام کا، اس رول کو ادا کرنے کے لئے تیار ہوا۔ ڈرامہ اسٹیج کیا گیا اور

www.taemeernews.com

بڑا کامیاب رہا۔ اس کامیابی سے شعبۂ اردو یونیورسٹی کے تہذیبی نقشے پر نمایاں ہونے لگا۔ پھر ہم لوگوں نے دوسرا کامیاب شو، عصمت چغتائی کے ایک ڈرامے 'شامت اعمال' کا کیا۔ اور اس کا نام بدل کر 'بٹوا' رکھا کہ اس میں ایک 'بٹوے' کے چوری ہو جانے کی کہانی تھی۔ اب ہمیں ہیروئن کے لئے ایک خاتون بھی مل گئیں۔ ایک روز کسی نے ذکر کیا کہ سول لائنز میں لیلا (لی۔لا) کنسلا نام کی ایک عیسائی خاتون رہتی ہیں۔ انھیں ڈرامہ اور اسٹیج وغیرہ سے بڑی دلچسپی ہے۔ ایک دن مسیح الزماں صاحب اور راقم الحروف ان کے گھر پہنچے۔ دروازے ہی پر ایک معمر آدمی مل گئے۔ ہم نے اپنی بات بتائی۔ وہ ہم لوگوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں آئے اور لیلا کو بُلا لائے۔ جب ہم گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے جگہ بتائی اور کہا کہ ریہرسل کے لئے آپ چاہیں تو اپنے والد کے ساتھ آجایئے گا۔ لیلا زور سے ہنسی اور کہا 'He is my husband' (یہ میرے شوہر ہیں) ہمیں بڑا تعجب ہوا۔ رہی ہوگی کوئی بات اس عمری تفاوت میں۔

ڈرامہ 'بٹوہ' بڑے اچھے ڈھنگ سے اسٹیج ہوا۔ اور شعبۂ اردو نے تمام انگریزی اور ہندی کے شعبوں پر سبقت حاصل کر لی۔ پھر مزید ڈرامے میر صاحب، اکبر الٰہ آبادی، مجاز، انشا اعجاز صاحب کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ مگر پھر یونیورسٹی کا ماحول بگڑنے لگا۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ اور طلبا میں کشیدگی بڑھنے لگی تو ساری تہذیبی صورتیں بھی ختم ہونے لگیں۔ مجاز میں نورا نرس کا پارٹ ریحانہ سلطان نے ادا کیا تھا جو بعد کو فلم کی مشہور ہیروئن ہوئی جس نے بیدی کی فلم دستک میں بڑا شاندار پارٹ ادا کیا۔ یہیں سے طلبا اور مسیح الزماں صاحب کے درمیان بھی کشیدگی شروع ہوئی اور پھر شعبۂ اردو کے یہ تہذیبی جلسے انتشاری حالات سے گزرنے لگے اور آخر کار ختم ہوگئے۔ آخری ڈرامہ "فٹ پاتھ کے شہزادے" تھا جس میں آل احمد عابدی اور رشتی کھنتے بڑا اچھا رول ادا کیا تھا۔

مئی ۱۹۵۲ء میں میری شادی آغا علی خاں کی صاحبزادی نجمی بیگم سے ہوگئی اور

www.taemeernews.com

میری زندگی میں پھر ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت میں اپنا مقالہ ڈی فِل ڈگری کے لیے مکمل کر رہا تھا۔ اب مجھے جلد از جلد مقالہ مکمل کرنے کی فکر ہوئی کیونکہ تاہل کی زندگی میں بہت سی مصروفیات ایسی بھی آجاتی ہیں کہ سکون سے کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر مجھے یہ خیال بھی ستاتا رہتا کہ ابھی ملازمت عارضی ہے۔ اور اب ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں۔ چنانچہ میں مقالہ مکمل کرنے میں یکسوئی سے لگ گیا۔ میری بیوی کو بہت جلد میرے مزاج اور مصروفیات کا اندازہ ہوگیا۔ اس لیے کچھ نوٹس وغیرہ صاف کر دیا کرتیں وہ ایک پرسکون اور شائستہ قسم کی لڑکی تھیں اور میرے پڑھنے لکھنے کے معاملے میں حائل نہیں ہوا کرتیں۔ خیر کسی طرح میں نے فروری ۱۹۵۵ء میں اپنا مقالہ مکمل کرکے یونیورسٹی میں جمع کر دیا۔ میرے مقالے کے ممتحنین میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ (مصنف تاریخ ادب اردو) اور ڈاکٹر اعجاز حسین تھے جو ابھی تک پچیس چھبیس سال کی ملازمت کے بعد بھی لکچرر ہی تھے کہ نہ کوئی جگہ ریڈر کی تھی اور نہ پروفیسر کی۔ ضامن علی صاحب کے بعد پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی۔ جیسا کہ ہوتا ہے۔ میرے مقالے کی رپورٹ تین ماہ بعد آگئی۔ اسی درمیان میرے یہاں ولادت بھی ہوگئی۔ یہ میری بڑی بیٹی ریشماں تھی (جو اب الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں استاد کے فرائض انجام دے رہی ہے) ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی، دونوں نے بڑی اچھی رپورٹ اس مقالے کی دی تھی۔ اس وقت یہ نہ تھا کہ چاہے جیسی تھیسس جمع کر دو، مقالہ تو منظور ہو ہی جاتا ہے۔ انھیں رام بابو سکسینہ نے میری تھیسس سے پہلے ڈاکٹر وشنو گوپال کا سرشار پر مقالہ منظور نہیں کیا تھا۔ میرا مقالہ ان لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ مسعود حسن رضوی نے مقالہ واپس نہیں کیا بلکہ اپنے پاس رکھ لیا۔ اس وقت تک مثنوی پر یہ پہلا مقالہ تھا جو مکمل اور مبسوط تھا۔ گیان چند صاحب نے اس وقت تک اپنا مثنوی والا مقالہ شروع بھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن، اسی دوران، گیان چند صاحب کا خط مجھے ملا کہ اپنے مقالے کی نقل مجھے بھیج دیجیے۔ اس وقت نقل کی آج جیسی آسانیاں نہ تھیں۔ میں نے ایک کاپی مقالے کی خود اپنے

www.taemeernews.com

ہاتھ سے تیار کی تھی اور بقیہ دو نقلیں میرے شاگردوں، سید علی حیدر، رضیہ اور مس خلیق زبیری (جو بعد کو شعبۂ تعلیم میں R.I.G.S ہوگئیں) نے تیار کی تھیں۔ میرے پاس کوئی نقل باقی نہ تھی۔ کیونکہ تینوں کا پیاں یونیورسٹی میں جمع کر دی گئی تھیں۔ میرے پاس صرف رف رہ گیا تھا۔ میں نے گیان چند صاحب کو یہی بات لکھ دی۔ مگر گیان چند صاحب کو یقین نہ آیا۔ وہ سمجھے کہ میں انھیں اپنا مقالہ دکھانا نہیں چاہتا۔ خیر جب اس مقالے کی دو نقلیں یونیورسٹی لائبریری کو ممتحنین نے واپس کیں تو گیان چند صاحب نے اس میں سے ایک نقل منگا کر دیکھا۔ پھر انھوں نے مزید بہتر مقالہ لکھ کر آگرہ یونیورسٹی سے "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں ڈی۔ لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ گیان چند صاحب کا مقالہ تحقیقی اعتبار سے یقیناً مجھ سے بہتر ہے۔ وہ ایک ماہر محقق تھے اور میں نو آموز۔ پھر میں کم آمیز اور اپنے میں گم رہنے والا۔ حالات نے مجھے کسی حد تک بے حد شرمیلا (shy) بنا دیا تھا۔ مقالہ چار پانچ سال تک یونہی پڑا رہا۔ پھر پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی کی مدد سے شائع ہوا۔ مگر یونیورسٹی نے شائع کر کے تمام جلدیں اپنے گودام میں ڈال دیں۔ اور کتاب کسی بک سیلر تک نہ پہنچی۔ چند جلدیں جو یونیورسٹی نے مجھے دیں۔ وہی میں نے ارباب نظر کو برائے ملاحظہ بھیجیں۔ مگر ارباب نظر میں سے صرف دو ایک نے تو کتاب شاید پڑھی۔ باقی لوگوں نے شاید پڑھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی۔ کیونکہ اس کتاب کا مصنف نہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا، اور نہ علمی ادبی دنیا میں اسے کوئی در خور حاصل تھا۔ پھر مجھے سیل آرگنائز کرنے کا نہ فن آتا تھا اور نہ پروپیگنڈے ہی کے فن سے میں واقف تھا۔ میں ایک طرح سے کڑھتا جب دیکھتا کہ لوگ اپنی ریڈیو ٹاک اور کلاس میں لکھوائے ہوئے نوٹس تک چھپوا کر طلبا میں مقبول ہو رہے تھے۔ اس لئے کہ ان کتابوں میں امتحان میں کام آنے کا بہت سا مسالہ تھا۔ اور میری اس تحقیقی کتاب کو یونیورسٹی کے پروفیسروں کو پڑھنے تک کی فرصت نہ تھی۔

مجھ میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ لیکن سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ علم کے معاملے میں میں جلدی سے کسی کا قائل نہیں ہوتا۔ عالم ہونے کے میرے اپنے معیار ہیں اور عالم کی

www.taemeernews.com

میرے ذہن میں ایک خاص تصویر ہے۔ علم کے معاملے میں میرے پاس ایک چھٹی حس ہے جو دھوکے باز عالم اور اصلی عالم کی نشاندہی کرتی رہتی ہے اور اچھا عالم ہمیشہ میرا دوست ہو جاتا ہے اور میں اس کا قائل ہو جاتا ہوں۔ خیر یہ بات برسبیل تذکرہ آ گئی۔

مجھے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ڈی۔ فل (یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی) کی ڈگری مل گئی۔ ڈگری کے ملتے ہی معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ شعبۂ اردو کے کچھ حضرات مجھ سے خفا خفا سے رہنے لگے۔ اس وقت تک شعبے میں صرف دو حضرات ریسرچ کی ڈگریاں رکھتے تھے۔ اب تیسرا نمبر میرا تھا۔ اب ہر موقع پر مجھے زک دینے کی فکر ہونے لگی۔ ٹائم ٹیبل میں پیچیدگیاں پیدا کی جانے لگیں میرا تقرر اس وقت تک عارضی تھا۔ اپریل ۱۹۵۸ء میں ضامن علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مگر میری جگہ مارچ ۱۹۵۹ء میں بھری گئی۔ یہ چند سال میرے لئے بڑی ذہنی اذیت کے سال گذرے۔ یونیورسٹی کو خفیہ طور پر میری شکائتیں لکھ لکھ کر شعبے سے بھیجی جاتیں۔ حد اس وقت ہو گئی جب ڈین سے شکایت کی گئی کہ مجھے حاضری لینے کا طریقہ بھی نہیں معلوم اور حاضری کا رجسٹر میری وجہ سے خراب ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں اس لئے تھیں کہ میں مستقل نہ ہونے پاؤں۔ پھر دوسری یونیورسٹیوں کے امیدواروں کو فارم بھیجے گئے کہ تم بھی آؤ۔ دلی یونیورسٹی کے ایک صاحب کو تو اپنے ہو جانے کا اتنا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے رہنے کے لئے الہ آباد میں مکان تک طے کرنے لگے تھے۔ بارے مارچ ۱۹۵۹ء میں سلیکشن کمیٹی ہوئی شعبے کی اندرونی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۶ امیدوار میرے مقابلے میں آئے۔ گوپی چند نارنگ صاحب بھی امیدوار تھے مگر وہ نہیں آئے۔ علی گڈھ سے شہاب جعفری صاحب آئے اور کمیٹی کے سامنے بھی گئے۔ آل احمد سرور صاحب علی گڈھ سے اور اختر اورینوی صاحب پٹنہ سے ماہرین میں سے تھے۔ سرور صاحب نے ایک دلچسپ سوال کیا کہ "آب حیات" کی زبان ایسی ہے کہ وہ ادبی متن (Text) تو ہو سکتی ہے۔ مگر کیا تاریخ ایسی زبان میں قابل اعتبار ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ ایسی ادبی مبالغے کی زبان میں تاریخی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔" سوال یقیناً اہم تھا۔ میں نے طالب علم کی حیثیت سے کئی اور تجزیہ تاریخ

www.taemeernews.com

بھی پڑھی تھیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آئینِ اکبری، ابن بطوطہ، عبدالحمید لاہوری اور منہاج السراج تاریخیں ہو سکتی ہیں جو بے حد ORNATE اسٹائیل میں لکھی گئی ہیں تو آبِ حیات کا اسٹائیل تاریخ کا اسٹائیل کیوں نہیں ہو سکتا؟ میرے استاد اور تاریخ کے ماہر ڈاکٹر ایشوری پرساد بھی یونیورسٹی کی طرف سے ماہرین کی کمیٹی میں تھے۔ انھوں نے اپنے خاص ایڈمنڈ برک والے اسٹائیل میں پوری تقریر انگریزی میں اس مسئلے پر کر ڈالی اور میری پوری طرح سے طرفداری کی اور کہا کہ بہت مناسب جواب ہے اور بھی سوالات ہوئے مگر متفقہ فیصلہ میرے حق میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر بشری رنجن کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا۔ ان تمام باتوں سے عام قاری کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ یہ سب یونیورسٹی کے اندرونی مسائل ہیں۔ بلکہ ان سے یہ اندازہ کرانا مقصود ہے کہ میری مسرتوں اور تلخیوں میں ایسی صورتوں اور ریشہ دوانیوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ میں بدطینت آدمی نہیں اور کسی سے بدلہ لینے کا جذبہ مجھ میں نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اور اپنی اس ذہنی افتاد اور طبیعت کے انداز سے میں نے یونیورسٹی کی ملازمت کے آخری دور میں بڑے نقصانات اٹھائے اور بڑے کرب سے گذرا ہوں۔ مگر خیر۔

بہرحال تقرر سے قدرے سکون ملا تو لکھنے پڑھنے کی طرف دلجمعی سے متوجہ ہوا۔ میرا پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نئی فکریں" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہو چکا تھا۔ پھر سنجیدہ کاموں کی طرف اپنے ذہنی تناؤ کے زمانے میں متوجہ نہ ہو سکا۔ اسی زمانے میں مجھے مشہور شکاری جم کاربٹ کی مشہور کتاب 'کمایوں کے آدم خور' ہاتھ آگئی۔ اس کتاب میں مجھے بڑا لطف اس لئے بھی آیا کہ بچپن میں مجھے بھی شکار کا خاصہ شوق تھا۔ خیر تو میں نے کاربٹ کی تقریباً تمام کتابیں۔ دی جنگل لور (THE JUNGLE LORE) "موریلین ایٹرس آف کمایوں، مین ایٹنگ لیپرڈ آف رُودر پریاگ" اور بہت سے دوسرے شکاریوں کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شکاری بندوق تو میرے پاس تھی ہی۔ پھر میں نے ایک اسپرنگ فیلڈ رائفل بھی خریدی اور الہ آباد کے شکاریوں کی پارٹی جوائن کر لی۔ شاید شعبے کے تناؤ نے

www.taemeernews.com

مجھے یہ فرار کا راستہ سُجھا دیا تھا۔ مجھ میں دیہات کی زندگی کا سیلانی آدمی اور اپنے اندر چھُپا ہوا جنگ جو آدمی شاید پھر اُبھر آیا تھا۔ یونیورسٹی میں جو یہ تاؤ میرے ساتھ ہو رہا تھا اس کا غصّہ جنگلی جانوروں پر اتارنے لگا۔ یہ کوئی نفسیاتی نکتہ بھی ہو سکتا ہے۔ الہ آباد کے مشہور شکاری جن میں راجن بنرجی، عبدالحمید، عبید شیر خاں اور لارٹیس LAUR-TIUS خاص تھے۔ ان کے ساتھ آٹھ دن جنگل جانے کے پروگرام بننے لگے۔ میرے شاگردوں میں بھی کچھ شکاری نکل آئے۔ ان میں اچھے نشانے باز سخاوت حسین اور فرحت علی تھے۔ جو این۔ سی۔ سی N.C.C کے کیڈٹ بھی تھے۔ ان میں سخاوت حسین نے اس پیشے میں کافی ترقی کی اور فی الحال وہ ہوم گارڈس کے کمانڈنٹ ہیں۔ فرحت علی ریلوے میں ملازم ہو گئے۔

www.taemeernews.com

جنگل جنگل گھوما ہوں

الٰہ آباد کے شکاریوں میں اس وقت دوؔ شکاری بہت مشہور تھے۔ ایک عبدالحمید جو لال محمد بیڑی ورکس اور جیتا فائٹ کے مالک تھے۔ اور دوسرے راجن بینرجی جو بڑے اچھے ٹینس کے کھلاڑی بھی تھے۔ اور الہ آباد میں ٹینس کی گیند بنانے والی سائمنڈس (SYMON-DS) کمپنی کے مالک بھی۔ حمید صاحب سے میں پہلے سے واقف تھا کہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں ان کے ساتھ دو ایک مرتبہ مانک پور اور شنکر گڑھ کی پہاڑیوں میں شکار کے لئے جا چکا تھا۔ مگر راجن بینرجی سے یونہی رسمی سے تعلقات تھے۔ رائفل خریدنے کے ساتھ ہی میرا جذبۂ شکار مہمیز ہوگیا۔ حمید صاحب کے ساتھ اس زمانے میں ایک رات میں آٹھ آٹھ ہرن ہم لوگوں نے مارے۔ تیندوے اور چیتے کے شکار میں بھی گھومے۔ مگر ابھی تک جنگل میں میرا کسی درندے سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ جم کاربٹ کی کتابیں پڑھ کر میں نے اپنے خیال میں درندے مارنے کے تمام گُر سیکھ لئے تھے۔ مگر علم کتابی اور حقیقی شکار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تھیوری اور فلاسفی الگ چیز ہے مگر عملی طور پر شکار الگ بات ہے۔

میرے ایک برادر نسبتی احمد علی خاں کورٹ آف وارڈس میں اسسٹنٹ منیجر تھے۔ ان کا قیام کچھ دنوں کے لئے مانڈہ اسٹیٹ میں ہوگیا۔ ایک دن وہ الہ آباد آئے اور میرے شوق کا انھیں علم ہوا تو مجھے انھوں نے مانڈہ اسٹیٹ میں شکار کی دعوت دی۔ بلکہ دوؔ تینؔ دن بعد جب وہ جانے لگے تو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ وہاں راجہ صاحب کے دوؔ شکاری جناب علی اور تُراب خاں تھے۔ جناب علی (عجیب نام تھا) کو شام میں احمد علی خاں صاحب نے بلا کر مجھے شکار کھلانے کی ڈیوٹی سپرد کی۔ تھوڑی دیر میں جناب علی کیل کانٹے سے لیس ایک لمبی توڑے دار بندوق لئے ہوئے آئے تو ان کے ساتھ

www.taemeernews.com

ایدل پور کے ایک میرے شناسا ذوالفقار حیدر صاحب بھی ساتھ تھے جو وہاں کی تحصیل میں بخشی تھے۔ انھیں بھی شکار کا بے حد شوق تھا۔ میں اپنے بچپن میں ان کے ساتھ چڑیوں کے شکار میں ساتھ رہتا بھی تھا۔ وہ بڑے اچھے نشانے باز تھے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ طے پایا کہ ٹونس ندی کی ایک شاخ جو مانڈہ کے جنگلوں کے بیچ سے گزرتی ہے وہاں ہم لوگ رات میں بیٹھیں۔ اس جگہ جنگلی جانور رات میں پانی پینے آتے ہیں۔ اور جب وہ آئیں تو شکار کیا جائے۔ ہم سرِ شام ندی سے کچھ فاصلے پر گڑھا کھدا کر، تین طرف سے کتھے کی جھاڑیوں سے اسے ڈھک کر دیکھتے کی جھاڑیاں بے حد خاردار ہوتی ہیں اور جنگلی جانور کانٹوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ خصوصاً نرم پودر (PAW) والے جانور) گڑھے میں بیٹھ گئے۔ شام گزر گئی، رات آئی۔ مگر کسی جانور کا کوئی پتہ نہ تھا۔ رات کے دس بجے ہوں گے کہ گیدڑ، لومڑی اور سیہی جیسے جانور آئے اور پانی پی پی کر چپ چاپ چلے گئے۔ پھر سناٹا۔ یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ نہ تو کوئی درندہ آیا اور نہ چرندہ۔ میرے ساتھ ذوالفقار صاحب اور ایک کول اور جناب علی بیٹھے تھے۔ اور دوسرے گڑھے میں تراب خاں اور دو کول۔ یہ گڑھا ذرا فاصلے پر تھا اور ایک راستے کے قریب۔ مجھے اور ذوالفقار صاحب کو نیند آنے لگی۔ جناب علی بھی نیند کے جھونکے کھانے لگے۔ جناب علی ایک دلیر اور تجربہ کار شکاری تھا۔ وہ گڑھے کے کنارے پر ہم سے ذرا اوپر بیٹھا تھا تاکہ جانور کے آتے ہی اس کی نظر پڑ جائے۔ تقریباً تین بجے کا عمل ہو گا کہ ایک سانبھر اور ایک کاکڑ جو چپ چاپ پانی پینے آئے تھے اور ہم انھیں نہیں دیکھ سکے، ایک تیز آواز نکال کر بھاگے۔ پھر لومڑیاں اور سیار بھی بھاگنے لگے۔ پھر ایک ڈونکنے کی آواز جنگل کے کونے سے آئی۔ جناب علی نے تجربے کی بنیاد پر مجھے کہنی مار کر ہشیار کیا اور میرے کان میں چپکے سے کہا کہ ہشیار رہیے شاید تیندوا آگیا۔ یہ سنتے ہی میرے خون کی گردش تیز ہو گئی اور سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کان میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ ذوالفقار صاحب اور میں نے اپنی اپنی رائفلیں سیدھی کر کے ٹارچ کے تار پر انگلیاں رکھ لیں کہ جیسے ہی موقع آئے ٹارچ جلا دیں۔ ایک اتھاہ سناٹا اتنی دیر میں گزر گیا اور پھر یکایک پانی پینے کی چپ چپ

www.taemeernews.com

آوازیں آنے لگیں۔ جناب علی نے مجھے ٹھوکا دیا تو میں نے تار کو رائفل کے لوہے سے چھلا دیا۔ روشنی کی ایک چوڑی اور تیز لکیر کنارِ آب تک تیر گئی۔ پانی پینے والے جانور نے آنے والی روشنی کی طرف غصیلی آنکھوں سے گردن پھرا کر جو دیکھا تو میرے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی۔ یہ تصویر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مگر میں نے اپنے حواس اور بدن کی تمام طاقت کو سمیٹ کر نشانہ باندھا اور اسپرنگ فیلڈ کی لبلبی دبا ہی تو دی۔ معلوم ہوا جیسے تمام جنگل میں بھونچال آگیا۔ رات اور جنگل کے سناٹے میں 220 گرین کے کارتوس کے چلنے کی آواز نے سارے جنگل کو ہلا دیا۔ ایک تیز آواز "ہاؤں" کی آئی اور پھر سطح آب پر سناٹا۔ جناب علی تیزی سے اٹھا "صاحب! جانور کے گولی لگ گئی ہے مگر شاید چوٹ ہلکی ہے۔ اب معاملہ خطرناک ہو گیا ہے۔ چلئے ڈھونڈتے ہیں۔" اس نے اپنی شتر نال جیسی بھرٹھونک بندوق اٹھائی۔ اب جو پلٹ کر ذوالفقار صاحب کو دیکھا تو وہ تقریباً سکتے میں پڑے تھے۔ رائفل ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔ جناب علی مجھ سے لاکھ کہتا رہا کہ چلئے جانور کو تلاش کریں۔ مگر میں رات میں ایسے ایڈونچر کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوا۔ کیونکہ ایسے موقعے کے لئے میں جم کاربٹ کی وارننگ پڑھ چکا تھا کہ زخمی جانور کا تعاقب رات میں کسی بھی حالت میں نہیں کرنا چاہئے کہ زخمی جانور بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔ اور پھر کیا معلوم کس جھاڑی سے اچھل کر وہ شکاری پر حملہ کردے اور شکاری کو دبوچ لے۔ میں نے جناب علی سے کہا کہ اب صبح کو تلاش کریں گے۔ وہ لاکھ کہتا رہا مگر میری ہمت نہ پڑی۔ اور پھر ہم لوگ ذوالفقار صاحب کو لے کر قیام گاہ پر واپس آئے۔ اب ذوالفقار صاحب بالکل ٹھیک تھے۔ پھر صبح کو بھی ہم زخمی جانور کی تلاش میں نہ گئے۔ اگرچہ یہ شکار کے اصول کے خلاف ہے۔ زخمی جانور کو بھی جنگل میں نہیں چھوڑنا چاہئے کہ وہ بے حد خطرناک ہو جاتا ہے اور آدم خور بھی بن جاتا ہے۔ ہم مانڈہ سے واپس چلے آئے۔ مگر جناب علی اور چند کول وغیرہ اس زخمی تیندوے کی تلاش میں گئے۔ تیندوا تھوڑی دور پر ایک کتھے کی جھاڑی میں مرا پڑا تھا۔ جو بعد کو راجہ صاحب کو بھینٹ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ احمد علی خاں نے جب الٰہ آباد آئے تو ہم لوگوں سے بیان کیا۔

www.taemeernews.com

جس طرح درندے کو اگر خون لگ جاتا ہے تو وہ مزید خطرناک ہو جاتا ہے۔ یہی حال شکاری کا بھی ہوتا ہے۔ اگر اسے شکار کا چسکہ لگ جاتا ہے تو پھر وہ گھر میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ اب میرا بھی یہ عالم ہوا کہ کیسی یونیورسٹی اور کہاں کا پڑھنا لکھنا! ادھر تعطیل ہوئی ادھر سخاوت، فرحت اور سردار سب کو ساتھ لے کر جنگل کی راہ لی۔ ہم لوگوں نے ایک چھوٹا خیمہ بھی خرید لیا۔ اور ملٹری کے رنگ کا O.G لباس سلوایا اور جنگل روانہ۔ جیسے جنگل ہمیں بلا رہا ہو۔ ورڈسورتھ کی زبان میں ترمیم کے ساتھ۔

The Jungle, haunted us like a passion

اس میں کسی موسم کی سختی یا نرمی ہمارے راستے میں حارج نہ ہوتی۔ دسمبر کی چھٹیاں آئیں تو ہماری پارٹی نے جنگل جانے کے لئے مارکنڈی کے جنگل کا پروگرام بنایا اور رات کی گاڑی سے پوری پارٹی مارکنڈی روانہ ہو گئی اور صبح ہوتے ہی ہم مارکنڈی پہنچ گئے۔ فرحت علی کے دو ایک شناسا اسٹیشن پر تھے۔ ہم نے وہیں ویٹنگ روم میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اور پھر ناشتہ وغیرہ کر کے اسی کنارے سے جنگل میں اتر گئے جہاں کیمپنگ اسٹیشن ہے۔ کیا وسیع و عریض جنگل ہے! سامنے اونچا پہاڑ ہے اور دور تک اس کا دامن پھیلا ہوا ہے۔ اسی دامن میں ہر طرح کے جانور ملتے ہیں۔ ہم اسی جنگل میں دن بھر ہرن اور سانبھر کی تلاش میں گھومتے پھرے۔ مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ رات آئی تو وہاں کے جنگلی لوگوں کی مدد سے ایک ایسی جگہ تلاش کی جہاں رات میں سانبھر نمک چاٹنے آتے ہیں۔ یہ ایک اوسر زمین کا قطعہ تھا نمک یہاں کہاں۔ ہاں یہ زمین شور تھی جہاں کی مٹی میں کھارا پن تھا۔ سانبھر اسی مٹی کی تلاش میں اس جگہ آتے۔ ہم چاروں شکاری ایک نیم دائرہ بنا کر اس کھلے ہوئے قطعے کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ جیسے جیسے رات بڑھتی گئی سناٹا بھی بڑھتا گیا۔ خاموشی کا یہ عالم ہوا کہ ہمیں اپنے سانسوں کی آواز تیز خرخراہٹ کی طرح معلوم ہونے لگی۔ ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک کول (جنگلی آدمی) تھا۔ میرے ساتھ کے کول نے میرے کان میں کہا کہ سانبھروں کی اس جگہ پر کبھی کبھی شیر بھی سانبھروں کی تلاش میں آنکلتا ہے۔ اس لئے

www.taemeernews.com

رائفل بھی تیار رکھئے۔ یہ سُن کر میری حالت خراب ہونے لگی کہ ہم بغیر کسی انتظام کے کھُلی زمین پر بیٹھے ہیں۔ سانبھر کا شکار تو بھول گیا۔ اب شیر کا خوف غالب آگیا۔ میں نے جنگلی کو بارہ بور کی بندوق تھمادی اور اس کی پشت اپنی پشت سے ملا کر منہ جنگل کی طرف کر دیا۔ اور خود اسپرنگ فیلڈ لے کر سامنے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ کول شکاریوں کے ساتھ رہتے رہتے خاصے ماہر ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے آدھے شکاری خود بن جاتے ہیں۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ میں رائفل کی پوری میگزین بھرے ہوئے اسی کھلے ہوئے قطعے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ مگر خوف کا یہ عالم کہ دور کی ہر جھاڑی Bush مجھے سمٹا ہوا شیر تھوڑی دیر میں نظر آنے لگی۔ ایک دفعہ تو یہ محسوس ہوا کہ جیسے ایک بڑا سا سر جھاڑیوں کے بیچ سے ابھرا۔ اگرچہ یہ بہت بڑی غلطی تھی مگر میں نے رائفل کی ٹارچ جلادی۔ مگر وہ ابھرا ہوا سر بھی ٹارچ پڑتے ہی جھاڑی بن گیا۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے کہ سامنے کے بلند پہاڑ پر ایک دفعہ گرجدار ہمکار اُبھری پھر دوسری ہمکار اور پھر نسبتاً تیز آواز۔ یہ معلوم ہوا کہ بس میرے بالکل قریب سے یہ آواز آرہی ہے۔ کول سمٹ کر میرے بالکل قریب آگیا اور کان میں چپکے سے کہا "باگھ نکل آیا صاحب۔ مگر ابھی پہاڑ پر ہے۔ پر منہ اس کا اسی طرف ہے۔" اس جملے کو پڑھنے والے اس ہیبت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو اس وقت مجھ پر طاری ہوئی۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ نہ راہِ رفتن نہ جائے ماندن۔ اگر ہم گڑھے میں بیٹھے ہوتے اور کھیتے کی خاردار جھاڑیاں ہمارے گرد ہوتیں تو کچھ ہماری بچت تھی۔ مگر کیا کرتے۔ چار و ناچار تن بہ تقدیر بیٹھے رہے۔ اب تو شکار کرنا کیسا، شکار ہوتے سے بچنے کی فکر سوار ہوئی۔ یکایک پھر قلہ کوہ سے ایک گرجدار آواز اور آئی۔ کول بولا۔ "باگھ چل پڑا۔" کول کا ہر جملہ میرے لئے خوف اور رہبری دونوں کا کام کر رہا تھا۔ پھر ایک آواز اور آئی مگر قدرے دور ہوتی ہوئی۔ کول نے کہا کہ باگھ پہاڑ کی دوسری طرف اُتر گیا۔ تب میری جان میں جان آئی۔ تقریباً دو گھنٹے اسی عالم میں گزر گئے۔ اتنے میں نیم دائرے کے آخری کونے سے جہاں سعادت اور فرحت علی

www.taemeernews.com

بیٹھے تھے یکایک ٹارچ جلی اور سخاوت کی ماؤزر گرجی اور پھر دو آدمیوں کے تیز تیز بولنے کی آواز بھی آئی۔ کول کو ساتھ لے کر میں اُدھر جھپٹا۔ پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ سخاوت نے ایک جنگلی سؤر کو نشانہ بنایا تھا۔ سور تڑپ کر سخاوت پر حملہ آور ہوا۔ مگر گولی سینے کے پار ہو گئی تھی اس لئے سور پاس پہنچتے پہنچتے سؤر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ تمام کول اکٹھا ہو گئے۔ سور اکیلا تھا یعنی اکیلا جو بے حد تنومند ہوتا ہے۔ کولوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہ اکیلا سور اب ان کی پوری بستی کے کام آئے گا۔ ہم لوگ تھوڑی دیر سانبھر کے انتظار میں اور بیٹھے۔ اگرچہ فائر ہو جانے کے بعد اب کسی جانور کے اِدھر آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اُدھر کول سور کو اپنے گھرلے جانے کے لئے بے قرار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم لوگ ڈھائی بجے رات میں جب سردی اپنے شباب پر تھی اسٹیشن کے ویٹنگ روم کی طرف چلے۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ دستانے پہنے ہونے کے باوجود رائفل کا لوہا سب کا نام پوچھ رہا تھا۔ میں نے رائفل کول کو تھما دی اور ہم دانت کٹکٹاتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔

دوسرے سال دسہرے کی چھٹیاں آئیں تو ہمارا ذوق شکار پھر ہمیں اکسانے لگا۔ الہ آباد کے دکھن کی طرف باندہ ضلع ہے۔ جمنا کے اس پار اتر جائیے تو جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ جسرا، شیوراج پور، شنکر گڑھ، برگڑھ سب جنگلوں کے علاقے ہیں اور ان کے باندہ ضلع کے بڑے جنگل شروع ہوتے ہیں۔ ہماری چھوٹی سی پارٹی نے پھر پروگرام بنایا اور رات کی گاڑی سے سوار ہو کر ہم ڈبھورا کے اسٹیشن پر اُتر گئے۔ اندر کے دور دراز گاؤں میں ہمارے کچھ ملاقاتی (Contacts) پیدا ہو گئے تھے۔ اسٹیشن سے ہمیں دس بارہ میل چل کر نیورا نام کے ایک گاؤں میں پہنچنا تھا۔ جہاں ہمارے ایک ملاقاتی کیشو رام تھے جنہیں ہم لوگ کیشو بابا کہتے تھے۔ کیشو رام ایک سیدھے سادھے کاشتکار تھے اور نیورا گاؤں کے مکھیا بھی اگرچہ گاؤں ہی کیا تھا۔ مشکل سے دس پندرہ گھر اس گاؤں میں ہوں گے۔ کیشو بابا کا لڑکا لکھن ہم لوگوں کا دوست بن گیا تھا کہ اکثر ہم لوگ جب ادھر شکار کے لئے جاتے تو قیام کیشو بابا کے یہاں ہی ہوتا۔ ایسی محبت کا آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ ہم

www.taemeernews.com

جاڑوں کے زمانے میں رات میں پہنچے۔ سردی کا اندازہ ہمیں زیادہ نہ تھا۔ کیشو بابا نے اپنا لحاف میرے کمبل کے اوپر ڈال دیا اور خود رات بھر آگ تاپتے رہے۔ اگرچہ دیہاتیوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد خود غرض یعنی سوارتھی ہوتے ہیں۔ مگر کیشو بابا ایسے لوگوں میں نہ تھے۔

اسٹیشن سے اتر کر ہم جنگلی راستے سے نیورا کی طرف سدھارے۔ ہمیں چلتے چلتے رات کے دو بج گئے۔ اب ہم پہاڑ کی اس بلندی پر پہنچے جسے کرکا کہتے ہیں۔ وہیں سے نیورا گاؤں کی طرف اتار تھا۔ میں سب سے آگے تھا اور میرے ہاتھ میں اسپرنگ فیلڈ تھی۔ ہم سبھوں نے اپنے اسلحے کارتوسوں سے بھر رکھے تھے کہ کیا معلوم اس جنگل میں کہاں کس جانور سے مڈھ بھیڑ ہو جائے۔ ہم لوگ قطار باندھے خاموشی سے اپنے دھن میں چلے جا رہے تھے۔ کہ دیکھا دوسری طرف سے بھی آٹھ دس آدمی اسی راستے پر قطار باندھے چلے آ رہے ہیں یہ بتانا بھول گیا کہ اس زمانے میں باندہ کے علاقے میں ایک خطرناک ڈاکو دیبی سنگھ اکثر وارداتیں کرتا اور حکومت کے لئے وہ ایک زبردست خطرہ (TERROR) بن گیا تھا۔ اکثر راستے میں لوگوں کے لٹ جانے کے واقعات ہو جاتے۔ اب اس آتی ہوئی قطار کو دیکھ کر ہمیں یہی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے دیبی سنگھ کے آدمیوں نے ہمیں اسٹیشن پر اترتے اور ادھر جنگل میں آتے دیکھا ہو اور کسی دوسرے راستے سے جا کر اپنے آدمی لے آئے ہیں اور ہمارے ہتھیاروں کے درپے ہیں۔ ہم رکے تو آنے والے بھی خاموشی سے ٹھٹھک گئے میرے ٹھیک پیچھے فرحت علی تھے جو این سی سی (نیشنل کیڈٹ کور) میں بہت اچھا کاشن (CAUTION) دیتے تھے۔ میں نے ان سے مڑ کر چپکے سے کہا کہ تیار ہو جاؤ۔ دیبی سنگھ کے آدمی آ گئے اور شاید یہ ہمارے ہتھیار لوٹنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم ہتھیار نہیں دیں گے۔ اب کراس فائرنگ ہونی ہے۔ ملٹری اسٹریٹجی MILITARY STRATEGY اختیار کرو۔ فرحت نے پیچھے مڑ کر سخاوت کو اور سخاوت نے دوسروں کو صورت حال سے مطلع کیا۔ قریب ہی پہاڑی میں دراڑیں تھیں۔ ہم سب دراڑوں میں کود

www.taemeernews.com

گئے اور اپنی بندوقوں کی نالیں آنے والوں کی طرف تان لیں۔ اور پھر فرحت نے اپنی کاشن والی گرجدار آواز میں زور سے ڈانٹا "کون ہے"۔ یکایک ہماری ساری تیاریاں ڈھیلی پڑ گئیں جب اُدھر سے ڈری ہوئی آوازیں آئیں "ہم ہیں بھیا، پاتھر توڑنے والے"۔ "لاحول ولا قوۃ" کہہ کر ہم نے اپنے ہتھیار نیچے کر لئے اور ان لوگوں کو پاس بلایا۔ یہ پہاڑ سے پتھر توڑنے والے مزدور تھے جو بڑے تڑکے اٹھ کر اسی پہاڑی کی طرف آتے اور دس بجے تک پتھر توڑ کر واپس چلے جاتے۔ پھر ہم کو اپنی تیاریوں پر خود بھی ہنسی آنے لگی کہ ہم نے اس رن کے لئے کیا کیا مورچہ بندی سوچی تھی۔ مگر سوچئے کہ وہ پتھر توڑنے والے کس قدر متحیّر ہوئے ہوں گے جب انھوں نے پانچ آدمیوں کو سر سے پاؤں تک کالے لباس میں اپنے اس راستے پر دیکھا ہوگا جس پر وہ روز چلتے تھے اور کبھی یہ صورت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور تو وہ کیا سوچتے۔ صرف یہی سوچا ہوگا کہ آج بھوت پریت ہم کو لپٹنے کے لئے آگئے۔ اسی ڈر سے وہ ٹھٹھک گئے ہوں گے۔

چار بجے صبح ہم نیورا پہنچے۔ کیشو بابا کو جگایا اور انھیں کی چوپال میں ڈیرہ ڈال دیا۔ پھر اور لوگ بھی ان کے گھر کے اکٹھا ہو گئے۔ ہم لوگوں نے یہ واقعہ سبھوں سے بتایا تو سبھوں نے اس ایڈونچر کا خوب لطف لیا۔ ہر جگہ شکاریوں کو دیکھ کر گاؤں والے شکار کی طرح طرح کی خبریں لاتے رہتے ہیں۔ ہر آنے والا ایک نہ ایک قصہ ضرور اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر دو سال پہلے بھی اس نے کسی ہرن یا چیتل کو کسی جگہ پر دیکھا ہوگا تو آپ کو لے کر وہاں جائے گا کہ یہاں ہرن رہتے ہیں اور جب وہاں کہیں ہرن یا چیتل کا نشان نہ ملے گا تو یہی کہے گا کہ یہیں تو برابر دکھائی دیتے تھے۔ کہیں چلے گئے ہوں گے۔ اسی طرح کا ایک مخبر شام کو ہمارے پاس آیا اور بولا کہ یہاں سے آگے جو ڈھال ہے اس کے دوسرے کونے پر ایک مہوے کا درخت ہے۔ کل وہیں ایک گوپے (جھونپڑی) میں ایک بکرا بندھا تھا۔ رات کو ایک سنجوا (تیندوا) اُسے اٹھا لے گیا۔ آج وہ پھر ضرور آئے گا۔ سخاوت اور میں دونوں تیار ہوئے کہ شام کو مہوے کے پیڑ پر بیٹھ کر سنجوا کا انتظار کیا جائے۔

www.taemeernews.com

وہی شخص ایک بکری کا بچہ بھی لے آیا تاکہ اُسے اُسی کوپے میں پھر باندھا جائے۔ جہاں سے سنجوا پچھلی رات کو ایک بکرا اٹھائے گیا تھا۔ آسمان پر کچھ بادل تھے۔ مگر ہم لوگ بکری کے بچے کو لے کر جنگل کے کوپے کی طرف چلے۔ جب تک جنگل نہیں آیا بکری کا بچہ بے حد چیختا رہا۔ مگر جب ہم کوپے کے پاس پہنچے تو بکری کا بچہ اچانک بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ کاربٹ کے تجربوں کی بنیاد پر ہم سمجھ گئے کہ معلوم ہوتا ہے سنجوا کہیں یہیں جھاڑی میں ہے۔ اور بکری کے بچے کو اس کی بو مل گئی ہے، اسی لئے خاموش ہو گیا ہے۔ ہم لوگ بچے کو کوپے میں باندھ کر چپ چاپ رائفلیں لے کر مہوے کے پیڑ پر چڑھ گئے اور بکری کے بچے کی طرف پوزیشن لے کر بیٹھ گئے بچہ ایسا خاموش تھا جیسے اس کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ وہ ایک جھاڑی کی طرف بس یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ ہم بھی اسی طرف رائفل کئے ہوئے ہوشیار (Alert) بیٹھے تھے کہ اچانک گرج چمک شروع ہوئی۔ وہ بادل کا ٹکڑا جسے ہم نے چلتے وقت آسمان پر دیکھا تھا اچانک پھیل کر سارے آسمان پر چھا گیا۔ پھر بوندا باندی شروع ہو گئی اور پھر بادل ایسا ٹوٹ کر برسا کہ ہم بڑی مشکلوں سے پیڑ کے نیچے اتر پائے۔ سارے نشیب میں پانی ہی پانی تھا۔ کمر تک پانی ہر طرف بھر گیا کہ پہاڑ کا پانی بھی نشیب ہی میں آ رہا تھا۔ ہم اسی پانی میں اپنی رائفلیں اور کارتوس کی پیٹیاں اپنے سروں سے اوپر اٹھائے ہوئے اور بکری کے بچے کو وہ آدمی اپنے کندھے پر بٹھائے، اس ہیئت کذائی سے قیام گاہ کی طرف لوٹنے لگے۔

اچانک ایک تیز روشنی ہوئی اور پھر وہ گرج کہ معلوم ہوا سب کے کان پھٹ جائیں گے۔ پہاڑ کی چوٹی کی طرف ہم سے کوئی چار سو گز دور پر لہراتی ہوئی بجلی گری۔ چکا چوندھ سے ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔ کسی طرح بھاگ کر قیام گاہ تک پہنچے۔ پھر رات کا کھانا کھا کر سو گئے۔ اگرچہ پروگرام یہ تھا کہ رات میں قریب کی چراہ گاہ میں ہرنوں کی تلاش میں نکلیں گے۔

صبح ہوئی تو کیشو بابا کے بیٹے لکھن ستے پروگرام بنایا کہ یہاں سے قریب ایک تال ہے۔ جسے ہاتھی تال کہتے ہیں، وہاں چڑیوں کا شکار کیا جائے۔ سب لوگ تیار ہوئے۔ وہاں پہنچے تو ایک بہت بڑا تال تھا۔ اس میں واقعی ایک پتھر کا ہاتھی تال میں کھڑا تھا۔

www.taemeernews.com

قریب ہی ایک اونچا پہاڑ تھا جس کی کمر میں کچھ ٹوٹی پھوٹی دیواریں تھیں۔ فرحت وغیرہ تو چڑیوں کا شکار کرتے رہے۔ مگر میں لکھن کو لیکر اُن ٹوٹی پھوٹی دیواروں کی طرف چلا۔ وہاں پہنچا تو وہ کسی بڑے قلعے کے آثار تھے جو خاصہ وسیع و عریض تھا۔ دوسری طرف ایک ڈھلان تھی جہاں کچھ لوگ پوجا پاٹ کرتے نظر آئے۔ میں نے لکھن سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ یہ دیوی کا مندر ہے۔ وہاں جا کر دیکھا تو کم از کم ایک درجن مورتیاں قطار سے رکھی ہوئی ہیں۔ یہ مورتیاں سائز میں کافی بڑی تھیں۔ الہ آباد آکر شعبۂ تاریخ سے پتہ چلا کہ وہ کسی بُندیلا راجہ کا محل تھا جو اجڑ گیا۔ ایسا کہ اب کوئی بتا بھی نہیں سکتا کہ کس کا محل تھا۔ ع "پردہ داری می کند بر طاقِ کسریٰ عنکبوت"

یہ ہاتھی بھی انھیں راجاؤں کا بنوایا ہوا رہا ہوگا۔ پہاڑ میں ایک چھوٹا سا غار کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ میں رائفل کی لبلبی پر انگلی رکھے ہوئے بہت محتاط طور پر غار میں داخل ہوا کہ مبادا کوئی درندہ نہ سو رہا ہو۔ مگر غار بالکل خالی تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف کاٹ کر مورتیاں بنائی گئی تھیں۔ مگر سب پوجا اور شردھا کے جذبے کے ساتھ بنائی گئی تھیں۔ ان میں کہیں کچھ EROTIC نہیں تھا۔ مورتیوں کے سر پر مکٹ اس ڈھنگ کا تھا جیسے وشنو دیوتا کے ماننے والے مورتیاں بناتے تھے۔ عورتوں کی مورتیاں مسکراتی ہوئی اپنے سینوں کے ابھار کے ساتھ کھڑی تھیں۔ مگر ان کے حرکات و سکنات میں بھی کہیں جنسیت کا شائبہ نہیں تھا۔ الہ آباد واپس آکر میں نے پھر ان مورتیوں اور قلعے پر ایک رائٹ اپ لکھا۔ جو لیڈر اخبار میں شائع ہوا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگوں نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ ہمیں واپس بھی اسی جنگل کے بیچ سے ہونا تھا جدھر سے ہم گئے تھے۔ جنگل میں اندر کچھ دور گئے ہوں گے کہ اچانک ایک ہرنوں کا چرتا ہوا جھنڈ دکھائی دیا۔ سخاوت نے اپنی ماؤزر سے نشانہ لے کر ایک تنومند نر ہرن پر فائر کر دیا۔ ہرن اچھلا اور پھر زمین پر آرہا۔ تمام ساتھیوں نے دوڑ کر ہرن کو اٹھا لیا۔ اب لے آنے کا مسئلہ سامنے آیا۔ آخر ہرن کے ٹکڑے کر کے سب نے اپنے اپنے شکاری

www.taemeernews.com

تھیلوں میں رکھ لیا اور ڈبھورا اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی خاصی لیٹ تھی تو ہم لوگوں کو مل گئی۔ ہم مسرور تھے کہ ہمیں شکار مل گیا تھا۔ اورنگ زیب نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "شکار کارِ بیکاران است"۔ یہ بات اس وقت یقیناً درست ہو جاتی جب ہم خالی ہاتھ لوٹتے مگر ہمارے ساتھ تو شکار تھا۔

www.taemeernews.com

بمبئی ہماری باہوں میں

الہ آباد کے محلے دریاآباد کے بیرونی شمالی سرے پر پھولپور تحصیل کے ایک زمیندار نے ایک بہت بڑا سا مکان بنوایا۔ یہ مکان اس نواح میں اُس وقت بالکل اکیلا تھا۔ چاروں طرف ویرانہ۔ ۱۹۴۶ء کے دسہرے میں الہ آباد میں جب ہندو مسلم فساد ہوا تو اس مکان میں اکیلے رہنے والے ایک فرد کا قتل ہو گیا تو مالک مکان کی یہاں رہنے کی ہمت نہ پڑی۔ کہیں سے پنڈت سندر لال اس مکان میں آ رہے۔ انھیں دنوں وہ اپنا اُردو، ہندی کا رسالہ 'نیا ہند' گاندھی جی کی ہندوستانی زبان میں نکال رہے تھے اور کوئی ہندی اُردو کا لغت بھی مرتب کر رہے تھے۔ پھر جیسے ہی چین میں نئی کمیونسٹ حکومت بنی تو پنڈت سندر لال ایک طرح سے ہندوستانی عوام کے سفیر بن کر چین کی یاترا پر گئے اور واپس آکر نئے چین پر انگریزی میں ایک کتاب "چائنا ٹوڈے" کے نام سے لکھی۔ مجھے خبر ملی کہ وہ چند نوجوانوں کو چین بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تو کبھی نہ تھا مگر بہرحال میری دلچسپیاں کمیونسٹ اور سوشلسٹ نظام سے تھیں اور ترقی پسند ادیبوں کے زمرے میں میرا بھی شمار ہوتا تھا۔ میں نے اعجاز صاحب سے کہا کہ اگر پنڈت سندر لال میری سفارش کر دیں تو میں چین چلا جاؤں۔ احکام بھی ہوگی یہ بھی عمل ہو جائے گا اور کچھ منفعت بھی۔ کیونکہ میں الہ آباد یونیورسٹی میں بیچ میں لٹکا ہوا ہوں۔ نہ مستقل تقرر ہوتا ہے، نہ طے کر پاتا ہوں کہ کیا کروں۔ ایک شام اعجاز صاحب مجھے لے کر پنڈت سندر لال سے ملے اور میری سفارش کی۔ پنڈت جی نے جواب دیا کہ مجھے دو لڑکوں کو بھیجنا تھا وہ سفارش میں کر چکا۔ اور اب وہاں سے ان لڑکوں کے نام دعوت نامہ بھی آگیا۔ اب انتظار کرنا ہوگا۔ اگر وہاں سے پھر مانگ آئی تو میں ضرور ان کا نام بھیج دوں گا۔ بہرحال اب تو یونیورسٹی کی سلیکشن کمیٹی کا انتظار ہی کرنا تھا۔ پاکستان

www.taemeernews.com

سے میری بہن برابر خط لکھتی تھیں کہ پاکستان چلے آؤ۔ یہاں بہت امکانات ہیں۔ مگر تقسیم کے دوران جو فسادات ہوئے تھے اس سے میں اس قدر افسردہ تھا کہ میرا جی کبھی پاکستان جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ خواہی نخواہی شعبۂ اردو کے علاوہ راستہ ہی کیا تھا۔ مگر شعبے کے حالات اور وہاں کی گھٹن مجھے مارے ڈالتی تھی۔ اگرچہ سبھی میرے استاد رہ چکے تھے۔ مگر میرے ساتھ بندھوا مزدوروں جیسا برتاؤ ہو رہا تھا۔ اور برداشت اس لئے کرنا پڑتا تھا کہ ملازمت کی لال گاجر (Red Carrot) بھی سامنے تھی۔

انھیں ایام میں اعجاز صاحب کو بمبئی سے ایک دعوت نامہ حضرت علیؑ کے چودہ صد سالہ جشن کے سلسلے میں داؤدی بوہرہ جماعت کی طرف سے ملا کہ آپ ایک مقالہ اس جشن میں پڑھ دیجئے۔ اعجاز صاحب نے انھیں لکھا کہ اتنے لمبے سفر پر وہ اکیلے نہیں آسکتے۔ اگر کمیٹی کسی اور کو بھی شعبۂ اردو سے بلائے تو یہ کام آسان ہو جائے گا اور پھر سفارش میں میرا نام بھی لکھ دیا۔ وہاں سے تار پر جواب آیا کر لیتے آئیے۔ غالباً ۱۲ فروری ۱۹۵۷ء تھی کہ ہم استاد شاگرد بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستہ بہت دلچسپ کٹا۔ اعجاز صاحب سفر میں بہت بے تکلف ہو جاتے تھے اور دلچسپ باتیں کرتے۔ میں نے ان کے ساتھ کئی سفر کئے۔ کچھ لطائف ظرائف کچھ علمی ادبی گفتگو، کچھ ادیبوں کے ٹکلے۔ غرض کہ سفر خوب رہا۔ ہم دوسرے دن تین بجے دن میں بمبئی پہنچ گئے۔ داؤدی بوہرہ کمیٹی کے والنیٹر اسٹیشن پر موجود تھے۔ دو حضرات سروں پر سنہری پگڑیاں باندھے وہاں تھے۔ ہم جیسے ہی اپنے ڈبے سے نکلے ان سنہرے پٹیلوں نے اعجاز صاحب کی وضع قطع سے پہچان لیا اور ہمیں جائے قیام پر پہنچا دیا جو فلورا فاؤنٹین کے پاس کوئی ہوٹل تھا پھر بعد کو ہمیں امبیسڈر ہوٹل چرچ گیٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ اعجاز صاحب کو سب سے پہلے اپنے شاگرد نیاز حسن خاں کی فکر ہوئی جو بمبئی کی مشہور کمپنی رسیلا کے منیجر تھے۔ یہ کمپنی سنٹرل بمبئی اسٹیشن کے پاس تھی۔

نیاز حسن خاں کو ٹیلیفون کیا تو انھوں نے جواب میں اپنی کار بھیج کر اپنے دفتر بلا لیا ہم پہنچے تو نیاز حسن خاں بڑے تپاک سے ملے۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھے ہوں گے کہ انھوں نے

www.taemeernews.com

کہا کہ آپ لوگ پہلے بمبئی گھوم لیجئے۔ ڈرائیور کو کچھ ہدائتیں دیں اور کچھ رقم بھی۔ ڈرائیور نے ہم لوگوں سے پوچھا، کہاں چلوں صاحب۔ اعجاز صاحب بمبئی کی دنیا سے کہاں دلچسپی رکھتے تھے؟ میں نے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں جوہو لے چلو۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں ہم جوہو پہنچ گئے۔ میں نے یہیں پہلی مرتبہ سمندر دیکھا۔ غروب آفتاب کا منظر تھا۔ سمندر میں نہاتی ہوئی پریاں۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں سنہری ہو رہی تھیں۔ میں کبھی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو دیکھتا کبھی پانی میں چھینٹیں اڑاتی ہوئی ان پریوں کو دیکھتا اور کبھی اعجاز صاحب کی طرف کہ کہیں وہ مجھے دیکھ تو نہیں رہے ہیں۔ یکایک اندھیرا ہوتے لگا کہ ایک ناریل پانی والا ہمارے پاس آیا۔ میں نے کرشن چندر اور بیدی کے افسانے میں جوہو کے بیانات اور ناریل پانی والوں کے دلچسپ تذکرے پڑھے تھے۔ چنانچہ ایک ناریل پانی والے کو میں نے بلایا اور اعجاز صاحب سے بھی ناریل پانی پینے کے لئے کہا۔ پانی والے نے جھٹ اپنی درانتی سے دو عدد ہرے ناریل چشم زدن میں کاٹ کر ہمارے سامنے کر دئے۔ اب یہ ناریل تھے اور مینا دونوں تھا۔ ہم نے بڑے اشتیاق میں ناریل کا جام ہونٹوں سے لگایا۔ ایک پھیکا، سیٹھا سا مزہ معلوم ہوا۔ مشکل سے دو گھونٹ پئے ہوں گے کہ ہم دونوں نے لاحول پڑھ کر ناریل پھینک دئیے۔ اگرچہ یہ شراب نہ تھی مگر جانے کیوں جگر صاحب کا شعر مجھے یاد آگیا تو میں نے بہ آواز بلند پڑھ دیا ؎

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے! ارے ظالم! شراب ہے

اعجاز صاحب ہنسنے لگے۔ پھر بولے، لطفِ محفل کے لئے یہ شعر خوب ہے۔ ساحلِ سمندر پر دور تک جاتی ہوئی ناریل کی قطاروں کے سائے مزید تاریک ہونے لگے تو ہمیں واپسی کا خیال آیا۔ سمندر اسی طرح ہونک رہا تھا۔ چھینٹیں اسی طرح اڑ رہی تھیں مگر نہاتی ہوئی پریاں رخت سفر باندھ کر رخصت ہونے لگیں تو ہم بھی چل دئیے۔ اب ہماری منزل تاج محل ہوٹل تھی۔ ڈرائیور ہمیں لئے ہوئے انڈیا گیٹ کی طرف چلا۔ تاج کے قریب گاڑی

www.taemeernews.com

رڑکی۔ میں حیرت سے تاج محل ہوٹل دیکھتا رہا۔ پھر وہیں گرین میں ہم نے چائے پی۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ کیا خرچ آیا کہ سب کچھ نیاز حسن خاں کا ڈرائیور خرچ کر رہا تھا۔ وہاں سے اٹھے تو تھوڑی دیر تک انڈیا گیٹ کا نظارہ دیکھتے رہے اور پھر ہوٹل ایمبسڈر واپس

ہوٹل پہنچے تو باقر مہدی اور عالی جعفری اعجاز صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ میری اس وقت تک ان دونوں میں سے کسی سے ملاقات نہ تھی۔ بارے اعجاز صاحب نے مجھے ان لوگوں سے ملوایا۔ باقر مہدی سے غائبانہ طور پر واقف تھا کہ ان کی نظمیں، غزلیں رسالوں میں پڑھتا رہتا تھا، مگر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہم لوگ بہت جلد آپس میں گھل مل گئے۔ کچھ ادبی مسئلے بھی زیر بحث آئے۔ یہی وقت تھا جب باقر مہدی، ترقی پسندوں کے خلاف ہونا شروع ہوئے تھے۔ سبب کیا تھا کہہ نہیں سکتا۔ وہ بمبئی میں سال دو سال پہلے ہی پہنچے تھے۔ سردار جعفری کے وہ بطور خاص شاکی تھے۔ پھر بمبئی کے تمام ترقی پسندوں کی شکایت کرتے رہے۔ ہوگا کوئی خاص سبب کہہ نہیں سکتا۔ شاید بمبئی کی زندگی میں کچھ ترقی پسندوں کا خود غرضانہ رویّہ رہا ہوگا۔ جیسا کہ ان کی گفتگو سے میں مستنبط کر سکا۔ اعجاز صاحب ہوں ہاں کرتے رہے۔ باقر مہدی ایک فائر برینڈ قسم کے آدمی ہمیشہ رہے ہیں اور پھر اس وقت تو عین شباب کا عالم تھا۔

دوسرے دن جشنِ چودہ صد سالہ تھا۔ یہ طے پایا کہ کل صبح سردار جعفری سے ملاقات کی جائے۔ ہو سکے تو مجروحؔ سے بھی۔ باقر مہدی نے تو معذرت کر لی۔ مگر عالی جعفری نے وعدہ کیا کہ وہ آئیں گے اور ساتھ چلیں گے۔ سردار جعفری اس وقت تک ہم نوجوانوں کی نظر میں ایک ہیرو تھے۔ ہم لوگوں نے ان کی کتابیں 'نئی دنیا کو سلام'، 'ایشیا جاگ اٹھا' اور 'ترقی پسند ادب' اپنی طالب علمی کے زمانے میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ پڑھی تھیں۔ 'نئی دنیا کو سلام' مجھے آج بھی تقریباً آدھی زبانی یاد ہے۔ وہ میرے آئیڈیل شاعر ان معنوں میں تھے کہ انقلاب کی جو آواز جوشؔ نے بلند کی تھی سردار جعفری نے اس کی توسیع کی بلکہ ایک طرح سے تمام ترقی پسندوں نے اسے منظم کرنے کی کوشش کی تھی۔ عملی طور پر بھی اور

www.taemeernews.com

اور فکری طریقے سے بھی۔ میں باقر مہدی اور دوسرے لوگوں سے آج بھی متفق نہیں ہوں کہ سردار جعفری کی شاعری محض ہنگامی شاعری ہے۔ 'نئی دنیا کو سلام' اگر ہنگامی شاعری ہے تو ہر انقلابی شاعری کچھ نہ کچھ ہنگامی ضرور ہوتی ہے۔ چی گوارا کی تحریریں ہنگامی کیوں نہیں جن کی تاثیر میں باقر مہدی یہاں تک گئے کہ "چی" کی طرح داڑھی تک رکھ لی؟ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ سردار جعفری کی اسی ہنگامی شاعری کے درمیان اس طرح کے اشعار بھی موجود ہیں ؎

ابھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے
•
کہستاں کے یہ سنہرے عقاب
ہواؤں میں اڑتے ہوئے آفتاب
•
کنول جھیل میں مسکراتے ہوئے
چراغاں کا منظر دکھاتے ہوئے
•
دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
•
ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا
مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا

وغیرہ ایسے اشعار ہیں جن میں جمالیات اور حسن و عشق کی بہترین پیکر تراشیاں ہیں۔ جنہیں فراق صاحب کے الفاظ میں "محبتوں کی چمکار" کہہ سکتے ہیں۔

دوسرے دن ٹھیک نو بجے عالی جعفری آگئے اور ہم لوگ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ پرنی روڈ کی کسی عمارت کے بالائی حصے میں پہنچے جہاں سردار جعفری صاحب اقامت پذیر تھے۔ پہنچتے ہی سردار جعفری صاحب نے سیڑھیوں پر ہماری پذیرائی کی۔ کچھ دنوں پہلے ہی وہ جیل سے رہا ہوئے تھے اور اب روس کا دورہ کرکے پلٹے تھے (شاید اسی دورے کے بعد انھوں نے اندازہ لگایا تھا کہ روس میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے) ایک ہلکے اودے رنگ کی ہلکی سی چادر لپیٹے اپنے لمبے بالوں کے ساتھ وہ اعجاز صاحب سے محو گفتگو تھے اور میں انھیں خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اب آئندہ ترقی پسندی کے کیا راستے ہوں گے اس پر سردار صاحب گفتگو کر رہے تھے کہ آزادی سے پہلے کے مسئلے اب ہمارے ادب اور زندگی کے مسئلے

www.taemeernews.com

نہیں رہے۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ میری یوں بھی یہی عادت ہے کہ جب تک کوئی مجھے گفتگو میں شریک نہیں کرتا، میں کبھی دخل در معقولات نہیں کرتا۔ صرف سیمناروں میں اپنا یہ اصول توڑتا ہوں جہاں مجھے کسی مسئلے پر گفتگو سے اختلاف ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ایک خاتون کشتی میں چائے لے کر آئیں اور اعجاز صاحب کو لکھنوی اسٹائل میں تسلیم کر کے اور چائے رکھ کر چلی گئیں غالباً یہی "ہر معشوقہ سلطانہ ہے" والی سلطانہ تھیں۔ چائے سے زیادہ خوبصورت وہ پیالے اور ان کے اسٹینڈ تھے جن پر شیشے کے وہ قدحے رکھے ہوئے تھے اور پھر چائے پلانے والی کا کیا کہنا! یہ اسٹینڈ چاندی کے تھے اور جب ہم نے ان کی تعریف کی تو سردار صاحب نے بتایا کہ یہ ان کو ابھی تاشقند سے تحفے میں ملے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم سردار جعفری صاحب کے یہاں بیٹھے رہے۔ پھر باہر نکلے۔ میں نے عالی جعفری سے پوچھا ہینگنگ گارڈن یہاں سے کتنی دور ہے؟ عالی جعفری نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم لوگ اس معلق باغ کی طرف چل پڑے۔ شاید اسے کملا پارک بھی کہتے ہیں۔ ہم گارڈن پہنچے تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ جھاڑیوں کو تراش کر طرح طرح کے جانوروں کی شکلیں بنائی گئی تھیں۔ ایک کونے میں بڑھیا کمپنی کا ایک بڑا سا جوتا بنا تھا۔ یہ باغ اتنی بلندی پر ہے کہ یہاں سے تقریباً آدھا بمبئی دکھائی دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہاں سے بمبئی شہر 'شہر آزر' کی طرح نظر آتا تھا۔ یعنی اینٹوں اور دیواروں کا ایک اجتماع۔ شمالی ہند کے کسی شہر کو بلندی سے دیکھئے تو وہ درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا ہے۔ مگر بمبئی پتھروں کا شہر دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے شاید پتھر دلی بھی یہاں کی تہذیبی اور سماجی زندگی میں شامل ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم نیچے اترے اور جناح صاحب کی کوٹھی دیکھ کر اکواریم کی طرف نکل گئے۔ اور پھر تھوڑی دیر میں میرین ڈرائیو سے گھوم کر امبیسڈر ہوٹل اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ رات کو جشن امام علی کرم تھا۔ قد آدم اشتہاروں میں جب ہم نے "امام علی" لکھا دیکھا تو عجیب سا لگا۔ عجیب ان معنوں میں کہ ہم شمالی ہند میں کبھی "امام علی کرم" نہیں کہتے۔ بلکہ امیرالمومنین حضرت علی یا صرف حضرت علی کہتے ہیں۔ اگرچہ شیعہ حضرات حضرت علی کو امام

www.taemeernews.com

اوّل' مانتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ گیارہ اماموں کے نام کے آگے تو لوگ 'امام' کا سابقہ لگاتے ہیں۔ لیکن حضرت علیؑ کے نام کے آگے 'امام' کا لفظ کیوں نہیں لگایا جاتا؟ کوئی سبب تو ہوگا؟ خیر بہت سی باتوں کا جواب نہیں ملتا۔ یہ بھی ایک اور سہی۔

رات کو ٹھیک آٹھ بجے ہم آزاد میدان میں پہنچ گئے۔ جہاں چودہ سو سالہ جشنِ امام علی ہونا تھا۔ تمام بمبئی کے بوا ہر جمع تھے۔ اگلی کئی صفوں میں ان کی سنہری پگڑیاں بجلی کی روشنی میں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے طلسم ہوشربا کے سنہرے پتلے، افراسیاب کے جادو سے زمین سے نکل آئے ہوں۔ شہر کے بہت سے عمائدین جمع تھے۔ مہاراشٹر کے چیف منسٹر... ساودو باپاٹل خاص طور پر مدعو تھے۔ جن کے پیچھے پرنس نجم الدین اور پرنس ماذون برہان الدین (جو اب خود سیدنا ہیں) اسٹیج تک آئے۔ جہاں سیدنا ملا طاہر سیف الدین پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ مختصر سی تقریر پاٹل صاحب نے کی اور روانہ۔ اب ادبی جلسے کی ابتدا ہوئی اور مسند صدارت کرنل بشیر حسن زیدی، وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی نے سنبھالی اور سیمنار کا باقاعدہ آغاز ہوا حضرت علی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مقالے پڑھے گئے، تقریریں ہوئیں۔ یہ پروگرام بارہ بجے رات تک چلتا رہا۔

صبح کو ہمارا ادھر گھومنے کا پروگرام بنا۔ اسی زمانے میں اعجاز صاحب کے ایک اہم شاگرد نخشب بھی بمبئی میں موجود تھے۔ یہ وہی نخشب تھے جن کی قوالی 'زینت' نام کے فلم میں "آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا" بہت مشہور ہوئی اور جہاں تک مجھے علم ہے اسی قوالی کی مقبولیت سے فلموں میں قوالی کا رواج ہوا۔ غالباً "زینت" فلم کے تمام گانے نخشب ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ نخشب اصلاً بجنور کے رہنے والے تھے مگر جب الہ آباد اپنی تعلیم کے سلسلے سے آئے تو اعجاز صاحب کے شاگرد ہوئے۔ نخشب صاحب اچانک ہماری قیام گاہ پر پہنچے اور ہم دونوں کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے مکان پر لائے اب یہ یاد نہیں کہ یہ مکان کس محلے میں تھا۔ وہاں پہنچے تو وہاں مجروح، محمد طاہر (نبیرۂ آزاد) اختر الایمان اور حضرت جگر مرادآبادی موجود تھے۔ نخشب کے یہاں ایک طرح کی

www.taemeernews.com

ملاقاتی محفل تھی جس میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ تاش کی محفل جمی تھی اور ہر شخص بڑے انہماک سے تاش کھیلنے میں منہمک تھا۔ مجروح صاحب نے تو سر اٹھا کر دیکھا بھی اور اعجاز صاحب سے صاحب سلامت بھی ہوئی۔ مگر جگر صاحب نے اس کی بھی زحمت گوارہ نہ کی۔ اعجاز صاحب محفل کے اس رویّے پر بے حد سنجیدہ ہو گئے۔ انھیں اپنی توہین کا احساس ہوا۔ مگر اتنے میں نخشب صاحب، اعجاز صاحب سے مخاطب ہو کر الہ آباد کی باتیں کرنے لگے۔ پھر اختر الایمان نے اپنی کتاب "تاریک سیّارہ" اعجاز صاحب کو پیش کی۔ بیچ میں مجروح صاحب نے کوئی جملہ اختر الایمان پر پھینکا اور محفل زعفران زار بن گئی۔ اختر الایمان اس وقت پینتالیس چھیالیس سال کے رہے ہوں گے۔ غالباً وہ بھی روس یا کسی بیرونی ملک کے دورے سے لوٹے تھے۔ کسی مشاعرے کا تذکرہ تھا۔ مجروح صاحب تاش بھی کھیلتے جاتے تھے اور الہ آباد کی زبان میں اختر الایمان کی "کھینچائی" بھی کر رہے تھے اور اختر الایمان سے کوئی جواب بن نہ آتا تھا۔ پھر تاش کی بازی بھی جاری رہی اور "تاریک سیّارہ" بھی زیر بحث رہا۔ پھر یکایک جگر صاحب نے خود ہی تاش کی بساط الٹ دی۔ میں مستقل خاموش بیٹھا ہوا رنگ محفل سے لطف لے رہا تھا۔ اچانک مجروح صاحب مجھے مخاطب کر کے بولے کہ عقیل صاحب آپ بڑے کم سخن ہیں، کیا آپ کی تعلیم کانونٹ میں ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ حضرت میں "تماشائے اہل قلم" دیکھ رہا ہوں۔ اس پر نخشب صاحب چونک پڑے اور سب ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ جگر صاحب نے بھی گردن اٹھا کر مجھے دیکھا اور مسکرا کر چپ بیٹھ گئے۔ اتنے میں نخشب صاحب کے باورچی جو ایک سردار جی تھے انھوں نے بغل کے کمرے سے ہانک لگائی کہ کھانا تیار ہے۔ پھر کھانا اسی فرشی میز پر چن دیا گیا، جہاں ابھی تاش کی بساط بچھی تھی۔ کھانا کھا کر ہم تھوڑی دیر وہاں بیٹھے پھر خدا حافظ کہہ کر وہاں سے رخصت ہوئے۔ مجروح صاحب اور نخشب ہم لوگوں کو دروازے تک پہنچانے آئے۔ مگر جگر صاحب ہم لوگوں سے مخاطب تک نہ ہوئے۔ مشاعروں سے باہر نجی محفل میں جگر صاحب کا میرا یہ پہلا اور آخری تجربہ تھا۔ نیچے اتر کر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھے قیام گاہ کو واپس آئے۔ ہمارا

www.taemeernews.com

رزرویشن دوسرے دن شام کا تھا۔ اس لئے ابھی ڈیڑھ دن بمبئی میں رہنا تھا۔

کہیں سے باقر مہدی گھومتے پھرتے آنکلے۔ وہ لوکین (Love Lane) مزہ گاؤں (مجگاؤں) میں رہتے تھے۔ انگریزی میں یہ (Mazagaon) ہی لکھا جاتا تھا۔ اعجاز صاحب نے دونوں ناموں کا خوب لطف لیا۔ شام ہوگئی۔ ہم باقر مہدی کے ساتھ نیچے اترے۔ طے ہوا کہ چوپاٹی پر چلیں۔ میرین ڈرائیو اوور برج سے پار کر کے چوپاٹی کی طرف اتر گئے۔ میں نے کرشن چندر کے افسانے 'بُت جاگتے ہیں' میں چوپاٹی کے دلچسپ مناظر اور وہاں کی ریت پر کی محفلوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ چوپاٹی ان بیانات میں بڑا دلکش (Fascinating) معلوم ہوا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر ابھی شفق کی سُرخی باقی تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے سمندر تک چلے گئے۔ ابھی کھڑے ہی ہوئے تھے کہ باقر مہدی چونکے۔ ارے مجھے تو اب گھر جانا پڑے گا۔ میں نے ایک صاحب کو ٹائم دے رکھا ہے۔ آپ لوگ ٹہلیے۔ پھر وہ سامنے ہوٹل ہے چلے جائیے گا اور یہ کہہ کر یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے ریت پر وہیں بیٹھ گئے۔ ایک سیٹھ نما شخص جس کی چاند صاف تھی، چمپی کرا رہا تھا۔ چمپی کرنے والا سیٹھ کو چابی کے گڈے کی طرح کبھی لٹاتا کبھی بٹھاتا۔ کبھی اس کی گردن مڑورتا۔ کہیں بھیل پوری والے آواز لگا لگا کر بیچ رہے تھے۔ ہماری طرح کے کچھ سیاح بیٹھے ہوئے بازی گروں کا کھیل تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اب اندھیرا کافی بڑھ گیا تھا۔ اتنے میں نوجوان لڑکیوں کی ایک پارٹی کہیں سے آکر ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ چند نوجوان بھی آکر کچھ دور پر کھڑے ہو گئے۔ ایک قدرے معمّر آدمی ان لڑکیوں کے بہت قریب آکر بیٹھا۔ پھر ان میں سے دو تین لڑکیاں اس معمّر آدمی کے ساتھ اٹھ کر روانہ ہو گئیں۔ میں کن انکھیوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور سچویشن کو بالکل ٹھیک سمجھ رہا تھا۔ پھر بقیہ نوجوان لڑکیاں بھی ایک قطار باندھ کر لڑکوں کے قریب ہی کھڑی ہو گئیں اور بظاہر افق پر پھیلی ہوئی سرخی کو سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ اعجاز صاحب کچھ اکتائے اور اٹھ کھڑے ہوئے اور جب ان نوجوان لڑکیوں کو اس طرح کھڑے دیکھا تو مسکرا کر ایک مصرعہ پڑھا ؎

www.taemeernews.com

؎ ستم کی فوج کھڑی ہے پرا جمائے ہوئے

پھر خود ہی بولے، یہ مصرعہ میر نفیس کے مرثیئے کا ہے۔ مگر خوب ہے اور پھر ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔ تقریباً آٹھ کا عمل ہوگا جب ہم لوگ ایمبیسڈر ہوٹل میں داخل ہوئے۔ یہ وقت خوب گزرا۔

صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ دوپہر کو سیدنا کے گھر سیفی محل میں ہم لوگوں کو ان سے ملاقات کرنی ہے۔ اور ان سے آشیرباد لینا ہے۔ ہمیں اسی دن شام کی گاڑی سے الہ آباد روانہ ہونا تھا۔ دوپہر کو ایک گاڑی آئی اور ہمیں سیفی محل لے گئی۔ ہمیں سمندر کے رُخ والے کمرے میں بٹھا دیا گیا کہ ابھی سیدنا اپنے مُریدوں سے مل رہے ہیں۔ اس کے بعد ہماری باری آئے گی۔ سیدنا کے مریدوں کا ایک ہجوم دوسری طرف ایک کمرے کے سامنے قطار باندھے کھڑا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ سب سیدنا کے کمرے میں جاتے اور سیدنا کو نذر پیش کرتے۔ سیدنا بھی ہاتھ اٹھا کر کبھی انھیں کچھ دے دیتے کبھی کچھ دعا کرتے۔ ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے اس کا ایک دروازہ سیدنا کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اگرچہ وہ دروازہ بھیڑ دیا گیا تھا مگر ہم صاف دیکھ رہے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ آنے والوں میں کچھ تو سیدنا کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اسے آنکھوں سے لگاتے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو آتے ہی سیدنا کو سجدہ کرتے لگتے۔ یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اعجاز صاحب اور میں دونوں اس سجدہ ریزی کو دیکھ کر متحیر تھے کہ اتنے میں ایک آدمی ہمارے کمرے میں آیا اور ہمیں لے کر سیدنا کے کمرے میں داخل ہوا۔ فوراً دو کرسیاں رکھ دی گئیں۔ ہم نے سیدنا سے مصافحہ کیا۔ سیدنا نے بہت دھیمی آواز میں ہم سے خیریت دریافت کی، جشن کے تاثرات پوچھے اور پھر ایک ایک گرم شال عنایت کی۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر تسلیم کر کے رخصت ہوئے۔ ہمارے لنچ کا انتظام بدری محل میں تھا۔ یہ دوسری عمارت تھی جو انجمن ریسرچ اسلام انسٹی ٹیوٹ کے قریب کہیں تھی۔ جہاں تمام مہمانوں کا لنچ تھا۔ یہاں کے انچارج پرنس یوسف نجم الدین اور شاکر شکری صاحبان تھے۔ کھانا کھا کر ہم اپنی قیام گاہ پر واپس آئے۔ ہمیں کسی کے طریقِ زندگی میں دخل دینے کی ضرورت تو نہیں مگر بہ حیثیت مسلمان ہم سوچنے لگے کہ اسلام میں تو سوا خدا کے

www.taemeernews.com

اور کسی کا سجدہ جائز نہیں۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا جوش عقیدت یہاں تک لے جا سکتا ہے؟ اور پھر وہ بھی اس دور میں؟ مگر مغل بادشاہوں میں سے کچھ نے بھی یہ رسم روا رکھی تھی اور اسے 'سجدۂ تعظیمی' کہہ کر اس پر عمل کراتے رہے۔ جبکہ اکبر نے سجدہ اور درشن دونوں ہی کو رواج دیا۔ بہت بعد کو جب اصغر علی انجینئر، جو ایک باغی بوہرہ ہیں، ان کا 'جرأت' نام کا اخبار مجھے ملنے لگا تو عجیب عجیب باتیں سیدنا اور ان کے عاملوں کے متعلق پڑھنے کو ملیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ بوہرہ کمیونٹی سیدنا کے ہاتھ میں ایک بندھوا مزدور سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔

ہم شام کو بمبئی میل سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن الہ آباد میں تھے۔

www.taemeernews.com

نظر نہیں تو کیا؟ — نظریہ تو ہے

ابھی پڑھنا لکھنا شروع ہی کہاں ہوا تھا؟ ابھی تو مجھ پر ادب کا نقطۂ نظر بھی واضح نہیں تھا۔ صرف کچھ ادبی مصطلحات سامنے تھے۔ ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی، ادب برائے تفریح اور ادب کے متعلق کچھ اسی طرح کی باتیں جو نظریہ بھی تھیں اور کچھ محض (CA-TCH WORDS) مگر ایک راستہ تو صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ اگر ادب کی کچھ غایت اور افادیت ہو سکتی ہے تو ادب کی تعمیری صورت ہی ہو سکتی ہے۔ اور اس میں ایسا ادب جو انسانوں کی بہتری کی فکر کرے، جو انسانوں کو جد و جہد سے گزار کر انھیں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے تیار کرے۔ یہ سوچ، اس فکر سے بہتر ہے جس میں نہ جہد للبقا ہے اور نہ جو انسانوں کے درمیان سے ان کے مصائب و آلام یا ان کے کیف و کم کا اندازہ کرتا ہے۔ ہندوستان جس نوآبادیاتی نظام کی سختیوں سے گزرا تھا۔ یہاں کے ادیبوں اور ناول نگاروں نے جس طرح اُس نوآبادیاتی نظام سے لڑنے اور ملک کو آزاد کرانے کے راستے سوچے تھے اور پریم چند نے جس جاگیردارانہ اور آمریت کے نظام سے انسانوں کو نکلنے کے راستے سجھائے تھے۔ ان کا لازمی نتیجہ تھا کہ ادیب اور ادب دونوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ انھیں کیا کرنا ہے اور تخلیق کو کیا ہونا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہوئے کہ زندگی اور سماج کو بدلنے کے لئے ادب کو جہادِ زندگانی کی تمام سرحدوں کی پہچان ہونی چاہئے اور نہ صرف پہچان ہونی چاہئے بلکہ وہ سماج اور زندگی کو بدلنے کا ایک ہتھیار بنتا جائے۔ تبھی ادب اور زندگی ساتھ چل سکتے ہیں۔ احتجاج کرنے میں بھی اور انقلاب لانے میں بھی فکری احتجاج اور انقلاب بھی اور سیاسی تبدیلی کے لئے بھی۔ نئی تہذیب جو نئے سامان بہم پہنچا رہی تھی، زرعی نظام میں بھی صنعتی صورتوں سے جو تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ وہ فکر اور فن دونوں کو متاثر کر رہی تھیں

www.taemeernews.com

اور ادب ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا۔ ان تمام صورتوں میں سیاست کے اتار چڑھاؤ بھی تھے۔ بدلتی ہوئی تاریخ بھی تھی اور حقیقتوں کی تلاش بھی تھی۔ اور پھر یہ سب سوچنے والے ایک نکتے پر آکر رُک بھی گئے تھے۔ دنیا ایک سرد جنگ کی صورت سے دو چار تھی۔ اور یہ سرد جنگ علم و ادب میں بھی داخل ہوئی۔ آخر، زندگی سے الگ ہو کر ادب کیسے چل سکتا ہے؟ چنانچہ لوگوں نے اس طرز فکر کو روسی پروپیگنڈہ، کمیونسٹ ادب اور فکر میں اجتماعی زندگی کے مسائل اور کیف کو ادب سے خارج کر دیا۔ مذہب سے دلچسپی رکھنے والے ممالک میں ایسی سوچ اور فکر اور ایسے اَدب کو لا مذہبیت اور دہریت کو فروغ دینے والا اَدب اُن لوگوں نے بتانا شروع کیا جو نہیں چاہتے تھے کہ انسان زندگی کے مسائل علی الخصوص معاشی صورتوں سے نجات پاسکیں اور یہ بھی کہ انھیں طبقاتی شعور سے دور رکھا جائے اور پھر یہ صورت عالمی ہوتی گئی۔ پریم چند کے وارث، اپنا ملک اور اپنے مسائل چھوڑ کر دوسروں کے گھروں کا جائزہ لینے لگے۔ "گیہوں اور گلاب" میں کچھ مزہ نہ تھا۔ "کاماٹی پورہ" کے ہندوستان کی طرف دیکھنے کی کسے فرصت تھی؟ کہ ادب سے اب انھیں ان باتوں کا کوئی رشتہ نظر نہ آیا۔ پھر ایک بات اور کہ 'تقسیم' سے لوگ ابھی تک دم بخود (stunned) تھے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ انگریز جانے لگے گا تو "ایک ہزار سال کی جنگ" کا بیج بو کر جائے گا۔ خدا نہ کرے کہ یہ جنگ واقعی ایک ہزار سال تک چلے۔ مگر اگر دشمنیاں کسی قوم کے اعصاب پر سوار جاتی ہیں تو ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ جس یورپ کی ہم نقل کرتے نہیں تھکتے وہاں ایسا ہوا ہے اور آج بھی سرد جنگ کی صورت میں قوموں کے خون میں سرایت کر گیا ہے۔ اب یہ سب کچھ کہنے سے تو کچھ فائدہ نہیں کہ جن قوموں کے گھروں کو ہم دیکھ کر للچا رہے ہیں، ان کی زندگیوں میں اب ایسا خلا ہے کہ وہ اُسے پُر کرنے کے لئے اپنی زندگی میں بھی اور اسی کے وسیلے سے اَدب میں بھی نئے تجربے کر رہے ہیں۔ نئے تجربے کرنا اچھی بات ہے۔ مگر کیا قومیں اپنے وجود اور اپنی معاشی، اخلاقی اور فکری وراثت کو داؤں پر لگا کر ایسا کر سکیں گی؟ ایسا ہو بھی سکتا ہے کبھی کبھی ہم جس بات کا پرچار کرتے ہیں، ٹھیک اس کی مخالف سمت میں چلے جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

گو گوئٹے کی نجی زندگی میں عورتوں کی جو بہار ہے۔ فاؤسٹ (FAUST) اس کی بالکل ضد ہے۔ اور ہندوستان جہاں نینسی فرائے ڈے (NANCY FRIDAY) کی کتابیں شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ دلی اور بمبئی جیسے شہروں میں ان جنسی ترکیبوں اور تجربوں پر عمل ہوتا رہتا ہے۔ کافکا، کامیو اور ویسٹ لینڈ جن صورتوں سے گزرے ہیں، ہمارا وہ مسئلہ کہاں؟ انٹرنیشنلزم، ترقی کی نشانی ہے۔ مگر اپنے پاس وسائل بھی تو ہوں۔ کچھ اسی طرح میں بھی اُس وقت سوچ رہا تھا۔ مجھ پر ترقی پسندوں کا خمار تھا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس طرح کی ترقی پسندی جو اس وقت چلی تھی اب ہمارا ادبی مسئلہ نہیں تھی۔ کہ ہمارا تو یہی قول تھا کہ ادب اور زندگی جامد نہیں، تغیر پذیر ہیں۔ اور جب زندگی کا پیٹرن بدل رہا ہے، انسانی مسائل آج وہ نہیں جو پچاس برس پہلے تھے تو ہمیں پھر سے اپنے ادبی نقاطِ نظر کا جائزہ لینا چاہیئے اور آج کی زندگی کے مطابق ادب کو بنانا چاہیئے۔ یا آج کی جیسی بھی زندگی ہے اسی کے مطابق ادب کی مشعل کو لے کر آگے چلنا چاہیئے۔ مگر کون کرتا؟ ہمارے رہنما تو خود ہی گو مگو کے عالم میں تھے۔ وہ جن پر مارکسزم کا رنگ گہرا تھا وہ ماؤ اور چین کی مارکسزم سے متاثر ہوئے اور اُدھر مڑ گئے۔ مگر ترقی پسند تحریک کے زیادہ تر ادیب ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ان میں سے کچھ بالکل آزاد فکر کی طرف چلے گئے۔ جیسے وارث علوی اور عمیق حنفی۔ کچھ نے حکومت سے صلح کر لی کہ بہت ہوا، اب فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور کچھ دونوں طرف سے بچ بچ کر چلنے لگے۔ جیسے اختر الایمان، خواجہ احمد عباس اور قرۃ العین حیدر۔ یہ ایسی تحریریں پیش کرنے لگے کہ چاہو تو ترقی پسندی کے خانے میں رکھ لو، چاہو تو آزاد سمجھ لو۔ ہم جیسے احمق کچھ نہ سوچ پائے۔ نہ ہمارا وہ قد تھا اور نہ ادب ہی میں کوئی حیثیت تھی کہ ترقی پسندی کے سربراہ بن جاتے۔ مگر ہمیں ادب اور زندگی کے مضبوط رشتے کا تو یقین تھا ہی۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ تاریخ اور بدلتے ہوئے وقت کا ادب کی فکر اور ہیئتوں سے گٹھ بندھن رہتا ہے اور رہے گا۔ اور ہیئت کو صرف ظاہری شکل وصورت ہی تک ہم محدود نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس میں طرزِ پیش کش اور ادبی پیٹرن کو بھی شامل سمجھتے تھے۔ اسی یقین

www.taemeernews.com

نے ہمیں ترقی پسندی پر قائم رکھا۔ ہمارے چند بہی خواہ ہماری اس محکم گیری پر طنز بھی کرتے اور کیسا بیانکا (Casablanca) کا وہ مصرعہ بھی ہمارے لئے پڑھتے کہ تمہاری مثال اسی لڑکے سی ہے جو جلتے ہوئے جہاز پر جہاز کو بچانے کے لئے ڈٹا کھڑا رہا۔ جہاں سے سوا اس کے سب بھاگ گئے۔ مگر ہم چند سر پھرے آج بھی اسی نقطۂ نظر پر قائم ہیں اور مجروح کا شعر للکار کر پڑھتے ہیں کہ ؎

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ — اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

یہ صحیح ہے کہ کچھ ترقی پسندوں کو گھن لگ گیا ہے۔ کچھ انعام و اکرام کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔ اور کچھ کی شہرت کو چند "لونڈے لپاڑی" کیش (Cash) کر رہے ہیں۔ مگر اس سے ترقی پسندی پر کیا حرف آسکتا ہے۔ مارکسزم کا سمجھدار لوگ انتزاع روس کے بعد پھر سے محاسبہ کر رہے ہیں۔ تضادات فکر میں ہیں تو بدلتی ہوئی زندگی میں بھی ہو سکتے ہیں۔ مارکسزم کوئی مذہب نہیں نظام فکر ہے جس کا پھر سے تجزیہ کر کے زندگی کے عملی شعور کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ حیرت ہوئی جب انتزاع روس کے بعد روس کے زاروں کے مدفن تلاش کئے جانے لگے۔ اور لینن گراڈ کا نام پھر سے سینٹ پیٹرس برگ کر دیا گیا۔ کیا پتہ کب قلوپطرہ کا مدفن تلاش کر کے مصر میں شاہی واپس لائی جائے اور "مذہب کا محافظ" Defender of the faith پھر ہٹلر کی طرح جنت کا پروانہ بیچنے لگے کہ عوام کا ایسی صورت میں استحصال بہت آسان ہوگا۔ باتیں بلاوجہ بہت آگے چلی گئیں۔ مگر خیر۔

اسی زمانے میں ایک نئی ادبی تحریک کا غلغلہ ہوا۔ اور عجیب بات ہوئی کہ یہ تحریک بھی، ترقی پسند تحریک ہی کی طرح الہ آباد ہی سے شروع ہوئی جسے بعد کو 'جدیدیت' کا نام ملا۔ اس کے بانی مبانی شمس الرحمان فاروقی اور ان سے زیادہ ان کا رسالہ 'شب خون' تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ اکتوبر، نومبر ۱۹۶۵ء کی بات تھی۔ سید احتشام حسین، الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین، احتشام حسین شمس الرحمان فاروقی جن کے شانہ بشانہ حامد حسین حامد بہکادوی نام کے ایک روایتی قسم

www.taemeernews.com

کے شاعر بھی تھے۔ ان سبھوں نے مل کر ایک ادبی رسالے کا ڈول ڈالا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین جو ترقی پسند تھے وہ اس اسکیم میں پیش پیش تھے۔ فاروقی اپنی ڈاکخانے کی ملازمت میں دلی سے تبدیل ہو کر آئے تھے اور تھارن ہل روڈ پر ایک بنگلے میں رہ رہے تھے۔ یہیں ایک ادبی رسالے کا منصوبہ بنا اور اس رسالے کا نام 'تیشہ' طے پایا۔ اتفاق رائے سے یہ بھی طے پایا کہ ڈاکٹر اعجاز حسین اس رسالے کے ایڈیٹر رہیں۔ 'تیشہ' کا بلاک بھی ایک آرٹسٹ کی مدد سے بنوایا گیا جو گلابی رنگ میں قدرے ٹیڑھا یعنی "تیشہ" جیسا بنایا گیا تھا مجھے آج تک وہ ڈمی (Dummy) یاد ہے یقیناً فاروقی کو بھی یاد ہوگا۔ پھر اچانک احتشام حسین سے معلوم ہوا کہ 'تیشہ' کا نام بدل گیا اور اب یہ رسالہ "شب خون" کے نام سے شائع ہوگا۔ کس نے اچانک یہ نام بدلا ہوگا اسے فاروقی ہی بتا سکتے ہیں۔ اگرچہ شبخون بھی احمد فراز کے ایک مجموعے کا نام تھا جو ۱۹۶۰ء کے گرد و پیش میں چھپا تھا۔ پھر شب خون کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۶۶ء میں نکلا۔ اس کی رسم اجرا اگذر نام کے ایک کھلے (open air) رستوراں واقع البرٹ روڈ (سردار پٹیل مارگ) میں ہوئی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رتن کمار نہرو نے رسم اجرا ادا کی تھی۔ اس وقت تک ہم تمام ترقی پسند بھی اس رسالے کے ساتھ تھے۔ میرے بھی مضامین اور بہت سے ریویو اس وقت شب خون میں چھپے۔ پھر اچانک "شب خون" میں ترقی پسندوں کے خلاف ایک لہر سی اٹھی۔ اعجاز صاحب اس کے برائے نام ایڈیٹر رہ گئے۔ نہ ان کو مضامین دکھائے جاتے تھے۔ اور نہ ان سے کوئی مشورہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب دلی کی ایک میگزین نے اعجاز صاحب سے سوال کیا کہ 'شب خون' ترقی پسندوں کے خلاف لکھتا ہے۔ آپ اس کے کیسے اور کیوں ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں؟ تو اعجاز صاحب نے حقیقتِ حال بتا دی۔ دلی کی اس میگزین نے یہی بیان اعجاز صاحب کا شائع کر دیا۔ پھر اعجاز صاحب نے "شب خون" کی ایڈیٹر شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر 'شب خون' میں ڈمی (Dummy) ایڈیٹر چلنے لگے۔ شمس الرحمان فاروقی اور حامد ہبکاوی تو ایڈیٹر ہو نہیں سکتے تھے کہ یہ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ مگر انھیں لوگوں کی پالیسی شب خون میں چلتی رہی۔ اسی وقت الہ آباد سے دو اور رسالے

www.taemeernews.com

"شب رنگ اور شہیر" نکلے۔ ادھر لکھنؤ سے ترقی پسندوں کا ہم خیال ایک رسالہ 'کتاب' نکل ہی رہا تھا۔ جس کے ایڈیٹر اردو کے مشہور افسانہ نگار عابد سہیل تھے۔ شب خون پہلے عجیب و غریب نام معلوم ہوا۔ مگر احتشام حسین نے شب خون کی رسم اجرا میں جو تقریر کی تھی اگرچہ وہ اس وقت محض مذاق معلوم ہوئی مگر بعد کو وہی حقیقت بن گئی۔ انھوں نے یہی کہا تھا کہ اگرچہ یہ نام عجیب ہے مگر اسے ایک علامتی نام سمجھنا چاہئے کہ جس کے ذریعہ نئی نسل پرانی نسل اور پرانے ادبی نظریات پر گویا شب خون مارے گی۔ اور یہی ہوا۔ شب خون پہلے تو ملے جلے خیالات کا حامل رہا۔ اس میں سب طرح کے لوگ لکھتے رہے۔ مگر پھر اس نے اپنی ایک انفرادیت بنالی۔ اعجاز صاحب کے الگ ہوتے ہی تقریباً تمام ترقی پسند شب خون سے الگ ہو گئے۔ پہلے تو اس رسالے میں فرانسیسی زوال پسندوں کے تراجم نظموں کے بھی اور نثر کے بھی شائع ہونے لگے۔ جن میں ملارمے، بودلیئر، ورلین دلائی آدام اور پال والیری کی نظموں کے ترجمے چھپے۔ پھر ابہال کا زور ہوا اور پھر علامت نگاری پر زور دیا جانے لگا۔ پھر تجریدیت اور جدیدیت کو ملا جلا کر مضامین اور مباحثے پیش کئے جانے لگے۔ مہمل اور لایعنی تخلیقات کی وہ تاویلیں پیش کی جانے لگیں کہ پڑھے لکھے لوگ بھی شبہے میں پڑ گئے کہ آج تک انھوں نے جو علم حاصل کیا تھا وہ سب بیکار تھا؟ چھٹ بھیوں کی بن آئی۔ جو چاہو لکھو۔ شب خون سب کی تاویلات کرکے اسے ادب عالیہ کے ایوان میں داخل کر دے گا۔ چھٹ بھیئے جو انگریزی کی چند سطریں بھی صحیح طریقے سے نہ پڑھ سکتے تھے، فرانسیسی کے شعرا کے اقوال اور اقتباسات اس طرح پیش کرتے جیسے انھیں پورے فرانسیسی ادب پر قدرت حاصل ہے۔ ایک دن عجیب بات ہوئی۔ ایک اتوار کو میں اپنے مکان پر تھا کہ میرے ایک شاگرد شکیل نوازش رضا (کراچی میں اب رہتے ہیں اور اچھی ادبی حیثیت بنالی ہے) ایک صاحب کو لے کر میرے پاس آئے کہ انھیں بہت اچھا ادبی ذوق ہے۔ انھوں نے فرانسیسی ادیب تین TAINE پر اردو میں ایک مضمون لکھا ہے آپ کو سنانا چاہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ کم عمر لڑکا

www.taemeernews.com

ابھی شاید ہائی اسکول میں پڑھتا ہوگا۔ تین پر کیا مضمون لکھے گا۔ ابھی تک صاحبزادے بے ریش و بروت تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ فرانسیسی جانتے ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ وہ پانڈیچری میں رہے ہیں اور پانڈیچری ایک فرانسیسی کالونی تھی اور یہ کہ تین پر انھوں نے فرانسیسی سے براہ راست مواد حاصل کیا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے پاس ہوں۔ اب تو میری حیرت اور بڑھی کہ جسے میں ہائی اسکول کا طالب علم سمجھ رہا تھا وہ ایم۔ اے پاس نکلا اور وہ بھی انگریزی میں۔ خیر انھوں نے تین پر اپنا مقالہ سنانا شروع کیا۔ ان کے پڑھنے کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مقالہ بہ نظرِ اصلاح نہیں سنا رہے ہیں بلکہ ایسی بلند خوانی کے ساتھ وہ مقالہ پڑھ رہے تھے جس میں جذبۂ تفاخر اور تحقیر دونوں ملے جلے تھے۔ تفاخر اپنے لئے اور تحقیر اردو والوں کے لئے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ بیچ بیچ میں رک رک کر شمس الرحمان فاروقی پر بھی طنز و تعریض کرتے جاتے۔ اسی زمانے میں، میں اپنی کتاب نئی علامت نگاری لکھ رہا تھا۔ جس میں فرانسیسی ادب میرے زیرِ مطالعہ تھا۔ صاحبزادے جیسے جیسے تین کے متعلق پڑھتے جاتے مجھے یہ محسوس ہوتا کہ جیسے میں نے یہ سب کہیں پڑھا ہے۔ یکایک میں اٹھ کر اندر گیا اور یوسف حسین خاں کی کتاب 'فرانسیسی ادب کی تاریخ' نکالی اور تین کا بیان کھولا۔ اب جو پڑھتا ہوں تو حرف بحرف وہی عبارت اور سب کچھ وہی۔ میں کتاب لئے ہوئے باہر آیا اور صاحبزادے سے بولا، میاں صاحبزادے آپ کی طرح دوسرے بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنا مضمون اس کتاب سے نقل کیا ہے۔ اور سب کو بے وقوف بناتے پھرتے ہیں؟ صاحبزادے آسمان سے یک بارگی زمین پر آگئے اور ہنس کر بولے کہ میں تو آپ کا امتحان لے رہا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ میں نے یونیورسٹی کے کئی اساتذہ کو یہ سنایا۔ کوئی نہیں سمجھ پایا۔ اس کے بعد پھر وہ صاحبزادے کبھی مجھے مضمون سنانے نہیں آئے۔ اب سنا ہے کہ وہ حضرت بہت بڑے نقاد بن گئے ہیں اور ان کی شہرت الہ آباد کے باہر خوب ہے۔ مگر وہ الہ آباد کی کسی

www.taemeernews.com

علمی ادبی محفل میں کبھی شریک نہیں ہوتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ فرانسیسی تھوڑی بہت جانتے ہیں۔ اور انھیں فرانسیسی الفاظ کے تلفظ اس قدر صحیح معلوم ہیں کہ دلی کے کچھ پروفیسر ان کو خط لکھ کر ان سے فرانسیسی الفاظ کا تلفظ اپنی کتابوں کے لیے معلوم کرتے ہیں۔ میں نے دلی یونیورسٹی کے ایسے پروفیسروں کے خطوط ان صاحب کے پاس دیکھے ہیں جو بالکل اصلی ہیں۔

اس زمانے میں الٰہ آباد کے ادبی حلقوں میں فرانسیسی ادب اور فاروقی کی فرانسیسی دانی کا بڑا چرچا رہتا تھا۔ اگرچہ فاروقی نے خود کہیں کبھی نہ کہا اور نہ لکھا کہ وہ فرانسیسی جانتے ہیں اور یہ سچ بھی ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ فرانسیسی زبان کا ماہر فاروقی کو لوگوں نے کیوں اور کیسے سمجھ لیا۔ کم از کم الٰہ آباد یونیورسٹی سے انھوں نے فرانسیسی زبان کا کوئی ڈپلوما نہیں لیا۔ مگر ڈپلوما لینا کوئی ضروری نہیں۔ اپنی دلچسپی سے بھی کوئی الگ سے کوئی بھی زبان سیکھ سکتا ہے تقریباً یہی بات محمد حسن عسکری کے لئے بھی تھی۔ پاکستان میں مشہور ہے کہ عسکری نے فرانسیسی الٰہ آباد یونیورسٹی سے پڑھی۔ جب کہ الٰہ آباد یونیورسٹی سے میرے علم و اطلاع کے مطابق عسکری نے صرف انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ ہندوستان میں اطلاع ہے کہ عسکری نے فرانس جا کر فرانسیسی پڑھی۔ اور تبھی مادام بواری اور لاروژات لانواغ کا ترجمہ 'سرخ و سیاہ' کے نام سے کیا تھا۔ خدا جانے اصلیت کیا ہے۔ فاروقی پر محمد حسن عسکری کا بڑا اثر تھا اور شاید آج بھی ہے۔ عسکری کی وفات کے بعد فاروقی جب کسی محفل میں عسکری کا تذکرہ کرتے تو ان کے نام ساتھ رحمۃ اللہ بھی لگا دیا کرتے تھے۔ ایک تقریب میں راقم الحروف نے انھیں یہ کہتے ہوئے خود سنا ہے۔ خیر یہ تو کلمۂ دعائیہ ہے۔ کسی مسلمان کے لئے کہا جا سکتا ہے مگر فاروقی نے عسکری کے اثرات کے تحت افسانے نہیں لکھے یا شاعری سے دلچسپی لی۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے بہت سارے ادبی نظریات سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا اور آج بھی ہے۔ مگر میں ان کے علم اور ان کی (TENACITY) کا قائل رہا ہوں۔ انھوں نے جدیدیت کی جس طرح حمایت کی اور جس طرح اس کے لئے سینہ سپر رہے، ایسے ترقی پسندوں کی صفوں میں اب ایک بھی نہیں۔ سجاد ظہیر کے دم تک ترقی پسندوں میں

www.taemeernews.com

کچھ دم خم تھا۔ مگر ان کے بعد کوئی بھی شیرازہ بند ترقی پسندوں میں نہیں رہا۔ اور اب تو بقول فراق صاحب ؎

ع سب کو اپنے اپنے غم ہیں، سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔

ترقی پسندی میں مختلف اسباب، مصلحت پسندیوں اور کسی حد تک خود غرضیوں کے باعث زبردست دراڑیں پڑ گئیں۔ اگرچہ دو ایک سال بعد ترقی پسندوں کو پھر سے مجتمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر انھیں کوئی باندھ نہیں پاتا۔ ترقی پسندی کے اسٹیج کو اب لوگ اپنے وقتی فائدے کے لئے بھی استعمال کرتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ محض جلب زر کے لئے بھی۔ ترقی پسندی کے زوال میں عالمی صورتوں کو بھی دخل ہے اور سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین اور احتشام حسین جیسے مخلصوں کا فقدان بھی۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک کی طرح اب کوئی ادبی تحریک اپنے ادبی اور نظریاتی ورثے کا ایسا اندوختہ پیش نہیں کر سکتی۔

جدیدیت کا بے مقصد ادب کچھ دنوں تک تو اپنی چمک دمک دکھاتا رہا۔ مگر چونکہ اس کی جڑیں، زندگی کی متحرک جمالیات، افادیت اور حرکت میں نہیں ہیں۔ اس لئے جدیدیت بھی "خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود" کا مصداق ہو کر رہ گئی۔ ہاں اس نے الفاظ ابہام، طرزِ اظہار اور فکری تضاد کی ایک گنجلک دنیا ضرور پیدا کر دی۔ جو نومشقوں اور مبتدیوں کے لئے ایک دلچسپی کا مشغلہ بن گئی۔ جس کا تفصیلی ذکر راقم الحروف کی کتاب "نئی علامت نگاری" میں موجود ہے۔ بقول میلان کنڈیرا (MILAN KUNDERA)

"یہ ایک ایسی بھول بھلیاں ہے جہاں انسان راستہ بھول جاتے ہیں"۔ تاہم جدیدیت نے یہ تو ضرور کیا کہ ادیب کی انا کو جگا دیا، جو انانیت کی حد تک پہنچ گئی۔ جہاں وہ یہ سمجھنے لگا کہ جو میں سوچ رہا ہوں وہ کوئی دوسرا سوچ ہی نہیں سکتا۔ اور اجتماعی فکر بالکل لایعنی اور اسٹیریو ٹائپ ہے۔

؎ منزل اُدھر نہیں ہے رواں ہے جدھر ہجوم
ویران راستوں پہ مرے ساتھ ساتھ گھوم

(عمیق حنفی)

www.taemeernews.com

پھر یہ بھی کہ ترقی پسند تو ادب کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس خیال کا سب سے بڑا مرکز علی گڈھ ہے، جہاں علم اور ادب لوگوں پر آیتوں کی طرح نازل ہوتے ہیں۔

○

سچ بات یہ بھی ہے کہ ترقی پسندوں کے پاس نہ کوئی منضبط ادبی پروگرام رہ گیا تھا اور نہ کوئی رسالہ جوان کی آواز بنتا۔ ۱۹۵۸ء کی فروری میں انجمن ترقی اُردو کی ایک کانفرنس دلی میں منعقد ہوئی۔ یہ وہی کانفرنس تھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آخری تقریر کی تھی۔ اردو کے مسئلے پر بھی یہ ان کی آخری تقریر تھی۔ الٰہ آباد سے ڈاکٹر اعجاز حسین، مسیح الزماں صاحب اور راقم الحروف اس میں شرکت کے لئے گئے۔ دلی شہر میں نے باقاعدہ طور پر اسی وقت دیکھا۔ اس سے پہلے دلی اسٹیشن سے تو گزرا تھا، مگر دلی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اعجاز صاحب کے ایک شاگرد مرزا باقر مہدی تھے (جو بعد کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل بھی ہوئے) اعجاز صاحب نے ان کو تار دیا کہ ہم دلی آرہے ہیں تمہارے ساتھ ٹھہریں گے۔ باقر مہدی اس وقت 'بیل بنگش' پر اندر موتی والی گلی میں رہتے تھے۔ باقر مہدی اسٹیشن آکر ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اور اگر چہ ان کا مکان بہت چھوٹا سا تھا۔ مگر انھوں نے بڑی محبت سے ہم لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام اسی مکان میں کیا۔ مرزا باقر مہدی حال ہی میں لندن سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے اور با قاعدگی سے رہنے کے عادی تھے۔ صبح آٹھ بجے تک سوتے۔ ایک خاص وقت پر چائے پیتے، خاص وقت پر کھانا کھاتے۔ مگر اعجاز صاحب کے ساتھ، یہ اصول اور باقاعدگی کہاں چل سکتی تھی۔ اعجاز صاحب صبح پانچ بجے اٹھ جاتے والے اور اٹھ کر فوراً چائے کا تقاضہ کرتے۔ بے چارے باقر مہدی سب اصول وغیرہ بھول کر صبح ہی سے خدمتِ استاد میں لگ جاتے۔ فوراً اٹھ کر خود چائے تیار کرتے (کہ وہ ابھی تک مفلس تھے یعنی غیر شادی شدہ) اور ہم لوگوں کو بلاتے۔ پھر جو اعجاز صاحب کی گل افشانئ گفتار شروع ہوتی تو کسی کے سونے کا کیا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ ہم لوگ تین چار دن اعجاز

www.taemeernews.com

صاحب کے ساتھ رہے۔ بڑا لطف آیا۔ ایسے موقعوں پر اعجاز صاحب استادی اور شاگردی کے رشتے کی تعلقات کو بھول جاتے اور اپنے شاگردوں کو صرف دوست متصور کرتے۔ اسی احاطے کی دوسری گلی میں محسن زیدی اور ان کے بھائی کاظم رضا زیدی بھی رہتے تھے۔ کاظم رضا زیدی، اعجاز صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ دن بھر تو ہم لوگ کانفرنس میں رہتے مگر رات کو باقر مہدی کے گھر میں خوب جعفری جمتی اور رات گئے تک لطائف و ظرائف اور دن کی کانفرنس پر تبصروں کا سلسلہ چلتا رہتا۔

آزادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کو ایک ساتھ اسٹیج پر دیکھا۔ یہ کانفرنس انجمن ترقی اردو ہند نے کی تھی اور غالباً آل احمد سرور صاحب اس وقت انجمن کے سکریٹری تھے۔ مولانا آزاد نے اردو کے مسئلے پر بہت مختصر تقریر کی تھی۔ مولانا کی جس طلاقت لسانی کا شہرہ تھا وہ اس تقریر میں نام کو نہ تھی۔ صرف چند جملے انھوں نے کہے تھے جو حرف بحرف تو یاد نہیں مگر کچھ اس طرح کے تھے کہ اردو اب نہ ہندی کی رقیب ہے نہ مخالف اور نہ اس طرح کا کوئی قضیہ اٹھانا چاہئے۔ اردو بھی ہندوستان کی ایک اہم زبان ہے۔ اسے بھی پھولنے پھلنے کا حق ہے۔ اور بس یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئے۔ اس وقت ان کی حالت ایک طائر پر بستہ کی سی نظر آرہی تھی۔ چہرے کی چمک تو دبی تھی مگر اس پر اضمحلال اور افسردگی کے آثار تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر اس طرح کی جیسے آئے ہیں تو کچھ کہنا ہی ہے۔ پھر جواہر لال نہرو نے اردو زبان کی خوبیاں گنوائیں۔ اور یہ اعتذار بھی کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہماری پہاڑی زبانوں کو بھی ترقی دی جائے۔ جو بہت چھوٹی زبانیں ہیں۔ اردو تو ملک کی بہت بڑی زبان ہے۔ اس وقت تک اردو والے اردو کے سلسلے میں اس سیاست سے واقف نہ تھے اور ان بیانات کو من وعن صحیح سمجھتے اور اس سے خوش ہو جاتے تھے کہ جب ملک کا وزیر اعظم اردو کی تعریف کر رہا ہے تو یقیناً اردو کے لئے کچھ ہو کر رہے گا۔

تقریریں ختم ہوئیں تو لوگ ایک دوسرے سے ملنے ملانے میں لگ گئے۔ یہیں پہلی مرتبہ

www.taemeernews.com

میں نے مخدوم محی الدین کو دیکھا جو حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔ تلنگانہ تحریک اپنے خاتمے پر تھی اور کرشن چندر کا ناول 'جب کھیت جاگے' جو تلنگانہ تحریک سے متعلق تھا اپنی کیفیت کھو چکا تھا۔ اسی کانفرنس میں پہلی بار ڈاکٹر محمد حسن سے ملاقات ہوئی جو حال ہی میں علی گڈھ سے شادی کر کے اپنی بیگم کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ مسیح الزماں صاحب نے مجھے ان سے ملایا۔ سجاد ظہیر، احتشام حسین، مسعود حسن رضوی عبدالقادر سروری، آل احمد سرور، خواجہ احمد فاروقی، ظ۔ انصاری، گلزار دہلوی ڈاکٹر نجیب اشرف اور بہت سے ادیبوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی جن کے نام اب یاد نہیں۔ کچھ کو تو میں پہچانتا بھی نہ تھا۔ بہر حال انجمن کا یہ جلسہ ایک یادگار جلسہ تھا۔ میں سب کو چھوڑ کر محسن زیدی کے ساتھ پنڈال سے باہر نکل آیا اور قریب ہی لال قلعہ تھا انھیں کے ساتھ جا کر دیکھ آیا۔ وہاں سے نکل کر پھر اردو بازار کی سیر کی اور پھر قیام گاہ پر واپس شام کو کناٹ پلیس گھومنے کا پروگرام بنا۔ اس وقت دلی کے چاندنی چوک میں کہیں کہیں ٹرام چلتی تھی۔ مسیح الزماں صاحب کی رائے ہوئی کہ کیوں نہ آج ٹرام پر سواری کی جائے ہم میں سے کسی نے کبھی ٹرام پر سفر نہیں کیا تھا۔ ہم ٹرام پر سوار ہوئے مگر ایک دو اسٹیشن گئے ہوں گے کہ اعجاز صاحب لاحول پڑھ کر اگلے اسٹیشن پر اتر گئے۔ پھر یہاں سے ہم لوگوں نے تانگہ پکڑا۔ اس وقت تک دلی میں تانگے کا بڑا رواج تھا۔ اعجاز صاحب نے کہا چلو۔ پہلے ریڈیو اسٹیشن چل کر ساغر نظامی سے ملتے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر اردو سیکشن تلاش کیا۔ وہاں پہنچے تو ساغر صاحب مل گئے۔ صرف اعجاز صاحب سے ان کی ملاقات تھی اور کسی حد تک بے تکلفی بھی۔ ساغر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اعجاز صاحب نے ہم لوگوں کو بھی ان سے ملایا۔ میں نے زلیخا ڈابسن کے مصنف سر میکس بیر بام (MAX BEER BHOM) کے متعلق ایک مرتبہ پڑھا تھا کہ وہ بے حد خوش پوشاک تھے۔ اور بہت بنے سنورے رہتے تھے۔ لباس اور جسم کی نوک پلک سنوارنے میں ان کا زیادہ وقت صرف ہوتا۔ ان کے دور میں انھیں لوگ (LAST OF THE DANDIES) کہتے تھے۔ اردو میں ہم

www.taemeernews.com

انھیں بانکا، چھیل چھبیلا اور خوش پوشاک کہہ سکتے ہیں۔ ساغر صاحب کو دیکھ کر ہمیں سرمیکس یاد آئے کہ اسی طرح رہے ہوں گے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی لانڈری سے دھل کر نکلے چلے آرہے ہیں۔ اور اگر کوئی انھیں چھوئے گا تو میلے ہو جائیں گے۔ اسی وقت دلی میں ایک اور شخصیت ایسی ہی نظر آئی اور وہ تھے گلزار دہلوی۔ ساغر صاحب باتیں محض لطف کی کر رہے تھے جنہیں اعجاز صاحب اور ہوا دیتے جاتے تھے۔ عجیب بات تھی کہ ساغر صاحب اعجاز صاحب کو "ایعجاز صاحب" کہہ رہے تھے۔ وہ 'اعجاز' کا تلفظ "ایعجاز" ہی کرتے تھے۔ کیوں؟ کہہ نہیں سکتا۔ اتنے میں انگریزی زبان میں لکھا ہوا کوئی سرکاری کاغذ ساغر صاحب کے پاس آیا۔ ساغر صاحب کا جیسے رنگ اتر گیا۔ معذرت کر کے اٹھے اور ایک کلرک کی میز پر جا کر اسے کاغذ دیا اور چپکے چپکے باتیں کیں، پھر واپس آئے تو اعجاز صاحب نے چٹکی لی، "ارے بھائی ہم ہی لوگوں سے پڑھوا لیتے" ساغر صاحب مسکرانے لگے۔ اتنے میں چائے آگئی اور ہم لوگ چائے پینے لگے۔ ساغر صاحب اس پرچے کا جواب اردو میں لکھنے لگے۔ جواب لکھ کر پھر اسی کلرک کے پاس گئے اور اپنا جواب اس کے حوالے کیا۔ ساغر صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اس وقت کے نوآبادیاتی ہندوستان میں یہ بہت بڑا نقص تھا۔ مگر سوچا جائے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ ساغر صاحب اپنی زبان تو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اسی زبان کے وہ شاعر بھی تھے۔ کیا ہوا اگر انگریزی نہیں جانتے تھے؟ ایک دفعہ سوویٹ یونین سے موسکا لیت نام کے ایک صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آئے۔ وہ اچھی خاصی اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ کہیں سے گھومتے پھرتے فراق صاحب آگئے۔ ہم ہندوستانی ہر سفید چمڑے والے کو انگریز سمجھ لیتے ہیں یا کم از کم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ وہ زبان انگریزی سے واقف ہوگا۔ فراق صاحب نے موسکالیت سے انگریزی میں گفتگو شروع کی۔ موسکالیت نے اچھی اردو میں جواب دیا کہ میں انگریزی زبان نہیں جانتا ہوں۔ فراق صاحب کو بڑی حیرت ہوئی اور شاید ساتھ ہی ساتھ موسکالیت کی حیثیت بھی ان کی نظروں میں گر گئی۔ بجائے ادب اور سیاست پر بات کرنے کے فراق صاحب اس سے پوچھنے

www.taemeernews.com

لگے کہ روس میں انڈا کتنے میں ملتا ہے۔ ایک مرغی کی کیا قیمت ہے اور بکرے کا گوشت کیا حساب بکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بعد کو جب موسکالیف چلا گیا تو احتشام صاحب نے بتایا کہ وہ دلّی میں روسی سفارت خانے کا فرسٹ سکریٹری ہے۔ اب فراق صاحب افسوس کرنے لگے کہ انھیں موسکالیف سے اپنی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کرنے کی بات کرنی چاہئے تھی۔ پھر انھوں نے اسے ایک خط بھی اس سلسلے میں لکھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔

ہم لوگ تھوڑی دیر بعد ریڈیو اسٹیشن سے اٹھے۔ سردیاں جا رہی تھیں۔ یونہی گلابی جاڑے تھے۔ ہم لوگ پیدل ہی گھوم کر کنگس وے (آج کا جن پتھ) کی طرف چل پڑے۔ مجھے اپنی بیوی کے لئے تحفے تحائف خریدنے تھے۔ مسیح الزماں صاحب کو ایسی چیزوں کی اچھی پرکھ تھی۔ ہم ایک دُکان سے نکلتے اور دوسری دُکان میں داخل ہو جاتے اور چیزوں کو تاکتے پھرتے۔ اعجاز صاحب بے دلی سے ہمارے ساتھ تھے اور خاصے اکتا رہے تھے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور بولے کہ بھئی مسیح اب واپس چلو میں بہت تھک گیا ہوں۔ آخر ہم لوگوں نے جلدی جلدی میں کچھ چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں اور تانگہ لے کر واپس پل بنگش جا پہنچے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے ترقی پسندوں نے ایک ملاقات رکھ لی تھی کہ مل کر ترقی پسندی کے آئندہ پروگرام پہ کچھ باتیں کی جائیں۔ اُردو کے اتنے مشاہیر کی موجودگی میں سجاد ظہیر نے یہ ملاقات طے کی تھی۔ ہم صبح آٹھ بجے جب پنڈال میں پہنچے تو ڈاکٹر عبد العلیم، سید احتشام حسین، مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، عابد سہیل، آل احمد سرور، باقر مہدی، سری نواس لاہوٹی اور شاید اختر اورینوی وغیرہ موجود تھے۔ اعجاز صاحب کی معیت میں ہم لوگ بھی پہنچ گئے تھے۔ یہ ملاقات (MEET) صرف اردو والوں کی تھی۔ ڈاکٹر کوثر چاند پوری نے اس مجلس کی صدارت کی۔ مسئلہ زیر بحث یہ آیا کہ اسٹالین کے بعد جو صورت حال روس میں رونما ہوئی ہے اس کا ادب پر کیا اثر پڑے گا۔ اور اب ترقی پسند ادب کے راستے کیا ہوں گے۔ غالباً خروشچیف کا دَور شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ژواگو اور پیسترناک کے جھگڑے شروع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر علیم

www.taemeernews.com

اور ظ۔ انصاری نے ادب کی صورت حال کا بہت مُسکت جائزہ لیا کہ اتنے میں احتشام حسین کھڑے ہوئے اور انھوں نے مارکس کے تاریخ اور سماج کے بدلتے ہوئے تعلّقے اور سوسائیٹی کے طبقات کے تضادات اور پھر ادب پر ان کے اثرات کیا ہو سکتے ہیں اور اب ترقی پسندی کے راستے کیا ہو سکتے ہیں سب کا تفصیلی اور تجزیاتی ڈھنگ سے جائزہ پیش کیا۔ ابھی احتشام حسین کی تقریر جاری ہی تھی کہ ایک صاحب سیاہ سوٹ میں ملبوس لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہوئے (غالباً ان کی ٹانگوں میں کچھ خرابی تھی) اور بولے کہ آپ مارکسزم کی غلط تاویل کر رہے ہیں۔ آپ شاید مارکسزم اچھی طرح نہیں جانتے اور پھر ایک جملہ اور آگے "شاید آپ احتشام حسین ہیں" یہ بات انھوں نے غالباً احتشام حسین کی تحقیر کرنے کے لئے کہی تھی۔ یہ گوپال متّل تھے۔ احتشام حسین نے بڑی سنجیدگی اور ضبط سے کہا کہ جی ہاں میں احتشام حسین ہوں، مگر میں باتیں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ گوپال متّل تو میٹنگ کو گڑبڑ (DIST-URB) کرنے آئے ہی تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی کے خلاف کچھ کہنا شروع کیا اور کہا کہ انھیں غلط تاویلات کی وجہ سے تو ترقی پسندی کا زوال ہو گیا۔ اس پر لاہوٹی نے ڈانٹ کر ان سے کہا کہ اگر آپ ہماری باتیں صبر و سکون سے نہیں سُن سکتے تو چلے جائیے ہماری محفل سے۔ اب یاد نہیں کہ کون کون ان کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔ مگر دو تین آدمی ضرور تھے۔ بعد کو کسی نے بتایا کہ جانے والوں میں نریش کمار شاد اور مخمور جالندھری بھی تھے۔ یہ میٹنگ تقریباً ایک گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ میرے لئے یہ بے حد اہم میٹنگ اس لئے بھی تھی کہ میں نے بہت سے چہرے ایسے یہاں دیکھ لئے جن کی تخلیقات پڑھی تھیں مگر جنہیں کبھی دیکھا نہ تھا۔

دوسرے دن رات کی گاڑی سے ہم لوگوں کو الہ آباد واپس آنا تھا۔ جی میں آئی کہ جامع مسجد، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، اور علائی دروازہ وغیرہ دیکھ لیا جائے دلّی میں یہ سب کوئی نہیں دیکھتا، مگر میں تو پہلی مرتبہ دلّی آیا تھا۔ پھر ان عمارتوں کے متعلق اتنا کچھ پڑھ رکھا تھا کہ انھیں دیکھنے کا شوق بے پایاں ہو گیا۔ صبح ہوئی تو مسیح الزماں صاحب کے ساتھ جامع مسجد دیکھنے گئے۔ پھر ہمایوں کا مقبرہ دیکھا اور اب ہماری منزل

www.taemeernews.com

قطب مینار تھی۔ قطب مینار کے لئے بسیں اسٹیشن سے جاتی تھیں۔ اسٹیشن پہنچے تو سیج ازنا صاحب کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بہت تھک گئے تھے اور معذرت کر کے قیام گاہ کو واپس ہو گئے۔ مگر میں بس پکڑ کر قطب مینار کے لئے روانہ ہو گیا۔ قطب مینار پہنچے تو میں اکیلا تھا۔ گارڈ نے کہا کہ آپ اکیلے ہیں اور ہم اکیلے آدمی کو اوپر نہیں جانے دیتے۔ بس اس نے یہ کہا تھا کہ میرے پیچھے قطار میں کھڑی ہوئی ایک لڑکی فوراً بول پڑی کہ اکیلے کیسے؟ میں بھی ان کے ساتھ ہوں۔ گارڈ کے پاس اب روکنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو لڑکی نے کہا کہ میں بھی اکیلی تھی اور جب میں نے دیکھا کہ گارڈ آپ کو روک رہا ہے تو مجھے بھی روکے گا بس فوراً میرے منھ سے یہ جواب نکل گیا۔ اور اچھا ہی ہوا ورنہ میں اور آپ دونوں میں سے کوئی قطب مینار نہ دیکھ سکتا۔ مجھے لڑکی کی تیزی اور ذہانت پر بڑا تعجب ہوا اور اس کی فوری قوت فیصلہ کی داد دینی پڑی۔ لڑکی میسور سے آئی تھی اور بی۔ اے کی طالبہ تھی، جیسا کہ اس نے بتایا۔ پھر ہم لوگ اوپر کی منزل تک گئے۔ اوپری منزل سے دلی ایک وسیع و عریض باغ سا دکھائی پڑا۔ عمارتیں درختوں کی بہتات میں تقریباً غائب ہو گئیں۔ ہوا اس قدر تیز تھی کہ پاؤں اکھڑے جاتے تھے۔ خوف کے مارے ہم لوگوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اگرچہ ایک اونچا سا جنگلہ بنا دیا گیا تھا۔ مگر بلندی اور ہوا کی تیزی کا خوف ہم پر غالب تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ گھوم پھر کر نیچے اتر آئے کہ اگر ذرا سی لغزش ہو جاتی تو ہم لوگ معلوم نہیں کہاں پہنچتے۔ یہ جملہ ذو معنی بھی ہو سکتا ہے مگر خیر نیچے آکر ہم لوگ التمش کی قبر، علائی دروازہ وغیرہ دیکھتے رہے۔ پھر وہیں ایک چھوٹی سی دکان پر ہم لوگوں نے چائے پی اور ان تاریخی عمارتوں پر تبصرہ کرتے رہے۔ لڑکی کا نام ششی کلا تھا۔ اس کے والد میسور میں فوج میں کپتان تھے۔ اصلاً وہ لوگ اتر پردیش ہی کے رہنے والے تھے۔ مسجد قوت الاسلام میں کچھ نمازی نماز ادا کر رہے تھے۔ جب نماز ہو چکی تو ہم لوگ یہ مسجد دیکھنے کے لئے بڑھے۔ ہم دروازے پر پہنچے۔ ششی کلا ساری میں ملبوس تھی۔ میں نے مسجد کے دروازے پر ہی اس سے جوتے اتارنے کے لئے کہا اور ہم اپنے

www.taemeernews.com

اپنے جوتے چپل ہاتھ میں لئے ہوئے مسجد میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ ایک باریش بزرگ نے ہمیں خشونت کی نظر سے دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ فوراً میں نے اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۔ پڑھا۔ اور بزرگ کی خشونت محبت میں بدل گئی۔ گویا یہ تالیف قلب کا عمل تھا۔ ہم نے اطمینان سے مسجد قوت الاسلام اندر سے دیکھی۔ اس کی معماری سنگ تراشی اور اس کا بھاری بھرکم پن اور عظمت ہمارے دلوں پر چھا گئی۔ پھر ہم لوگ مسجد سے باہر نکل آئے اور کچھ دیر وہ تماشا دیکھتے رہے جہاں اشوک کی لوہے والی لاٹ کے گرد لوگ ہاتھ پیٹھ کر اپنے صحیح النسب ہونے کا یقین کرتے رہتے ہیں۔ اور کوتاہ دست بلا سبب ملول ہو جاتے ہیں۔ میں نے ششی کلا سے یہ بتایا تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ پھر ہم بس پر سوار ہو کر چلے۔ ششی کلا تو حوض خاص پر اتر گئی اور میں سیدھا اسٹیشن پہنچا اور وہاں سے پل بنگش۔ رات کی گاڑی سے ہم الٰہ آباد کے لئے روانہ ہوئے اور صبح اپنے گھر پہنچ گئے۔

○

شعبۂ اردو میں وہی گھٹن کا ماحول پھر مسلط ہو گیا۔ وہی ریشہ دوانیاں، سازش کا ماحول۔ ایک دوسرے کے خلاف حکایت شکایت۔ خردہ گیریاں اور خرافات کا زور۔ جتنی تکلیف اور گھٹن سے میں ان چھ سات برسوں میں گزرا ہوں جو میری غیر مستقل ملازمت کا زمانہ تھا، مجھے زندگی کے کسی حصے میں اس کا احساس نہیں ہوا۔ اعجاز صاحب اگرچہ بڑے جہاندیدہ اور ہوشمند آدمی تھے مگر اس سازشی ماحول کو دور نہ کر سکے۔ ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ ایم۔ اے کے کورس میں منیر شکوہ آبادی کی مثنوی "معراج المضامین" تھی۔ اس میں ایک مصرعہ یوں تھا۔ ع "قیامِ قدِ آدم مارِ دافق"۔ استاد نے اسے "مارِ وافق" (بجائے دال، واؤ پڑھایا) ٹیوٹوریلز (Tutorial) کے کلاس میں جہاں ٹیکسٹ وغیرہ کا آموختہ اور بازدید ہوا کرتی ہے، مجھ سے کسی طالب علم نے پوچھ لیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ مارِ دافق ہے 'وافق' نہیں۔ قرآن کی آیت۔ انسان کی تخلیق کی

www.taemeernews.com

طرف اشارہ کرتی ہے کہ "ہم نے انسان کو اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا ہے" 'دافق' کے معنی ہیں "اچھلتا ہوا"۔ دوسرے دن جنرل کلاس میں طالب علم نے استاد کو ٹوک دیا۔ استاد بے حد خفا ہوئے اور جب ان کو حقیقت معلوم ہوئی تو ایک طویل خط صدر شعبہ کو لکھا کہ ٹیوٹوریل کلاس میں میری توہین کی جاتی ہے۔ اعجاز صاحب نے مجھ سے بلا کر پوچھا۔ تو میں نے واقعہ بیان کر دیا اور شعبۂ عربی و فارسی سے جا کر عربی کا لغت 'منجد' لے آیا۔ جس میں "دَفقہ" درج تھا۔ اعجاز صاحب چپ ہو گئے۔ اب ہر دس پندرہ دن پر میری شکایت کبھی صدر شعبہ اور کبھی ڈین سے ہونے لگی۔ ایک دن ڈین نے ہم دونوں عارضی لکچررز کو بلایا اور کہا کہ بھئی کلاس میں ٹھیک وقت سے جایا کرو۔ تم لوگوں کی شکایت آئی ہے کہ تم لوگ دیر سے کلاس میں پہنچتے ہو۔ ہم نے اس کا انکار کیا۔ پھر ایک دن اگست کا مہینہ تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کہ ڈین صاحب برساتی اوڑھ کر، پانی برستے میں ہمارے کلاس کو دیکھنے آئے کہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگرچہ یونیورسٹیوں میں اس طریقے کی جانچ پڑتال نہیں ہوا کرتی۔ مگر ہماری شکائتیں اتنی پہنچ رہی تھیں کہ ڈین بھی شبہے میں پڑ گئے۔ مگر ہم تو اپنا کلاس پڑھا رہے تھے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے میری نفسیات بدلنے لگی۔ ہم صحیح ادبی بحثوں میں بھی ڈانٹ دیئے جاتے۔ اعجاز صاحب کے جمعراتی کلب میں ایک استاد نے مضمون پڑھا۔ مضمون منیر شکوہ آبادی کی مثنوی 'حجاب زناں' پر تھا۔ استاد کبھی 'زَنا' کہتے کبھی 'زِنا'۔ مجھ سے غلط زبان برداشت نہیں ہوتی۔ یہ بھی برداشت نہ ہوئی اور میں نے لائٹ موڈ میں کہا کہ طے کر لیجئے کہ کیا ہے؟ بس استاد خفا ہو گئے۔ اگرچہ یہ نہ کلاس روم تھا اور نہ میں طالب علم۔ مگر استاد اپنی خاص لفظیات میں بولے، "خاموش رہو۔ مجھے لونڈا سمجھتے ہو۔ تمہارے جیسے پتہ نہیں کتنے لونڈے لپاڑیوں کو میں نے پڑھا کر پھینک دیا ہے۔" میں خاموش ہو گیا۔ میں دیہات کا پروردہ ہوں اور فکر و نظر میں بالکل آزاد۔ اگر کوئی غلطی کرتا ہوں تو صدق دل سے تسلیم کر لیتا ہوں اور آئندہ وہ غلطی نہیں کرتا۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتا اور نہ کسی سے بدلہ لینے کا خیال میرے

www.taemeernews.com

دل میں آتا ہے۔ کبھی روپے پیسے کا لالچ میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ لالچ میں کوئی کام میں نے کیا ہے۔ میں اقبالؔ کے اس قول کا قائل ہوں کہ "ع کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق"! مگر حق بات کہنے والوں کا جو انجام ہوتا ہے، وہی انجام اپنا بھی اکثر ہوتا ہے۔ خوشامدی ہونا یا خوشامد کرنا میری سرشت سے بالکل الگ ہے۔ علم کے معاملے میں میں صرف اسی کی بات مانتا ہوں جس کے علم کا قائل ہوتا ہوں۔ علم کے معاملے میں ہوّا باندھنے والوں کو بھلا میں کیا خاطر میں لاؤں گا؟! مجھ میں ایک چھٹی حس ہے جس کے ذریعہ میں عالم اور صرف ہوّا باندھنے والوں کو سمجھ لیتا ہوں۔ علم کے معاملے میں یہ قول اکثر دُہراتا ہوں کہ "علم کسی کی میراث نہیں، جو حاصل کرے گا وہ پائے گا"۔ یونیورسٹی کا پروفیسر ہونے سے، نہ پہلے کوئی عالم ہو جاتا تھا اور نہ آج ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو پروفیسر ہونا کبھی کبھی جہل کا تمغہ بن جاتا ہے۔ پروفیسری اب علم کی علامت نہیں بلکہ جلب زر اور تزک و احتشام ہے۔ کوئی کتنا ہی رسا اور ذوی الاقتدار پروفیسر کیوں نہ ہو، مگر علم اگر اس کے پاس نہیں تو وہ میری نظر میں ہیچ ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کو اپنی ایک اسکیم بھیجی کہ اگر منظور ہو جائے تو یہ کام میں کر ڈالوں۔ اسکیم تھی، "طلسم ہوشربا کا سماجی اور تہذیبی مطالعہ"۔ یہ بات میں نے پروفیسر گیان چند کی ترغیب پر کی تھی۔ وہ میری صلاحیتوں سے واقف ہیں۔ انھوں نے میری کچھ مدد بھی کی۔ مگر یونیورسٹی گرانٹ کمیشن میں اردو کے ایک ایسے پروفیسر بیٹھے تھے جن کی شرط یہ تھی کہ میں خود ان سے کہوں اور پھر ایک قدم اور آگے جا کر ان کی خوشامد کروں تو یہ اسکیم منظور ہو جائے۔ مگر میں نہ گیا اور میر انیسؔ کا یہ مصرعہ پڑھتا رہا: "ع سب جہاں رکھتے ہیں سر، واں ہم قدم رکھتے نہیں"۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اسے کوئی میری بددماغی پر محمول نہ کرے۔ اگر کوئی عالم مجھے مل جاتا ہے تو میرا سر تسلیم اس کے آگے ہمیشہ خم رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے عالم مجھے زندگی میں بہت کم ملے ہیں۔ عالم کے سامنے مجھ سے زیادہ منکسر مزاج بہت کم لوگ ملیں گے۔ مگر پینترے باز اور جعلی عالم سے مجھے ایک طرح کا

www.taemeernews.com

بغض ہو جاتا ہے۔ میرے ایک دوست نے ابھی حال ہی میں ایک محفل میں کہا کہ "نقیل صاحب پڑھے لکھے لوگوں کو برداشت نہیں کر پاتے۔" یہ محض ان کا بھرم (ہندی میں بھرم) ہے ہاں میں علم کا جھوٹا رعب جمانے والوں کو یقیناً برداشت نہیں کر پاتا۔ میں خود عالم نہیں مگر عالم کی پرکھ ضرور رکھتا ہوں۔ اور اس میں کبھی دھوکا نہیں کھاتا۔

باتیں بہت آگے چلی گئیں۔ شعبے کے ایسے واقعات کے درمیان جن کا ذکر اوپر کیا گیا میں اپنی جودتِ طبع کھونے لگا۔ اعجاز صاحب کے بعد اگر احتشام حسین صدر شعبۂ اردو ہو کر الہ آباد نہ آگئے ہوتے تو میں بالکل ہی ختم ہو گیا ہوتا۔ شعبے کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو احتشام حسین بھی ختم نہ کر سکے بلکہ یہ سازشیں کسی حد تک اور بڑھ گئیں مگر اس وقت تک میری ملازمت مستقل ہو چکی تھی اور اب ایک طمانیت اور قوت کا احساس ہونے لگا تھا کہ کوئی اب میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ پھر احتشام حسین کے ساتھ جو ایک عالمی ادب کے مطالعے کا بھی موقع مجھے ملا اور ساتھ ہی ساتھ جو دوسری یونیورسٹیوں، سیمناروں میں شرکت کرنے لگا۔ اس سے مجھ میں ایک نئی بصیرت پیدا ہوئی۔

سب سے پہلا سیمنار جس میں میں نے اپنا مقالہ پیش کیا وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تنقیدی مسائل پر تھا۔ جس میں مقالہ پڑھنے کے لئے آل احمد سرور صاحب نے احتشام صاحب اور مجھے دعوت نامہ بھیجا۔ سرور صاحب مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ میرا تقرر بھی بحیثیت لکچرر کے سرور صاحب ہی نے الہ آباد یونیورسٹی میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے مضامین بھی 'اردو ادب' علی گڑھ میں وہ شائع کرتے رہتے تھے۔ بہرحال اس سیمنار میں میرے مقالے کا عنوان تھا "تاریخی تنقید اور انفرادیت"۔ یہ مقالہ بعد کو سرور صاحب کی مرتبہ کتاب 'تنقیدی مسائل' میں شائع ہوا۔ تب سے میں نے یہ اصول بنالیا ہے کہ اگر علی گڑھ میں کوئی سیمنار ہوا اور مجھے دعوت نامہ ملا تو میں اس سیمنار میں ضرور شرکت کرتا ہوں۔ علی گڑھ کی پذیرائی نے میرا دل بڑھایا اور پھر میں دلی، حیدرآباد، پٹنہ، کلکتہ، احمدآباد، لندن، پٹیالہ، لکھنؤ، سولن (شملہ) بمبئی اور پاکستان ہر جگہ سیمناروں میں

www.taemeernews.com

شرکت کے لئے جا تا رہا ہوں۔ سید احتشام حسین کے ساتھ جو دس گیارہ سال میں نے گزارے وہ علمی اور ادبی اعتبار سے میرا بہترین زمانہ تھا۔ انگریزی ادب کا تفصیلی مطالعہ میں نے انھیں کی معیت میں کیا۔ انگریزی تنقید کے تمام اسکولوں کے اصول اور نظریات احتشام صاحب ہی کی رہبری میں میں نے پڑھے۔ میں نے جو وقتاً فوقتاً احتشام حسین پر مضامین لکھے ہیں، ان میں بھی ان باتوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔

اسی زمانے میں جب ہم لوگوں نے "شب رنگ" محلہ چک سے نکالنا شروع کیا (جس کا مختصر تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) تو احتشام حسین کے ریویو اور مضامین بھی اس میں چھپتے تھے۔ "شب خون" میں جب ترقی پسندوں کے خلاف کچھ چھپتا تو شب رنگ اس کا جواب دیتا۔ اور جدیدیت کی مہملیت کے خلاف بھی اس میں مضامین چھپتے۔ شکیل نوازش رضا نے محمود ہاشمی کی بدعنوانیوں کے خلاف جم کر مضامین لکھے۔ یہ مضامین شب رنگ اور گیا، بہار سے نکلنے والے رسالے 'مورچہ' میں چھپے ہیں۔ جب یہ صورت ہوئی تو محمود ہاشمی نے پہلا حملہ اپنے خاص انداز میں راقم الحروف پر کیا۔ میرے خلاف ایک مضمون "جرثقیل کے قتیل۔ عقیل" کے نام سے 'شب خون' میں شائع ہوا۔ جس میں راقم الحروف پر طنز و تعریض تھی۔ پھر ادب کی دنیا میں ایک غیر اخلاقی بات یہ بھی کی گئی کہ مجھے ایک عدالتی نوٹس دلی کے کسی وکیل کے ذریعہ بھجوایا کہ 'جدیدیوں' کی مخالفت میں کیوں کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں دلی کی عدالت میں آکر صفائی پیش کروں اس میں الہ آباد کے "ایک صاحب" بہت پیش پیش تھے جو اس وقت ادیب بننے کی ٹریننگ لے رہے تھے اور ہر جگہ خود کو فاروقی کا مشیر خاص بنا کر پیش کرتے تھے۔ اس وقت فاروقی یو۔پی کے پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں افسر تحقیقات تھے۔ رسالہ شب رنگ نے یو۔پی کے پوسٹل ڈیپارٹمنٹ کو ڈسپیچ (Despatch) کے ٹکٹ میں رعایت دینے کی درخواست بھیجی۔ شب رنگ کا رجسٹرڈ نمبر L/839 تھا۔ بہت دنوں تک ڈیپارٹمنٹ سے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر طرح طرح کی انکوائری شروع ہوئی۔ کبھی یہ کہ یہ رسالہ رجسٹرڈ نہیں

www.taemeernews.com

ہے۔ کبھی یہ کہ یہ دُوسو سے کم ڈسپیچ ہوتا ہے اس لئے اسے رعائت نہیں مل سکتی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ جب تمام جوابات بھیج دیئے گئے تو ایک دن ایک انسپکٹر آیا اور بولا کہ آپ لوگوں کو پوسٹل رعائت نہیں مل سکتی اس لئے کہ آپ لوگ ہمارے صاحب کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ غرض کہ رسالے کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی اس لئے تقریباً سال ڈیڑھ سال سال نکلنے کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا۔ شب خون کے دفتر اور حلقے میں 'شب رنگ' کے بند ہونے کی بڑی خوشی منائی گئی۔ ادیب کی ٹریننگ لینے والے حضرت اس واقعے کو غیرادبی حلقوں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور کہتے کہ بھلا ہم لوگوں سے لڑ کر کوئی زندہ رہ سکتا ؟ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اصل بات کیا تھی۔

www.taemeernews.com

باغِ نشاط کے گلو!

ابھی برف پڑنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکتوبر کی آخری تاریخیں تھیں۔ لوگ گلمرگ سے اتر کر یا تو ٹنگ مرگ میں خیمہ زن تھے یا سری نگر کی طرف روانہ ہو رہے تھے ٹنگ مرگ کے اڈے کے نیچے جو فیروز پور کا چوڑا سا نالہ بہتا ہے، اس کی ایک پتلی سی شاخ سڑک کے کنارے چل کر سڑک پر بنے ہوئے پل کے نیچے سے مڑ کر شمال کی طرف گھوم گئی تھی۔ ڈاکٹر چاند کشن کے بنگلے سے نیچے اتر کر مغربی کونے پر دو چھوٹے چھوٹے آؤٹ ہاؤس بنے ہوئے تھے۔ ان سے ذرا آگے ترکاریوں کے کچھ کھیت تھے اور بس وہیں سے بابا ریشی کی طرف جانے کی بلندیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ گویا گلمرگ کا گھیرا یہاں تک اترا ہوا تھا۔ لکڑی کا ایک بڑا بنگلہ بھی یہیں بنا ہوا تھا۔ بنا کیا۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا جیسے پہاڑوں کی بلندیوں کے پاس یہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کھلونے رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں بارہ مولہ کا ایک خاندان اقامت پذیر تھا۔ خاندان کے سربراہ ایک سردار صاحب تھے جو دق کے مریض تھے اور علاج کی غرض سے ٹنگ مرگ سینی ٹوریم میں آئے ہوئے تھے اور اسی کرائے کے بنگلے میں اپنی بیوی اور ایک لال رنگ کی گائے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ہر روز شام ہوتے ہی سینی ٹوریم کے اوپر سے راما نند ساگر (اس وقت کے مشہور ادیب) معہ اپنے دو عدد بچوں کے نیچے اترتے اور نیچے چھوٹے آؤٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے الٰہ آباد کے خاندان میں مل جاتے۔ کچھ دیر گپیں مارتے۔ بہت صاف ستھری اردو بول کر الہ آباد والوں پر اپنی اردو دانی کا اثر جماتے۔ انشاءاللہ اور ماشاءاللہ کے سابقے اور لاحقے کے ساتھ باتیں کرتے اور پان کے بجائے چھالیہ کتھا کا ملغوبہ کھا کر اپنی قیام گاہ کو واپس چلے جاتے۔ اور جب چاندنی کھیت کرتی تو سردار صاحب نورجہاں کا نیا گانا آواز دے

www.taemeernews.com

کہاں ہے، دنیا مری جواں ہے" ضرور بجاتے کہ ابھی ابھی یہ گانا، نیا نیا ریلیز ہوا تھا۔ اور جب تک چاندنی رہتی سرور صاحب کا یہ گانا بجتا رہتا۔

پاکستان کو بنے ہوئے ابھی صرف دو ماہ اور کچھ دن ہوئے تھے کہ ایک شام ٹنگ مرگ اور نواحِ گلمرگ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ اڑھی اور دو میل کی طرف سے نئے بنے ہوئے ملک پاکستان کے قبائلیوں نے حملہ کر دیا ہے اور اڑھی پار کرکے وہ بارہ مولہ تک پہنچ گئے ہیں۔ بس کل تک وہ گلمرگ اور ٹنگ مرگ پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ اور اس کا خاندان جموں بھاگ گیا۔ بس پھر کیا تھا اسی وقت سے ٹنگ مرگ اور گل مرگ میں بھاگم بھاگ شروع ہو گئی۔ گل مرگ کے دکاندار راتوں رات سامان لاد کر نیچے اتر آئے اور ہاتوؤں کے گھوڑوں پر چوگنا دام دے کر تمام سامان لاد کر سری نگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اتنے میں راما نند ساگر بھی اپنے دونوں بچوں کو لے کر الہ آباد کے خاندان میں آملے۔ بڑی مشکل سے ایک ٹانگہ ملا جو سولہ روپئے میں سری نگر جانے کے لئے تیار ہوا۔ طے پایا کہ عورتیں اور بچے اور اسباب تانگے پر چلے اور مرد پا پیادہ ساٹھ کلو میٹر کا راستہ طے کریں اور کوئی صورت نہ تھی۔ غرض کہ تانگہ سری نگر کی طرف چلا اور پھر مسجد کے قریب اسلام یاد بل پہنچ گیا اور ایک دق زدہ مریض یعنی راما نند ساگر اور دو جوان ہوتے ہوئے لڑکے پیدل روانہ ہوئے۔ تھم تھم کر پہاڑ کی دوسری طرف سے مشین گن چلنے کی آواز اور کبھی رائفلوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ہر طرف جیسے موت کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔ بھاگنے والے دانستہ یا نادانستہ طور پر مہاراجہ اور جواہر لال نہرو کو مستقل گالیاں دے رہے تھے کہ انھوں نے ہی یہ مصیبت ہمارے سر پر توڑی ہے۔ راما نند ساگر خاموش، قدم ملائے سڑک پر روانہ تھے۔ یہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کی بات ہے دق زدہ راما نند ساگر ایک میل چلے ہوں گے کہ سامنے ایک چھوٹا سا پل نظر آیا۔ اس کی لال اینٹوں سے بنی منڈیر پر سب تھک کر بیٹھ گئے کہ ان پر یہ نئی افتاد پڑی تھی۔ پل کے ٹھیک سامنے دور تک پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے (Boulders) پڑے ہوئے

www.taemeernews.com

تھے اور ان پر قد آدم سے کچھ بڑے ٹنگ (ناشپاتی) کے پیڑ کھڑے تھے۔ جن کی شاخوں میں ہری اور پیلی ہوتی ہوئی ٹنگ لٹک رہی تھیں۔ پل پر ایک دیر لینے میں تین آدمیوں کو بیٹھا دیکھ کر دو تین کشمیری بچے آگئے "صاحب پولس، صاحب پولس" (پیسہ) اور انھیں کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا کشمیری سر پر پھلوں کا ٹوکرا لیے ہوئے۔ ٹوکرے میں سرخ سرخ سیب اور ٹنگ بھرے ہوئے تھے۔ سیب والا بلایا گیا اور اس سے کچھ سیب اور کچھ ٹنگ خریدے گئے کہ کیا معلوم راستے میں کچھ کھانے کو ملے یا نہ ملے۔ دو ایک سیب کھائے اور پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب گل مرگ کی برف کی دھاریاں دور ہو کر دھندلی ہو چکی تھیں۔ مگر سبزی اسی طرح غم زدہ دلوں کو ڈھکار ہی تھی۔ مگر حالت یہ تھی کہ بقول میر حسن ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

جان کے ڈر سے بھاگنے والوں کو یہ سبزہ یہ گل مرگ کا حسن کیا مزہ دیتا۔ انھیں تو صرف قبائلیوں کے خونخوار چہرے اور اپنی طرف اٹھی ہوئی رائفلیں نظر آرہی تھیں جو کسی وقت بھی انھیں خون میں لت پت کر سکتی تھیں اور سری نگر ابھی بہت دور تھا۔ خواہی نخواہی اٹھے چلے۔ رُکے پھر چلے کہ ایک گاؤں کے کچھ آثار نظر آئے۔ اندر گئے تو معلوم ہوا یہ ماگام ہے۔ وہاں چائے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی، جہاں کچھ کھانے کو بسکٹ وغیرہ مل گئے۔ وہیں کچھ آرام کیا کہ شام کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی عالم میں راما نند ساگر نے اپنا مسودہ کسی کتاب کا پڑھنا شروع کیا۔ شاید یہ ان کے ناول "اور انسان مر گیا" کا مسودہ تھا مگر موت کے خوف نے سب کے پیروں میں جیسے پَر لگا دیئے ہوں۔ اٹھ کر پھر چل پڑے اور دس بجے رات تک عجیب عالم میں سری نگر پہنچے۔ راما نند ساگر حبّہ کدل میں اپنے باپ کے یہاں چلے گئے۔ الہ آباد کی فیملی پہلے ہی اسلام یار بل پہنچ چکی تھی۔ اب پیدل چل کر آنے والے بھی وہیں پہنچ گئے۔ رات آئی تو پورا شہر اندھیرے میں ڈوب گیا کہ قبائلیوں نے بجلی کا مہورہ پاور اسٹیشن اڑا دیا تھا اور کوئی دوسرا انتظام بجلی کا نہیں تھا۔ بجلی گئی تو گھروں میں لگے ہوئے پانی کے نل بھی خاموش ہو گئے۔ اب پانی کا واحد سہارا سری نگر

www.taemeernews.com

کے بیچ سے بہتا ہوا دریائے جہلم تھا جس میں پانی بھی بہتا تھا اور سارے شہر کی غلاظت بھی۔ اور اسی دریا میں سارا شہر مادر زاد ننگا ہو کر نہاتا بھی تھا۔ اسی جہلم سے اب تمام سری نگر پینے اور کھانا پکانے کا پانی بھی لے رہا تھا۔ ایک ہجوم جہلم کے کنارے صبح سے شام تک اکٹھا رہتا اور رات آتی تو نیشنل کانفرنس کے والنٹیر ڈر ڈر کر سڑکوں پر آواز لگاتے "خبردار! خبردار!" اور لوگوں کی ہمت بڑھانے کے لئے گانا گاتے "بڑھے چلو بہادرو" اور پھر اسی میں کشمیری زبان کے دو ایک نعرے جوڑ لیتے۔ نمک اور چائے جو کشمیریوں کی زندگی ہیں، ایک جنس نایاب بن گئے۔ ساتھ ہی ساتھ مٹی کا تیل اور موم بتیاں بھی۔

اسی اسلام پارک میں مجاہد منزل بھی تھی۔ جس میں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے والنٹیرس لوگوں کی کچھ مدد کر رہے تھے۔ لوگوں کے ذہن صاف نہ تھے۔ کیا کشمیر پاکستان میں چلا جائے گا یا شیخ عبداللہ اسے بچا کر ایک کشمیری صوبہ بنالیں گے، یا ہندوستان کے قبضے میں کشمیر رہے گا؟ ہر دوسرے تیسرے کشمیری کے سامنے یہی سوال درپیش تھا۔

شیخ صاحب کا کشمیریوں پر بڑا اثر تھا اور اس اثر کا وہ ہر طرح فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ تمام کشمیری مسلمان پاکستان کے حق میں تھے۔ صرف شیخ صاحب اپنے اثر سے انھیں ہندوستان کا طرفدار بنائے ہوئے تھے۔ کہہ نہیں سکتا مگر پاکستان میں چلے جانے سے شیخ صاحب کو یہ خدشہ تھا کہ کشمیریوں اور خود شیخ عبداللہ کی شناخت گم ہو جائے گی۔ اگرچہ انھوں نے اپنی سوانح حیات "آتش چنار" میں یہ بات واضح طور پر نہیں لکھی مگر حقیقت یہی تھی۔ ہندوستان نے کشمیر اور شیخ عبداللہ کے لئے جو رعائتیں آئین ہند میں رکھی تھیں وہ پاکستان میں کبھی ممکن نہیں ہو سکتی تھیں۔ شاید یہی رعائتیں کشمیریوں کو ہندوستان کا حلیف بنائے رہیں۔ اسی لئے آئین ہند میں آرٹیکل 370 بھی بنایا گیا۔

نیشنل کانفرنس کے والنٹیر عام کشمیریوں کے لئے چائے، نمک اور مٹی کا تیل، تمُل (چاول)، فراہم کرنے کی فکر کرتے۔ کچھ ایسے بھی تھے کہ انھیں مجبوریوں کا فائدہ بھی اٹھاتے ایسی بھی خبریں تھیں کہ کچھ عیاش نمک اور چائے کے بدلے مجبور عورتوں کی عصمتیں بھی

www.taemeernews.com

لوٹتے۔ عثمانی کا بیٹا اب بھی جم کر فلش اور تاش کھیلتا اور خوب رنگ رلیاں مناتا جب کہ سری نگر کی بہت بڑی آبادی فاقے کر رہی تھی۔ نشاط، شالیمار اور چشمہ شاہی سب پر اوس پڑ چکی تھی۔ سیاح الگ پھنسے پڑے تھے۔ وہ نہ جا سکتے تھے، نہ روپیہ پیسہ ان کے لئے آ سکتا تھا۔ بیرونی سیاحوں کو تو ان کے ملک کے سفارتخانے کسی طرح لے اڑے۔ مگر ملکی سیاح جو دور دراز علاقوں سے آئے تھے وہ بھوکوں مر رہے تھے۔ اور کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا قریب قریب قحط بنگال کی صورت رونما ہوا چاہتی تھی۔ سری نگر شہر سے باہر کے علاقوں کی کیا صورت تھی کہی نہیں جا سکتی۔

وادی میں یہ پھلوں کا موسم تھا۔ مگر پھل وادی میں پڑے سڑ رہے تھے۔ باہر جانے کے تمام راستے بند تھے۔ مغل روڈ بھی قبائلی حملہ آوروں کے علاقے سے گذرتی تھی اور لاہور جا کر نکلتی تھی۔ سیالکوٹ اور جموّں کو ملانے والی ریلوے لائن کی پٹریاں اکھڑ چکی تھیں۔ خبریں روز تیزی سے آ رہی تھیں کہ قبائلی بس صبح و شام میں سری نگر پہنچا ہی چاہتے ہیں بلکہ ان کی کچھ ٹکڑیاں چھتہ بل تک پہنچ بھی چکی تھیں۔ پہلے تو سری نگر کے لوگ بہت خوش ہوئے مگر جب مقبول احمد شیروانی پر چاند ماری کی خبریں آئیں کہ قبائلیوں نے اسے ایک ٹیلے سے باندھ کر اس کو رائفل کی گولیوں سے چھید دیا۔ پھر رسول جو درزی کی دعوت میں اس کے گھر کی عورتوں کی قبائلیوں کے ذریعہ آبرو ریزی کی خبریں پہنچیں تو سری نگر کے لوگ صورت حال سے خبردار ہو گئے۔ وہ لوگ جو ابھی تک قبائلیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے اب شیخ عبداللہ کے گرد جمع ہونے لگے اور جب شیخ عبداللہ اور ہندوستان کی حکومت کی کوششوں سے ہندوستانی فوج سری نگر کے ہوائی اڈے پر پہنچ گئی تو صورت حال بدل گئی۔ چھتہ بل تک پہنچے ہوئے قبائلیوں کا ہندوستانی فوج اور کشمیر ملیشیا نے صفایا کر دیا۔ یہ قبائلی باقاعدہ تربیت یافتہ فوجی نہ تھے اور نہ ان کے جسم پر فوجی لباس اور نہ تحفظی آلات تھے۔ یہاں تک کہ اکثر کے پاس فوجی بوٹ بھی نہ تھے۔ کچھ مرے ہوئے قبائلیوں کو دیکھا تو وہ تہمد اور پیروں میں معمولی پشاوری چپلیں پہنے تھے یا بالکل ننگے پیر۔ بہت سے

www.taemeernews.com

کشمیری، اس امید میں کہ اب بہت جلد کشمیر پاکستان میں شامل ہو جائے گا، پہاڑی راستوں سے گلگت اور مری پہنچ گئے کہ وہاں پہنچ کر اپنے تجارتی اڈے پہلے سے بنا لیں۔ مگر وہاں پہنچ کر انھیں بہت مایوسی ہوئی اور جلد ہی وہاں سے لوٹ آئے۔ پھر بھی کشمیریوں کی ایک بہت بڑی تعداد جناح صاحب اور پاکستان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس پس منظر میں محمود ہاشمی (لندنی) نے اپنی مشہور کتاب "کشمیر اُداس ہے" تحریر کی تھی جو اب نایاب ہے۔ مگر میرے علم میں نہیں کہ ہمارے نامور افسانہ نگاروں میں سے کسی نے بھی اس صورتحال پر کوئی بھی افسانہ یا ناول لکھا ہو۔ یہاں تک کہ رامانند ساگر نے بھی کچھ نہیں لکھا اگرچہ وہ ان صورتوں کے چشم دید گواہ تھے اور وہ ان تمام مصائب سے بذاتِ خود گزرے تھے۔ انھوں نے "اور انسان مر گیا" کے بعد اُردو ادب کا قلم رکھ دیا اور پھر صارفیت کے تحت فلموں میں مکالمے لکھنے لگے۔ پھر کشمیر کے پس منظر میں ایک فلم 'برسات' بنائی جس کا گانا "ہوا میں اڑتا جائے مرا لال دوپٹہ ململ کا" شہرۂ آفاق بن گیا۔ یہ فلم بہت دنوں تک کشمیر میں ممنوع (BANNED) رہا۔ معلوم نہیں سبب کیا تھا۔ غالباً سیاحوں کے ساتھ کشمیری عورتوں کے معاشقے کو کشمیری عوام نے ناپسند کیا۔ میرا خیال ہے کہ "اور انسان مر گیا" کے بعد رامانند ساگر کے اندر کا انسان اور ادیب بھی مر گیا۔ اور پھر وہ زرگری کی منزل میں پہنچ گئے۔ پھر ٹی۔وی سیریل 'رامائن' نے انھیں بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ اور ٹنگ مرگ والے راماند ساگر "انشاء اللہ" اور "ماشاء اللہ" کے سابقے اور لاحقے سب چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں جا پہنچے۔ آئینہ، جوار بھاٹا، اور ٹنگ مرگ کے اڈے پر' جیسے افسانے لکھنے والا انسان دوست جا کر کہاں ڈوبا؟!۔

اُدھر جموّں سے خبریں آ رہی تھیں کہ مہاراجہ اور مہارانی تارا دیوی اور وزیرِ اعظم مہر چند مہاجن جموں کے علاقے میں مسلمانوں کا قتلِ عام کرا رہے ہیں۔ جموں کے شہری علاقے میں ایک دن ان لوگوں نے اعلان کرایا کہ سب مسلمان ایک جگہ پر اکٹھا ہوں۔ انھیں پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ پھر انھیں ٹرکوں میں بھر کر سانبھا نام کے مقام پر لے گئے۔ بوڑھے مرد

www.taemeernews.com

اور عورتوں کو الگ کر کے سب کو گولی سے اڑا دیا۔ شیر خوار بچوں کو ڈوگرا فوج ان کی ماؤں کی گود سے چھین کر ہوا میں اچھالتی اور واپسی میں اپنی بندوق کی سنگینوں پر لے لیتی۔ کچھ کو ان کی ماؤں کے سامنے اپنے بوٹوں تلے روند ڈالا۔ یہ نامرد ڈوگرہ فوج کا انتقامی کھیل تھا۔ نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو الگ کر کے ان کے ساتھ ہفتوں تک ڈوگرہ فوج زناکرتی رہی۔ اس درندگی کا ذکر شیخ عبداللہ نے اپنی کتاب "آتشِ چنار" میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اور قدرت اللہ شہاب آئی سی۔ ایس۔ جو خود جموں کے رہنے والے تھے اور جن کا خاندان بھی اس بربریت کی لپیٹ میں آیا۔ انھوں نے بھی "شہاب نامہ" میں اس کا تفصیلی احوال لکھا ہے۔ اب مہجور کا گیت پڑھئے اور دل گرفتہ ہو جائیے۔

باغِ نشاط کے گلو ۔۔۔ اے باغِ نشاط کے پھولو
نازکراں کراں ودلو ۔۔۔ ناز کرتے ہوئے آجاؤ
خندکراں کراں ودلو ۔۔۔ مسکراتے ہوئے آجاؤ
موختہ ہراں ہراں ودلو ۔۔۔ موتی بکھیرتے ہوئے آجاؤ

(غلام احمد مہجور کاشمیری)

O

۱۹۶۰ء میں جب پھر کشمیر گیا تو فضا بدل چکی تھی۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جیل کی کوٹھری میں کُد کے مقام پر پڑے تھے۔ اور بخشی غلام محمد خالدِ کشمیر بنے ہوئے زمامِ حکومت کشمیر سنبھالے ہوئے تھے۔ اور ہر طرف ان کے برادران بخشی مجید اور بخشی رشید دندناتے پھرتے تھے۔ حکومت ہند ہر طرح سے کشمیریوں کی نازبرداری کر رہی تھی۔ کشمیری اس وقت تک ڈالڈا گھی اور معمولی کڑوے تیل کے عادی نہ تھے۔ اس لئے ان کے لئے اصلی گھی وادی میں سپلائی ہوتا۔ چاول اور چائے رعایتی نرخ پر کشمیریوں کو دیئے جا رہے تھے۔ بخشی غلام محمد ہر طرف دریاؤں اور نہروں پر پل تعمیر کرا رہے تھے۔ جنوبی اور مشرقی سری نگر

www.taemeernews.com

میں لکڑیاں چیرنے کی آرا مشین لگ رہی تھیں اور ریشم بننے کی ملیں اور فیکٹریاں دامنِ کوہ میں استادہ کی جارہی تھیں۔ زعفران کی کھیتی کو نئے طریقوں پر فروغ دیا جارہا تھا۔ پھلوں کی پیکنگ جدید طریقوں سے کرکے دلی، امرتسر، بمبئی، کلکتہ اور دوسرے شہروں میں ہوائی جہاز سے پہنچانے کی سہولت، اہلِ کشمیر کو حاصل تھی جو پہلے سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ عام کشمیری کو یہ احساس دلایا جارہا تھا کہ بخشی غلام محمد، شیخ عبداللہ سے بہتر آدمی ہیں۔ یہ بات اس لحاظ سے صحیح تھی کہ بخشی غلام محمد ایک عملی آدمی تھے۔ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہ تھے سیاست میں آنے سے پہلے وہ ایک پرائمری اسکول میں جونیر ماسٹر رہ چکے تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ کشمیر میں جتنی عملی ترقیاں ہوئیں، سب بخشی کے زمانے ہی میں ہوئیں۔ گورنمنٹ کے دفتروں کی بڑی بڑی عمارتیں، بڑے بڑے ہوٹل، ٹورسٹوں کے لئے بہتر انتظامات، سب بخشی حکومت کے دوران ہی ہوئے۔ کشمیر کا نیا ریڈیو اسٹیشن بھی بخشی غلام محمد ہی کے زمانے میں بنا۔ شیخ عبداللہ کو اوّل تو ابتدا میں زیادہ موقع نہیں ملا پھر وہ ایک آئیڈیلیسٹ Idea List قسم کے آدمی تھے۔ شاید تعمیری کاموں کی طرف ان کا ذہن سیاسی فکر اور پالیسی کی تدوین کے راستوں سے جاتا تھا۔ بقول شخصے وہ بک بک زیادہ کرتے تھے، عملی پروگرام بنانا اور ان کی تکمیل میں جُٹ جانا ان کے بس میں نہ تھا۔ بخشی ان کے برخلاف دُھن کے پکے تھے اور جو پلان بناتے اس کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے مگر ان کے بھائیوں نے بخشی کو بہت بدنام کیا۔ عموماً تعمیر کے سلسلے کے تمام ٹھیکے اور ایجنسیاں یہی لوگ لیتے۔ پھر پیسے لے کر ان کی Sub-Letting کرتے۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک وفد کے ساتھ میری بھی ملاقات ایک مرتبہ بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق سے ہوئی جو اس وقت کشمیر کے وزیر تعلیم تھے۔ اندازہ ہوا کہ بخشی صاحب بہت تیکھے فیصلے اور گفتگو دونوں کرتے تھے۔ گفتگو کرتے وقت انھیں آدابِ گفتگو اور آدابِ محفل کا بھی کچھ لحاظ نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ علی گڈھ کے وفد میں جیالوجی کے پروفیسر نے جب بخشی صاحب کے استفسار پر یہ بات کہی کہ کشمیر کی زمین میں معدنیات کا خزانہ ہے مگر ابھی تک اُسے EXPLOIT نہیں

www.taemeernews.com

کیا گیا تو بخشی صاحب نے بلا تامل کہا کہ یہ بات تو کوئی ناخواندہ اور ناتجربے کار (LAY-MAN) بھی کہہ سکتا ہے۔ پھر آپ کی مہارت سے کیا فائدہ؟ اس وفد میں جغرافیہ کے پروفیسر اُنس صاحب اور قانون کے پروفیسر امان اللہ بھی شامل تھے اور بھی کچھ لوگ تھے جن کے نام یاد نہیں۔

ایک صبح پروگرام بنا کہ ذرا گل مرگ اور ٹنگ مرگ بھی دیکھا جائے۔ اگرچہ میرے لئے یہ جگہیں نئی نہیں تھیں مگر وہی کہ دوسری بار دیکھنے کی ہوس والی صورت تو ہمیشہ ہی کشمیر کے ہر مقام کے لئے رہتی ہے۔ چنانچہ ایک بیگ میں ناشتہ لے کر ہم بٹ مالو کے بس اڈے سے ٹنگ مرگ کے لئے روانہ ہوئے۔ موسم صبح سے کچھ ابر و باد کا تھا۔ میرے ساتھ میری بیوی کے ماموں اکبر شاہ بھی تھے (سیّد اکبر جلالی، ڈپٹی سکریٹری ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، کشمیر۔ میری بیوی کا ننہال کشمیر ہے) ہم سفیدوں کی قطاروں سے سجی بارہ مولا جانے والی شاہراہ سے ٹنگ مرگ کی طرف مڑ گئے۔ میری ایک عجیب عادت ہے کہ جہاں بھی جاتا ہوں اس شہر کی ثنا و صفت یا ہجو میں جو اشعار، شعرائے اُردو و فارسی نے کہہ رکھے ہیں انھیں ضرور پڑھتا ہوں۔ کشمیر میں ہمہ وقت عرفی اور حافظ کے یہ دو اشعار میری زبان پر رہتے ہیں۔ جب جس کا موقع ہوا پڑھا جاتا۔

۱۔ ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید ۔۔۔ گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

۲۔ بہ شعرِ حافظِ شیراز می رقصند و می نازند ۔۔۔ سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

ہم ٹنگ مرگ پہنچے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ٹنگ مرگ کی سناٹی زندگی میں خاصی چہل پہل آگئی تھی اور وہ اڈہ جہاں صرف ہانو اور ان کے ٹٹو اور یا لیو ہوا کرتے اب وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ اڈے پر اب دو ایک رستوراں اور کچھ قیام گاہیں تھیں۔ پھر بہت سی دکانیں بھی آگئی تھیں۔ پرانا ڈاک بنگلہ قریب قریب سنسان تھا۔ ہاں ڈاک بنگلے کے پیچھے چیڑ کا وہ بڑا جنگل اسی طرح برقرار تھا جس میں سینی ٹوریم تھا۔ سینی ٹوریم اب یہاں سے ہٹا کر شہر میں ڈرگجن نام کے مقام، ڈل گیٹ کے پاس چلا گیا تھا کیونکہ اب تپ دق کا علاج، باغ و

www.taemeernews.com

راغ کے بجائے انجکشنوں سے ہونے لگا تھا۔ شاید چیڑ اور دیودار کی فرحت افزا ہوا کی تپ دق کے مریض کو اب کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب یہ مرض راج روگ نہیں رہ گیا تھا جس کے ناز نخرے صرف پیسے والے اٹھا سکتے تھے۔ اسی لئے سینی ٹوریم ٹنگ مرگ سے اٹھا کر شہر بھیج دیا گیا تھا جہاں ایک عامی بھی اس سے فائدہ حاصل کر سکے اور یہ کام بھی بخشی حکومت ہی کے زمانے میں ہوا۔ ایک بات اور قابل غور ہے۔ بخشی نے بہت سے کام کئے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے اپنے نام سے کوئی پبلک بلڈنگ نہیں بنوائی۔ برخلاف اس کے شیخ صاحب کے نام سے 'شیر کشمیر اسپتال' اور خود شیخ صاحب کا مزار حضرت بل میں بڑے تزک و احتشام سے بنا۔ یہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور نہرو خاندان کی تائی بھی۔ شاید یہ سب وقتی اثرات اور خوشیاں ہیں ورنہ اسٹالین گراڈ اور لینن گراڈ جب بدل سکتے ہیں تو کسی دَور میں کچھ بھی بدل سکتا ہے۔ خیر یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ تبھی تو اقبال نے کہا تھا کہ

ع ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں۔

سینی ٹوریم کے چیڑ کے جنگلوں میں اب فوجوں کے دستے گھومتے تھے۔ ۱۹۶۰-۶۱ء تک گل مرگ تک جانے کے لئے کوئی سڑک نہیں بنی تھی۔ صرف کچے اور پتھریلے راستے تھے جن پر ہاتووُں کے ٹٹو اور آدمی پیدل چلا کرتے تھے۔ ہم نے بھی ٹٹو لئے اور گل مرگ کے راستے پر چل پڑے چیڑ کے پیڑوں کی سائیں سائیں جنگل کا گمبھیر پن اور پانی کا شور، سب احساسات کو بے حد پرسکون دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ اور یہاں پہنچ کر حواس خمسہ کی آنکھیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔ انھیں صورتوں سے متاثر ہو کر انگریزی زبان کے شاعر ورڈس ورتھ نے اپنی نظم، ٹنٹرن ایبے (TINTERN ABBEY,) میں وہ بات کہی تھی۔

The sounding chataracts

Haunted me like a passion.

And the deep and gloomy wood.....were then

www.taemeernews.com

to be an apetite.

یہ باتیں گل مرگ کے ان راستوں پر بخوبی محسوس ہوتی ہیں۔

گل مرگ کے میدانوں میں انگریزوں کے دَور جیسی صفائی اور رونق باقی نہ رہ گئی تھی۔ مگر ابھی گالف لنک باقی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۹ ہزار فٹ کی بلندی پر گل مرگ دنیا کا سب سے بڑا گالف لنک ہے۔ ایسی خاموشی کہ فطرت باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ مگر افسوس کہ اب یہ خاموشی اور Serinity ختم ہو چکی ہے۔ جب سے گل مرگ تک جانے کے لئے سڑک بن گئی ہے۔ اب تو دلّی اور بمبئی کے بڑے بڑے سیٹھ لمبی لمبی گاڑیاں لئے گرد، پیٹرول اور ڈیزل کا دھواں اڑاتے ہوئے سارے گل مرگ میں دندناتے پھرتے ہیں اور گل مرگ کے خوبصورت اور پر سکون میدان میں وہ شور شرابہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی تو میدان حشر نہ سہی تو میلے کا سماں ضرور ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں جب میں گلمرگ گیا تو ایک ملک التجار میرے پاس آئے۔ غالباً وہ گجراتی تھے اور پوچھنے لگے کہ وشنو دیوی کا مندر یہاں کہاں ہے۔ میں نے ان کے ذوق پر آفریں کہی اور ان سے بتایا کہ وہ تو آپ جموں میں چھوڑ آئے۔ یہاں گالف کھیلئے، مناظر دیکھئے واپس جاتے ہوئے دیوی کے بھی درشن کرتے جائیے گا۔ وہ خاصے جز بز ہوئے۔ بولے "یہاں کیا ہے؟۔ ہر طرف شالا پیڑ ہیں، پہاڑ ہے، مندر سندر تو کچھ بھی نہیں۔ بیکار جگہ ہے۔" خیر مگر ابھی تک اسی طرح ہے۔ ویسے ہی برف پہ پھسلنے والی گاڑیاں ہیں۔ ویسے ہی چند گھنٹوں والی چائے کی دکانیں ہیں ویسا ہی ننگا پربت کا نظارہ ہے۔ اب سورج غروب ہونے کے بعد گل مرگ میں وہ چہل پہل بھی نہیں رہتی جو انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ جیسے ہی شام کی ٹھنڈک میدان میں اترتی ہے اب لوگ اپنے مامنوں میں جا چھپتے ہیں اور پھر ایک اتھاہ سناٹا گل مرگ پر طاری ہو جاتا ہے اور پھر ع "وہ درختوں پہ تفکر کا سماں چھایا ہوا" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی غنیمت ہے کہ ان مقامات پر ابھی بڑے شہروں جیسے بدمعاشوں کی ریشہ دوانیاں شروع نہیں ہوئیں، اب ہو گئی ہوں تو کیا پتہ ہے میں ۱۹۸۴ء کے بعد پھر کشمیر نہیں گیا۔

www.taemeernews.com

اس وقت سری نگر میں نئی نئی کشمیر یونیورسٹی بنی تھی۔ ابھی صرف ایک سفید بلڈنگ فیکلٹی آف آرٹس کی تھی (یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے) صرف تین لکچرر تھے۔ حیدرآباد سے پروفیسر محی الدین قادری زور نے آکر پروفیسری کا عہدہ سنبھالا تھا۔ حامدی کاشمیری، سری پرتاپ کالج سے آکر یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ ایس۔پی کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اس وقت وہ اردو کے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ اور ان کے ناول قسط وار بیسویں صدی، شمع اور مستانہ جوگی جیسے رسالوں میں چھپتے تھے۔ دیسے تو وہ شاعری بھی کرتے تھے اور ان کا ایک شعری مجموعہ "عروس تمنا" بھی چھپ گیا تھا۔ مگر ان کی ادبی شناخت ناول اور افسانوں ہی سے تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے دو ناول 'پگھلتے خواب' اور 'وادی کے پھول' شائع ہو چکے تھے۔ یہ ہلکے پھلکے رومانی ناول تھے اور وہی شمع اور بیسویں صدی جیسے رسالوں کا مزاج رکھتے تھے۔ موصوف نے اپنی تینوں کتابیں مجھے عنایت کی تھیں۔ میں نے ان کے شعری مجموعے 'عروس تمنا' پر ریویو بھی لکھا تھا۔ ابھی جدیدیت کا غلغلہ اردو میں نہیں بلند ہوا تھا۔ حامدی کاشمیری اس وقت مجھے بے حد متوازن، ملنسار، خلیق اور دوست آدمی معلوم ہوئے (بعد کی ملاقاتوں میں بھی ان کے متعلق میرا یہی خیال رہا۔ ادبی اختلاف اپنی جگہ پر) میرا خیال ہے کہ حامدی اصلاً تخلیق کار ہیں۔ مگر جب جدیدیت کا عروج ہوا تو زبردست جدیدیئے بن گئے۔ شاعری تو وہ کرتے رہے مگر تنقید نگاری کا بھی روگ انھوں نے پال لیا۔ اور اپنے خیال میں تنقید نگاری کے ایک نئے اسکول کی انھوں نے بنیاد ڈالی اور وہ ہے "اکتشافی تنقید"۔ پھر ایک اور کتاب "معاصر تنقید" کے نام سے انھوں نے کھینچ دی جس میں ترقی پسندوں کی خوب خبر لی۔ مگر بہر حال جو بھی ادب کا مطالعہ کرتا ہے اُسے پورا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے اور حامدی نے یہی کیا ہے۔ مگر ان کا یہ محاسبہ بے حد غیر متوازن، معاندانہ اور بڑی حد تک جانبدارانہ ہے۔ تنقید کسی جانب داری کو برداشت نہیں کرتی۔ اور معاصر تنقید میں ہر ہر قدم پر معاندانہ یا جانبدارانہ صورتیں نظر آتی ہیں جو حامدی کو تنقید نگار کے منصب سے گرا دیتی

www.taemeernews.com

ہیں۔ ادیب اور ناقد اگر ادبی محاسبے میں اپنے مزعومات (whims) کو داخل کر دیا گے تو محاسبے کا حال معلوم۔

اکبر ماموں (سید اکبر جلالی) کے ایک برادر نسبتی صادق علی ہیں۔ یہ سری نگر میں پیر ماشی کے ایک بڑے تاجر جعفر علی آرٹسٹ کے بیٹے ہیں۔ بے حد سوشل آدمی ہیں۔ شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ اسیر تخلص کرتے تھے۔ اور ہمیں کشمیر کے تمام پُرفضا مقامات کی سیر بھی کراتے تھے اس وقت خاصے رنگین مزاج تھے۔ مگر اس میں ایک کھلنڈرا پن زیادہ تھا اور بہت سی باتیں محض لطف لینے کے لئے کیا کرتے۔ اکثر حامدی صاحب اور ہم لوگوں کے ساتھ سیر سپاٹے بھی کرتے تھے۔ ان کی مزاجی کیفیت اور کھلنڈرے پن کو دیکھ کر ایک شعر بھی ان کی ثنا و صفت میں کہا گیا۔ شعر یوں تھا۔

اُلجھے ہیں آج کل جو حسینوں کے جال میں صادق علی اسیر ہیں دام خیال میں

یہ شعر خالص لکھنوی انداز کا ہے۔ اس میں تمام رعائتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ پھر انھیں سنایا گیا تو انھوں نے بھی خاصہ لطف لیا۔ پھر انھیں کے ساتھ میں نے نشاط، شالا مار، چشمہ شاہی ہاروَن، ڈک سُون، اچھابل، چار چناری، ویری ناگ، اہربل فال، مانس بل جھیل، وُولر لیک اور معلوم نہیں کہاں کہاں کی سیر کی۔ پیر پنجال پہاڑ کی بلندی سے ہم لوگ بہت مرعوب تھے۔ سری نگر میں یہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہوتا۔ اکبر ماموں سے میں کبھی کبھی کہتا کہ ایک دن میں اس پر چڑھوں گا۔ آخر انھیں کے ساتھ ایک دن میں نے کوشش کی تو پری محل سے آگے نہ جا سکا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پری محل دارا شکوہ کا بنوایا ہوا ہے۔ یہ اس کی رصدگاہ تھی (observatory') ۔ یہ پری محل بھی خوب جگہ ہے۔

ہم روز ہی سیر کو نکلتے۔ اسی آؤ جاؤ میں ایک دن سر راہے غلام رسول نازکی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے جو حسن آباد جاتے ہوئے ہمارے راستے میں پڑتا تھا۔ نازکی صاحب بے حد گڑھے ہوئے آدمی معلوم ہوئے۔ میں نے کشمیر کے لوگوں میں بہت کم ایسا مہذب اور سخن فہم آدمی دیکھا ہے۔ وہ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں

www.taemeernews.com

شاعری کرتے ہیں (خدا کے فضل سے ابھی تک وہ بقید حیات ہیں)

اس زمانے میں میں اکثر امراض شکم میں گرفتار رہتا۔ ویسے بھی میرا یہ مرض مزمن ہو گیا ہے جس کی وجہ سے میں کھانے پینے میں بے حد احتیاط برتتا ہوں۔ کشمیریوں میں چاہے جتنی خرابیاں ہوں مگر مہمان نوازی ان کا ایسا جوہر ہے جو اب بہت کم مسلمانوں میں باقی رہ گیا ہے۔ علی الخصوص ہندوستان میں۔ کشمیر میں اس مہمان نوازی کا قدم قدم پر ثبوت ملتا ہے۔ تبھی تو چکبست نے بھی وہ شعر کہا تھا۔ شاعری ہی سہی مگر اس مہمان نوازی کے جذبے کا تو اظہار ہوتا ہی ہے۔

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز　　　راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

یہاں میری قرابتیں بھی ہیں اور دوستیاں بھی۔ اس لئے روز کہیں نہ کہیں دعوت ہوتی رہتی اور ان دعوتوں میں انواع و اقسام کے کھانے ہوتے رہتے جن میں گوشت کا سالن عجیب عجیب طریقوں سے پکایا جاتا۔ ایک بڑی دعوت میں چھبیس قسم کا گوشت کا سالن میں نے خود گنا تھا۔ طبق ماز سے گوشتابہ تک معلوم نہیں کتنے نام ہیں۔ ایک دن میری یہ حالت دیکھ کر میرے ایک عزیز نے رائے دی کہ میں جب تک کشمیر میں رہوں روز چشمہ شاہی کا پانی پیا کروں۔ انشاء اللہ تمام امراض شکم دور ہو جائیں گے۔ میں نے دوسرے ہی دن سے اس پر عمل شروع کر دیا۔ ایک بڑا برتن لے کر چشمۂ شاہی جاتا۔ وہاں خوب پانی پیتا اور پھر وہ برتن بھر کر پانی اپنے ساتھ لاتا۔ اور دن بھر وہی پانی استعمال کرتا۔ یہ عمل تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ جہاں گھومنے جاتا چشموں کا پانی پیتا رہتا۔ سونا مرگ کے گلیشیر کا پانی مجھے بہت پسند آیا۔ وہ پانی تو میں الہ آباد تک اپنے ساتھ لایا۔ جب وہ کم ہوتا اس میں مزید پانی ملا لیتا۔ اس طرح اصل پانی کی تاثیر باقی رہتی۔ اب کیا ہوا کہہ نہیں سکتا مگر آج تک امراض شکم کی وہ کیفیت دوبارہ پیدا نہیں ہوئی۔ واقعی اگر آب حیات کہیں ہے تو میرے لئے انھیں کشمیر کے چشموں میں ہے۔

دوسرے سال پھر کشمیر پہنچا تو چند دنوں بعد محرم شروع ہو گیا۔ میرے یہاں کے طریق

www.taemeernews.com

عزاداری کو شمالی ہند کے طریقوں سے بالکل مختلف پایا۔ اگرچہ یہاں بھی کچھ ہندو مذہب کے طور طریقے عزاداری میں شامل ہوگئے ہیں۔ مثلاً علم اور تعزیے کے سامنے قربانی پیش کرنا وغیرہ۔ مگر خیر۔ میں نے اپنے ایک مضمون "کشمیر میں محرّم کے چند مشاہدے" میں ان باتوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ میرا وہ مضمون الہ آباد یونیورسٹی میگزین میں شائع ہوا۔ اس میں میں نے یہ بیان کیا تھا کہ کشمیر میں عزاداری، لکھنؤ اور ایران لکھنؤ کی عزاداری کی رسموں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ چونکہ کشمیر ایک تجارتی علاقہ ہے۔ یہاں سال بھر لوگ جو سامان بناتے ہیں گرمیوں میں سیاحوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں اور ہر موسم میں اپنے کاروبار میں بے حد مشغول رہتے ہیں، اس لئے یہاں محرّم کی تقریبات لکھنؤ کی طرح ہمہ وقتی نہیں ہوتیں۔ نہ ایامِ عزا میں اتنی توسیع دی جاتی ہے جو لکھنؤ میں ہے۔ جیسے لکھنؤ کی شاہی میں فروغ ملا تھا۔ پھر کشمیر میں اہل کشمیر کی معاشی ضرورتوں کے تحت ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ پھر ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ کشمیر میں محرّم صرف شیعہ حضرات مناتے ہیں اور ان کی تعداد بہت کم ہے۔ یہاں بھی ایسے ناواقف اور تنگ نظر حضرات آج بھی ہیں جو شیعوں کو مسلمان ہی نہیں مانتے۔ مگر یہ ایک الگ بحث ہے۔ کشمیر میں راجہ کی حکومت کے دور میں محرّم کے جلوس سڑکوں پر نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ رات میں کسی وقت خاموشی سے شیعہ حضرات اپنی رسمیں پوری کر لیتے۔ اس وقت بھی تنگ نظر اور متعصب لوگ ان جلوسوں پر اینٹ پتھر پھینکتے، اور بہت سی بیہودہ باتیں محرّم کی تقریبات کے سلسلے میں کہتے۔ مگر جب شیخ عبداللہ برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے یہ رسمِ قبیح توڑ دی۔ دسویں محرّم کو وہ خود ذوالجناح کی باگ پکڑ کر چلتے۔ پھر یہ رسم بن گئی کہ ہر سربراہ حکومت ایسا ہی کرتا۔ میں نے بخشی غلام محمّد کو ذوالجناح کی باگ پکڑ کر خانقاہ شریف سے برآمد ہوتے دیکھا ہے۔ سری نگر کے عوام نہ لکھنؤ کی عزاداری سے واقف ہیں اور نہ اس تہذیب سے۔ چنانچہ اس وقت (۱۹۹۶ء تک) مجھے شیعہ حضرات گلابی اور رنگین کپڑے پہنے ہوئے روزِ عاشورہ ملے۔ شیعہ عورتوں کو زیورات پہنے ہوئے بھی میں نے روزِ عاشورہ دیکھا ہے۔ اپنے مضمون میں ایسی ہی

www.taemeernews.com

باتیں لکھتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا کہ کشمیر کے شیعہ گھرانوں میں بھی محرم کی تقریبات ساتویں محرم سے شروع ہوتی ہیں اور تمام تقریبات صرف رات میں ہوتی ہیں۔ ایسی ہی باتیں لکھتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا کہ ہم لوگوں کو ساتویں محرم کی رات کی ایک مجلس میں صادق علی اثیر کے یہاں جانا تھا۔ ابھی وقت بہت باقی تھا۔ صادق علی کے ساتھ دو ایک آدمی اور تھے۔ سب کی رائے ہوئی کہ چلو بند پہ کافی پی لی جائے پھر مجلس میں چلیں گے۔ ہم سب لوگ بند کے ایک پوش (POSH) رستوراں میں داخل ہوئے۔ جیسا کہ پوش ہوٹلوں میں ہوا کرتا ہے، یہاں بھی ایک طرف ڈانس ہو رہا تھا۔ یہ صورتیں ابھی بزنس کو چمکانے کے لئے پوش رستوراں میں اکثر بڑے شہروں میں ہوتی ہیں۔ ہم لوگوں نے خاموشی سے کافی پی اور باہر نکل آئے۔ بس اتنی سی بات تھی۔ جب مضمون شائع ہوا تو اس وقت کسی نے کوئی بات نہ کی مگر دس، پندرہ برس بعد جب ایک صاحب یونیورسٹی کے معاملات میں دخیل ہوئے اور میرے ریڈرشپ کا معاملہ درپیش ہوا تو اس مضمون کو لے کر یہ حضرت شیعوں کے غالی اور متعصب حلقوں میں دکھاتے پھرے اور زبانی بھی تبلیغ کرتے کہ دیکھئے عقیل صاحب ساتویں محرم کو ناچ دیکھ رہے تھے۔ بلکہ جہاں انھوں نے زبانی باتیں کیں وہاں یہ بھی کہا کہ عقیل صاحب کو مجلس میں جانا تھا اور ناچ دیکھنے گئے۔ پھر انھوں نے طے کیا کہ نہیں مجھے ناچ دیکھنا چاہئے۔ مجلسیں تو برابر ہی ہوا کرتی ہیں۔ الہ آباد کے شیعی "قل اعوذئیے" حلقے میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ یہی بات انھیں حضرت نے اس وقت پھر اٹھائی جب میری پروفیسر شپ داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ ان کے خیال میں یونیورسٹی کی تعلیم و تعلم کی ملازمت نہ ہوئی مسجد کی امامت ہو گئی۔ یا شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، شیعہ وقف بورڈ کے پیسوں سے بنا ہے کہ ایسے آدمی کو شعبے میں صدارت اور پروفیسری نہیں ملنی چاہئے۔ اور اس میں شیعوں اور شیعہ وقف بورڈ کو مداخلت کرنی چاہئے۔ ناواقف قسم کے "قل اعوذئیے" مجھ پر تبرّہ پڑھنے لگے اور یہی ان "حضرت" کا مقصد بھی تھا۔ میں ایسی باتوں کو کہاں خاطر میں لاتا ہوں۔ مگر مناسب معلوم ہوا کہ اصل واقعے کی وضاحت کر دوں۔ تمام دنیا

www.taemeernews.com

کی عزاداری پر نہ لکھنؤ کے شیعہ حضرات کی اجارہ داری ہے اور نہ علمائے لکھنؤ کی۔ ہر ملکے ہر رسمے۔ حیدرآباد اور کرناٹک کی عزاداری میں اپنے نواح اور اپنی تہذیبی روایات کی جھلکیاں ہیں۔ وہ لکھنؤ کی رسموں کو کیوں قبول کر لیں؟ ایران میں عشرہ محرم کے دن لوگ دعوتیں کھاتے ہیں۔ قہوہ پیتے ہیں اور جلوس جلسے کچھ نہیں اٹھاتے (کم از ایران کی شاہی کے دور میں کوئی پبلک جلوس نہیں اٹھ سکتا تھا)

مجھے کوہ پیمائی کا تو شوق نہیں مگر مناظرِ فطرت میں بس ڈوب جانے کا جی چاہتا ہے اس شوق میں میں نے کشمیر کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ میں نے کشمیر کے بہت سے دیہات بھی دیکھے ہیں اور وہاں کی زندگیوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ دریائی چلتے پھرتے کھیتوں کو دیکھنے کے شوق میں ڈل جھیل کے ہانجیوں کے ساتھ بھی میں نے دو ایک دن گزارے ہیں۔ اور ان چلتے پھرتے کھیتوں کی چوریاں بھی دیکھی ہیں۔ جس میں چور کھیت اپنے گھر اٹھالے جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف دو جگہیں ہیں جہاں کھیت چرائے جاتے ہیں۔ پہلا کشمیر اور دوسرا... سوئزرلینڈ۔ بات یہ ہے کہ یہ کھیت بڑی بڑی کشتیوں میں لگائے جاتے ہیں اور جھیل میں ایک جگہ سے دوسری جگہوں پر منتقل بھی کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح چرائے بھی جاتے ہیں۔ میں نے مناظرِ فطرت کے شوق میں نیل ناگ، یوس مرگ اور چرار شریف کی خانقاہ میں قیام بھی کیا۔ یہ قیام مناظرِ فطرت کے مطالعے کے لئے بھی تھا اور گوجروں کی زندگی کا مطالعہ بھی اس میں شامل تھا۔ یہیں میں نے ایک گوجر کے یہاں دودھ کی روٹی بھی کھائی جو بہت عجیب و غریب ذائقہ بھی رکھتی ہے۔ حسنِ بے پروا، جیسا گوجروں کی زندگی میں ہے۔ کشمیر کی متمدن زندگی میں بھلا کہاں! کوکرناگ کے اردگرد، اخروٹ کے باغات، پہلگام کی لدھر ندی اور لدھر کے اوپر سائیں سائیں کرتے ہوئے چیڑ کے جنگل۔ احاطۂ بیان میں نہیں آسکتے۔ پہلی مرتبہ میں چندن واڑی تک گیا۔ پھر دوسری مرتبہ شیش ناگ تک۔ اس کے بعد میری ہمت جواب دے گئی۔ ان کی ہمت کا کیا کہنا جو امرناتھ تک یاترا کرتے ہیں۔ میں نے دو مرتبہ کوشش کی مگر امرناتھ تک نہ جا سکا۔

www.taemeernews.com

آخری مرتبہ جب ۱۹۸۲ء میں کشمیر گیا تو شنکراچاریہ پہاڑ کو نیچے سے کھدتے دیکھا شنکراچاریہ وہی پہاڑ ہے جسے مسلمان تخت سلیمان کہتے ہیں۔ اب یہ میری سادگی ہی تو ہے کہ مجھے اس پہاڑ کو کھدتے دیکھ کر ایسی تکلیف ہوئی جیسی میری جائداد کھودی جارہی ہے۔ اس پہاڑ کو کاٹ کر نیچے سے سڑک بھی چوڑی کی جارہی تھی اور پہاڑ پر پجاریوں کو موٹر کار میں بیٹھ کر پوجا کے لئے جانے کا راستہ بنایا جارہا تھا۔ اور اس رومانس (Romance) کا کسی کو احساس نہیں جو اس پہاڑ سے ختم ہوتا جارہا ہے۔ تعجب ہے کہ تخت سلیمان اور شنکراچاریہ دونوں کے ماننے والوں کو یہ کیسے گوارہ ہوا کہ اس متبرک مقام کے قدموں اور اس کے جسم کو نقصان پہنچایا جائے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ انسان بڑا ہے یا پہاڑ؟ انسان کی ضرورتیں اور زندگی زیادہ اہم ہیں یا فطرت کی نشانیاں؟ لیکن اگر فطرت اپنے پھیلے ہوئے پر سمیٹ لے تو انسان کی زندگی کس حال میں باقی رہے گی؟ پلاسٹک کے پھولوں اور درختوں کے سہارے؟ یا مصنوعی ہواؤں کی ٹھنڈی اور گرم لہروں کے سہارے؟! بہرحال یہ اپنا اپنا سوچنے کا طریقہ ہے۔

○

www.taemeernews.com

دکن ملک کھوتیچ خاصا اَہے

نومبر ۱۹۶۱ء میں سید احتشام حسین شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہو کر آئے اور ان کے ساتھ علم و ادب کی ایک نئی دنیا بھی آئی۔ اور علمی ادبی دنیا کے تذکرے بھی۔ احتشام حسین دنیا گھوم کر کچھ دنوں پہلے آئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے دورے ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی برابر ہوا کرتے۔ دکن میں حیدرآباد، ایک زمانے میں اُردو کا بڑا مرکز رہ چکا تھا۔ مولوی عبدالحق اور حیدرآباد کے دارالترجمہ نے اس نواح کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ جہاں نذیر احمد، شبلی، سید علی بلگرامی، مرزا ہادی رسوا رتن ناتھ سرشار اور ان سے پہلے شاہ نصیر، نواب مرزا خاں داغ پھر امیر مینائی، فصاحت جنگ جلیل مانک پوری، نظم طباطبائی، حسرت، فانی، جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی غرض کہ نئے پرانے ادیبوں اور شاعروں کی ایک کہکشاں تھی جن کا مامن حیدرآباد رہ چکا تھا۔ سید احتشام حسین سے اکثر حیدرآباد کے نئے شعرا اور ادیبوں اور حیدرآباد کے موجودہ ادبی ماحول کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہتا تھا۔ احتشام حسین خود بھی حیدرآباد سے بے حد متاثر تھے۔ وہ اکثر راج بہادر گوڑ، مخدوم، سری نواس لاہوٹی زینت ساجدہ، میر حسن اور حسینی شاہد کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا کرتے۔ میں اس وقت تک حیدرآباد نہیں گیا تھا اور یہ باتیں سُن سُن کر میری آتش شوق بھڑکتی رہتی کہ اچانک مجھے اپنے ریسرچ، مابعد پی۔ ایچ۔ ڈی (POST DOCTORAL) کے سلسلے میں حیدرآباد جانے کا موقع مل گیا۔ یہ مئی ۱۹۶۶ء کا زمانہ تھا۔ حیدرآباد میں کسی سے واقف نہ تھا۔ پھر ٹھہرنے کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مگر اعجاز صاحب نے میری یہ مشکل بھی حل کر دی۔ ان کے ایک شاگرد محمد احسن صاحب نظام کالج حیدرآباد

www.taemeernews.com

میں بہت دنوں سے انگریزی کے استاد تھے۔ اعجاز صاحب نے ایک خط مجھے ان کے نام دیا کہ وہ نظام کالج کے ہوسٹل میں کہیں میرا انتظام کرا دیں۔ اور میں مئی کی آخری تاریخوں میں وارد حیدر آباد ہوا۔ محمد احسن صاحب نے میرا انتظام نظام کالج کے ہوسٹل میں کر دیا۔

دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے سالار جنگ لائبریری کا پروگرام بنایا کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں مجھے گھوم پھر کر کام کرنا تھا۔ ایک خط احتشام حسین صاحب نے مجھے سری نواس لاہوٹی کے نام بھی دے دیا تھا جو حمایت نگر کے اردو کالج میں اس وقت کسی تیلگو اردو ڈکشنری پر کام کر رہے تھے۔ احسن صاحب سے معلوم ہوا کہ حمایت نگر تو نظام کالج سے بہت نزدیک ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ پہلے لاہوٹی صاحب سے مل لیا جائے۔ وہاں پہنچا تو لاہوٹی صاحب مل گئے۔ ان سے میری ملاقات جے پور کی اردو کانفرنس میں کچھ دنوں پہلے ہو چکی تھی۔ اگرچہ یہ ملاقات بہت سرسری تھی مگر لاہوٹی صاحب مجھے پہچان گئے۔ میں نے احتشام حسین کا خط انھیں دیا۔ اور پھر لاہوٹی صاحب نے مجھے حیدر آباد میں وی۔ آئی۔ پی (V. I. P) بنا دیا۔ جو لوگ لاہوٹی صاحب سے واقف ہیں وہ ان کے طرز کارکردگی سے بھی ضرور واقف ہوں گے۔ وہ اس وقت ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر بدیع الدین کے ساتھ لغت پر کام کر رہے تھے۔ جب تک لاہوٹی صاحب کام کرتے رہے میں اردو ہال کی لائبریری دیکھتا رہا اور پھر لاہوٹی صاحب وہاں سے فراغت پا کر مجھے اپنے اسکوٹر پر لے کر نکلے۔ ہماری پہلی منزل اورینٹ ہوٹل تھی۔ ہم لوگ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ یکایک ہوٹل میں "اک چنبیلی کے منڈوے تلے" والا ریکارڈ بجنے لگا۔ لاہوٹی اپنی جگہ سے اچھلے۔ بولے کہ مخدوم آ گئے اور تھوڑی دیر میں مخدوم کو ساتھ لئے ہوئے اسی جگہ پر آ گئے جہاں ہم کھانا کھا رہے تھے۔ چائے منگوائی گئی اور مخدوم اپنی خاص مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں مخدوم کو دلّی میں تو چند سال قبل دیکھ چکا تھا مگر ان سے بات چیت کا یہ پہلا موقع تھا۔ عجب دلنواز شخصیت مخدوم کی تھی! چہرہ جیسے سنگِ اسود کی چٹان سے تراشا گیا ہو اور اس میں سفید دانتوں کی چمک، ملنے والوں کو ان کا اسیر کر لیتی تھی۔ اور ینٹ ہوٹل مخدوم

www.taemeernews.com

کا ایک طرح کا اڈہ تھا جہاں وہ دن میں ایک بار ضرور آتے تھے اور ہوٹل والوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ جب تک مخدوم بیٹھے رہتے ان کی نظموں، غزلوں اور فلم کے گانوں کے ریکارڈ بجاتے رہتے۔ اور ینٹ ہوٹل دو تین منزلوں میں تھا اور اس طرح لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ مخدوم ہوٹل میں موجود ہیں۔ مخدوم ہم لوگوں کے پاس تقریباً دس منٹ تک بیٹھے۔ کچھ دلی کانفرنس کی باتیں، کچھ الہ آباد کی باتیں۔ کچھ اردو کے مسائل پر ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ اٹھ کر کہیں چلے گئے اور جاتے ہوئے لاہوٹی سے کسی میٹنگ کی بات کرتے گئے جس میں ڈانگے اور موہت سین بھی آنے والے تھے۔ اسی زمانے میں ہندوستانی سکّے کی قیمت حکومت ہند نے گھٹا دی تھی۔ اس کا کیا اثر ملک پر پڑے گا، اسی مسئلے پر برکت پورہ نام کے مقام پر کوئی اجتماع کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ہونا تھا۔ مخدوم کے جانے کے بعد ہم لوگ وہاں سے اٹھے۔ لاہوٹی مجھے لئے ہوئے میر حسن کے گھر پہنچے۔ میر حسن حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن کے بڑے اچھے آرٹسٹ تھے۔ ڈرامے سے ان کی خاص دلچسپی تھی۔ وہ انگریزی ادب کے بھی طالب علم رہ چکے تھے۔ انھوں نے ورڈسورتھ کی نیچر شاعری پر اردو میں چھپی ہوئی اپنی کتاب مجھے عنایت کی۔ یہاں بھی ہم لوگ حیدرآباد اور الہ آباد کی ادبی صورتوں پر باتیں کرتے رہے۔ احتشام حسین کے حوالے سے بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ میر حسن، قدرے سنجیدہ مگر متبسّم چہرے کے ساتھ ہم لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ انگریزی ادب پر بیٹ جنریشن کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایلن گینس برگ حال ہی میں ہندوستان آیا تھا۔ میر حسن اس سے مل چکے تھے۔ اس کی مشہور زمانہ نظم ہاؤل (HOWL) پر اپنے تاثرات اور خود گینس برگ کی دلچسپیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ میر حسن کے رہنے سہنے کا طریقہ بالکل آرٹسٹوں جیسا تھا۔ ان کا کمرہ جیسے کباڑی کی دکان بنا تھا۔ مگر کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ہاؤل تو پڑھی تھی مگر گینس برگ سے ملنے کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ وہ بنارس تک آیا تھا اور الہ آباد کے سنگم تک بھی ماگھ میلے کے زمانے میں پہنچا تھا۔

www.taemeernews.com

مگر تقریباً روپوشی (INCOGNITO) کے عالم میں۔ پتہ نہیں کہاں سے فراق صاحب کو خبر ہو گئی تھی اور انھوں نے اس کا تذکرہ اور اس کی شاعری پر اپنی کافی ہاؤس کی محفلوں میں ایک لکچر دے ڈالا تھا جس کا بعد کو بڑا چرچا ہوا۔ ہندوستان میں ہر جگہ کی طرح الہ آباد میں بھی ان دنوں جدیدیت کا بڑا چرچا تھا۔ اور فراق صاحب جدیدیت کے سخت مخالف تھے۔ مگر میر حسن سے گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ادب میں ایک متوازن تبدیلی کے حق میں ہیں۔ مگر ہاؤل جیسی تبدیلی انھیں بھی پسند نہ تھی۔ شاید ان کی نسل اس حد تک شعر و ادب میں تبدیلی کے حق میں نہیں تھی۔

وہاں سے اٹھے تو لاہوٹی مجھے سالار جنگ میوزیم کی لائبریری تک چھوڑ کر یہ جا وہ جا غائب۔ میں نے شام تک سالار جنگ میوزیم میں کام کیا اور جب وہاں سے اٹھا تو جاوید وششٹ بھی میرے ساتھ تھے۔ جاوید صاحب وجہی پر کام کر رہے تھے اور مجھے "ناول کے سماجی محرکات" کے موضوع پر کام کرنا تھا۔ ہم لوگ افضل گنج تک باتیں کرتے آئے کچھ ناشتہ کیا اور پھر بس پکڑ کر روانہ۔ جاوید وششٹ صاحب کو ارم منزل کے پاس ادارۂ ادبیات اردو کے مہمان خانے جانا تھا اور مجھے نظام کالج ہوسٹل۔ اور بس کا راستہ ایک ہی تھا۔ بس پھر ہمارا روز کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہم ٹھیک دس بجے سالار جنگ میوزیم لائبریری پہنچتے۔ دوپہر کو وہاں سے نکل کر مدینہ ہوٹل میں کچھ کھاتے پیتے اور پھر لائبریری میں داخل۔

ایک دن لاہوٹی صاحب وہیں سالار جنگ میوزیم میں آئے اور ہمیں اردو ہال کی ایک تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر جا عفر ہسن (جعفر حسن اپنے نام کی ہجے یوں ہی لکھا کرتے تھے) نے اردو ہال کو ایک سیاہ رنگ کی آرام کرسی پیش کی تھی جس پر سروجنی نائیڈو بیٹھا کرتی تھیں۔ اسی کرسی کی پیش کش کی تقریب تھی۔ (یہ بات کتنی ہی مضحک کیوں نہ معلوم ہو مگر اس سے اہل حیدرآباد کی اپنے ادیبوں سے محبت کے جذبے کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے) محض اس کرسی کو دیکھنے کے لئے اردو ہال میں ادیبوں کا ایک جمگھٹا لگ گیا۔ مختصر تقریریں سروجنی نائیڈو کی ادب دوستی پر ہوئیں۔ اگر لکھنؤ

www.taemeernews.com

میں یہ تقریب ہوئی ہوتی تو لوگ 'کرسی' کی رعایت سے معلوم نہیں کہاں تک سوچ لیتے۔ اور پھر اس کا اثر اتنے شاعروں اور ادیبوں پر بھی تقسیم کر دیتے۔ بعد کو ہلکا پھلکا مشاعرہ بھی ہو گیا۔ خیر میرے لئے یہ محفل بے حد مفید ثابت ہوئی کہ یہاں حیدر آباد کے بہت سے ادیبوں مثلاً حکیم یوسف حسین خاں، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، نجمہ سمیع، زینت ساجدہ، مغنی تبسم، غیاث صدیقی، عوض سعید اور حضرت نجم آفندی سے ملاقات ہو گئی۔ اور یہ سب 'کرسی' دیکھنے آئے تھے۔ اس وقت تک حیدر آباد کی کسی محفل میں تین چار سو ادب دوستوں کا ایک جگہ پر اکٹھا ہو جانا کوئی خاص بات نہیں ہوا کرتی تھی لاہوٹی صاحب نے اسی محفل میں اعلان کر دیا کہ کل شام میں یہ دو مہمان جو ہمارے ساتھ ہیں (یعنی جاوید وششٹ اور راقم) ان کا حیدر آباد میں استقبال ہوگا اور دوسری شام کو تیز بارش کے باوجود لوگ اکٹھا ہوئے اور حیدر آباد میں ہمیں خوش آمدید کہا۔

وقار خلیل اس درمیان ہمارے قریبی دوست ہو گئے۔ جب لاہوٹی صاحب مصروف ہوتے تو وقار خلیل ہمیں ادبی محفلوں اور حلقوں میں لئے پھرتے۔ وقار خلیل بے حد مخلص اور دوست آدمی ہیں۔ وہ اس وقت ادارۂ ادبیات اردو کے دفتر اور لائبریری میں کام کرتے تھے۔ ہم کبھی کبھی دفتر ختم ہونے سے پہلے ہی ان کے پاس پہنچ جاتے اور پھر وہیں سے کبھی انور معظم اور جیلانی بانو کے یہاں جاتے۔ کبھی حیرت بدایونی کے یہاں اور کبھی زینت ساجدہ کے یہاں۔ کبھی راج بہادر گوڑ کے یہاں ہوتے اور کبھی رائے محبوب نارائن کا کتب خانہ دیکھتے اور کبھی احمد اللہ قادری کے یہاں پہنچ کر شام کا ناشتہ کرتے۔ مگر یہ ناشتہ ہم کو بہت مہنگا پڑتا۔ کیونکہ اسی کے ساتھ ساتھ احمد اللہ قادری کا محررہ 'بہادر نامہ' (در ثنا و صفت لال بہادر شاستری) پھر ان کے کمرے میں ٹنگے ہوئے توصیف ناموں کے صفحات، ان کا شانِ نزول، اور پھر خود ان کی بہت سی 'بلند خوانیاں' بھی سننا پڑتیں۔ احمد اللہ قادری اردو کے مشہور محقق شمس اللہ قادری کے بیٹے تھے۔ ہماری دلچسپی یہ تھی کہ انھوں نے شمس اللہ قادری کا کتب خانہ بڑی حفاظت

www.taemeernews.com

سے سجا کر رکھا تھا۔ مجھے اس کتب خانے میں ڈاکٹر عبدالحق کے کچھ خطوط، شمس اللہ قادری کے نام ملے۔ حیرت ہوئی جب ایک خط غالباً ۱۹۲۶ء کا لکھا ملا (مجھے اب صحیح سن یاد نہیں ستائیس یا اٹھائیس تھا) جس میں ڈاکٹر عبدالحق نے شمس اللہ قادری کو لکھا تھا کہ "سنا ہے دکن میں وجہی نام کا کوئی شاعر گزرا ہے۔ آپ کے پاس اس کی کتاب 'سب رس' ہے۔ اگر کچھ دنوں کے لئے مجھے عنایت کر دیجئے تو میں بھی دیکھ لوں۔" (تقریباً یہی عبارت ہے۔ میں صرف اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ دو ایک لفظ اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں) احمد اللہ قادری کی تحویل میں عبدالحق کے تقریباً بیس پچیس خطوط محفوظ تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر ڈاکٹر اکبرالدین صدیقی سے واقعہ بیان کیا۔ چونکہ وہ اس وقت ڈاکٹر عبدالحق کے خطوط مرتب کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ عبدالحق کے وہ خطوط بھی شامل کر لیں جن میں اہم علمی اور ادبی بحثیں ہیں تو آپ کا یہ اندوختہ بے حد وقیع ہو جائے گا۔ مگر غالباً احمد اللہ قادری نے وہ خطوط اکبرالدین صدیقی کو نہیں دیئے۔ کیا معلوم اب وہ خطوط کیا ہو گئے ہوں گے؟ وقار خلیل اور لاہوتی صاحب کی معیت میں میں نے یہ خطوط اور شمس اللہ قادری کا وہ اہم کتب خانہ دیکھا تھا۔

وقار خلیل، صلاح الدین نیّر اور جاوید وششٹ کے ساتھ ہم شام کو کبھی کبھی نوبت پہاڑ پر بھی چڑھ جاتے۔ وہاں شام کو رصدگاہ میں سے ستارے بھی دیکھتے اور چھوٹا موٹا مشاعرہ بھی جماتے اور ہندوستان میں آیا ہوا نیا مشروب 'گولڈ اسپاٹ' پیتے۔ حکیم یوسف حسین خاں باوجود اپنی کبرسنی کے ہمارے ساتھ خوب گھومتے۔ حیدرآباد ہی میں سیدہ جعفر کے مکان واقع لنگر حوض پر پہلی مرتبہ ڈاکٹر وحید اختر سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ وحید اختر صاحب تیکھا بولنے کے ماہر ہیں۔ میں ان کی کتاب 'پتھروں کا مغنّی' پڑھ چکا تھا۔ مجھے ان کی شاعری اور اس کا لہجہ بہت پسند تھا۔ ان کی نظم 'صحرائے سکوت'، 'دشت گرداں'، کہاں کی رباعی کہاں کی غزل' اس مجموعے کی اچھی نظمیں معلوم ہوئیں۔ مگر جو گفتگو انھوں نے مجھ سے یہاں کی اس میں بڑی کڑواہٹ

www.taemeernews.com

تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے شعبے سے ایک ریڈر کی جگہ نکلی تھی۔ مجھے الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے تیرہ چودہ سال ہو چکے تھے۔ میں نے بھی وہاں درخواست بھیج دی تھی۔ غالباً اہل علی گڑھ نے یہ جگہ ذہنی طور پر خلیل الرحمان اعظمی کے لئے مخصوص کر دی تھی (جس کا علم مجھے بعد کو ہوا) وحید اختر صاحب نے پہلی ہی گفتگو اسی موضوع سے شروع کی کہ غالباً آپ نے ریڈر والی جگہ کے لئے علی گڑھ درخواست بھیجی ہے۔ میں نے اقرار کیا۔ اس پر وحید اختر صاحب بولے کہ وہاں خلیل الرحمان اعظمی بھی امیدوار ہیں۔ ان کے اس طرح کہنے پر مجھے ایک چیلنج نظر آیا جو مجھے اچھا نہ معلوم ہوا۔ میری تعلیمی استعداد کسی سے کم نہ تھی بلکہ خلیل مرحوم سے بہتر ہی تھی۔ اور بہت کم اردو کے اساتذہ کے پاس یہ تعلیمی لیاقت اس زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ میں ہائی اسکول اور انٹر دونوں امتحانوں میں یو۔ پی میں پوزیشن ہولڈر تھا۔ اور یونیورسٹی کا ٹاپر (TOPPER)۔ میں اسے ایک طرح کی دھمکی ہی سمجھا۔ مگر چونکہ یونیورسیٹیوں کی ملازمتوں کے فیصلے صرف تعلیمی لیاقت پر نہیں ہوا کرتے۔ پھر علی گڑھ جدیدیوں کا مرکز تھا۔ خود صدر شعبہ آل احمد سرور بھی ترقی پسندوں سے الگ ہو کر جدیدیوں سے جا ملے تھے۔ اس لئے یقیناً علی گڑھ میں میرا ہو جانا ممکن نہ تھا۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وحید اختر کا یہ فطری لہجہ ہے۔ بات رفت گزشت ہوئی اور ہم لوگ لاہوٹی صاحب اور وقار خلیل کے ساتھ لوٹ آئے۔ کالی کمان پر ایک ڈاکٹر اختر احمد تھے۔ وہ خاندان انیس کے ایک فرد تھے۔ غالباً میر انیس کے پوتے۔ اس وقت ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ آدمی تو وہ میڈیکل لائن کے تھے مگر شعر و ادب سے بھی ان کی خاصی دلچسپی تھی۔ سخت کمیونسٹ مخالف تھے اور ترقی پسندوں کے تو جیسے دشمن۔ مگر اختلاف کرنے کا ان کے پاس سلیقہ تھا شاید یہ ان کی لکھنوی وراثت کا اثر رہا ہو۔ اکثر ان کے مطب میں حکیم یوسف حسین خاں اور وقار خلیل کے ساتھ جانا ہوتا۔ اور خوب بحث و مباحثے ہوتے۔ اختر صاحب نے کچھ پمفلٹ بھی مذہب اور سائنس سے متعلق لکھ رکھے تھے۔ کچھ مارکسزم کے خلاف بھی

www.taemeernews.com

مضامین لکھ کر چھپوایا کرتے تھے۔ مگر لاہوٹی وغیرہ انھیں سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔ ہم لوگوں کی منڈلی سے مل کر وہ بہت خوش ہوتے۔ ہمارے مباحثے بھی دائرہ تہذیب ہی میں ہوا کرتے۔ پھر اختر صاحب مارکسی نظریات کی بنیادی باتیں جانتے بھی نہ تھے۔ بس ایک عام مخالفت، مذہبی نقطۂ نظر سے معصومیت کے ساتھ کیا کرتے۔ ایک دن اختر صاحب نے بھی اپنے گھر پر ہم لوگوں کی دعوت کی۔ شام کو ہم لوگ ان کے گھر پہنچے۔ اس دعوت میں اور کئی حضرات تھے۔ منجملہ ان کے حضرت نجم آفندی بھی تشریف لائے تھے۔ نجم آفندی صاحب سے تفصیلی ملاقات نہ تھی۔ صرف ایک مرتبہ اردو ہال میں رسمی سی ملاقات ہوئی تھی۔ کھانے سے پہلے کچھ یونہی سی شعر خوانی کی محفل بھی ہوئی۔ اس محفل میں حضرت نجم نے ایک غزل سنائی جس کی ردیف ”آدمی“ اور قافیہ ”ہم، غم“ وغیرہ تھا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور پھر حیدرآباد کا مشہور آم ”بے نشان“ کھانے کے بعد جب ہم بیٹھے تو مذاق میں میرے منہ سے یہ مصرعہ نکل گیا۔ ؏ صوفے پہ آم کھاکے گرا دھم سے آدمی۔ ہماری محفل نے اس مصرعے کا خوب لطف لیا۔ حضرت نجم آفندی بھی محظوظ ہوئے اور بولے کہ بھئی عقیل صاحب میں نے آپ کا تذکرہ پرنس معظم جاہ سے بھی کر دیا ہے۔ انھوں نے اس دن اردو ہال والی ملاقات کی خبر پڑھی تھی۔ تو وہ بھی آپ دونوں حضرات سے ملنا چاہتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان کی محفل رات میں بارہ بجے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ (ان دنوں حضرت نجم آفندی، پرنس معظم جاہ کی محفلوں میں بڑا درخور رکھتے تھے) میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ میں نے صدق جائسی کی کتاب ”دربار دُربار“ پڑھ رکھی تھی اور پھر حیدرآباد میں بھی پرنس کی محفلوں کے حالات سن رکھے تھے کہ جملہ صفات کے ساتھ پرنس معظم جاہ کے دربار میں پہلے تو نئے آدمیوں کو تولا جاتا ہے۔ عالم ہے، مسخرہ ہے، باتونی ہے کہ محض قصہ گو یا زیٹ زباٹ کا آدمی ہے۔ پھر یہ بھی اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ شخص کتنی بے عزتی برداشت کر سکتا ہے۔ کسی کو اشارہ کر دیا گیا کہ ایک چپت اس طرح لگا دو کہ یہ معلوم ہو جیسے یہ امر اتفاقی ہو گیا ہے۔ اگر وہ آدمی برا مان گیا تو وہیں تک اسے رکھا گیا اور اگر پی گیا یا اسے مذاق سمجھ

www.taemeernews.com

کر خوش ہوا تو پھر آگے کی اور منزلیں بھی ہیں۔ یہاں تک کہ "جل بھی شمعوں" والا واقعہ بھی اس کے ساتھ پیش آسکتا ہے۔ پھر انعام واکرام اور دل آسائی سب اس کے لئے ہیں۔ اس وقت اگرچہ پرنس موصوف اپنا اقتدار کھو چکے تھے مگر اپنی محفلوں کے تو وہ اب بھی بادشاہ تھے خیر میں نے رات میں نہ جاگ سکنے کا بہانہ کر کے معذرت کر لی اور یہ بھی کہا کہ آپ ہی میرا عذر "عالی جاہ" تک پہنچا دیجئے گا۔ تعجب ہے کہ نجم آفندی صاحب جیسا ثقہ آدمی اس محفل میں کیسے نبھاتا ہوگا! یہ تو یقین ہے کہ ان کے ساتھ اس طرح کی کوئی صورت پیش نہ آتی ہوگی۔ مگر کچھ نہ کچھ تو اس دربار عالی جاہ میں ضرور ہوتا ہوگا۔ ایک واقعہ تو حضرت نجم نے خود بیان کیا کہ ایک مرتبہ صحن میں دعوت کا انتظام کیا گیا۔ تمام مہمان کھانے کی میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک تیز بارش ہونے لگی۔ پرنس معظم جاہ اسی طرح بارش میں بیٹھے ہوئے کھانا کھاتے رہے۔ سر تک نہیں اٹھایا۔ اب مہمانوں یا مصاحبوں میں سے کس کی مجال تھی کہ کھانے کی میز سے اٹھتا۔ اسی طرح پانی میں شرابور بھیگا ہوا کھانا کھاتے رہے۔ کھانا بھلا کیا ہو گیا ہوگا؟! لیکن جب پرنس اٹھے تو بولے کہ آج کھانے میں مزہ آگیا۔ کیوں بھئی؟ اور مصاحبین کو بھی یہی کہنا پڑا۔ وہی شیخ سعدی کی نصیحت "اگر شہ روز را گوید شب است ایں۔ تو باید گفت اینک ماہ و پروین" والی بات۔

حضرت نجم آفندی اصلاً مرثیے اور نوحوں کے شاعر تھے۔ ان کا ذہن اسی فن میں خوب چلتا تھا۔ بڑے معرکے کے نوحے انھوں نے کہے۔ بلکہ میرے بچپن میں تو یہ فن شاعری صرف انھیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ نوحوں کی یوں تو کوئی ادبی حیثیت نہیں بنتی۔ مگر حضرت نجم نے ان نوحوں میں ادبی وقار بھی پیدا کیا۔ پھر دو ایک مرثیے بھی لکھے "معراج فکر" ان کا بہت مشہور مرثیہ ہے جو اس وقت کے نئے رنگ یعنی جوش ملیح آبادی کے "حسین اور انقلاب" کے رنگ کا تھا۔ مگر غزل میں بھی ان کا ذہن خوب چلتا تھا۔ انھوں نے واقعۂ کربلا کو غزلوں میں بھی اس طرح سمویا تھا کہ غم انگیزی کا ایک نیا رنگ غزلوں میں پیدا ہو گیا۔ ان کی کسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

www.taemeernews.com

جاں نثاروں نے ترے کر دیئے جنگل آباد   خاک اڑتی تھی شہیدانِ وفا سے پہلے

اب اس شعر کو کوئی چاہے تو مرثیے میں رکھ لے، چاہے تو غزل میں۔ جہاں حقیقت جو اس خمسہ پر چھا جاتی ہے۔ مگر جذباتیت، حقیقت پر پردے نہیں ڈالتی۔ یعنی واقعہ بھی یہی ہے کہ واقعۂ کربلا سے پہلے میدان کربلا ایک جنگل ہی تو تھا۔ ایک ویرانۂ بے آب و گیاہ۔ میں حضرت نجم آفندی سے مل کر، ان سے بے حد متاثر ہوا۔ ان کی سادہ مزاجی کو میں کبھی بھول نہیں سکتا جس میں شعرا کا تبختر نام کو نہ تھا۔

مخدوم سے ابھی تک تفصیلی ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ ایک دن اُن سے ملنے کا باقاعدہ پروگرام بنایا گیا۔ وقار خلیل، لاہوتی صاحب اور حکیم یوسف حسین خاں کے ساتھ ایک شام ہم لوگ مخدوم کی قیام گاہ ایم۔ ایل۔ اے کوارٹر کے لئے روانہ ہوئے۔ انھیں پہلے سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ ہم پہنچے تو وہ ہمارے منتظر تھے۔ اسی طرح ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ اس زمانے میں مخدوم حیدر آباد کی ایک خاتون اندرا دھن راج گیر کی انگریزی نظموں کو اردو شاعری کا جامہ پہنا رہے تھے۔ وہیں کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ہم پہنچے تو انھیں سمیٹ کر ایک طرف کر دیا۔ لاہوتی، مخدوم صاحب سے بے تکلف تھے۔ بولے مخدوم بھائی کہاں اس کمبخت کی اوٹ پٹانگ شاعری میں سر کھپائی کر رہے ہو۔ مخدوم اپنی خاص مسکراہٹ میں مسکرائے اور ہُوں۔ ہاں کر کے خاموش ہو رہے۔ سنا ہے کہ جس زمانے میں جوش صاحب حیدر آباد میں تھے، .... نام کے ایک شخص نے بڑا رسوخ حاصل کیا اور کچھ دنوں میں نظام حیدر آباد کا بے حد مقرب بارگاہ بن گیا۔ یہاں تک کہ نظام امور ملکی میں بھی کبھی اس سے مشورہ کرنے لگے۔ جوش صاحب تو غیر محتاط کسی حد تک دریدہ دہن اور ناعاقبت اندیش آدمی تھے ہی، کسی محفل میں .... کے متعلق کچھ گل افشانی کر دی۔ ریاستوں کے سازشی مزاج نے جوش صاحب کو پہلے جنگ پر چڑھایا پھر انھیں کی گفتار سے باتیں لے کر صاحبانِ اقتدار تک باتیں پہنچا دیں۔ جوش صاحب کی بہت سی باتیں محض لطف صحبت کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوش صاحب

www.taemeernews.com

کے خلاف جو ماحول بنا اس میں .... بھی شامل تھے۔ حیدر آباد کے امرائے پائیگان میں سے کسی نے جوش صاحب کو تاؤ دلا دیا۔ جوش صاحب کی حسِ مزاح جاگ اٹھی۔ دروغ برگردن راوی، حیدر آباد ہی میں، میں نے سنا ہے کہ جوش صاحب نے ایک نظم لکھ دی۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے (یہ نظم شاید سیف و سبو میں شامل ہے)

دھن راجہ کا جو پائے ہے لونڈا فقیر کا　　کیا کیا ٹھسک دکھائے ہے لونڈا فقیر کا

یہ صنعت ایہام خالص لکھنوی انداز کی تھی۔ جیسے ...... 'پڑھئے تب بھی مصرعہ بحر میں رہتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ 'یادوں کی برات' میں جوش نے اس واقعے کا ذکر کیا ہے یا نہیں مگر حیدر آباد میں یہ قصہ بہت مشہور ہے۔ لاہوتی صاحب اس روایت کے ناقل تھے۔ واللہ اعلم۔

ہاں تو مخدوم صاحب سے باتیں شروع ہوئیں۔ کچھ ترقی پسند تحریک کی باتیں، کچھ تلنگانہ تحریک کی ناکامیابی کے اسباب کچھ حیدر آباد کے ادیبوں کی باتیں۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دو حضرات اور ہماری محفل میں آکر شامل ہوئے۔ ایک سلیمان اریب اور دوسرے سرور ڈنڈا، حیدر آباد کے مزاحیہ شاعر تھے۔ میں دونوں کے نام اور کلام سے تو واقف تھا مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب اتنے شاعر جمع ہوں تو محفلِ شعر کیسے نہ جمے۔ سبھوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ مخدوم نے ایک غزل سنائی۔ اس کے کچھ اشعار یوں تھے۔

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخرِ شب　　اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے　　اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا، آخرِ شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے　　اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

پھر سرور ڈنڈا، حکیم یوسف حسین خاں، سلمان اریب، وقار خلیل اور جاوید وشسشٹ سبھوں نے اپنا کلام سنایا۔ یہ محفل تقریباً نو بجے رات تک چلتی رہی۔ مخدوم کا کلام تو اچھا ہوتا ہی ہے۔ مگر ان کے سنانے اور پڑھنے کا انداز بھی خوب تھا۔ تحت اللفظ میں

www.taemeernews.com

پڑھتے تھے۔ مگر اس میں بھی سماں بندھ جاتا تھا۔ اس طرح پڑھتے کہ ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت کا اندازہ سننے والوں کو ہونے لگتا۔ وہ انقلابی تھے مگر شعر پڑھنے کا انداز ان کا بڑا دلنواز اور ٹھہرا ہوا ہوتا۔ میں تو اپنی قیام گاہ سے قریب ہی تھا۔ اس لئے وہاں سے پیدل چل پڑا۔ بشیر باغ کے چوراہے پر ڈارسی (Darcy) ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر نظام ہوسٹل پہنچ گیا۔ انتزاعِ حیدرآباد کے بعد، حیدرآباد کے شعرا میں ایک طرح کی قنوطیت سی آگئی تھی۔ اور یہ فطری سی بات معلوم ہوتی تھی۔ اردو کے ساتھ جو برتاؤ یہاں ہوا اس سے اور شعرائے حیدرآباد کبیدہ خاطر تھے۔ لاہوتی اکثر یہ بات کرتے کہ حیدرآباد کے شعرا کو یہ کیا ہوگیا ہے؟! انھیں نئی ابھرتی ہوئی زندگی کی بھی تو ترجمانی کرنی چاہیئے۔ کب تک یہ لوگ ماضی کے اصنام خیالی سے دل بہلاتے رہیں گے۔ مگر میں کیا کہتا کہ قوموں کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک کھلے ذہن کو ان سے سَر بَر ہونے کی فکر کرنی چاہیئے۔ معلوم نہیں کہ کتنے اچھے شاعر حیدرآباد کے غم کی آگ میں جل بجھے۔ خورشید احمد جامی، شاہد صدیقی، سلیمان خطیب اور معلوم نہیں کون کون۔ یہ نہ خود، حیدرآباد سے نکلے اور نہ ان کا کلام۔ یہ صورت شاید اب بھی ہے۔ مخدوم، شاذ تمکنت اور مغنی تبسم کے علاوہ شاید ہی کسی اور کو دکن یا ہندوستان سے باہر کوئی اعتبار حاصل ہوا ہو۔

دوسرے دن سالار جنگ میوزیم لائبریری پہنچا تو جاوید وشسشٹ پہلے سے موجود تھے۔ ہم اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ کر کام کرنے لگے۔ میں نے جو کام لیا تھا اس کا عنوان تھا۔ "اردو ناول کے سماجی محرکات" اسی سلسلے میں مواد اکٹھا کرنے حیدرآباد گیا تھا۔ یہاں مجھے دکن کے ناول نگاروں کی کچھ ایسی کتابیں ملیں جنھیں شمال میں یا تو کوئی نہیں جانتا یا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ کشن پرشاد شاد کے کئی ناول ملے جن کا کوئی تذکرہ ناول نگاری کی تاریخ میں کہیں نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یوسف سرمست نے جب اپنی کتاب "بیسویں صدی میں اردو ناول" پیش کی تو اس میں کشن پرشاد شاد کے ناولوں کا تذکرہ تک نہیں کیا جبکہ

www.taemeernews.com

یہ تمام ناول سالار جنگ لائبریری میں موجود ہیں۔ سبب کیا ہے؟ کہہ نہیں سکتا۔ کشن پرشاد شاد نے چار ناول لکھے۔ (۱) چنچل نار، مطبوعہ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء (۲) سرمایۂ سعادت مطبوعہ ۱۳۰۵ھ (۳) مطلع خورشید، مطبوعہ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء (۴) بزم خیال، مطبوعہ ۱۳۲۷ھ/۱۹۱۲ء۔ آخری ناول تین جلدوں میں ہے۔ یہ سارے ناول سالار جنگ لائبریری میں بھی ہیں اور ادارۂ ادبیات اردو کی لائبریری میں بھی ہیں۔ شاد کے ان ناولوں پر میرا ایک تفصیلی مقالہ میری کتاب "تنقید اور عصری آگہی" مطبوعہ انجمن تہذیب نو الہ آباد (۱۹۷۶ء) میں موجود ہے۔ یہ ناول اہم نہ سہی مگر حیدرآباد کی زندگی اور معاشرے پر ان میں بہت دلچسپ مواد موجود ہے۔ کچھ کتابیں بھی مجھے حیدرآباد کی معاشرتی زندگی پر ملیں جس سے اس "شہر نگاراں" کی نظام شاہی کی بڑی اچھی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ ایک غیر معروف مصنف ابوظفر مؤید الدین حسن صاحب کی قلمی کتاب "تذکرہ معاشرت حیدرآباد دکن" ملی جس میں تمام حیدرآباد کی سماجی زندگی کا بڑا دلچسپ تذکرہ ہے۔ یہ کتاب مجھے حمایت نگر کے اردو ہال میں ملی تھی۔ معلوم نہیں شائع ہوئی یا نہیں۔ میں نے اس میں سے کچھ دلچسپ اقتباسات اور نکتے نوٹ کر لئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء کا مبیضہ تھی۔ ان اقتباسات اور نکتوں کو یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ بہت اختصار کے ساتھ کہ اس طرح یہ سوانح حیات کہیں بہت اکیڈمک نہ ہو جائے مگر چونکہ کتاب شائع نہیں ہوئی اس لئے عام قاری کی دلچسپی ان اقتباسات میں رہ سکتی ہے۔ صرف دو حصے پیش کئے جاتے ہیں۔

•

"جاگیرداروں کے خاندان میں حسب نسب کے لئے صرف دادیہال دیکھا جاتا ہے ماں نہال پر نظر نہیں ڈالی جاتی۔ اس طبقے اور ان کے حاشیہ برداروں میں یہ ضرب المثل ہے کہ تخم دیکھو زمین کیا دیکھتے ہو...... بیویوں کے چار درجے ہوتے ہیں۔ (۱) شادی کی بیوی (۲) منکوحہ (۳) خواص (۴) مدخولہ یا داشتہ۔ ان میں سب سے

www.taemeernews.com

بڑا درجہ شادی کی بیوی کا ہے۔ مرنے کے بعد صرف شادی ہی کی بیوی، خاندانی قبرستان میں دفن ہو سکتی ہے۔"

"مشائخین کی کثرت ہے۔ نہ صرف شہر حیدرآباد اور اورنگ آباد، گلبرگہ، وارنگل، میدک، بیدر وغیرہ بڑی آبادیوں میں بلکہ گاؤں گاؤں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ باستثنائے چند.... سب کے سب رنگین کپڑوں، جبّہ و عمامہ، لنگی و تسبیح کی آڑ میں دنیا کمارہے ہیں.... سیندھی (تاڑی) کے درخت ہراج (نیلام) کرتے اور اس کی آمدنی سے بلا تکلف مستفید ہوتے ہیں۔ دفع امراض کے لئے مرشد کے پاس دوڑے جاتے ہیں۔ تعویذ گنڈے اور چلہ کشی کی التجا کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے علاج کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا.... قدیم حیدرآباد میں تجارت کو ایک ذلیل پیشہ سمجھا جاتا ہے۔"

●

محرّم :-

"حیدرآباد میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی محرّم مناتے ہیں.... شیعہ سنّی، عَلَم استاد کرتے ہیں۔ سبز جوڑے، چاندی کی بیڑیاں، طوق اور زنجیر بنائے اور خریدے جاتے ہیں۔ ٹیکہ ٹکہ (گلگا، جو بجائے پان کھاتے ہیں)، قہوہ، روٹ چونگے (رحم ملیدہ) بتّی (غالباً گھتّی) کھچڑی، قبولی اور قسم قسم کے شربت، پہلی محرّم سے بارہ محرم.... تک مختلف تاریخوں میں خصوصاً ۸ محرّم سے دس محرّم تک بڑے اہتمام اور صفائی اور طہارت سے پکائے جاتے ہیں.... غریبوں کو کھلاتے ہیں.... علموں پر سے بچوں کو وارتے ہیں۔"

"دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت عباس کا الاوہ روشن کیا جاتا ہے۔ اسی سے قریب بادشاہی عاشورخانہ اور نعل صاحب کا عاشورخانہ ہے۔ شب عاشور کو علم نعل صاحب کی سواری نکلتی ہے.... علم کی سواری نکلنے تک، پتھر گٹی، مچھلی کمان، گلزار حوض، پنج محلہ شاہ علی بندہ تک لمبی سڑک، ڈبوٹیوں (چھوٹی چھوٹی مشعلوں) سے پٹ جاتی ہے۔ کسی بلندی سے دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سڑک پر یہاں سے وہاں تک آگ کے شعلے

www.taemeernews.com

بھڑک رہے ہیں اور مجمع دو حصّوں میں تقسیم ہو کر نعرے لگاتا ہے۔ ایک کہتا ہے "پھر گئی" دوسرا جواب دیتا ہے "لعل صاحب"۔ پھر مجمع کہتا ہے "محبوب علی شاہ" دوسرا جواب دیتا ہے "پکھال میں شیر مارے"۔ ایک حصہ کہتا ہے "امام قاسم" دوسرا کہتا ہے "دولھا" پھر کوئی کہتا ہے "مہندی والے"۔ مجمع کہتا ہے "دشمن کو مارے"۔

"جب بی بی کا عَلَم کھلتا ہے تو یاقوت پورہ تک اس کو آدمی ہی اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ پھر یہاں سے یہ عَلَم ہاتھی پر سوار ہوتا ہے۔ علم اٹھانے کے لئے سب سے پہلے نظام ننگے سر ننگے پیر آتے ہیں۔۔۔۔ جا بجا ہندو حضرات کی عورتیں سناروں کو ساتھ لئے کھڑی رہتی ہیں۔ جیسے ہی عَلَم قریب آتا ہے تو وہ بچوں کے کان فوراً امام کا نام لے کر چھید تا ہے۔۔۔۔ نظام بھی علم کی زیارت پرانی حویلی سے کرتے تھے اور نذر چڑھاتے تھے۔"

کہیں کہیں الاؤ لگا کر آگ کا ماتم بھی کرتے ہیں۔ میں نے یہاں ہندوؤں کو بھی آگ کا ماتم کرتے دیکھا ہے۔ لاہوتی صاحب ساتویں محرّم سے ہرا کرتا پہن لیتے تھے۔ ماتمی جلوس کے ساتھ ماتم کرتے چلتے تھے اور خود کو ہندو شیعہ کہتے تھے۔ اپنے دوست جوّاد رضوی کے ساتھ الاؤ میں کود کر آگ کا ماتم کرتے تھے۔ لاہوتی کے مخالف ان باتوں کو محض دکھاوا کہتے ہیں مگر کیا آدمی دکھاوے کے لئے یہاں تک جا سکتا ہے؟ وہ سچّے دل سے حضرت امام حسین پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اور اس کا ایک سبب بھی انھوں نے بیان کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے باپ نے ان کی پیدائش کے فوراً بعد ایک عاشور خانے میں لے جا کر ڈال دیا تھا۔ کیوں کہ ان کے کئی بچے پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہ بچا۔ اب یہ ان کے باپ کا عقیدہ تھا کہ سری لال محض امام کے کرم سے زندہ رہا۔ اسی لئے وہ ساتویں محرّم کو لاہوتی کو امام کا فقیر بناتے تھے۔ اور سبز کپڑے پہناتے۔ اور اس رسم کو لاہوتی نے اپنی زندگی تک قائم رکھا۔ لاہوتی جیسی شخصیت اب حیدرآباد میں مشکل ہی سے پیدا ہوگی۔ مرنے سے کچھ دنوں پہلے انھوں نے ایک کتاب "یہ لوگ" لکھی۔ جس میں اپنے عہد کے دوستوں اور بزرگوں کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں لاہوتی صاحب کسی کام سے بنارس آئے۔ ان

www.taemeernews.com

کا جی نہ مانا اور وہ الہ آباد صرف مجھ سے ملنے چلے آئے اور اپنی یہ کتاب مجھے عنایت کی۔ پس ان سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ الہ آباد وہ جب بھی آتے اپنی وضعداری کے مطابق، ہمیشہ پریم چند کے بیٹے امرت رائے کے ساتھ ٹھہرتے تھے۔ امرت رائے کے ساتھ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ان سے بڑی دوستی تھی۔ مگر ۱۹۹۰ء میں جب آئے تو وہ الہ آباد ریلوے اسٹیشن پر ٹھہرے۔ میں نے شکایت کی تو بولے "بس تم سے ملنا ہی تو تھا۔ تمہارے گھر آ گیا۔" حیدرآباد میں اپنی آخری بیماری کے درمیان جب وہ اسپتال میں داخل ہوئے تو مجھے فوراً انھوں نے ایک خط سے اپنی بیماری کی اطلاع دی اور جب تک اپنے ہوش و حواس میں رہے۔ برابر مجھے خط لکھتے رہے۔ افسوس اب لاہوتی جیسے دوست حیدرآباد میں میرے لئے کہاں ؟! ایک زمانے میں 'منصف' حیدرآباد میں میں نے کئی حضرات کے خاکے لکھے تھے۔ ان میں ایک خاکہ لاہوتی صاحب کا بھی تھا۔ یہ تمام خاکے اہل حیدرآباد کے تھے۔ مگر وہ سب کہیں ضائع ہو گئے۔ ان میں ڈاکٹر جافر حسن (جعفر حسن) زینت ساجدہ وقار خلیل، احمد اللہ قادری، سیدہ جعفر، حکیم یوسف حسین خاں اور جاوید وششٹ کے خاکے خاص تھے۔

ہم گولکنڈہ، تارامتی، میر عالم ٹینک، بنجارہ ہل، فلک نما اور جانے کہاں کہاں گھومتے پھرے۔ گولکنڈہ، تعمیر کا حیرت خیز نمونہ بنا ہوا آج بھی کھڑا ہے۔ اگر میں اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو مجھے ان باتوں کا کبھی یقین نہ آتا جو یہاں کے باقی ماندہ کھنڈرات میں آج بھی موجود ہیں۔ مثلاً اکبر الہ آبادی کا مصرعہ 'پانی پینا پڑا ہے پائپ کا' پڑھ کر ہم نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ پائپ سسٹم انگریزوں کا لایا ہوا ہے جو صنعتی انقلاب کی برکت ہے۔ مگر گولکنڈہ کے ان کھنڈروں کو دیکھ کر آج بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ماہرین عمارات، کم از کم سولہویں صدی سے ضرور اس سسٹم سے واقف تھے۔ زمین سے کم از کم دو ڈھائی سو فٹ کی بلندی تک پانی لے جانے اور پتھروں کی نلکیوں کے ذریعہ ساری عمارتوں میں آب رسانی کے یہ نمونے آج بھی ان کھنڈروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور اگر

www.taemeernews.com

یہ کہا جائے کہ دور کی آواز کا تین سو فٹ کی بلندی تک پہنچا تے کا فن محض معماری کے کمال سے قطب شاہی دور کے لوگ جانتے تھے تو کلونیل (Colonial) آب و ہوا کا پروردہ ذہن اسے ماننے کو تیار نہ ہو گا۔ مگر یہ معجزہ آج بھی گولکنڈہ کی عمارتوں میں جا کر دیکھا جا سکتا ہے۔ قلعے میں داخلے کے دروازے سے کچھ آگے چل کر ایک گنبد بنا ہوا ہے اس کے بیچ بیچ میں کھڑے ہو کر اگر آپ تالی بجائیں تو تقریباً تین سو فٹ کی بلندی پر تیز ہواؤں کے باوجود آپ کو تالیوں کی آواز سنائی دے گی اور گنبد سے ہٹ کر اگر تالی بجائی جائے تو آواز نہیں پہنچتی۔ افسوس کہ محکمہ آثار قدیمہ ان کھنڈرات کی مرمت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔ حکومت گولکنڈہ کے کھنڈرات کو اگر چاہے تو کسی تفریح گاہ (Picnic Spot) میں تبدیل کر سکتی ہے۔ شاید اہل اقتدار بھول گئے ہیں کہ جو کچھ ہندوستان میں ہے وہ ہندوستان کا ہے اور اسے حفاظت سے رکھنا چاہیے کہ یہ ہماری تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ ہاں قطب شاہی مقابر کی ضرور دیکھ بھال ہوتی ہے۔ یوم قلی قطب شاہ بھی اب اردو والوں نے منانا شروع کر دیا ہے۔ آندھرا پردیش کی حکومت بھی اس میں دلچسپی لیتی ہے۔ مجھے یہیں ایک مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شروانی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا جو بھاگ متی کے وجود ہی کے منکر تھے اور جھلم کی رقاصہ بھاگ متی کو محض داستان کہتے تھے جس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ شروانی مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ وہ اس مسئلے پر خاصی معلوماتی بحث کرتے تھے کہ بھاگ متی صرف ایک فرضی افسانوی کردار ہے۔ مگر قلی قطب شاہ کی پیاریوں میں تو حیدر محل کا تذکرہ موجود ہے۔ اور یہی کہا جاتا ہے کہ حیدر محل ہی کے نام پر حیدرآباد بسایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بھاگ متی ہی حیدر محل بعد کو ہو گئی ہو۔ میں نے پروفیسر موصوف سے اس طرح کی باتیں کیں مگر انھوں نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ اب تاریخ نے لوگوں کو کیسی کیسی جھلکیاں دیں اسے کیسے حل کیا جائے۔ تاہم لوگ بھاگ متی کو ایک حقیقی کردار مانتے ہیں۔ حیدرآباد میں کہیں کہیں حیدرآباد کے بجائے کچھ دکانوں پر بھاگ نگر بھی اب دیکھنے کو ملنے لگا ہے۔ کچھ بھی ہو جڑواں تہذیب حیدرآباد میں پہلے تھی وہ آج بھی عوامی طور پر

www.taemeernews.com

تسلیم کی جاتی ہے۔ مگر اب جب سے یہاں ہندو مسلم فساد ہونے لگے ہیں اس ملواں تہذیب میں دراڑیں پڑنے لگی ہیں۔ اردو جو پہلے حیدرآباد کے تعلیمی نظام میں اصل زبان تھی اتر پردیش کی طرح یہاں بھی اسے زندہ رہنے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اب تو دکانوں پر اردو کے بورڈ بھی نظر نہیں آتے۔ جو تھوڑے سے بہت بورڈ کالی کمان اور چار مینار کے گرد ہوا کرتے تھے وہ بھی لوگوں نے ہٹا دیئے ہیں۔ جب سے فسادات حیدرآباد میں ہونے لگے، اب اردو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے لگی ہے اور مسلمان بھی اپنی دکانوں سے اردو کے بورڈ اس لئے ہٹا رہے ہیں کہ فسادات میں یہ دکانیں لٹ جاتی ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں جب میں حیدرآباد گیا تھا تو صرف سرکاری اداروں پر ہندی زبان میں بورڈ ہوا کرتے۔ باقی جگہوں پر اردو اور تیلگو میں بورڈ لگے تھے۔ مگر اب خال خال اردو میں بورڈ ملیں گے۔

حیدرآباد میں کبھی جنسی زندگی ایک طبقے کے لئے بہت ارزاں تھی۔ جیسا کہ واجدہ تبسم کی 'نتھ سیریز' کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ 'نتھ کا بوجھ، نتھ اترائی، نتھ کا زخم'، اور معلوم نہیں کیا کیا۔ یہ کتابیں لکھ کر واجدہ تبسم نے عصمت اور منٹو کے بیچ سے اپنا راستہ بنانا چاہا تھا۔ مگر اس چکر میں وہ اپنا فطری راستہ بھی بھول گئیں۔ جب واجدہ عثمانیہ یونیورسٹی کی طالبہ تھیں، تب بھی وہ کچھ اسی طرح کے خطوط یونیورسٹی کے اساتذہ کو لکھا کرتی تھیں جن میں تحقیق کے لئے جنسی مسائل کے اردو ادب میں مسالے کی انھیں تلاش تھی۔ پھر جب میں ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد پہنچا تو وہ حیدرآباد چھوڑ چکی تھیں۔ اب بھی چھٹ پٹ واقعات حیدرآباد کے سننے کو مل جاتے ہیں۔ مگر یہ کہاں نہیں ہوتا۔ بڑے شہروں میں تو کوئی اس پر دھیان بھی نہیں دیتا۔ حیدرآباد ہی میں میرے ایک شاگرد کو ایک مرتبہ ایک دعوت نامہ حیدرآباد کے ایک دور افتادہ محلہ بارکس سے ملا۔ شاگرد وہاں گیا۔ بارکس سے بلانے والی میرے شاگرد کے شبینہ مدرسے میں پہلے پڑھنے آیا کرتی تھی۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ خاصی 'بالا قد و کلفت' لڑکی تھی۔ اس نے چاہا کہ شاگرد بارکس جا کر اسے پڑھا دیا کرے۔ مگر شاگرد بارکس جانے پر تیار نہ ہوا کہ روز بس سے اتنا سفر، شاگرد کے بس میں نہ تھا۔ بارکس اور بس کے سفر پر مجھے حیدرآباد

www.taemeernews.com

کے شاعر شاہد صدیقی کا ایک شعر یاد آگیا تو میں نے یہ واقعہ سننے کے بعد شاگرد کو سنایا۔ شعر یوں ہے۔

میرے پاس اک لڑکی بارکس سے آتی ہے — اس کے پاس موٹر ہے پھر بھی بس سے آتی ہے

میرے ایک دوست جو ایک تعلیمی ادارے سے وابستہ تھے اسی حیدرآباد میں انھوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ ان کے دشمنوں کے مطابق خاصہ مال و متاع اور املاک اکٹھا کیا۔ اگرچہ وہ عمر کی اس منزل میں ہیں کہ بقول نظیر ع سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ۔ والی ندا کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ عجیب بات ہوئی کہ پھر ان کے دشمنوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی تو دبھی یہی کاروبار شوق شروع کر دیا۔ مگر یہ بات مجھے محقق نہیں۔ اس لئے "عکہ کی پیاز مکہ" والی روایت بھی ہو سکتی ہے۔

بہرحال حیدرآباد علم و ادب کی دنیا ہے، محبت اور اخوت کی دنیا ہے۔ اور تلاش کرنے والے یہاں عشق و محبت کی رومان پرور فضا بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ مجھے عزیز احمد کے ناول 'شبنم' کی ہیروئن سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر اب وہ بازاری مصرعہ ہی ان کے لئے پڑھا جاسکتا ہے۔ ع کھنڈرات کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی۔

تاہم لٹکے جھٹکے اس وقت بھی خاصے تھے جن پر بقول باقر مہدی "بوڑھے ترقی پسند شاعر" آج بھی ریجھ جاتے ہیں۔ لاہوتی صاحب کے ساتھ ایک دن بنجارہ ہل پر نواب مہدی نواز جنگ سے بھی ملنے گیا۔ پہلے تو معلوم ہوا کہ ہم کسی پہاڑ کی کھوہ میں گھسے جا رہے ہیں۔ ان کے مکان کا نام بھی غالباً راک کیسل (Rock Castile) ہے نواب صاحب نے محل ایسا بنایا ہے کہ صدر دروازہ پہاڑ کے بڑے بڑے پتھروں (Boulders) سے درّہ نما بنایا گیا ہے۔ جب اس درّے نما راستے سے اندر آئیے تو ایک وسیع مکان میں آپ داخل ہوتے ہیں۔ مہدی نواز جنگ بے حد علم دوست آدمی تھے۔ بڑی دیر تک ان کی لائبریری دیکھتا رہا۔ کیا کیا نوادرات اس لائبریری میں تھے! پھر ان سے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے متعلق باتیں ہوئیں کہ شاد کے متعلق حیدرآباد میں میں نے ایک روایت یہ بھی سنی

www.taemeernews.com

تھی کہ شاد معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اور جو کتابیں ان کے نام سے شائع ہوئی ہیں وہ دوسروں کی لکھی ہوئی ہیں۔ میں نے نواب مہدی نواز جنگ سے اس روایت کی تصدیق چاہی نواب صاحب نے، نہ یہ کہ اس روایت کا انکار کیا بلکہ شاد کی وہ سوانح عمری بھی مجھے عنایت کی۔ جو نواب صاحب ہی کی لکھی ہوئی تھی۔ اس میں ان ناولوں کے نام موجود ہیں جو شاد کی تصنیف ہیں۔

ایک دن نواب عنایت جنگ سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ اگرچہ مرحوم بے حد بانونی آدمی تھے مگر حیدرآباد اور اردو ادب کی روایات کا انھیں بہت اچھا علم تھا۔ میں نے جب انھیں بتایا کہ میں ناول پر کام کر رہا ہوں تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ ناول بھی کوئی علمی ادبی چیز ہوئی۔ اردو کے پرانے دانشوروں کی طرح غالباً عنایت جنگ مرحوم بھی ادب کے معنی صرف شعر و شاعری ہی سمجھتے تھے۔ پھر انھوں نے متعدد بار مجھ سے پوچھا کہ آپ نے فلم "آسمان محل" دیکھی ہے۔ اس کی شوٹنگ اسی محل میں ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے اس فلم کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تو اس پر وہ افسوس کرتے رہے اور پھر مجھے اپنے محل کے وہ حصّے دکھائے جہاں فلم آسمان محل کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ بہرحال حیدرآباد کی یہ علمی اور ادبی صحبتیں اور اہل حیدرآباد کی محبتیں میں کبھی بھول نہیں سکتا۔

کوئی اس خود نوشت سوانح عمری کو بھلا کہے یا بُرا، پسند کرے یا ناپسند، مگر یہ تمام بیانات میرا عہد ہیں۔ میں اس میں زندہ ہوں اور نہایت والہانہ ڈھنگ سے زندہ ہوں اور میرے ساتھ تمام بیانات، واقعات اور معاملات اور وقت کے کیف و کم، سب نثر کر ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ میں نے بڑے ادیبوں کی بہت سی سوانح عمریاں بھی پڑھی ہیں اور خود نوشتیں بھی دیکھی ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اس خود نوشت میں، میں خود کو بھی تلاش کر رہا ہوں اور ان رشتوں کو بھی جو دنیا نے مجھے دیئے ہیں یا مجھ سے لئے ہیں۔ اب اگر میرے ہاتھ میں سارتر کا قلم ہوتا تو الفاظ (WORDS) جیسی چیز تو بھلا کیا پیش کر سکتا مگر اتنی بڑی اہم اور طوفانی زندگی کو صرف ۲۰۷ صفحات (انگریزی ترجمہ) میں قید کر لینے کا سلیقہ ضرور سیکھنے کی فکر کرتا۔

www.taemeernews.com

اگر چہ یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو سارتر کی بیوی سیموں دبوار خود ہی سیکھ لیتی اور اپنی زندگی کو تین جلدوں میں کیوں پھیلاتی۔ یہ تو بہت بڑے فنکار کا کام ہے کہ تمام رطب و یابس کو چھانٹ کر صرف جوہر اپنی خود نوشت میں رکھ دے۔ جو مصنف کو بھی اچھی طرح پیش کر دے اور دنیا کے کام اور تجربات کے لئے بھی کچھ دے جائے۔ میں تو سر سید رضا علی کے "اعمال نامہ" اور اختر رائے پوری کی "گرد راہ" کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ مگر پھر بھی یہی جی چاہا کہ جو کچھ اس دنیا میں دیکھا اسے بیان کر دینے میں کیا ہرج ہے۔ میں نہ تو انشا پردازی کا ماہر، نہ استاد فن، مگر پھر بھی شعرا کے اپنے اشعار کی طرح کسے اپنی زندگی کے واقعات اچھے نہیں لگتے؟ دراصل یہ لمحہ لمحہ جینے کی ہی تو داستان ہے۔ ہر بیان کے ساتھ مصنف چند لمحوں کے لئے اپنی عمر کی اس منزل پر بھی تو پہنچ جاتا ہے جس سے وہ گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو عالم خیال میں اپنی ناآسودہ خواہشات کو بھی تحریر میں پیش کر کے اپنی محرومیوں کی خلش کا بھی مداوا کر لیتے ہیں۔ ایسے فرضی اعمال بھی تحریر کر جاتے ہیں جن کی تکمیل نہ کر سکے مگر یہی سوچتے رہے کہ کاش ایسا ہو جاتا۔ اس خود نوشت کا حال کچھ ویسا بھی ہو جاتا ہے جب عالم خیال میں انسان معلوم نہیں کیا کیا سوچ ڈالتا ہے۔ اور اسی خیالی سوچ میں، انھیں سوچوں کے سہارے اس کے دن کٹتے رہتے ہیں کہ کاش ایسا ہو جاتا۔ خصوصاً عشق و عاشقی کے معاملے میں تو فکر کی آزادی کی حدیں نہیں ہیں۔ جو نیتی فرائی ڈے کی طرح فنطاسیہ کا ایک ڈھیر لگا سکتی ہیں۔ بھلا جوش صاحب کے اٹھارہ معاشقے بھی نیتی کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مانا کہ یہ سب مغربی طوائفوں کی آپ بیتیاں ہیں۔ مگر جس طرح جوش صاحب اپنے معاشقے تفاخر سے بیان کر سکتے ہیں اسی طرح دوسروں کو اپنی آپ بیتی پیش کرنے کا حق کیوں نہیں؟ جب انا کا شتر بے مہار چل پڑتا ہے تو پھر کسی چیز کا اتت نہیں ہوتا۔ مگر آخر اس میں کیا مزہ ہے؟ جب آپ کا ضمیر خود کہہ بیٹھے کہ "اماں! کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟ مان لیا کہ تم نے دوسروں کو مطمئن کر بھی دیا تو کیا؟ پھر کیا تم کو ہر وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس میں اتنا اصلی

www.taemeernews.com

ہے باقی سب کھوٹ ہے۔ یہ خود سے پیار کرنا بھی تو ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ اپنے کو اذیت پہنچانا بھی ہوا۔ اس سے بڑی اذیت اور کوئی نہیں کہ انسان کا ضمیر خود اس پر ملامت کرے اور اسے جھوٹا کہے۔ پھر بھی انسان اپنی ہانک لگاتا رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسٹوڈنٹ نے ایک مرتبہ اپنے سامعین کو یہ بتا کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ ایک مرتبہ سجاد ظہیر الہ آباد میں قلاش ہو گئے تو طالب علم نے انھیں دس ہزار کی رقم فراہم کر دی اور ایک جلسے کی صدارت کے لئے سید احتشام حسین کو ایک نیا سوٹ بنوا دیا کہ احتشام حسین کے پاس کوئی معقول سوٹ جلسے میں پہن کر جانے کے لئے نہیں تھا۔ تو اس خود نوشت میں کہیں اس طرح کی حیرت ناکیاں نہیں ہیں۔ اور نہ کچھ محض زیب داستان کے لئے لکھا گیا ہے ہاں قاری کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ضرور بیانات میں کچھ دلچسپ باتیں آگئی ہیں۔

جولائی کے وسط کی تاریخیں تھیں جب حیدرآباد سے میں نے اپنے شاگرد فضیل جعفری (اردو کے مشہور ناقد اور شاعر) کو لکھا، جو اس وقت اورنگ آباد کے مولانا آزاد کالج میں انگریزی کے استاد تھے کہ میں برہ اورنگ آباد پہنچ رہا ہوں۔ اور اجنتا اور ایلورا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور ایک شام حیدرآباد سے چل کر صبح اورنگ آباد پہنچ گیا۔ فضیل جعفری اسٹیشن پر موجود تھے۔ انھوں نے میرے ٹھہرنے کا انتظام اورنگ آباد کے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں کرا دیا تھا۔ پہلی نظر میں اورنگ آباد مجھے بڑا اچھا شہر نظر آیا۔ پہاڑی پر دور تک بسا ہوا شہر بے حد صاف ستھرا اور کھلا کھلا سا دکھائی پڑا۔ دوسرے دن صبح کو ایلورا جانے کا پروگرام بنا۔ فضیل جعفری نے مجھے بس اڈے تک پہنچا دیا اور میں ایلورا کے لئے روانہ ہو گیا۔ اورنگ آباد شہر سے ایلورا کا فاصلہ صرف پندرہ ۱۵ میل ہے (یا کیلومیٹر اب صحیح یاد نہیں) راستے میں ایک جگہ بس رکی تو بتایا گیا کہ یہ خلد آباد ہے جہاں شہنشاہ اورنگ زیب کی قبر ہے مجھے اورنگ زیب سے خاص دلچسپی ہے کہ اس کے ساتھ مورخین نے خاصا مذاق کیا ہے۔ اسے ہر جگہ ہندو دشمن اور شیعہ دشمن ثابت کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی دشمنی لوگوں کے دلوں میں اس طرح بٹھا دی ہے کہ کوئی اورنگ زیب کے حق میں اچھی باتیں سننے کو ہی تیار نہیں

www.taemeernews.com

ہوتا۔ بہر حال میں بس سے اتر کر اس بلندی کی طرف چلا جہاں مغلیہ سلطنت کا آخری بلند نام بادشاہ دفن ہے۔ بلندی پر ایک بے حد سادہ سی قبر بنی ہے اور جسے نے پرپروانہ سوزد نے صدائے بلبلے، والی کیفیت ہے۔ نہ مغل شاہی مقبروں کا تام جھام ہے، نہ قبر پر کوئی عمارت۔ بس ایک سادہ سی قبر اور یہی اورنگ زیب کی وصیت بھی تھی۔ اور یہ قبر بھی اپنے بسائے ہوئے شہر سے دور ایک جنگل میں۔ اب تو کچھ آبادی بھی ہو گئی ہے۔ بھلا ۱۷۰۷ء میں یہاں کیا رہا ہوگا؟! اب یہ یاد نہیں کہ خلد آباد سے کچھ آگے یا کچھ پہلے ہی، قلعۂ دولت آباد بھی نظر آیا۔ تین بہت بلند پہاڑوں کے بیچ میں ایک پہاڑی کے قلۂ کوہ پر ایک قلعہ بنا ہوا ہے کہ نیچے سے نظر بھی وہاں مشکل سے پہنچ پاتی ہے۔ اسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ محمد تغلق، منگولوں کے حملوں سے کس قدر خائف ہو گیا تھا کہ پہاڑ کی وادی میں قلعہ بنانے کے بجائے قلۂ کوہ پر دولت آباد میں ایسا قلعہ تعمیر کرایا کہ کسی فوج کے پہنچنے کا امکان ہی نہ رہے۔ یہ واقعہ ۱۳۲۸ء کا ہے۔ پہاڑوں پر ایسی ڈھلان ہے کہ کوئی چیز اس پر ٹک ہی نہیں سکتی۔ معلوم نہیں کہ دلّی کی جو آبادی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اسے اس نے کہاں بسایا ہوگا۔ کہ پہاڑی کے دامن میں دور دور تک کسی آبادی کے نشانات نہیں ہیں۔

میں تھوڑی دیر میں ایلورا پہنچا۔ ایلورا سنگ تراشی کا بہترین نمونہ ہے مجھے سنگ تراشی اور مورتی کلا میں خاصی دلچسپی ہے۔ میں کچھ بنا تو نہیں سکتا مگر یہ آرٹ میری سمجھ میں خوب آتا ہے۔ پتھروں کی تراش خراش ان کا دوران کی عمر وغیرہ سب کا مجھے اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں قدیم تاریخ کا طالب علم تو نہیں رہا مگر تاریخ کے اپنے ایک استاد گوبردھن ہاشرما پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ اکثر کھدائی کے مقامات (EXCAVATION SITES) پر جاتا رہا ہوں۔ کوسامبی، بیلن اور پرتاپ گڈھ کی کھدائی کی جگہوں پر بھی پروفیسر موصوف کے ساتھ گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس تجربے سے مجھے مورتی کلا میں دلچسپی پیدا ہوئی ہو۔ بہر حال ایلورا کا کیلاش مندر بڑی دیر تک میری دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔ مہاتما گوتم بدھ کی وہ مورتی بھی مجھے بڑی دیر تک متوجہ کئے رہی۔ جس کے چہرے پر مختلف زاویوں سے دیکھنے پر مہاتما کے چہرے پر مختلف

www.taemeernews.com

موڈ طاری نظر آتے ہیں۔ مہاتما بدھ سے میری اتنی دلچسپی ہے کہ بدھ کی چھٹی صدی عیسوی کی ایک مورتی آج بھی میرے پاس ہے۔

شاعرانہ بات ہی سہی مگر ع "ترا دل تو ہے صنم آشنا" والی صورت ہے۔ اب ایلورا کی تفصیلات کیا بیان کروں۔ شائقین مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ واپس آکر وہیں اورنگ آباد کے گیسٹ ہاؤس میں ایلورا پر ایک نظم لکھ ڈالی جو یوں ہے۔

کون جانے کہ اس غار میں
کتنے برسوں تلک
اپنے تیشے لئے فن کے عاشق
پتھروں کی مکدر جبیں پر
حسن کی دلربائی ابھارا کئے۔
خون دل اپنا حل کرکے تیشوں کی رگ میں
یہ پرستارِ فن
صرف تاریخ آدم سنوارا کئے

پتھروں کا جگر چیر کر سارے آذر
آسمانی سکوں ان کو دینے کی خاطر
رسم تشہیر وابلاغ سے بے خبر
وقت کی منجمد کچھ دراڑوں میں گم ہوگئے
آج نرگس کی کھلتی ہوئی نرم کلیاں
آم کی لچکی ٹہنیوں سے جھانکتی ہیں
سیکڑوں سال سے مسکراتی گلابی ہنسی
اک مغنی کا زخمہ بنی
ساز دل چھیڑتی ہے
زلفیں، ساون کے بادل بنی
پتھروں کا جگر چیرتی ہیں
شیو کی کافر جٹاؤں میں لٹکے ہوئے
کتنے محمود
اپنا گرز گراں چھوڑ کر
آج مٹیوں کی آوازمیں کھو گئے ہیں۔
جو ٹے شیر
معجزہ ایک تھی
اور ایلورا ؟!
حسن ملکوت ہے
عشق کے ساز کا ایک بکھرا سا نغمہ
جابجا جس کے بت بن گئے ہیں
کوئی فرہاد کو ڈھونڈ لائے۔

●

www.taemeernews.com

دوسرے دن اجنتا کا پروگرام بنا۔ اسے دیکھ کر ان تمام حیرتوں نے مجھے بھی گھیر لیا جو اجنتا کے دیکھنے والوں کو گھیر لیتی ہیں۔ رنگوں کے مختلف نمونے، پہاڑ کے غاروں کے اندھیرے میں کس طرح یہ پینٹنگ بنی ہوں گی؟ طرح طرح کی تاویلیں کی گئی ہیں۔ آئینے چمکا کر؟ پانی کا عکس غاروں میں اتار کر؟ یا معلوم نہیں کوئی اور ترکیب انھیں معلوم رہی ہو کہ اندھیرے غاروں میں کس طرح روشنی پہنچائی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ اجنتا میں ہر طرف حیرتناکیاں ہی ہیں۔ مگر مصوری، میری سمجھ میں کم آتی ہے۔ مصوری کے متعلق بس ایک عام آدمی کا تصور میرے پاس ہے۔ اس کی باریکیاں میں نہیں سمجھتا۔ نہ تو رنگوں سے میں تہذیب ہوں اور عام تصور کے انفرادی موڈ اور پسند کے اسباب کو سمجھ سکتا ہوں اور نہ ہی مصور کے موقلم کے اشارات یا اس کے رنگوں کی پسندیدگی کا سبب۔ مجھے یہی مشکل لندن کی نیشنل آرٹ گیلری اور ٹیٹ گیلری میں بھی آئی۔ پیرس میں لوور کو تو میں دیکھنے ہی نہیں گیا۔ کچھ یہ مزاج بھی ہے کہ وہ دیکھو جو کم لوگوں نے دیکھا ہو۔ ہاں اگر پسند خاطر ہو تو ضرور دیکھنا چاہئے۔ لوور کی مونالیزا دیکھنے کے لوگ کس قدر خواہش مند ہوتے ہیں مگر میں پیرس میں ہوتے ہوئے بھی مونالیزا دیکھنے نہیں گیا۔ یقیناً یہ کوئی اچھی بات نہیں مگر بس اپنا ایک مزاج ہے۔ سالار جنگ میوزیم کی ساری حیرت خیزیاں میں نے بھی دیکھی ہیں۔ مگر ان کا تذکرہ نہیں کیا کہ بہتوں نے مجھ سے بہتر تذکرے کئے ہوں گے۔ اگرچہ اس میں بھی نقطۂ اپنی اپنی والی بات ہوتی ہے۔ اس وقت اجنتا کی اس مصوری کو محفوظ رکھنے اور انھیں شائقین اور ناظرین کے 'دستِ شفقت' سے بچانے کے لئے حکومت کی طرف سے ان پر شیشے لگائے جا رہے تھے کہ سیاح ہاتھوں سے چھو کر ان کے رنگوں کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ تاج محل، پیلا ہو رہا ہے اور مورخین کے شور مچانے کے باوجود حکومت کوئی ٹھوس عملی قدم ابھی تک نہیں اٹھا سکی۔ اس میں عصبیت بھی ہو سکتی ہے اور لاپرواہی بھی۔ عصبیت حکومت کے کارندوں کی اور لاپرواہی حکومت کی۔ میں یہ سب کسی تعصب کی بنیاد پر نہیں سوچ رہا ہوں بلکہ ملک چلانے والے سیاست دانوں کا مزاج اور ان کے آرٹ اور کلچر سے لگاؤ کا اندازہ اسی طرح کرتا ہوں۔ یہ بھی

www.taemeernews.com

ہوسکتا ہے کہ اس طرح کچھ دنوں میں تاج کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ ایک واقعہ سنئے۔ لارڈ ویلزلی نے ہندوستان میں بہت سی تہذیبی اصلاحیں شروع کیں اور ہندوستانیوں کی زبانیں انگریزوں کو سکھانے کے لئے جب فورٹ ولیم کالج کھولا اور بہت سی تعلیمی اصلاحات چاہیں تو لندن میں ویلزلی کے خلاف بورڈ آف ڈائرکٹرس اور دوسرے تجارت پیشہ لوگوں نے بڑا ہنگامہ مچایا۔ فورٹ ولیم کالج کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر کمپنی نے قدغن لگادی (یہاں تک کہ آخر آخر میں کالج بند ہی ہوگیا) تو لارڈ ویلزلی نے جل کر ایک بڑے معرکے کا تاریخی جملہ کہا:۔

"These mischief mongers of the street of London can not appreciate the work of a Governor General."

"لندن کی سڑکوں پر فتنہ و فساد برپا کرنے والے یہ شرارتی، ایک گورنر جنرل کے کارناموں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔"

تو یہی کچھ ہندوستان کے آرٹ اور کلچر کے نمونوں اور خود آرٹ و کلچر کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں سیاست میں چانکیہ اور میکیاولی کے ملے جلے کردار بھی ہیں اور وہ بھی جو آرٹ، کلچر، تہذیب اور انسانی فطرت کی یگانگت اور بیگانگی سب کو یا تو وہ کیا جانے یہ پتھر ہے کہ جوہر، والی واقفیت سے دیکھتے ہیں۔ یا ہندوستان کی تہذیبی ہم آہنگی میں سے صرف چند تہذیبوں کا انتخاب کرکے الگ کر لینا چاہتے ہیں اور اس طرح ہندوستان کی دھنک رنگ تہذیب کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ ہندوستان جنت نشان میں جب اردو کا قتل عام شروع ہوا تو اردو کے شیدائیوں میں پنڈت سندر لال (بھارت میں انگریزی راج کے مصنف اور 'نیا ہند' کے ایڈیٹر اور گاندھی جی کے چیلے) بھی شور مچانے لگے۔ اردو کی حمایت میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تحریک پر جب بیس لاکھ دستخط جمع کرنے کی بات آئی تو پنڈت سندر لال نے بھی اس میں حصّہ لیا۔ لیکن جب وہ اردو کے لئے بہت مکھر ہوئے تو اس وقت کے وزیر اعلیٰ پنڈت گوبند ولبھ پنتھ نے ان کو منع کیا (جیسا

www.taemeernews.com

کہ پنڈت سندر لال نے اپنی ایک تقریر میں الہ آباد میں بیان کیا) اور کہا کہ جب ہم نے فارسی پڑھ لی تو اردو والے ہندی کیوں نہیں پڑھ سکتے۔ اُدھر ڈاکٹر ذاکر حسین وائس پریسیڈنٹ ہوئے تو حکومت میں اس قدر مشغول ہوئے کہ اردو کا مسئلہ ہی بھول گئے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ان کی وجہ سے انجمن ترقی اردو ہند کو کچھ مزید رعائتیں مل گئیں۔ اردو کے سلسلے میں پنڈت سندر لال کو بہت زیادہ جذباتی ہونے کی سزا شاید یہ ملی کہ انھیں کونے کھترے میں ڈال دیا گیا۔ ان کا نیا ہند بھی جو اردو ہندی دونوں کا پرچارک تھا اور گاندھی جی کی ہندوستانی کا موئید تھا اسے بھی کوئی اہمیت ادبی حلقوں میں نہ ملی۔ پھر ہندوستانی کے پرچار میں نہ ہندی والے ان کے ساتھ رہے اور نہ ہی اردو والے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد پنڈت سندر لال کی زندگی ہی میں 'نیا ہند' بند ہوگیا۔ پھر ان کی ہندوستانی زبان کی تحریک بھی ختم ہوگئی۔ پھر اردو کی ثنا و صفت میں تو بہت کچھ ہمیشہ کہا جاتا رہا مگر اردو کو عملی طور پر بڑھاوا دینے کے لئے بہت کم اقدام کئے گئے اور جو کئے بھی گئے وہ بے دلی سے۔ آخری صورت یہ ہے کہ اردو تعلیمی اداروں میں مغربی زبانوں کے ساتھ اس طرح رکھ دی گئی ہے کہ اردو اور انگریزی ایک ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ یا تو اختیاری موضوعات OPTIONAL SUBJECTS میں طالب علم اردو لے یا پھر انگریزی۔ پھر اترپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے تماشے کتنی مرتبہ ہو چکے ہیں۔ اور اب پھر یہی "مزاج المومنین" ذرا نئے ڈھنگ سے شروع کیا گیا ہے ع 'اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔' دیکھئے اردو کے عشاق کیا فیض اٹھاتے ہیں۔ زبان، آرٹ، کلچر سب کا ایک اندرونی اور باہمی رشتہ ہے۔ اس لئے جب بھی آرٹ اور کلچر کو بڑھاوا دینے کی بات آئے گی تو زبان کا مسئلہ بھی لازمی طور پر آئے گا۔

○

www.taemeernews.com

پھر الہ آباد

الہ آباد یونیورسٹی میں احتشام حسین کے آتے ہی شعبۂ اردو اپنی ایک انفرادیت بنانے لگا۔ اردو والوں کے لئے جو ایک ڈھیلا ڈھالا اور صرف شعر و شاعری اور مشاعرہ بازی کا تصور تھا اسے احتشام حسین نے بدلا۔ ان کی سنجیدہ اور ادبی تقریریں، اردو کے علاوہ دوسرے ادب سے بھی ان کی دلچسپیوں کا جب اندازہ یونیورسٹی کے سنجیدہ اور ادبی ماحول کو ہوا تو یونیورسٹی کے پڑھے لکھے ماحول میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کی رائے یونیورسٹی کے اہم مسائل میں وقیع سمجھی جانے لگی۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو میں سازشوں، ریشہ دوانیوں اور افترا پردازیوں کا بھی دور دورہ شروع ہوا۔ ابھی تک اس شعبے میں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں ہی کو درخور حاصل تھا۔ مگر اب یہاں ایک دوسری ہوا بھی چلنے لگی۔ خوشامدی جھلئے، کم علم، افترا پرداز یہاں بار پانے لگے۔ اعجاز صاحب کے زمانے تک شعبۂ اردو میں کُھلا ہوا اسٹرائیکا اور گلاسناسٹ کی فضا تھی۔ مگر اب خاموشی اور ہر چیز کو چھپانے کی فضا بننے لگی۔ کسی کے خلاف اگر کسی نے کوئی بات کہی یا بتائی تو بجائے اس کے کہ شخص مذکور سے اس کی وضاحت طلب کی جاتی جیسا کہ اعجاز صاحب کا دستور تھا، اب اسے درست یا نادرست مان کر خاموشی کو بہتر سمجھا جانے لگا کہ کون بڑھائے بات کو۔ اس سے غلط باتیں کرنے والوں کو بڑھاوا ملا کہ ان کی بے بنیاد باتیں کسی پر واضح بھی نہ ہوں گی اور وہ اپنا بیہودہ کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعبے کا سکون درہم برہم ہونے لگا۔ احتشام حسین کے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ شعبے میں درپردہ صاف دو پارٹیاں بن گئیں۔ احتشام صاحب سے ایک چوک اور ہوئی کہ انھوں نے چند اچھے امیدواروں کی موجودگی میں بھی، ہوائی باتیں کرکے متاثر کرنے اور جوڑ توڑ میں ماہر لوگوں کو شعبے میں داخل کر لیا۔ اب ہر وقت ایک کانا پھوسی کا ماحول شروع ہوا اس سے

www.taemeernews.com

ایک بے اعتباری کی فضا بننا شروع ہوئی۔ میں جو پندرہ سولہ سال سے شعبے میں کام کر رہا تھا جب صدر کے کمرے میں جاتا تو محسوس کرتا کہ کوئی بات شعبے میں ایسی ہو رہی ہے جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے۔ باتیں اشاروں کنایوں میں ہونے لگتیں۔ کبھی یہ محسوس کرتا کہ مجھے اب اٹھ جانا چاہئے۔ باتیں کرنے والوں کے چہروں پر عجب پُراسراریت کی فضا ہوتی۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن سے آنے والے احتشام حسین کے جیسے راز دار بن گئے تھے اور ہم چند پرانے اساتذہ جیسے کوئی ڈھول یا مٹی اور نامطبوع (Unwanted) بن گئے تھے۔ اب جب صدر کے کمرے میں جاؤ تو ہندی کے کسی ادیب سے تعلقات کا بکھان ہوتا رہتا یا ہندی کے کچھ سربرآوردہ ادیبوں سے مراسم کے تذکرے اس طرح ہوتے جیسے گفتگو کرنے والوں سے ان کی ملاقاتیں نہیں بلکہ یارانے ہیں۔ چونکہ ہم لوگوں کو ہندی ادب سے اور ہندی کی محفلوں کی اس سطح کا بہت کم علم تھا جس سطح کی باتیں ہوتیں، اس لئے سوا خاموشی کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ہماری، ہندی کے ترقی پسند ادیبوں سے تو ملاقاتیں تھیں مگر چھایاوادیوں میں سوا رام کمار ورما اور پنت جی کے اور ہماری کسی سے راہ و رسم نہ تھی اور پری مل والوں سے تو ایک طرح سے ہمارا بیر ہی تھا کہ وہ ترقی پسندوں کا مخالف گروپ تھا۔ احتشام حسین کو اب پری مل والوں سے ملانے کا کام ہو رہا تھا اور ایک مرتبہ احتشام حسین پری مل کی ایک گوشٹھی میں گئے بھی۔ اور انھوں نے اس کے مذاکرے میں حصہ بھی لیا۔ دلچسپ بات تھی کہ پری مل میں زیادہ تر اینٹی پروگریسو، رُوڑھ وادی اور کچھ سوشلسٹ لوہیاوادی بھی شامل تھے۔ دھرم ویر بھارتی تو علانیہ ترقی پسندوں کو گالیاں دیتے پھرتے تھے اور وہ پری مل کے بہت بڑے کھمبے تھے۔ ہم یقیناً ان سے بے خبر تھے۔ انھیں کی باتیں اب ہر وقت شعبے میں احتشام حسین کے سامنے بڑے طمطراق سے ہوتیں۔ احتشام حسین انھیں کیا سمجھتے تھے کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ خاموش بیٹھے سنا کرتے۔ کبھی کبھی کچھ بول بھی دیا کرتے۔ مگر ان کا یوں ناپسندیدگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ کبھی باتیں یوں ہوتیں۔

"تو پھر شام کو وہاں آئیں گے؟ میں کہہ دوں گا وہ لوگ آپ کا انتظار کریں گے۔"

www.taemeernews.com

"بھئی ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا" احتشام حسین کہتے۔ "نہیں سر، سی۔بی۔راؤ اور اگنیہ جی سے باتیں طے ہو گئی ہیں۔ وہ ٹھلوا و اے بھی آئیں گے۔ بنارس سے کیڈیا بھی آتے ہیں۔ شاید وہ پریم چند کی کوئی پانڈولیپ آپ سے پڑھانا چاہتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں وہ نہیں آ رہی ہے۔"

احتشام صاحب 'ہوں، ہاں' کرتے۔ ہم یہ محسوس کرتے کہ شاید احتشام حسین ہم لوگوں کے سامنے کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ محض ٹال رہے ہیں اور ہم لوگ اپنا بیگ وغیرہ لے کر وہاں سے چلے آتے تاکہ وہ کھل کر باتیں کر سکیں۔ پھر رفتہ رفتہ میں نے صدر کے کمرے میں جانا چھوڑ دیا۔ مجھے اگر احتشام حسین سے کچھ باتیں کرنی ہوتیں تو میں ان کے گھر پر جاتا۔ وہاں ہم لوگ زیادہ تر انگریزی ادب پر باتیں کرتے۔ گھر پر نہ میں احتشام حسین سے ان کے ہندی والوں سے تعلقات کی باتیں کرتا اور نہ شعبے کی باتیں۔ پہلے احتشام حسین شعبے کے مسائل پر مجھ سے بھی باتیں کرتے تھے۔ پھر انھوں نے مشورہ کرنا چھوڑ دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہندی کے متعلق احتشام حسین کی معلومات کیا تھیں مگر انگریزی ادب پر ان کی گرفت مکمل تھی۔ شعبے میں ہم لوگوں کی موجودگی میں ہندی ادب کی باتیں اس لئے بھی چھیڑی جاتیں تاکہ ہم خاموش رہیں اور صرف لن ترانیاں سنتے رہیں۔ پھر یہ بھی کہ انگریزی اور عالمی ادب کی اگر باتیں چھڑ گئیں تو ان "تازہ واردان بساط" کو خاموش ہی رہنا پڑے گا۔ اور ایسا ہوتا بھی تھا۔ اگر پروفیسر ستیش چندر دے" فراق صاحب یا ان کے بھائی جدیدیت سہائے شعبے میں آجاتے تو ٹامس، ہمنگ وے، پرتول برشت (بریخت)، میکیاں، کریمن، کیسٹ کی باتیں شروع ہوتیں جو شعبے کے حضرات کے لئے چارگن بن جاتیں۔

اسی زمانے میں جدیدیت کا غلغلہ ہوا۔ ہر طرف سے نئی نظمیں، غزلیں اور عجیب و غریب افسانوں کی کھیپ آنے لگی۔ عجیب عجیب لایعنی اشعار اور افسانے رسالوں کی زینت بننے لگے۔ جس کا چیمپین "شب خون" تھا۔ جس کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اسی زمانے میں میری کتاب "نئی علامت نگاری" شائع ہوئی۔ جس میں کھل کر ایسی شاعری کی مخالفت کی گئی اور جدیدیت کی بہت ساری زیریں لہروں کا تجزیہ اس کتاب میں کیا گیا۔

www.taemeernews.com

الہ آباد میں تو جدیدیت کا ماحول نہیں بن سکا لیکن علی گڑھ جدیدیت کا واقعی گڑھ بن گیا۔ نئی نسل نے وہاں جدیدیت کو توپ انگیز کیا۔ علی گڑھ میں جدیدیت پر بڑے بڑے سیمینار ہوئے۔ جہاں امریکی سفارت خانے کے لوگ بھی شرکت کرتے۔ اس میں ایک مسٹر ڈیمبو (DAMBO) خاص طور سے شرکت کرتے۔ نئی نسل کے ادیب ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ایزرا پاؤنڈ، طارمے، بودلیغ، رین بو (RIMBAUD) ورلین اور ژان ژینے وغیرہ کا نام اپنی تحریروں میں اس طرح Quote کرتے جیسے ان تمام ادیبوں پر انھیں عبور حاصل ہے جب کہ بہت سے نئے ادیب یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان میں کون انگریزی ادب کا ادیب یا شاعر ہے اور کون فرانسیسی ادب کا۔ تو واردانِ بساطِ ادب کو ایک مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ غرض کہ کچھ دنوں تک یہ مشغلہ خوب چلتا رہا۔ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں اس طرز فکر اور طریقۂ کار کی پذیرائی ہوئی۔ اور افتخار جالب، ظفر اقبال، انیس ناگی، محبوب خزاں، محمود مادھو، انور شعور اور جانے کون کون اس کارواں میں شامل ہوتے گئے۔ پھر ان کے اڈے امریکہ، کناڈا اور کچھ لندن میں بھی بن گئے۔ پھر ادیب کی اہمیت اس کی تخلیق سے نہیں ہوتی تھی بلکہ کون امریکہ، ناروے ڈنمارک، کینیڈا اور نیوجرسی میں بیٹھا لکھ رہا ہے اور کون امریکہ جاکر اردو زبان و ادب پہ لکچر دے آتا ہے۔ یہی سب لوگ اردو کے اہم ادیب ہیں۔ باقی جو ہندوستان اور پاکستان میں بیٹھ کر لکھ پڑھ رہے ہیں، نہ ان کی کچھ وقعت ہے اور نہ ان کے ادب کی۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھا کہ جدید ادیبوں کے پاس ماشاءاللہ بڑی بڑی گاڑیاں ہیں۔ ہر سال ان میں سے کچھ امریکہ جاتے ہیں اور کچھ امریکہ اور لندن میں مستقل رہتے ہیں۔ ترقی پسند بھلا ان کا مقابلہ کیا کریں گے۔ گویا فیصلہ تخلیق نہیں ادیبوں کا اسٹیٹس STATUS کرے گا۔ یہ وہی کلونیل مزاج تھا۔ پھر اس مہم میں جدیدیوں نے امداد باہمی سے بھی کام لیا۔ ترقی پسندوں نے بھی خود کو پھر سے مجتمع کرنا شروع کیا مگر ان میں اب لگن اور گرمی ختم ہوگئی تھی ترقی پسندی کی ہزیمت SETBACK کے اور بہت سے ادبی اور فکری اسباب بھی تھے۔ مگر سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان میں سے ٹیم اسپرٹ ختم ہوگئی تھی اور ان کے بلند نام

www.taemeernews.com

ادیب اپنے اسٹیبلشمنٹ میں لگ چکے تھے۔ شاید انھیں آئیڈیالوجی سے زیادہ خود اپنی ذات میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی جس کے لئے وہ ترقی پسندوں کے دشمنوں سے بھی ساز باز کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ بات بُری معلوم ہو، مگر یہی حقیقت ہے۔ انھیں بس اپنی فکر اور اپنے ہوائی ٹکٹ کی فکر ہوتی اور اپنی ٹیم کی نہیں۔ ایک موقعے پر تو کینیڈا کے جوش سیمینار کے لئے جب کسی نے لندن میں میرا بھی نام پیش کیا تو کینیڈا میں بڑا در خور رکھنے والے ایک بڑے ترقی پسند ادیب نے میری مخالفت کی۔ خیر یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ادب میں بھی جنگ زرگری چلتی رہتی ہے۔ مگر اس سے یہ خرابی آئی کہ ترقی پسندوں میں خود آپس میں من مٹاؤ پیدا ہونے لگا۔ یاشیخ اپنی اپنی دیکھ، کی صورت نے حضرت عیسٰی کی بھیڑوں کو منتشر کر دیا۔ پھر ترقی پسندوں میں سرکاری انعامات حاصل کرنے اور سرافرازیاں پانے کی دوڑ شروع ہوئی اور اس میں پھر ترقی پسند ایک دوسرے کی کاٹ کرنے لگے۔ اپنے دیرینہ رفیقوں کو چھوڑ کر اثر اور رسوخ رکھنے والے رفیق ڈھونڈنے لگے خواہ وہ کسی مکتب خیال کے کیوں نہ ہوں۔ اسی میں ممنون حسن خاں بھوپالی کا باز اور ان کا اقبال سمان بھی ادیبوں کو ڈہکانے لگا اور پھر تو وہ صورت پیدا ہوئی جو غالب کے ساتھ ہوئی تھی کہ جنہوں نے مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوہ کو رام پور سے وظیفہ ملنے کی مخالفت کی اور خود کو بیوہ صدر الدین آزردہ سے زیادہ مستحق ثابت کیا۔ جب کہ صدر الدین آزردہ غالب کے محسن بھی تھے۔ نئے رفیق تلاش کرنے اور پرانے رفیقوں کو نظر انداز کرنے کا ایک عبرت ناک نقشہ میں نے یہ دیکھا کہ پاکستان میں مہیا لکھنوی کے افکار کے سردار جعفری نمبر میں جو "حلقۂ یاراں" کے عنوان سے جعفری صاحب نے اپنے دوستوں کے نام دیئے ہیں ان میں نیاز حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، مہندر ناتھ، بلونت سنگھ ظ۔ انصاری، سہیل عظیم آبادی، پرویز شاہدی، اوپندر ناتھ اشک، محمود الظفر، غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر اعجاز حسین، ممتاز حسین، رتن سنگھ صاحبان کے نام نہیں ہیں۔ جو جعفری صاحب کے ہم فکر اور ہم سفر اور کچھ ہم پارٹی بھی ہیں یا تھے۔ پھر ان کی ادبی حیثیت بھی اور ہے۔ برخلاف اس کے جعفری صاحب کے حلقۂ یاراں کی فہرست میں گوپی چند نارنگ

www.taemeernews.com

اور شمس الرحمان فاروقی صاحبان کے نام شامل ہیں۔ آخر ادیب کے ہم سفر اور ہم عصر جعفری صاحب سے کب الگ ہو گئے۔ اور دوسرے حضرات ان کے 'حلقۂ یاراں' میں کب سے شامل ہو گئے؟

میری کتاب "نئی علامت نگاری" اپنے ڈھنگ کی بالکل ایک نئی کتاب تھی جس میں نئی شعری صورتوں اور ان کے ابہام اور ان کے اسباب و علل پر بحثیں کی گئی تھیں۔ اس وقت تک جدیدیت کا اس طرح کسی نے تجزیہ نہیں کیا تھا۔ احتشام حسین نے ضرور کچھ مضامین لکھے تھے اور ان پر خاصی بحثیں بھی چلیں۔ اسی زمانے میں احتشام حسین اپنی ایک پرانی کتاب 'اردو ساہتیہ کا اتہاس' جو انھوں نے ۱۹۵۲ء میں لکھی تھی اور جسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی تھی۔ اس میں پھر سے ترمیم کر رہے تھے۔ یہ کتاب ہندی میں تیار کرنی تھی۔ احتشام حسین روانی کے ساتھ ہندی نہیں لکھ سکتے تھے، اگرچہ وہ روانی کے ساتھ بڑی اچھی ہندی بولتے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ ہندی نہیں پڑھی تھی۔ اس لئے لکھنے میں ان کی مشق نہ تھی۔ اس لئے جب اس تاریخ کی کتاب میں ترمیم کرنے لگے تو شعبۂ اردو کے ایک ریسرچ اسسٹنٹ کی مدد سے یہ مسودہ ریسرچ اسسٹنٹ ہی کی تحریر میں تیار کیا اور الٰہ آباد کے ایک ہندی پبلشر لوک بھارتی نے احتشام حسین کی یہ ترمیم شدہ کتاب "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں احتشام حسین نے بہت سے نئے شعرا اور ادیبوں کو بھی لیا۔ منجملہ اور لوگوں کے اس میں میرا نام بھی شامل کیا اور میری دو کتابوں کے نام بھی اس میں درج کئے۔ پھر اسی ایڈیشن کا اردو مسودہ ترقی اردو بیورو نئی دلی نے ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ پھر جب لوک بھارتی نے احتشام حسین کی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس میں سے میرا اور محمد مثنیٰ کا نام غائب تھا۔ اور اس جگہ ڈاکٹر جعفر رضا اور ڈاکٹر محمود الحسن کا نام درج تھا۔ جعفر رضا صاحب کی ادبی قدآوری میں کئی سطریں بھی درج تھیں۔ احتشام صاحب کی اصل کتاب میں شمس الرحمان فاروقی اور شارب ردولوی کا نام بھی نہیں ہے۔ مگر یہ اس لئے بڑھایا گیا کہ اگر صرف ایک ہی نام

www.taemeernews.com

بڑھایا جائے گا تو بڑھانے والا گرفت میں آسکتا ہے۔ اب احتشام حسین کے پرانے مقدمے کے نیچے ایک نوٹ لکھا گیا (جو اس نئے ایڈیشن میں ۱۹۸۲ء میں چھپا) "پھر بھی کچھ استھانوں پر نئے تتھ سمّلت کر دیئے گئے ہیں" اور اس نوٹ کے نیچے تاریخ ۱۹ اگست ۱۹۷۲ء پڑی ہے۔ گویا تبدیلی کرنے والے نے یہ اہتمام کیا کہ احتشام حسین کی وفات یکم دسمبر ۱۹۷۲ء سے پہلے کی تاریخ ہونی چاہئے۔ "نئے تتھ سمّلت کرتے کے" ساتھ تحریف کرنے والا یہ بھول گیا کہ یہ بھی بڑھانا چاہئے تھا کہ "اور کچھ لوگوں کے نام نکال دیئے گئے ہیں۔" مجھے یہ بات بہت بعد میں اتفاقیہ طور پر معلوم ہوئی۔ میں نے پبلشر سے پوچھا کہ اس تبدیلی کی "پانڈولیپی" (مخطوطہ) کہاں ہے جس میں یہ تبدیلی احتشام حسین نے کی تھی تو پبلشر حیران رہ گیا۔ اسے اس کتاب میں تحریف اور تبدیلی کی کوئی خبر نہ تھی۔ ہاں اس نے ایک صاحب کا نام لیا کہ انھوں نے ہی پروف دیکھے تھے میں نے احتشام حسین کے بیٹے جعفر عسکری کو لکھا کہ وہ بتائیں کہ کیا احتشام حسین نے بعد کو اس کتاب میں تبدیلی کی تھی؟ انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ اصل کتاب کا مسودہ میرے پاس ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ میں اس لئے بھی متعجب تھا کہ احتشام حسین یہ تو کر سکتے تھے کہ کچھ نام بڑھا دیتے مگر یہ نہیں کر سکتے تھے کہ میرا نام کتاب سے خارج کر دیتے کیونکہ یہ ان کا مزاج نہیں تھا۔ پھر "نئے تتھوں میں" وارث علوی، مغنی تبسم، حامدی کاشمیری، خالدہ اصغر، بانو قدسیہ، احمد ہمیش، سریندر پرکاش، کمار پاشی، احتشام حسین کی نظر میں کیوں نہیں آئے؟ یہ سب احتشام حسین کی وفات کے بعد کی کارستانیاں ہیں۔ پھر اسی اگست ۱۹۷۲ء میں "نیا دور" لکھنؤ کے اسپیشل نمبر کے لئے احتشام حسین نے ایک مقالہ بہ عنوان "اردو میں تحقیق، آزادی کے بعد" لکھا۔ اس میں یہ عبارت درج ہے:۔

"بعض کی تحریریں امید افزا ہیں۔ جیسے محمود الہٰی، رفیعہ سلطانہ، علی جواد زیدی ..... ڈاکٹر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر محمد عقیل، عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ.... اور کئی دوسرے ادیب۔"

(جدید ادب، منظر و پس منظر ص ۔ از سید احتشام حسین مرتبہ جعفر عسکری ۱۹۷۳ء)

www.taemeernews.com

اب یہ کیا جادوگری ہے؟ ایسے سطروں کے درمیان (Between the Lines) پڑھا جا سکتا ہے۔ میری دوسری کتاب 'تنقید اور عصری آگہی' ۱۹۷۶ء میں چھپی۔ پھر 'سماجی تنقید اور تنقیدی عمل' (۱۹۸۰ء) 'تاریخ اردو ادب' (۱۹۸۴ء) یہ تاریخ ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب میں ترمیم و اضافہ کرکے شائع کی گئی۔ ۱۹۸۶ء میں ایک سفرنامہ 'لندن۔ او۔ لندن'، 'غزل کے نئے جہات (۱۹۸۹ء) اور عملی انتقادیات (۱۹۹۰ء) اس کتاب میں عملی تنقید کے اصول اور عملی تنقید کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ پھر مرثیے کی سماجیات (۱۹۹۴ء) یہ کتاب مرثیے کے مطالعے میں اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں ہر دور کے مرثیوں پر اس دور کے سماجی اثرات کی تلاش اور ان کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب خاصی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ جیسی کہ امید تھی۔ ایک طبقہ اس طرزِ تجزیہ سے متفق نہیں ہوا۔ کچھ نے یہ بھی کہا کہ باتیں تو سب صحیح ہیں مگر انھیں لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے مرثیہ نگاروں کی تحقیر ہوتی ہے۔ کچھ ذاکرین کرام نے درپردہ لوگوں کو اکسانے کی فکر کی کہ کتاب کے خلاف مولوی علی نقی صاحب کی کتاب کی طرح اعتراضات اٹھائیں جائیں مگر اس کتاب میں کوئی اس طرح کی بات تھی ہی نہیں۔ کچھ حضرات جو مرثیے کو اپنی موروثی چیز سمجھتے ہیں کہ سوا ان کے خاندان کے اور کسی کو مرثیوں پر بات کرنے کا حق نہیں ہے انھوں نے دوسری طرح سے React کیا کہ "مصنف پہلے مرثیے صحیح طور سے پڑھ تو لیں پھر مرثیے پر کتاب لکھیں گے۔" یہ حضرات شہر لکھنؤ سے تھے۔ ماشاءاللہ ایسے لوگ ابھی موجود تو ہیں جو اس خاکسار کو راہِ علم دکھا رہے ہیں! اُن کا شکریہ میں نے ادا کیا کہ میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں مرثیے میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ پھر میں ان کا کیا مقابلہ کر سکتا ہوں جن کے گھر میں مرثیہ اور اور اس کے متعلقات کا نزول ہوا۔ وہی مرثیے کی یقیناً نبض پہچان سکتے ہیں کہ وہی "اہل الذکر" ہیں (اور اگر تم نہیں جانتے تو اہل الذکر سے پوچھو) یہ خاکسار تو مرثیہ کیسا، ادب کے میدان میں بھی پیدل ہے اور مرثیہ شناسوں کی خاک پا بھی نہیں۔

میری کتاب "نئی علامت نگاری" پہلی مرتبہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ پھر اس کے دو ایڈیشن اور چھپے۔ اس سے پہلے میرا ڈی۔ فل (پی۔ ایچ۔ ڈی) کا مقالہ "اردو مثنوی کا ارتقا

www.taemeernews.com

شمالی ہند میں " ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہو چکا تھا۔ جس پر حکومت اتر پردیش کی طرف سے اکبر الہ آبادی انعام ملا تھا۔ پھر یہ کتاب ترمیم اور اضافے کے ساتھ دوبار اور چھپی۔ ابھی تک کا آخری ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں اتر پردیش اُردو اکیڈمی سے شائع ہوا۔ انعامات تو اور کتابوں پر بھی ملے مگر اب ان کا ذکر کیا۔ اس سے پہلے سامرسٹ مام کے ناول CAKES AND ALE کا ترجمہ ۱۹۶۳ء میں چھپا اور سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں مضامین کا مجموعہ 'نئی فکریں' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ میری پہلی کتاب ہے۔ 'اردو افسانے کی تنقیدی تاریخ' کا مسودہ تیار ہے۔ جلد ہی اس کی اشاعت کی فکر کروں گا۔ 'نئی علامت نگاری' اگرچہ احتشام حسین صاحب کے سامنے ہی تیار ہو گئی تھی اور اس میں مرحوم کے بہت سے مشورے بھی شامل تھے۔ مگر یہ کتاب ان کی وفات کے بعد ہی شائع ہو سکی۔ اس کتاب نے جدیدیوں کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔ جدیدیوں کی طرف سے راقم پر خاصی خشت باری ہوئی اور راقم جدیدیوں کا دشمن نمبر ون مشہور ہو گیا۔ خاصے ادبی مجادلے ہوئے۔ ترقی پسندوں نے بھی اپنی ادبی صفوں کو درست کرنا شروع کیا اور متعدد سمینار دلی اور لکھنؤ میں ترقی پسندوں کے بھی ہوئے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ترقی پسندوں کے پاس اپنا کوئی رسالہ مستقل طور پر نہ تھا۔ جو نئی نسل کی تخلیقات کو چھاپتا۔ وقتی طور پر کچھ رسالے نکلے۔ کچھ دنوں چلے بھی مگر پھر بند ہو گئے۔ لکھنؤ سے 'کتاب' الہ آباد سے 'شب رنگ'، بمبئی سے 'گفتگو' دلی سے 'عصری ادب' اور 'عصری آگہی'، مگر نئی نسل کے زیادہ تر لوگ ترقی پسندوں کے ساتھ نہ تھے۔ سبب یہ تھا کہ ترقی پسند ادبی معیار کے قائل تھے اور اُدھر شب خون ہر کہہ و مہہ کو دھڑا دھڑ چھاپ رہا تھا۔ جو چاہو لکھو اور جس طرح چاہو لکھو۔ بس جدیدیوں کے ساتھ رہو۔ 'شب خون' نہ صرف ہر رطب و یابس کو چھاپتا تھا بلکہ نئے شاعر اور نئے ادیبوں کی ثنا و صفت میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا پھر یہی نہیں کچھ لوگوں کو ملازمتیں بھی فراہم کرا رہا تھا۔ گویا جدید ہوتے ہی شہرت بھی مل رہی تھی اور ملازمت بھی۔ پھر جدید حلقے میں ہر دو مصرعے نظم کر لینے والا جوش، مجاز، جذبی اور احتشام حسین پر معترض ہوتا تو اس کی پیٹھ ٹھونکی جاتی۔ کبھی اگر ان صورتوں کا نفسیاتی اور سماجیاتی مطالعہ کیا گیا تو یہ مطالعہ بہت دلچسپ ہو گا کہ 'جدیدیت' کی تحریک میں چھٹ بھیّوں

www.taemeernews.com

کا عروج کیوں ہوا۔ اتنی گرد اڑی کہ صاحبان فہم سر بجیب ہو گئے۔ اور اگر کچھ سنجیدہ لوگ ان غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے تو ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ یہ بھی کہا جانے لگا کہ اتنے بڑے ذخیرے میں دس بیس اشعار یا افسانے اگر تجربے کے لئے لکھے بھی گئے تو کیا ہوا؟ دس بیس اشعار تو میر اور غالب کے یہاں بھی مل جائیں گے۔ اس دور میں سب سے زیادہ پذیرائی غالب کی ہوئی کہ پہلے جس طرح غالب کو مبہم گو کہا جاتا تھا اسی طرح ہمیں بھی کہا جا رہا ہے۔ بعد کو ہماری تخلیقات بھی غالب کی طرح چمکیں گی۔ پھر ایک ہوا یہ بھی چلی کہ یورپ سے جب کوئی نئی کتاب چھپتی تو صرف جدید ہی حضرات اسے پڑھتے اور جانتے ہیں۔ اس کا ایک تجربہ مجھے دلی کے ایک سمینار میں ہوا۔ ایک صاحبزادے جنہیں دنیا کے نقشے پر شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ یورپ کے مختلف شہر کس ملک میں ہیں اور کہاں ہیں، ایک مقالے پر معترض ہوئے اور بولے کہ اگر صاحب مقالہ نے میلان کنڈیرا (MILAN KUNDERA) کو پڑھا ہوتا تو انھیں معلوم ہوتا کہ آج ناول کیا ہو گیا ہے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ ان کی تخلیقات کس زبان میں لکھی گئی ہیں اور میلان کنڈیرا صاحب کس ملک کے رہنے والے ہیں۔ اب صاحبزادے پریشان ہوئے مگر ہوشیار تھے بولے میں نے تو انگریزی میں پڑھی ہے مگر دوسرے سوال کا جواب نہ دے سکے۔ اندازے سے کہا کہ میلان، اٹلی کا شہر ہے غالباً کنڈیرا وہیں کے رہنے والے ہیں۔ کیسا دلچسپ اور ونڈرفل جواب ہے!! میلان کنڈیرا اصلاً چیکوسلواکیہ کا رہنے والا ہے مگر جب ۱۹۶۸ء میں چیکوسلواکیہ میں روسیوں کا غلبہ ہوا تو وہ فرانس منتقل ہو گیا۔ میں جب ۱۹۸۶ء میں لندن گیا تو وہیں میں نے کنڈیرا کی کتاب L'ART DU ROMAN کا بڑا تذکرہ سنا۔ میں فرانسیسی کی شُد بُد رکھتا ہوں۔ تنقیدی کتاب تو دور رہی کوئی ناول بھی فرانسیسی زبان میں نہیں پڑھ سکتا۔ آکسفرڈ میں ٹیری ایگلٹن سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کتاب کے انگریزی ترجمے کی بات ان سے پوچھی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ ایک دن جب فوائلس گیا تو میلان کنڈیرا کی یہ کتاب 'دی آرٹ آف دی ناول' کے نام سے مل گئی میں نے فوراً یہ کتاب خرید لی۔ انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ لنڈا ایشر LINDA ASHER

www.taemeernews.com

نے کیا ہے اور لندن میں فیبر اینڈ فیبر نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں شائع کی ہے۔ یہ کوئی مکمل اور مسلسل کتاب نہیں ہے۔ بلکہ سات مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ اور پھر اکٹھا کر کے چھاپ دیئے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کُندیرا کا ناول کے متعلق اپنا نظریہ ہے۔ اس کتاب کا چھٹا مضمون "تر لیسٹھ الفاظ" ہے۔ کندیرا نے ان الفاظ کی وضاحت میں لکھا ہے۔ جنہیں اس نے اپنے ناول اور جمالیات کے سلسلے میں کلیدی الفاظ کے طور پر استعمال کئے ہیں اور بہت سی باتیں، ناول اور انسانی زندگی سے متعلق ان مضامین میں درج ہیں۔ مگر یہ کیا ضرور تھا کہ سیمینار میں مقالہ پیش کرنے والا اس کتاب کو پڑھے ہوتا؟

(۴۰)

سید احتشام حسین کے ساتھ ان کے آخری دنوں میں مَیں نے ڈی۔ لٹ کے لئے ایک موضوع لیا۔ "اردو ناول کے سماجی محرکات" مگر یہ کام نہ کبھی شروع ہوا اور نہ مکمل۔ ہاں اس بہانے بہت سے ناول اور ناول پر کچھ تنقیدی کتابیں ضرور پڑھنے کا موقع مل گیا۔ آرنلڈ کیٹل، والٹر ایلن، رالف فاکس، شولا خادر، رچرڈ چیز سب کتابیں مَیں نے پڑھ ڈالیں۔ احتشام حسین ہی نے مقالے کا خاکہ بنا دیا جو ابھی تک انھیں کی تحریر میں میرے پاس موجود ہے مگر مَیں نے کچھ کام نہ کیا۔ بس یہی خیال آیا کہ علم حاصل کرنا چاہئے۔ ڈگریاں لادنے سے کیا حاصل۔ اصل میں ایک نفسیاتی گرہ بھی اس سلسلے میں میرے ذہن میں پڑ گئی۔ اسی زمانے میں الہ آباد سے ایک نامنظور شدہ مقالے پر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی۔ لٹ کی ڈگری مل گئی جنہیں یہ ڈگری ملی انھیں صحیح طور سے غالب کا شعر پڑھنے کا بھی شعور نہ تھا۔ تو ڈی۔ لٹ کی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں جیسے جعلی نظر آنے لگیں۔ اس لئے بھی ڈگریوں کی طرف سے طبیعت میں ایک انقباض پیدا ہوا۔ چنانچہ ناول پر تنقیدی کتابیں پڑھنے کے بعد میں نے اوریجنل ناول انگریزی ادب کے پڑھنے شروع کئے۔ وکٹورین ناول نگاروں میں ہارڈی اور برانٹی سسٹرس کے تقریباً تمام ناول پڑھ ڈالے۔ پھر نئے لوگوں خصوصاً امریکی ناول نگاروں میں ڈوس پاسوس DOS PASSOS

www.taemeernews.com

میل ویل اور ہمنگ وے بہت پسند آئے۔ آخر آخر میں ہمنگ وے میرا سب سے پسندیدہ ناول نگار ہوگیا۔ میں نے ہمنگ وے سے متعلق تقریباً تمام تنقیدی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہمنگ وے کی زندگی کے ایک ایک موڑ میری نظر میں ہیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ کس چیز نے مجھے ہمنگ وے سے اتنا قریب کر دیا۔ ہوسکتا ہے اس کی زندگی کا ایڈونچر اور اس کے شوقِ شکار اور باکچوپن نے مجھ میں اس کی تحریروں میں دلچسپی پیدا کی ہو۔ بہرحال میں آج بھی ہمنگ وے سے بے حد متاثر ہوں۔ میری بیٹی ڈاکٹر ریشماں جو شعبۂ انگریزی، الہ آباد یونیورسٹی میں استاد ہے۔ اس کو بھی ہمنگ وے سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ ہمنگ وے سوسائٹی کی ممبر بھی ہے اور ۱۹۸۹ء میں بوسٹن میں جب ہمنگ وے پر انٹرنیشنل سیمینار ہوا تو ریشماں نے اس میں شرکت بھی کی اور ایک مقالہ بھی "اولڈ مین اینڈ دی سی" پر پیش کیا۔ ہمنگ وے پر لکھی گئی کتابوں میں سے بیکر، فلپ ینگ اور پاپا ہمنگ وے اپنی نوعیت کی دلچسپ کتابیں ہیں۔ احتشام صاحب کے ساتھ میں نے ولیم فاکنر، ہاورڈ فاسٹ اور اسٹائن بیک کے تقریباً تمام ناول پڑھ ڈالے میں نے جیمس جوائس بھی پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ مجھ سے نہیں چلا۔ علم تو کسی کی میراث نہیں مگر آج نئی نسل جو انگریزی میں ایک درخواست بھی بمشکل لکھ سکتی ہے جب اپنی ہر تحریر میں جیمس جوائس، کافکا اور کامیو کے حوالے اس طرح دیتی ہے جیسے یہ ادیب ان رات دن ان کا اوڑھنا بچھونا ہوں، تو سخت حیرت ہوتی ہے۔

احتشام حسین نے اندرون ملک اور بیرون ملک بھی شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا بڑا نام روشن کیا۔ جب وہ الہ آباد یونیورسٹی میں تھے تو انھوں نے روس کا سفر بھی کیا اور روس کا سفرنامہ لکھنے کے لئے نوٹس بھی تیار کئے مگر یہ سفرنامہ وہ لکھ نہ سکے۔ ان کی وفات کے بعد سوویت دیس کے عملے خصوصاً اجمل اجملی نے اس میں دلچسپی لے کر وہ نوٹس اسی طرح شائع کر دیئے۔ غالب صدی کی تقریبات کے سلسلے میں احتشام صاحب نے روس اور تاشقند کا دورہ کیا اور وہاں لکچر بھی دیئے۔ اسی وقت انھوں نے یہ نوٹس تیار کئے تھے۔ یہ نوٹس اتنے تفصیلی ہیں کہ ڈیمائی سائز کے ایک سو بیس صفحات کو محیط ہیں۔ انھیں

www.taemeernews.com

دلوں الہ آباد میں روس سے ایک کلچرل وفد بھی آیا ہوا تھا۔ جس میں ملاّ جان اور شرف جہاں نام کی دو خواتین اور تیسری خاتون ایک بیلا رینا بھی ساتھ تھی۔ ان لوگوں نے الہ آباد میں اپنے فن کے قیامت کے مظاہرے کئے۔ یہ تقریباً سبھی تاشقند کے آرٹسٹ تھے۔ احتشام حسین نے اپنے نوٹس میں تاشقند کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس پیش ہے۔

" اس وقت ہم چھ (ڈاکٹر علیم، مالک رام، کیفی، مجروح سلطانپوری، ہاجرہ، احتشام حسین) کے علاوہ روس کے مہمان ساتھی غضنفروف اور پری گار رینا بھی ساتھ ہیں (یہ پریوں کا دیس ہے) خوبصورت مناظر، سیر دریا، اوپر سے اڑ رہے ہیں۔ اوپر ہی جاکر زمین کا حسن اس کی عظمت اور ہیبت کا احساس ہوتا ہے۔ برف پوش پہاڑ جیسے دور تک اونچے اونچے خیمے نصب ہوں چنگیز اور تیمور کی فوجیں اتری ہوں..... 'خیابان رُودکی' میں رُودکی کا عالیشان مجسمہ نصب ہے۔ پرانے مکانات ازبکستان کے پرانے مکانوں سے ملتے جلتے ہیں..... فردوسی، بوعلی سینا، رودکی، ٹالسٹائے، گورکی، مایا کووسکی، ترسون زادے اور لاہوتی کے ساتھ زیب النساء کی تصویر بھی نظر آئی۔"

کیا معلوم احتشام حسین جب یہ سفرنامہ کتابی شکل میں لکھتے تو ان کا اپروچ ... (Approach) کیا ہوتا۔ مگر نوٹس یہی بتا رہے ہیں کہ یہ خالص ایجابی انداز میں ہوتا۔ اس وقت تک کوئی کسی اور طرح سے سوویٹ یونین کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خروشچیف کی کتاب "خروشچیف کو یاد آتا ہے" -KHURUSCHOV REM EMBERS جب میں نے پڑھی اور استالین کے ظلم و ستم کی کچھ جھلکیاں اس میں دیکھیں تو یقین نہیں آیا۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی یہی کہا کہ خروشچیف اپنا ذاتی عناد استالین سے نکال رہا ہے۔ احتشام حسین، خروشچیف کے فوراً بعد گئے تھے تو انھیں صورت حال سمجھنی چاہئے تھی۔ مگر وہ ایجابی مزاج لے کر گئے تھے اس لئے انھیں سب اچھا ہی اچھا نظر آ رہا تھا۔ ہم میں سے بھی کوئی اگر ہوتا تو اسی طرح سوچتا۔ احتشام حسین نے اس سفرنامے میں اس کا اقرار بھی کیا ہے۔

www.taemeernews.com

"اس بات کا یقین لے کر جا رہا ہوں کہ انسان نے اب تک جتنے نظام حیات وضع کئے ہیں ان میں اشتراکیت سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے (یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے امریکی، یوروپی اور اشتراکی نظام حیات سب کچھ دیکھا ہو۔ اور احتشام حسین نے یہ سب دیکھا تھا) اور انسان کے تقریباً سبھی دکھوں کا حل۔"

احتشام حسین بار یک بیں ضرور تھے مگر سوویت روس کے اندر اندر جو معاشی بحران ہلچل مچائے ہوئے تھا اس کی انھیں خبر نہ تھی۔ پھر ہرشد مہتا اور ہیراداس مُندڑا جیسے معاشی اسکینڈل روس میں بھی ہونے لگے تھے۔ واپسی پر جب میں نے احتشام حسین سے پوچھا کہ کیا یہ Guided Toure تھا تو انھوں نے اس کا انکار کیا۔ پھر ایک واقعہ بھی بیان کیا کہ ہم لوگ زلفیہ خانم کے ساتھ گھومنے نکلے۔ ہم نے چلتے چلتے اچانک ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ ایک ضعیف سی خاتون باہر نکلیں۔ زلفیہ خانم نے ان سے بتایا کہ ہم لوگ ہندوستان سے مہمان آئے ہیں۔ اتنے میں ان کی نوجوان بیٹی اور اس کے شوہر بھی دروازے پر آگئے۔ اور ہمیں اندر لے گئے۔ تھوڑے سے ہماری خاطر کی۔ گھر بہت اچھا سجا تھا۔ ہندوستان کا نام سُن کر بیٹی نے ہم سے پوچھا کہ "آوارہ ہوں" نغمہ آپ لوگ سنا سکتے ہیں؟ ہم نے انکار کیا تو اسے تعجب ہوا۔ پھر اس نے ہمیں یہ گانا سنایا۔ ہم نے ان کے رہن سہن سے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ خاصے خوشحال ہیں۔ مزے دار بات یہ تھی کہ لڑکی بھی ٹوپی پہنے ہوئے تھی اور گھر کے دوسرے افراد بھی۔ ایسی حالت میں آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ گائیڈڈ ٹور تھا؟

○

www.taemeernews.com

دامن نئے نئے ہیں

یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو سید احتشام حسین کا اچانک انتقال ہوگیا اور الہ آباد کی علمی اور ادبی فضا پر یکایک اُوس پڑ گئی۔ شعبۂ اردو میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ احتشام حسین کے بعد تو سب سے سینیئر استاد ڈاکٹر رفیق حسین تھے مگر وہ کچھ دنوں کے لئے شعبے سے رخصت لے کر یونیورسٹی کے دوسرے کاموں میں منہمک تھے۔ اس لئے سر دست ڈاکٹر مسیح الزماں نے چارج لے لیا۔ مسیح الزماں نے کل دس دنوں تک صدارت کی ہوگی کہ رفیق حسین صاحب واپس آگئے۔ اور پھر شعبے میں انھوں نے انتظامی امور کو چوکس کرنا شروع کیا۔ ٹائم ٹیبل، اساتذہ کی بروقت آمد و رفت سب پر قدغن اور پوچھ تاچھ شروع ہوئی جو یونیورسٹی میں کبھی نہیں ہوتا۔ گویا شعبۂ اردو میں ہیڈ ماسٹری اور پرنسپلی کا ماحول شروع ہوا۔ صدر کے کمرے میں ہر وقت حاضری پر زور دیا جانے لگا۔ مگر مسیح الزماں صاحب نے ان سب صورتوں کا بائیکاٹ کیا۔ وہ صرف اپنا کلاس لے کر گھر چلے جاتے۔ یہاں تک کہ ۸ فروری ۱۹۷۳ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ زود رنج آدمی تو پہلے ہی تھے۔ پھر ذرا ذرا سی باتوں کو وہ اپنی عزت اور وقار کا مسئلہ بنا لیتے۔ اسی زمانے میں ان کے گھریلو معاملات میں بھی خاصا تناؤ پیدا ہوگیا تھا۔ بہر حال اور بہت سے معاملات مل کر ان کی موت کا سبب بنے۔ مسیح الزماں صاحب یقیناً علم دوست آدمی تھے اور اچھے محقق بھی ہو سکتے تھے تحقیق میں جتنا بھی کام انھوں نے کیا ہے سب قدر اوّل کی چیز ہے۔ مگر تنقید میں ان کا ذہن نہیں چلتا تھا۔ تنقید میں مغربی علوم کے بغیر جدید تنقید کا اندازہ کرنا ممکن نہیں۔ اور مسیح الزماں صاحب کا مطالعہ مغربی ادب کا بہت محدود تھا۔ وہ میرے استاد تھے مگر ہمیشہ دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ مجھے ان کے مرنے کا بڑا افسوس رہا کہ ایک اچھا محقق

www.taemeernews.com

مہذّب اور سلیقہ مند انسان شعبے سے اٹھ گیا۔ افسوس اس کا بھی رہا کہ آخر آخر میں چند افترا پردازوں نے میرے اور ان کے درمیان ایک طرح کا مَن مٹاؤ پیدا کر دیا تھا۔

مئی ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر رفیق حسین بھی ریٹائر ہو گئے۔ اب شعبے میں بیٹی کوٹ گورنمنٹ آگہی اور جہالت کا دَور دورہ شروع ہوا۔ خاتون پہلے لڑکیوں کے کالج میں پڑھاتی تھیں مگر سینیئر ہونے کی وجہ سے شعبۂ اردو کا چارج ان کو ملا۔ شعبے میں پروفیسری کی جگہ خالی تھی اور ہر آنے والا اسی کو حاصل کرنے کی فکر کرتا۔ مگر یہ جگہ ابھی تک خالی رہی۔ ایک تو معاملہ اردو کا تھا۔ یونیورسٹی کو کیوں فکر ہوتی کہ اس جگہ کو بھرنے کی جلد فکر کی جائے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ ہر وقت شعبے میں ایک تناؤ کی صورت رہتی اور یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے ایک دوسرے کی شکایت حکایت ہوا کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروفیسر کی جگہ خالی ہی رہی۔ کسی نے "خاتون اوّل" کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا مقالہ شائع کرا دیں۔ یہ مقالہ بھی بازار کا لکھا ہوا مقالہ تھا اور خاتون کو معلوم بھی نہ تھا کہ کن کن کتابوں کے "کٹ پیس" سے یہ مقالہ تیار ہوا تھا۔ کیوں کہ رقم لے کر لکھنے والے نے اسے مختلف کتابوں سے نقل کر کے تیار کر دیا تھا۔ چنانچہ جب یہ مقالہ شائع ہوا تو عجیب عجیب طرح کے انکشافات ہوئے۔ معلوم ہوا کہ وقار عظیم، شبلی، حالی کی مقدمہ شعر و شاعری، جمیل احمد کندھائے پوری کی کتاب۔ افکار نو، مجنوں گورکھپوری کی کتاب "افسانہ" سے صفحات کے صفحات اس کتاب میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ حد تو یہ تھی کہ شبلی کی شعر العجم اور مقدمۂ شعر و شاعری سے پوری پوری عبارت نقل تھی اور جہاں شبلی اور حالی نے شعر یا شاعری کا لفظ لکھا تھا۔ وہاں معجون بنانے والے نے لفظ 'افسانہ' لکھ دیا تھا۔ اسی مقالے پر پٹنہ یونیورسٹی سے خاتون کو ڈی لٹ کی ڈگری ملی تھی جس کے ممتحنین ڈاکٹر حفیظ سید (الہ آباد) ڈاکٹر نجیب اشرف (بمبئی) اور ڈاکٹر اقبال حسین (پٹنہ یونیورسٹی) تھے۔ یہ مقالہ اردو افسانے پر ہے اور شائع ہو چکا ہے۔ جس کا جی چاہے مذکورہ بالا کتابوں سے ملا کر دیکھ سکتا ہے۔ پھر "چہ دلاور است دُزدے" والی بھی بات یہ ہوئی کہ کتاب یو۔پی اردو اکیڈمی لکھنؤ میں انعام کے لئے بھی

www.taemeernews.com

جمع ہوئی۔ اکیڈمی کی انعامی کمیٹی نے یہ راز دریافت کرلیا تو عین وقت پر کتاب انعام کے لئے نامنظور ہوگئی۔ خیر پھر اور بہت سی باتیں اس ضمن میں ہوئیں جن کو قلم انداز کیا جاتا ہے کہ عام قاری کو اُن باتوں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔

جولائی ۱۹۷۵ء میں اردو پروفیسر کے تقرر کے لئے کمیٹی ہوئی اور اس جگہ پر گیان چند جین کا تقرر ہوگیا۔ گیان چند نے آتے ہی شعبے کے حالات پر قابو پالیا اور ہم سب لوگ ان کے ساتھ تھے۔ گیان چند محض کرم کتابی نہ تھے۔ انتظامی امور میں بھی چوکس تھے۔ پھر انھیں دو یونیورسٹیوں کی صدارت کا بھی تجربہ تھا۔ اور پروفیسری کا بھی۔ یہاں سے پہلے وہ بھوپال اور جموں میں پروفیسر رہ چکے تھے۔ پھر انھیں ایک فوقیت اور حاصل تھی کہ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم بھی چھ سات سال تک رہ چکے تھے۔ اور الہ آباد یونیورسٹی کے مزاج اور شعبے کے حالات سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ یہاں کے ہر استاد سے ان کی واقفیت بھی تھی اس لئے انھیں لوگوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ پھر بھی وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ شعبۂ اردو میں وہ زیادہ دیر تک نہ ٹکتے۔ اور ایک بجے پابندی سے اپنے گھر چلے جاتے۔ ان کے خیال میں انتظامی امور کو چُست و درست رکھنے کے لئے زیادہ خَلا مُلا اچھا نہیں ہوتا۔ وہ اس گُر پر عمل کرتے رہے۔ ان کی ایک مجبوری بھی تھی کہ ان کی دھرم پتنی بغیر ان کے کھانا نہیں کھاتی ہیں۔ اگر یہ وقت سے گھر نہ پہنچے تو دیوی جی بڑی سوکھا کرتیں۔ بہر حال گیان چند صاحب کے شعبے سے جلد چلے جانے کا سبب جو بھی رہا ہو۔ اب شعبۂ اردو سے بیٹھک بازی اور چائے نوشی کی محفلیں ختم ہوگئیں۔ کام کرو اور گھر جاؤ۔ گیان چند صاحب ہر وقت نشۂ علم میں غرقاب رہنے والے آدمی تھے۔ یوں بھی ان کے پاس فالتو باتوں کے لئے وقت نہ ہوتا۔ وہ ایک معتبر محقق ہیں اور تحقیق و علم کے ساتھ بیٹھک بازی کہاں چل پاتی ہے۔ ان میں علّی، اکافر کا بیر ہے۔ کیونکہ حقیقتوں میں مبالغے کا رنگ بیٹھک بازی ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ تاہم اردو والوں نے جو کچھ بھی زبان و بیان کی خوبیاں، جولانیاں، تخیل کی رنگ آمیزی، نئے نئے محاوروں کی ایجاد، سب کچھ

www.taemeernews.com

صحبتوں اور بیٹھک بازیوں ہی سے سیکھا ہے۔ خالص حقیقتوں میں اردو کی انشا پردازی کورو کھا پن محسوس ہوتا ہے۔ یہ تو عام بات ہے کہ محلوں کے ٹٹ پونجئے شاعروں کو میر و غالب کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا صحبتوں کو گرم رکھنے والوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اردو میں ہر بات کو بڑھا چڑھا کر یعنی Superlatives میں پیش کرنا ہی اس کا حسن سمجھا جاتا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مبالغہ، مشرقی شاعری علی الخصوص فارسی اور عربی شاعری کا زیور ہے۔ مگر محقق کی مشکل یہ ہے کہ حقیقت تو ایک ہی ہے اور جب محقق اس حقیقت کو ڈھونڈے گا تو اس کے چاروں طرف لپٹی ہوئی مبالغے کی گرد چھٹ جائے گی۔ ایسی صحبتوں کا گیان چند صاحب کو شاید ہی کبھی تجربہ ہوا ہو۔ اسی واسطے وہ سچ باتیں دو ٹوک اور بے دھڑک ہو کر کہتے ہیں جو لوگوں کو اچھی بھی نہیں لگتیں۔ کبھی کبھی اس عادت کا خمیازہ بھی انھیں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک امیدوار نے انھیں پٹنہ یونیورسٹی کی پروفیسری کے لئے بہت گھیرا کہ وہ امیدوار کی سفارش کر دیں۔ بجائے اس کے گیان چند صاحب بہ لطائف الحیل امیدوار کو ٹال دیتے۔ انھوں نے اس سے وہی دو ٹوک بات کہہ دی۔ "میں آپ کو پروفیسری کے لائق نہیں سمجھتا" اور پھر اپنے اس کتھن کا وہ خمیازہ بھگتے رہے۔ اب ان خمیازوں کا ذکر بے کار ہے۔

گیان چند صاحب ذات کے بنیا ہیں۔ جیسا کہ وہ خود بھی مزاحاً کہا کرتے ہیں۔ اس لئے نہ اپنا حساب چھوڑتے ہیں اور نہ کسی کا حساب اپنے اوپر باقی رکھتے ہیں۔ اگر کسی نے ذرا سا بھی احسان ان کے ساتھ کیا ہے تو وہ اس کا بدلہ جلد ہی چکا دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے ان کے ساتھ کوئی برائی کی تو اس کا وہ بدلہ نہیں لیتے بلکہ خاموش ہو جاتے ہیں ان دونوں باتوں کی مثالیں میں نے الہ آباد اور حیدر آباد میں دیکھ لیں۔ الہ آباد میں اچھائی کرنے والوں کے ساتھ احسان مندی سے پیش آئے۔ ان کے ایک غائبانہ احسان کا میں خود مرہون ہوں۔ جس کا انھوں نے کبھی مجھ سے تذکرہ تک نہیں کیا۔ اور حیدر آباد میں بدی کرنے والوں کو انھوں نے معاف کر دیا اور پھر ایک موقعے پر ان کی سفارش بھی کی۔ وہ

www.taemeernews.com

ہندو ہیں مگر یہ صفت اقبال کے مرد مومن کی ان میں موجود ہے۔ اور کسی موقعے پر اس سے گریز نہیں کرتے۔ تحقیق کے معاملے میں وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتے جب تک اپنی آنکھ سے وہ بیان یا واقعے کو دیکھ یا پڑھ نہیں لیتے۔ مگر اردو تہذیب میں ایسے ایسے چرب زبان پڑے ہیں جو کبھی کبھی تمام احتیاط کے باوجود انھیں جھاڑیاں دے جاتے ہیں۔ یہ جھاڑیاں انھوں نے الہ آباد میں بھی کھائی ہیں اور حیدرآباد میں بھی۔ گیان چند صاحب کے اپنے چند اصول ہیں جن پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ جو ان کی اس عادت سے واقف نہیں وہ ان اصولوں کو ان کی کفایت شعاری پر محمول کرتا ہے۔ وہ اردو کے عام اساتذہ کی طرح یہ بھی نہیں کرتے کہ بقول سید محمد جعفری ع اترا فلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا۔ وہ ریل سے ہمیشہ اسی کلاس میں سفر کرتے ہیں جس کا کرایہ لیتے ہیں۔ کبھی مجبوری ہو تو سفر نہیں کرتے۔ میں ایک مرتبہ حیدرآباد میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے لئے گیا۔ میرے ساتھ دو طلبا یو۔جی۔سی کے بھی تھے۔ ہم سب اپنے شاگرد ڈاکٹر مجاور حسین کے یہاں ٹھہرے۔ مجاور حسین صاحب میرے شاگرد بھی ہیں اور دوست بھی۔ وہ خود مجھے حیدرآباد اسٹیشن سے آکر اپنے ساتھ لے گئے اور یہ رسم انھوں نے آخر تک نبھائی۔ جب بھی میں حیدرآباد گیا وہ مجھے اسٹیشن ہی سے آکر لینے ساتھ لے گئے اور اپنے ہی ساتھ ٹھہراتے۔ ہاں تو یہ بات جب گیان چند صاحب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے مجھے طلبا اور خاص طور پر یو۔جی۔سی کے طلبا کے ساتھ سفر کرنے کو منع کیا کہ دوسرے لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپ کا خرچ بھی یہی یو۔جی۔سی کے طلبا اٹھاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ریسرچ اسکالر میرے ساتھ اس لئے بھی سفر کرتے تھے کہ انھیں میرے ساتھ سیمیناروں میں شرکت کرنے کا موقع ملتا تھا۔ نیز اس رقم کو بھی خرچ کرنے کا موقع جو انھیں یو۔جی۔سی سے CONTENGENCY کے لئے ملتی تھی۔ میرے ساتھ ریسرچ کرنے والوں میں علی احمد فاطمی سے لیکر حسن امتطااور نگینہ جبیں تک ایک لمبی فہرست ہے۔ ان تمام طلبا نے ایسے اسفار سے فائدے حاصل کئے ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی خدانخواستہ میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ گیان چند صاحب کے یہ اندیشے بر بنائے احتیاط تھے کہ گائیڈ

www.taemeernews.com

حضرات اس طرح کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض واقعات تو ایسے بھی معلوم ہوئے جہاں گائیڈ تمام Contengency کی رقم طلبا سے خود لے لیتے ہیں اور اسکالرشپ انھیں دے دیتے ہیں۔ اس طرح گیان چند صاحب کا خدشہ بلا سبب نہیں تھا۔

گیان چند صاحب سلیقے سے رہنے اور رکھنے کو خاصی اہمیت دیتے۔ ان کا ڈرائنگ روم قدیم یوروپی پروفیسروں کا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا ہے۔ وہ گھر بڑے سلیقے سے سجائے رکھتے ہیں۔ آج کل بہت کم دانشور اس طرح گھر اور کمرہ سجا کر ادبی کام کرتے ہیں۔ میرے دوست ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے پاس تو لکھنے کی باقاعدہ کوئی میز بھی نہیں ہے جہاں بیٹھے کاغذ لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ ہاں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب ضرور لوبان اور بخور سلگا کر مائل بہ نگارش ہوتے ہیں۔ جب تک عطر حنا یا شمامۃ العنبر نہیں لگاتے کچھ لکھ نہیں سکتے۔ احتشام حسین بھی لکھنے پڑھنے کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے تھے۔ کہیں بھی بیٹھے ہیں یکایک کاغذ کھینچ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ نہ پڑھنے لکھنے کی کوئی میز اور نہ سجا ہوا ڈرائنگ روم بلکہ ڈرائنگ روم نام کی تو کوئی چیز احتشام حسین کے پاس تھی ہی نہیں۔ اب اتنے بڑے بڑے لوگوں کے تذکرے میں راقم الحروف اپنا کیا تذکرہ کرے۔ میری بھی پڑھنے لکھنے کی کوئی جگہ مقرر نہیں ہے۔ جہاں چاہتا ہوں بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتا ہوں اور جہاں چاہتا ہوں پڑھنے لگتا ہوں۔ کاغذ بھی کسی طرح کا ہو میرے لکھنے کے کام آتا ہے یونیورسٹی کی میٹنگوں کا کاغذ یا روداد جس میں صفحہ ایک طرف سادہ ہوتا ہے میرے لکھنے کے بہترین کاغذ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دعوت ناموں کے لفافے اور اندر کے کارڈ بھی میری قلم کی جولانگاہ بن جاتے ہیں۔ پھر مسودہ جو تیار ہوتا ہے اسے میرے سوا دوسرا نہ جوڑ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہی بیہودہ ردی کاغذ لئے سیمنار وں میں بھی چلا جاتا ہوں اور مقالہ پڑھتے وقت بار بار ان کاغذات کو الٹتا پلٹتا رہتا ہوں۔ ہاں میں نے اس کا ہمیشہ خیال رکھا ہے کہ قلم کو تلوار کی طرح چلنا چاہئے۔ چنانچہ زیادہ تر بدیسی قلم استعمال کرتا ہوں۔ پارکر اور شیفرس میرے محبوب قلم ہیں۔ اور یہ عادت

www.taemeernews.com

آج کی نہیں طالب علمی کے زمانے سے ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں پارکر اور بلیک برڈ میرے محبوب قلم ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی دلچسپ ہے کہ لوگ باہر سے میرے لئے قلموں کے تحفے لاتے ہیں تو ان میں زیادہ تر پارکر یا شیفرس ہی ہوتے ہیں۔ قلموں کو میں بہت سنبھال کر رکھتا ہوں۔ آج کل مجھے ایک جاپانی قلم پائیلٹ (Pilot) ٹوکیو سے لاکر ایک عزیز نے دیا ہے۔ اس کتاب کا پورا مسودہ اسی جاپانی قلم سے تیار ہوا ہے۔ میری اولاد میں صرف میرے بیٹے بابر کو بھی یہی شوق ہے۔ وہ بھی ہمیشہ قلم بہت اچھا استعمال کرتا ہے جب کہ میری ایک بیٹی افشاں کو قلموں کے گم کر دینے میں مہارت حاصل ہے۔ کیسا ہی اچھا قلم ہو ایک ماہ سے زیادہ اس کے پاس نہیں چلتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ گیان چند صاحب کیسا قلم استعمال کرتے ہیں مگر کاغذ وہ ہمیشہ سفید اور اچھا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریر بھی ایسی ہے کہ آج تک کسی اردو لکھنے والے نے اس طرح کے حروف اپنی تحریر میں نہ بنائے ہوں گے اور نہ کوئی ان کے خط کی نقل اتار سکتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ اپنی تحریروں کی چھوٹی چھوٹی چٹیں بھی بہت سنبھال کر رکھتے ہیں چنانچہ دوسروں کی کتابوں پر لکھے ہوئے اپنے مقدمے اور تبصرے تک کتابی شکل میں چھاپ دیتے ہیں۔ اس معاملے میں انھیں اگر کوئی شکست دے سکتا ہے تو وہ جگن ناتھ آزاد ہیں جو اپنے نام کے دعوت نامے اور محفلوں میں اپنی تقریروں کے پروگرام تک چھاپ چکے ہیں۔ گیان چند صاحب ریڈیو سے بے حد چڑھتے ہیں۔ کبھی شاید ہی ریڈیو پر کوئی پروگرام دیتے ہوں۔ ہاں ٹی۔وی پر ضرور اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اہل علم کو فوراً تاڑ لیتے ہیں۔ اور ان کی قدر کرتے ہیں۔ جعلی ادیبوں کو بھی جلد سمجھ لیتے ہیں۔ پھر خاموش ہی رہتے ہیں صرف ہوں۔ ہاں کر کے کام چلاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تحقیق کے آدمی ہیں اس لئے بغیر خود تفتیش کئے کسی بات پر اعتبار نہیں کرتے۔ جب وہ نئے نئے الہ آباد آئے تھے تو فراق صاحب سے ملنے کے لئے بہت بے چین رہتے تھے۔ میں نے کہا کہ کہاں جائیے گا آج کل وہ ننگے پڑے رہتے ہیں۔ مگر انھیں یقین نہ آیا۔ آخر ایک دوپہر کو انھیں ساتھ

www.taemeernews.com

لے کر فراق صاحب کے گھر گیا۔ جاڑوں کے زمانے تھے۔ فراق صاحب دھوپ میں ننگے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے گیان چند صاحب کو دور سے یہ نظارہ دکھایا۔ لاحول پڑھ کر واپس آئے اور بولے کہ آپ صحیح کہتے تھے۔ تحقیق اور اصول تحقیق میں ان کا بڑا حصہ ہے اور حصہ ہی نہیں بڑا "یوگ دان" ہے۔ اردو دنیا میں ایک زمانے میں "چہار چند" تھے۔ مگر ان "چہار چند" میں صرف "گیان چند" اور "گوپی چند" چمکے باقی دو "حکم چند" اور "امین چند" ماند پڑ گئے۔ اب صرف دو چند حیات ہیں۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے۔ تاکہ یہ اردو ادب کو مزید مالا مال کرتے رہیں۔

گیان چند صاحب میں ایک قدرے پوشیدہ لہر بھی ہے جو اوپر سے معلوم نہیں ہوتی۔ وہ متعصب ہرگز نہیں ہیں۔ یعنی مذہبی "پکش پات" ان میں نہیں مگر وہ چکبست و شرر کے معرکے میں چکبست کے طرفداروں میں رہتے ہیں۔ وہ اردو کے ہندو ادیبوں سے ضرور "سہان بھوت" یعنی ہمدردی رکھتے ہیں۔ مگر نالائق ادیبوں سے نہیں۔ بہت سے اردو کے ہندو ادیبوں کی طرح ان کے ذہن کے کبھی کسی گوشے میں شاید یہ بات پڑی ہے کہ عام اردو کے ادیب، ہندو ادیبوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہ بات نہ انھوں نے کہیں لکھی ہے اور نہ اپنی گفتگو میں کبھی لاتے ہیں۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوتا رہا ہے۔ دیا شنکر نسیم ہی شاید اس شاخسانے کی بنیاد ہیں۔ جن کے ساتھ واقعی شعرائے لکھنؤ نے اس وقت انصاف نہیں کیا۔ گیان چند صاحب، آنند نرائن ملا سے بھی بے حد متاثر ہیں۔ مگر ان کی شاعری کو وقیع نہیں سمجھتے۔ ورنہ کوئی مقالہ ضرور ان کی شعری قدر و قیمت آنکنے کے لئے لکھتے۔ وہ فراق صاحب کی شاعری کے زیادہ قائل نہیں ہیں۔ ایک بات اور جب ترقی پسندوں اور جدیدیوں میں سے انھیں کسی ایک کو منتخب کرنے کا موقع دیا جائے گا تو شاید وہ جدیدیوں کے طرفدار ہوں گے۔ مگر معقول اور پڑھے لکھے جدیدیوں کے۔

www.taemeernews.com

اور بستی نہیں یہ دلّی ہے!

اگست ۱۹۸۰ء تھا کہ مجھے دلّی یونیورسٹی نے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے دلّی یونیورسٹی جوائن کرنے کی دعوت دی۔ یہ میرے لئے ایک نیا دامن تھا۔ میں رخصت لے کر دلی یونیورسٹی پہنچ گیا۔ اس وقت صدر شعبہ قمر رئیس صاحب تھے۔ اور انھیں کی تحریک پر دلّی یونیورسٹی نے مجھے بلایا تھا۔ یہ بالکل ایک الگ دنیا تھی۔ دلّی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ایک بے حیثیت شعبہ پہلے تھا۔ مگر جب خواجہ احمد فاروقی دلّی کالج سے یہاں منتقل ہوئے تو انھوں نے شعبۂ اردو کو سنوارنا شروع کیا۔ وہ مولانا آزاد کی خدمت میں باریاب تھے انھیں دنوں مولانا وزیر تعلیم بھی تھے۔ خواجہ صاحب انھیں کی وساطت سے جواہر لال نہرو تک پہنچے۔ پھر شعبۂ اردو کو ایک پروفیسر کی جگہ ملی۔ اور جب خواجہ صاحب پروفیسر ہو گئے تو شعبۂ اردو میں انھوں نے ایک دارالترجمہ بھی کھلوا لیا اور اس کے لئے ایک الگ عمارت میں چند کمرے یونیورسٹی سے لے لئے جو آج بھی ہیں۔ اگرچہ اب اس میں برائے نام ہی کوئی کام ہوتا ہے۔ ایک کاتب اور ایک ریسرچ اسسٹنٹ اور ایک چپراسی کی جگہ بھی اس دارالترجمہ میں ملی۔ خواجہ احمد فاروقی جب تک شعبے کے سربراہ رہے یہاں خوب کام ہوتا رہا۔ دلّی یونیورسٹی کی میگزین کے بڑے شاندار نمبر نکلتے رہے۔ اردو کے کچھ تذکرے بھی چھپے جن میں تذکرۂ سرور اور ایک نایاب کتاب 'کربل کتھا' بھی یہیں سے شائع کی گئی۔ پھر رشید حسن خاں صاحب نے فسانۂ عجائب بھی یہیں مرتب کی (اگرچہ بعد کو اس کی اشاعت جھگڑے میں پڑ گئی) جب تک خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ رہے دلّی یونیورسٹی میں اردو کے شعبے کی خاصی حیثیت رہی۔ خواجہ صاحب انتظامی امور اور پروپیگنڈے میں بڑے ماہر آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ علم و ادب کی دنیا میں ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں بن

www.taemeernews.com

پائی مگر ان کو شہرت خوب ملی۔ انھوں نے کچھ تقرر ضرور ایسے کئے جنہوں نے بعد کو شعبے کو تقریباً ختم کر دیا۔ کیونکہ یہ تقرر لیاقت کی بنیادوں پر نہ تھے بلکہ محض خوشامد کی بنیادوں پر تھے۔ اور خواجہ صاحب کو خوشامد بہت پسند ہے۔

میں جب دلی یونیورسٹی پہنچا تو مجھے تاریخ ادب اردو اور اقبال پڑھانے کو ملے پھر مغیث الدین فریدی صاحب کے اچانک بیمار ہو جانے پر مجھے علم عروض کا کورس بھی پڑھانا پڑا۔ اندازہ ہوا کہ طلبا کورس میں تو بہت پیچھے ہیں مگر ان میں علم کی پیاس ہے اور ادب پر ان کی گرفت بھی ہے۔ اور اگر انھیں صحیح طریقے سے پڑھایا جائے تو ان کے ذوق کو انگیز کیا جا سکتا ہے۔ میں صبح دس بجے کا کلاس پڑھاتا تھا مگر تمام طلبا پہنچ جاتے تھے۔ جو دلی کی معروف اور بسوں میں سفر کرنے والی زندگی میں خاصہ مشکل کام ہے۔ میں نے اپنی تدریسی زندگی میں کبھی نوٹس سے نہیں پڑھایا۔ دلی یونیورسٹی میں بھی یہی عادت رہی کہ جو کچھ معلوم ہے لکچر کی شکل میں زبانی ہی پڑھاتا رہا ہوں۔ یہاں اندازہ ہوا کہ وہ طلبا جو جامع مسجد کے علاقے سے آتے تھے، کم از کم اردو کے معاملے میں خاصے ہوشیار ہوتے ہیں۔ ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ میں شمالی ہندوستان میں زبان اردو، برج، اودھی اور پراکرت نیز پڑی بولیوں کے سلسلوں کو بتا رہا تھا کہ ایک طالبہ اچانک کلاس میں کھڑی ہو گئی اور اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ اتنے نام، اتنے مقامات، زبانوں کی اتنی صورتیں سب زبانی کیسے یاد کئے ہیں؟ اگر آپ نوٹس لئے ہیں تو اسے چھپاتے کیوں ہیں؟ سامنے رکھ کر پڑھائیے۔ تو پھر کیا آپ نے رٹ لیا ہے؟ استاد کے لئے اور وہ بھی چلتے ہوئے کلاس میں یہ سوال خاصہ پریشان کن اور حواس منتشر کر دینے والا ہوا۔ مگر مجھے یہ موضوع پڑھاتے ہوئے بیس برس ہو گئے تھے اور میں ہر کلاس کے لئے ایک منجھا ہوا استاد ہوں۔ میں نے یہی بات رُک کر اس طالبہ سے کہی مزید یہ بھی کہ جب تم بھی میری طرح کہیں استاد ہو جاؤ گی اور اتنے دنوں تک پڑھا لو گی تو تمہیں بھی سب کچھ خود بخود زبانی یاد ہو جائے گا۔ دلی یونیورسٹی میں یہ بھی دستور ہے کہ اگر کوئی استاد چاہے تو کسی کے چلتے ہوئے کلاس میں وہ بھی جا کر بیٹھ سکتا ہے اور کبھی

www.taemeernews.com

کبھی استاد کلاسوں میں جاتے بھی ہیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ پڑھاتے والا استاد چوکنا بھی ہو جاتا ہے۔ اور پھر جتنا کچھ وہ جانتا ہے سب سامنے آتا ہے۔ میرے اقبال والے کلاس میں کبھی ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور کبھی ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحبان آجاتے۔ تنویر احمد علوی صاحب اپنے علم میں بے حد پختہ ہیں اور ان کی گرفت کلاسکی ادب پر بہت اچھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دلی یونیورسٹی میں کلاسکی ادب کا اتنا گیان کسی اور کو نہیں ہے۔ مگر وہ اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے بہت کم قائل ہیں۔ یعنی کہ لکھنے اور چھپوانے سے تقریباً گریز کرتے ہیں۔ اور چھپواتے بھی ہیں تو ایسے موضوعات پر جن کے پڑھنے اور سمجھنے والے ہی اب غائب ہوتے جاتے ہیں۔ ایک 'تاریخ محمودی' ایڈٹ کر رکھی ہے۔ اب اس کتاب کو کوئی کیا پڑھے گا؟ اسی طرح کے کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر دو کام انھوں نے اچھے کئے ہیں۔ ایک 'ذوق کا کلیات' شائع کر دیا ہے اور بڑی تحقیق اور تدقیق کے بعد۔ اور دوسری کتاب تحقیق کے مسائل پر ہے۔ مگر ان کے مزاج میں قلندرانہ پن بھی ہے جس کی وجہ سے پڑھنے لکھنے میں ترتیب نہیں ہوتی۔ کبھی تصوف سے دلچسپی ہوئی تو اسی کے ہو رہے کبھی 'بارہ ماسہ' پر کام کر رہے ہیں۔ کبھی خانقاہوں میں حاضریاں دے رہے ہیں۔ تو کبھی صوفیوں کے درمیان 'حال قال' کی منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ اور بات بات میں اپنے کانوں کی لویں چھوتے رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

یونیورسٹی سے میں اور تنویر احمد علوی اکثر ساتھ ساتھ واپس ہوتے۔ لال قلعے پر اتر کر ہم لوگ ایک ایک گلاس گنے کا رس پیتے۔ پھر وہ جامع مسجد کے علاقے میں چلے جاتے اور میں دوسری بس پکڑ کر اپنے جائے قیام اوکھلا واپس ہوتا۔ جب مغیث الدین فریدی صاحب اچھے ہو کر شعبے میں آگئے تو شعر و شاعری کی محفلیں بھی جمنے لگیں۔ فریدی صاحب کو فن تاریخ گوئی پر بڑی مہارت ہے اور انھوں نے چند بڑے مدے کی تاریخیں نکالی ہیں۔ آگرے کے کسی مشہور درزی کے مرنے کی تاریخ نکالی تو مصرعۂ تاریخ یہ تھا ع خلد میں سیتے ہیں کرتی ٹوپی۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب ستّر برس کی عمر میں حج بیت اللہ سے

www.taemeernews.com

مشرف ہو گئے۔ ان کی معیت میں ہالینڈ کی وہ عیسائی خاتون بھی تھیں جنہیں دلّی میں خواجہ صاحب کے شاگرد نیٹی (NITTY) باجی کہتے تھے۔ جب وہ حج سے واپس ہوئے تو ان کے شاگرد اور دلّی یونیورسٹی کے اساتذہ خواجہ صاحب کو لینے (Receive) اسٹیشن گئے۔ ٹرین سے پہلے نیٹی باجی اتریں اور خواجہ صاحب ان کے پیچھے۔ مغیث الدین فریدی صاحب نے یہ صورت دیکھی تو فوراً غالب کے مصرعے سے تاریخ نکالی۔ تاریخ تھی

؏ کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے۔

۱۹۸۲ء میں ایک وائی وا کے سلسلے میں مَیں دلّی یونیورسٹی گیا۔ شعبے میں فریدی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں وہیں میرا بیٹا ظہیر بابر مجھ سے ملنے آگیا جو اس وقت دلّی اسکول آف اکنامکس میں پڑھتا تھا۔ فریدی صاحب نے دیکھا کہ ایک باریش و پُروقت صاحبزادے مجھ سے گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں تو مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ میں نے بابر کا تعارف کرایا اور کہا کہ میں نے داڑھی نہیں رکھی تو میری طرف سے اس نے رکھ لی۔ وہ مثل ہے نا کہ ؏ اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند۔ یکایک فریدی صاحب اپنی جگہ سے اچھلے اور بولے۔ ارے یہ تو تاریخ کا مصرعہ ہو گیا اور پھر پورا شعر تاریخ میں یوں کہہ کر مجھے دے دیا۔ (یہ ۱۲ اگست ۱۹۸۲ء کا دن تھا)

؎ برائے سال یہ ضرب المثل گوارا ہے — اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

اس میں شاید "گوارا ہے" بھی شامل ہے۔

غرض کہ یہ تین مہینے دلّی میں بہت دلچسپی سے کٹے۔ اسی زمانے میں "اقبال صدی" کا جشن منایا گیا۔ (یہ ۱۹۷۷ء تھا) حکومت اور شعبۂ اردو دلّی یونیورسٹی کے اشتراک سے یہ جشن وگیان بھون کے آڈیٹوریم میں منایا گیا تھا۔ میں نے بھی ایک مقالہ "اقبال کے شاہین کا ایک اور مطالعہ" کے عنوان سے لکھا جو میری کتاب "سماجی تنقید اور تنقیدی عمل" میں شامل ہے۔ یہیں پہلی مرتبہ مشہور جرمن مستشرق انا ماری شمل کا اقبال پر مقالہ سنا۔ مقالہ کچھ یونہی سا تھا۔ 'نام بڑے اور درشن چھوٹے' کا مصداق۔ اس کے برخلاف ایک ایرانی

www.taemeernews.com

پروفیسر کا مقالہ بے حد پُرمغز اور اہم تھا۔ ان کا عراقی پروفیسر کا نام ذہن میں اس وقت نہیں رہا۔

دلی یونیورسٹی کی اس چند روزہ ملازمت کے سلسلے میں میرا قیام اپنے بزرگ دوست پروفیسر اظہر انصاری کے یہاں تھا۔ وہ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر انصاری مشہور نیشنلسٹ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھتیجے ہیں۔ ان کی بیگم صاحبہ اس وقت جامعہ کے گرلس ہوسٹل کی وارڈن تھیں۔ ہوسٹل کا نام جی۔ پی ہوسٹل تھا جسے میں "غریب پرور ہوسٹل" کہتا تھا۔ میں بھی یہیں اظہر صاحب کے ساتھ ایک کمرے میں مقیم تھا۔ اور مسافر بھی تھا۔ اس لیے اس کا "غریب پرور" نام بہت مناسب تھا۔ صبح اٹھ کر ملیا دکھلا نہر تک گھومنے جاتا کہ یہ میری عادت پرانی ہے۔ یہاں جامعہ کے دو ایک آدمی اور ٹہلتے جن میں ایک کرنل بشیر حسن زیدی مرحوم ہوا کرتے اور ایک حکیم میرن صاحب جو ڈاکٹر عابد حسین کے برادر نسبتی تھے۔ حکیم میرن صاحب بڑے خوش مذاق اور ادب دوست آدمی تھے۔ میری اُن سے الہ آباد ہی سے ملاقات تھی۔ ہاں زیدی صاحب سے میری ملاقات نہیں تھی۔ اگرچہ وہ جی۔ پی ہوسٹل سے بالکل ملحق مکان میں رہتے تھے۔ مگر میں "پاس یہ حجاب پاسِ وضع" میں گرفتار تھا۔ جامعہ کے قیام میں چند مزید اچھے لوگوں سے فیضِ صحبت مجھے حاصل تھا۔ اکثر شام کو ڈاکٹر عابد حسین کے یہاں چلا جاتا۔ وہاں صالحہ آپا (صالحہ عابد حسین) صغریٰ مہدی اور دوسرے لوگوں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ ڈاکٹر عابد حسین، الہ آباد کے میور سنٹرل کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ پھر یہاں ان کے دور کے لوگوں کی باتیں چھڑ جاتیں ڈاکٹر عابد حسین مسلم ہوسٹل الہ آباد یونیورسٹی میں بھی رہ چکے تھے۔ اس وقت کے اساتذہ ناصری صاحب، امیگھ ناتھ سا یا وغیرہ کا اکثر ذکر رہتا۔ پھر مسلم ہوسٹل کے مشاعروں کے تذکرے۔ صفی اور سائل دہلوی کا بھی ذکر آتا۔ غرض کہ جامعہ کے قیام میں یہ شامیں بڑی دلچسپ گزرتیں۔ کبھی ڈاکٹر عابد حسین اپنے ڈرامے "پردۂ غفلت" پر باتیں کرتے۔ جو اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے بی۔ اے کورس میں شامل تھا۔ یوں تو ڈاکٹر عابد حسین بہت ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے کہ پھنسے پھنسے ہکلاتے تھے۔ کبھی کسی کسی لفظ پر اٹک جاتے تو وہیں

www.taemeernews.com

اٹکے رہتے اور کہیں وہ لفظ آپ نے جلدی سے پورا کر دیا تو اس کا برا مانتے تھے۔ جو لوگ ان کی یہ مزاجی کیفیت جانتے تھے وہ کبھی اٹکے ہوئے لفظ کو پورا نہیں کرتے تھے بلکہ خاموش بیٹھے اس لفظ کی تکمیل کا انتظار کرتے رہتے۔ اور کسی نے پورا بھی کر دیا تو جب تک وہ خود اس لفظ کو پورا نہیں کر لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ایک صبح معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عابد حسین کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ میں سمجھا کہ صالحہ آپا کا یہ سانحہ ہوا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ عابد صاحب کی پہلی بیوی بھی انھیں کے پاس ایک دوسرے مکان میں رہتی تھیں۔ ان کا انتقال ہوا تھا جو حکیم میرن صاحب کی بہن تھیں۔ بعد کو انھیں کے انتقال سے متاثر ہو کر صالحہ آپا نے ایک ناول لکھا جس کا نام ہے "گوری سووے سیج پر"۔

صالحہ عابد حسین سے ملنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا وہ اپنے شب و روز یا تو امور خانہ داری میں صرف کرتیں یا علمی ادبی کاموں میں۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کے پاس بھی آ بیٹھتیں انھوں نے متعدد ناول لکھے۔ کچھ یقیناً قدر اوّل کے ناول ہیں۔ مگر ناول کے میدان میں صالحہ عابد حسین کو وہ شہرت نہ مل سکی جس کی وہ حقدار تھیں۔ شاید اس میں ان کی کم آمیزی کو بھی دخل ہے اور کچھ ان ناولوں کا گھریلو پن اور ایک محدود زندگی کی پیش کش۔ ورنہ قرۃ العین حیدر سے زیادہ کم آمیز کون ہوگا۔ مگر قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا کینوس بھی وسیع ہے۔ اور طرز پیش کش تو سب سے جدا ہے ہی۔ ایک شام میں اور ڈاکٹر اطہر انصاری ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ یکایک جھلملی کا دروازہ کھلا اور ایک چہرے نے اندر جھانک کر پوچھا کہ کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ مسز سیٹھ کا گھر کون سا ہے؟ اب غور کیا تو یہ قرۃ العین حیدر تھیں۔ اطہر صاحب نے کہا کہ آپ اندر آئیے۔ کب آئیں؟ مگر وہ بالکل اجنبی بنی رہیں اگرچہ الہ آباد میں اپنے بھائی جرار حیدر صاحب کے یہاں جب آتیں تو اطہر صاحب سے خاصی ملاقات رہتی تھی۔ قرۃ العین حیدر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اطہر صاحب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو قرۃ العین حیدر بغیر کچھ کہے سنے دروازہ بند کر کے روانہ ہو گئیں۔ ہمیں ان کا یہ رویہ بڑا عجیب سا لگا۔ ایک بار دلی گیا تو جامعہ بھی گوپی چند نارنگ صاحب سے ملنے چلا

www.taemeernews.com

گیا۔ پتہ چلا کہ قرۃ العین حیدر جامعہ ملیہ میں وزٹینگ پروفیسر ہو کر آئی ہیں۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ کچھ ابر و باد بھی تھا۔ نارنگ صاحب مجھے لیے ہوئے ریڈنگ روم میں چلے آئے۔ وہیں قرۃ العین بھی بیٹھی تھیں۔ گوپی چند نارنگ صاحب نے مجھے ملانا چاہا تو میں نے کہا کہ میری ملاقات الہ آباد میں جرار حیدر صاحب کے یہاں ہو چکی ہے۔ پھر میں نے ان سے جرار حیدر صاحب کی خیریت ان کے بغیر ان کے پوچھے ہوئے بتائی۔ کیونکہ میں الہ آباد سے دلی گیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے ہوں، ہاں کہہ کر میری باتیں بے توجہی سے سُنیں۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ پھر یکایک انھوں نے اپنا چہرہ ایک کھڑکی کی طرف کر لیا اور کتاب پڑھنے لگیں۔ مجھے ان کا یہ انداز اچھا معلوم نہ ہوا مگر میں کیا کہتا۔ گوپی چند صاحب بھی قدرے خفیف ہوئے اور پھر مجھے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں اٹھ آئے۔ گوپی چند صاحب نے قرۃ العین حیدر کو ناول پر کام کرنے والے طلبا کا مشیر مقرر کیا تھا۔ آخر وزٹینگ پروفیسر کو کچھ کام تو دینا ہی تھا۔ اس وقت انور جمال قدوائی، جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر تھے بعد کو قرۃ العین بمبئی واپس چلی گئیں۔

گوپی چند نارنگ صاحب بے حد فعال اور لگن کے آدمی ہیں۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو کالج کے مزاج سے نکال کر، اردو کی ادبی صورتوں میں ایک انٹرنیشنل پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ جب تک وہ جامعہ میں رہے سیمینار پر سیمینار کرتے رہے اور پاکستان نیز بیرونی ممالک کے ادیبوں کی جامعہ ایک طرح سے آماجگاہ بنا رہا۔ ایک وقت ان پر جامعہ میں بہت سخت گزرا جب ان کی ایک گفتگو جو انھوں نے جامعہ کے استادوں کے خلاف کی تھی، ٹیپ کر لی گئی اور پھر اس کا جم کر استحصال کیا گیا۔ مگر سخت مخالفت کے باوجود کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ اس واقعے کو مسعود حسین خاں نے جو اس وقت جامعہ کے وائس چانسلر تھے اپنی سوانح عمری میں "واقعۂ نارنگ" لکھا ہے۔ وائس چانسلر کے خلاف طلبا اور اساتذہ سب نے مظاہرے کئے کہ گوپی چند نارنگ صاحب کو سزا ملنی چاہئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ کہا ہے۔ یہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۰ء کا

www.taemeernews.com

واقعہ ہے۔ طلبا نے نارنگ کے خلاف وائس چانسلر کا گھر گھیر لیا۔ جی۔ پی ہوسٹل وائس چانسلر کے گھر سے قریب ہے۔ جس رات لڑکوں نے وائس چانسلر کا گھیراؤ کیا تو جامعہ کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ نارنگ صاحب کے خلاف طلبا اشعار میں بھی نعرے لگا رہے تھے۔

آج کل طلبا جب کسی کی پگڑی اچھالنے پر آ جائیں تو انھیں کون روک سکتا ہے۔ معاملہ پھر ہدایت اللہ صاحب تک گیا جو جامعہ کے اس وقت چانسلر (امیر جامعہ) تھے۔ پھر شاید عدالت تک۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے نارنگ صاحب اپنی جگہ پر قرار رہے۔ مگر مسعود حسین خاں نے جھنجھلا کر استعفیٰ دے دیا۔ اسی درمیان نارنگ صاحب نے کچھ اور سمینار جامعہ میں کرائے۔ افسانے پر سمینار، اقبال پر سمینار، انیس پر انٹرنیشنل سمینار جو دلّی کی کسی بھی یونیورسٹی سے ممکن نہ ہو سکا۔ جامعہ کے محدود وسائل میں اتنے بڑے سمینار کرانا آسان کام نہ تھا اور یہ نارنگ صاحب ہی کرا سکتے تھے۔

قیام دلی کے دوران اجمل اجملی مرحوم کے یہاں ادبی نشستیں ہوا کرتیں یہیں کئی دلچسپ شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جامعہ کے استاد یوسف پاپا تھے۔ یہ مزاحیہ نظمیں لکھتے ان کا ایک مجموعہ بھی چلم نامہ اسی وقت شائع ہوا تھا۔ جس میں خوشامدی اساتذہ پر بھی چوٹیں تھیں اور جدید طرز زندگی پر بھی۔ 'چلم نامہ' کی نظم اس طرح شروع ہوتی۔ "چلم بھرو کبھی چلم بھرو"۔ یوسف پاپا کو بھی صبح کے وقت ٹہلنے کی عادت تھی۔ ان سے اکثر صبح کے وقت مڈبھیڑ ہو جاتی۔ وہ دیکھنے میں اپنے حلیے سے بھی ایک مزاحیہ کردار نظر آتے تھے۔ چلم نامہ میں بعض قلمی چہرے بہت مزے دار ہیں۔ خصوصاً چاٹ کھاتی ہوئی لڑکیوں کو پاپا نے بڑی عمیق نظروں سے دیکھا ہے۔ اس طرح کہ شاید پاپا کا بھی جی کھٹا میٹھا ہونے لگتا تھا۔

اسی دوران ماہ رمضان المبارک آ گیا تو آئے دن دلّی یونیورسٹی کے اساتذہ کے

www.taemeernews.com

یہاں افطار پارٹیاں ہوا کرتیں۔ ظہیر احمد صدیقی اور عبدالحق صاحبان کے یہاں کی افطار پارٹیوں میں بڑا لطف رہتا تھا۔ ایک دن تنویر احمد علوی کے یہاں بھی تہہ در تہہ مکانات اور کارخانوں سے گزرتے ہوئے پہنچے تو لذت کام و دہن کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی مزہ ملا۔ محفل بھی جمی مگر اس کا بھگتان بھی انھیں بھگتنا پڑا کہ سب کے کھانے کا بھی انھوں نے انتظام کیا اور بڑی محبت سے ہم لوگوں کی ضیافت کی۔ وہ پیر تو نہیں ہیں مگر حضرت نظام الدین کا فیض ان تک بہت سے راستوں سے پہنچتا ہے۔ چنانچہ درگاہ شریف پر حاضری دیتے ہیں۔ اور علوی ہونے کے باعث اپنے حق اور حصۂ رسدی کے طالب بھی ہوتے ہیں۔ اب یہ کسی دوسرے کو کیا معلوم کہ کہاں کہاں وہ محروم رہتے ہیں اور کہاں متمتع ہوئے کہ بہرحال یہ ان کا خاندانی معاملہ ہے۔ تنویر علوی میرے جگری دوست ہیں۔ اس لئے میں ان سے ہر طرح کی بے تکلفی برت لیتا ہوں۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ میری اور ان کی دوستی ایک اختلاف سے شروع ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک ریڈر کی جگہ ہوئی تھی۔ اس میں دلی یونیورسٹی اور دلی کالج کے لوگ بھی امیدوار تھے۔ یہ عاصی بھی ایک امیدوار تھا۔ مگر تنویر احمد علوی وہاں ریڈر اور صدر شعبہ ہو گئے اور میں بے نیل مرام واپس آیا۔ اور میں ہی کیا ڈاکٹر خلیق انجم، شارب ردولوی، قمر رئیس اور لوگ بھی تھے۔ کل ملا کر پندرہ امیدوار تھے۔ سب کے سب تنویر احمد علوی کے مقابلے میں ناکامیاب رہے۔ جہاں تک یاد ہے یہ اگست ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ مگر اس کے بعد ہی علوی صاحب سے محبتوں کے رشتے استوار ہو گئے۔ اب جب بھی دلی جاتا ہوں علوی صاحب کو ٹیلیفون کر کے ایک شعر پڑھتا ہوں۔ اور اسی سے تنویر احمد علوی صاحب سمجھ جاتے ہیں کہ یہ خاکسار ہے۔ شعر یوں ہے ۔

اٹھارہ سال سے کرتے ہو شاعری علوی ــــــ یہ جانتے ہوئے پیشہ ہے یہ رذیلوں کا

یہ شعر اصلاً تو محمد علوی کا ہے جو ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ ہیں۔ مگر میں اسے تنویر احمد علوی کا ہی شعر کہتا ہوں۔

اسی زمانے میں دلی یونیورسٹی کے شریف احمد صاحب، عبدالحلیم شرر کے ناولوں پر

www.taemeernews.com

کام کر رہے تھے۔ اس وقت قمر رئیس صاحب صدر شعبہ نے یہ انتظام کیا تھا کہ ہر جمعرات کو اساتذہ یا ریسرچ اسکالروں سے ایک مقالہ پڑھواتے تھے۔ اس کے لئے ایک سمینار کا کمرہ مقرر کیا گیا تھا۔ کبھی مقالہ پڑھا جاتا اور کبھی کسی ادیب یا شاعر کے کلام کا جائزہ تقریروں میں لیا جاتا۔ میرے سامنے خواجہ احمد فاروقی صاحب، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مختلف موضوعات پر لکچر دیئے۔ قمر رئیس صاحب کے زمانۂ صدارت میں بہرحال شعبے میں بڑا اچھا ادبی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ایک سمینار بھی زبان اردو کی موجودہ صورت حال پر منعقد ہوا۔ اور اس میں مشاہیر اردو نے شرکت کی۔ اس ادبی چہل پہل سے متاثر ہو کر مغیث الدین فریدی صاحب نے ایک تاریخ بھی حافظ کے مصرعے (کچھ لوگ اس غزل کو الحاقی سمجھتے ہیں) سے نکالی۔ ع "ایں چہ شور یست کہ در دَور قمر می بینم" چونکہ صدارت کا یہ دَور قمر رئیس صاحب کا تھا اس لئے مصرعہ بہت مناسب تھا۔ بہرحال یہ وقت دلّی یونیورسٹی میں بڑی دلچسپی اور معلومات کا گزرا۔

۱۹۷۹ء میں پھر مجھے جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہو کر دلّی جانے کا موقع پروفیسر محمد حسن نے دیا۔ مگر اس بار میں جلد ہی لوٹ آیا اس لئے کہ الہ آباد سے گیان چند صاحب نے خط لکھ کر مجھے بلا لیا کہ وہ حیدر آباد منتقل ہو رہے تھے اور مجھے شعبۂ اردو کی سربراہی سنبھالنی تھی۔ جواہر لال یونیورسٹی میں بمشکل تمام ایک ماہ میں نے قیام کیا۔ جہاں ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی، نصیر احمد خاں، اسلم پرویز اور اشفاق محمد خاں صاحبان کی محبتیں مجھے حاصل تھیں۔ یہاں ایک دن ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ میں ٹھیک گیارہ بجے سنٹر پہنچ گیا۔ عموماً محمد حسن صاحب کے کلاس ایک بجے سے ہوتے تھے تو میں انھیں کے کمرے میں ادب کی سماجیات (Sociology of Literature) کا کلاس پڑھا لیا کرتا تھا۔ میں گیارہ بجے پہنچا تو محمد حسن صاحب کی میز پر ایک پرچہ لکھا ہوا رکھا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید محمد حسن صاحب میرے لئے کوئی ہدایت چھوڑ گئے ہیں۔ یہ پرچہ پڑھا تو میں بہت دیر تک ہنستا رہا۔ یہ پرچہ ڈاکٹر محمد حسنین عظیم آبادی کا لکھا ہوا تھا۔ عبارت یہ تھی کہ آپ کے کمرے

www.taemeernews.com

میں آیا تو دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ آپ نے اپنے کمرے میں سب شیعہ شاعروں کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔ کمرے میں میرؔ، سوداؔ اور انیسؔ کے اسکیچ کسی طالب علم نے غالباً بنا کر محمد حسن صاحب کو دیئے تھے۔ انھوں نے وہی اسکیچ اپنے کمرے میں لگا دیئے۔ محمد حسن صاحب جب آئے تو وہ بھی اس عبارت سے بہت محظوظ ہوئے۔ اب یہ کیسی عصبیت ہے کہہ نہیں سکتا اردو ادب بھی شیعوں اور سنیوں میں بٹ گیا ہے۔ معلوم نہیں جب حسنین صاحب مگدھ یونیورسٹی کے سربراہ ہوئے تو انھوں نے وجہی، سوداؔ، میرؔ، انیسؔ، امیر حسن، دبیرؔ، آتشؔ و ناسخؔ، محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی، رسوا، سردار جعفری، احتشام حسین، امداد امام اثر، یگانہ چنگیزی، میر امن، جمیل مظہری اور معلوم نہیں کتنوں کو کورس میں رکھا تھا یا انھیں کورس سے خارج کر دیا کہ یہ سب شیعہ تھے۔ بہرحال یہ باتیں محض لطف لینے کے لئے ہیں۔ ان پر سنجیدگی سے غور کرنا یا عمل کرنا نہایت غیر ادبی بات ہے۔ یا تو حسنین صاحب محمد حسن صاحب کے مزاج سے واقف نہ تھے یا پھر کوئی اور بات رہی ہوگی۔ شاید وہ اس وقت پروفیسری کے امیدوار تھے اور محمد حسن صاحب اکسپرٹ۔

دلی شہر کسی کی پروا نہیں کرتا۔ چشم مروت نام کی چیز شاید ہی یہاں ملے۔ شاید تمام بڑے شہروں کا یہی المیہ ہوگا، سرد اور بے رحم۔ جو کچھ مروت محلّوں میں ہے وہ بھی بس منہ دیکھے کی۔ پھر جب بسوں میں ہر روز اٹھارہ بیس میل کا سفر ہو تو یہ مروت بھی محض کاروباری سمجھیے۔ اگر آپ نے کسی کی مروّت کی اور اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور جانے والے کو جگہ دے دی تو اب پندرہ بیس کلو میٹر تک آپ کو کھڑے ہو کر دھکے کھاتے ہوئے سفر کرنا پڑے گا اور اگر آپ کار پر سفر کر رہے ہیں اور کسی اجنبی مسافر کو از راہ ہمدردی آپ نے لفٹ دے دی تو آگے بڑھ کر وہ آپ کو لوٹ سکتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آس پاس سے دلی شہر میں لوگوں نے لفٹ دینا بند کر دیا ہے۔ اس طرح کی باتیں ہونے لگی تھیں کہ راستے میں جوان عورتیں اور لڑکیاں بسوں کے اڈوں پر کھڑی رہتیں اور آپ سے لفٹ مانگتیں اور جب آپ انھیں لفٹ دے دیتے تو پھر راستے میں وہ آپ کی حیثیت

www.taemeernews.com

دیکھ کر آپ سے یرغمال (RANSOM) طلب کرتیں۔ اور آپ نے اگر مطلوبہ رقم دے دی تو فبہا ورنہ شور مچا کر آپ کو بدنام بھی کیا اور پولیس کے حوالے بھی کر دیا۔ بس ایسی واردات کو دیکھ کر لوگوں نے لفٹ دینا بند کر دیا۔ یہ بھی ہوا کہ آپ کھڑے ہیں اور کوئی کار آپ کے پاس رات کو دیر سے آکر رکی اور پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے۔ اگر آپ لالچ میں آ گئے اور کہا کہ ادھر جانا ہے تو صاحب، کار نے فوراً کہا کہ آئیے ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ آپ کو اتار دیں گے۔ آپ سوار ہوئے تھوڑی دور جا کر کسی سنسان جگہ پر کار والوں نے آپ کا سب کچھ چھین کر آپ کو کار سے نیچے ڈھکیل دیا۔ اب اگر آپ بچ گئے تو آپ کی قسمت اور اگر راہی ملک بقا ہوئے تو انا للہ۔ اس طرح کا ایک واقعہ مشہور ادیب اور ریڈیو کے آرٹسٹ رفعت سروش کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ جسے انھوں نے اپنی سوانح عمری میں تحریر بھی کیا ہے۔ کیا عجیب ہے کہ یہ بے مروتی دلی کی زندگی میں یہاں روز کے ایڈونچر اور لطیفے بھی داخل ہوئی ہو۔ تبھی غالب نے شاید عاجز آکر وہ شعر بھی کہا ہوگا کہ

پڑئیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار　　اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اگرچہ یہ خواہش دوسرے موقعے کی ہے مگر یہ اسی تشنگی ہوئی صورت انداز بے رحمی کی داستان سے ہو کر ہی تو آتی ہے۔ تنہائی کی تلاش بھی تو حالات کی ناساعدت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب انسانوں سے آدمیت غائب ہو جائے اور دستگیری حماقت خیال کی جانے لگے تو پھر سوسائٹی سے کیا امید کی جا سکتی ہے۔ اس موقعے پر بہت سے واقعے یاد آرہے ہیں مگر ایک واقعہ جو مجھ پر گزرا وہ پیش ہے۔

اپنے دلی یونیورسٹی کے قیام کے دوران ایک دن یونیورسٹی سے واپس ہو رہا تھا آئی۔ ٹی۔ او کے بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا دوسری بس کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک کہیں سے بس آکر رکی۔ ایک خاتون ہاتھوں میں کتابیں لئے ہوئے بس پر چڑھنے کے لئے بڑھیں۔ ابھی انھوں نے بس کے ہینڈل کو تھاما ہی تھا کہ بس چل پڑی۔ بے چاری خاتون بدن کا توازن قائم نہ رکھ سکیں اور دھڑام سے نیچے آرہیں۔ ان کے سر سے خون بہنے لگا

www.taemeernews.com

کتابیں سب بکھر گئیں۔ آئی۔ ٹی۔ او کے بس اسٹینڈ پر کم از کم دو سو آدمی کھڑے اپنی اپنی بسوں کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ میں چونکہ ایک چھوٹے سے شہر سے گیا ہوا تھا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں دوڑ کر گیا اور خاتون کو سہارا دے کر اٹھایا، ان کی کتابیں اٹھائیں۔ ان سے پوچھا آپ کہاں جائیں گی۔ انھوں نے کالکاجی کہا اور بے ہوش سی ہونے لگیں۔ میں نے انھیں ایک اسکوٹر روک کر اس پر کسی طرح سوار کیا۔ اتنے میں خاتون بے ہوش ہو گئیں۔ اب کیا کروں۔ خیر میں بھی اسکوٹر پر سوار ہوا اور انھیں کے ساتھ کالکاجی روانہ ہوا۔ مگر کالکاجی میں کہاں جاؤں؟ میں کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا تو اس میں ایک کتاب پر گھر کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھا تھا۔ کالکاجی پہنچ کر ایک جگہ سے ٹیلیفون اسی نمبر پر کیا اور واقعہ بتایا۔ ادھر اسکوٹر ڈرائیور جلدی کر رہا تھا۔ خاتون جس حالت میں تھیں، میں اکیلا انھیں اتار بھی نہیں سکتا تھا۔ خون ان کے سر سے برابر جاری تھا۔ یہ بھی خطرہ کہ کہیں خون بہنے سے موت واقع نہ ہو جائے۔ غرض کہ اسی کشمکش میں تھا کہ دو سکھ نوجوان اور ایک معمر خاتون گھبرائے ہوئے اس جگہ پر وارد ہوئے جہاں سے میں نے فون کیا تھا۔ کسی طرح خاتون اسکوٹر سے اتاری گئیں مگر وہ لوگ اب تمام واقعات سن کر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک صاحب تو بڑے غصے میں آکر بولے کہ آپ ابھی جا نہیں سکتے۔ ہمارے گھر چلئے۔ پولیس کو اپنا بیان لکھوائیے۔ میری مشکل یہ کہ خاتون بدستور بے ہوش تھیں۔ اب اصل واقعہ بتائے گا کون؟ اگر اسی عالم میں خاتون دوسری دنیا میں پہنچ گئیں تو رپورٹ آنے تک تو بہرحال میں پولیس کی حراست میں رہوں گا۔ بادرِ جۂ مجبوری اسکوٹر والے کو کرایہ دے کر میں ان لوگوں کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ فوراً ایک ڈاکٹر بلایا گیا۔ کچھ انجکشن وغیرہ لگانے کے بعد خاتون کو ہوش آگیا تو میری جان میں جان آئی۔ پھر خاتون نے وہی واقعہ بیان کیا۔ اتنے میں پولیس بھی آگئی۔ پولیس نے میرا اور خاتون، دونوں کا بیان لیا اور پھر میری گلو خلاصی اس شرط پر ہوئی کہ جب پولیس کو ضرورت

www.taemeernews.com

ہو گی تو مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ (اگرچہ اس کی نوبت نہیں آئی، کیسا دلچسپ فلمی واقعہ ہے) یہ پانچ بجے شام کا واقعہ تھا اور اب رات کے نو بج رہے تھے۔ خیر کسی طرح نجات حاصل کر کے میں ادھ کھلا پہنچا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ بس اسٹینڈ کا مجمع کیوں بے رحم بنا کھڑا رہا تھا۔ اگر کہیں وہ خاتون عالم جاودانی کو چلی گئی ہوتیں تو پھر میری کیا درگت، خاتون کے گھر والے اور پولیس بناتی۔ اسے صرف سوچا ہی جا سکتا ہے۔

دلّی کی بسوں میں سفر کرنے کے دوسرے بھی مزے ہیں (بمبئی اور کراچی میں بھی ہوتے ہوں گے) اگر کسی کے پاس اپنی موٹر کار ہے تو بات الگ ہے ورنہ بسوں میں سفر کرنا تقریباً ہر آدمی کی مجبوری ہے۔ وہ جو بسوں کا نقشہ غلام علی بلبل کاشمیری نے کراچی کی بسوں کا کھینچا ہے کہ لوگ مرغی کے جھابے اور بکری کے بچے بھی بسوں کے اندر لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اگر مرغیاں جھابوں سے آزاد ہو گئیں تو بس میں سفر کرنے والے کس عالم میں ہوتے ہیں۔ یہ نقشے تو دلّی کی بسوں میں نظر نہیں آئے۔ مگر ڈاکٹر محمد حسن نے جو بات لکھی ہے وہ ضرور صحیح ہے کہ بسوں میں وہ درگت بن جاتی ہے کہ اگر کوئی مجرم بھاگ کر بس میں گھس جائے اور پھر پولیس بھی اس کا پیچھا کر رہی ہو تو جب مجرم بس سے اترے گا تو اس کا حلیہ اتنا بدل جائے گا کہ پولیس پھر اسے جلدی سے پہچان نہیں سکے گی۔ مگر یہ بھی ہے کہ جو لوگ بسوں میں سفر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں انھیں اسی میں مزہ آنے لگتا ہے۔ جیسے کوچۂ رحمان کے رہنے والوں کو پرانی دلّی میں مزہ آنے لگتا ہے۔ انھیں اگر کناٹ پلیس یا دھولا کنواں کے علاقے میں بسا دیجئے تو وہ دو تین دن بعد فوراً بھاگ آئیں گے۔ احمد علی کی "ہماری گلی" کی دلچسپیاں کناٹ پلیس میں کہاں؟ نہ مرزا کی دکان، نہ کلّو کو چھیڑنے والے لمڈے۔ یہی صورت بسوں میں سفر کرنے والوں کی بھی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو تیور بدل کر بس دور کا سفر کرتے ہیں وہ بھی اور جو چھوٹے فاصلوں کا سفر اختیار کرتے ہیں سب کو بھیڑ کے لمحات (PEAK HOURS) میں سفر کرنے کا نشہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ بسوں میں کھڑے مجمع کی ٹانگوں کے بیچ سے اس طرح گزر جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

جیسے صابون میں سے تار کبھی گزرتا تھا۔ مجمع ملا جُلا ہوتا ہے۔ یعنی مرد عورت، کالج کی لڑکیاں اسکول کے بچے، چھوٹے اور پسینے لئے ہوئے۔ کچھ اس بھیڑ میں پریشان ہوتے ہیں اور پس جاتے ہیں۔ اور کچھ کو اسی رگڑ جھگڑ میں لطف اور مزے کے لمحات بھی نصیب ہوتے ہیں۔ ایک بار میں جب جواہر لال یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا اور آشرم سے نور وجی نگر جا رہا تھا تو لاجپت نگر کے قریب ایک لڑکی زور سے چلائی اور پلٹ کر اس نے اپنے پیچھے کے ایک ادھیڑ عمر کے مسافر کو زناٹے دار طمانچہ رسید کیا۔ مسافر اور لڑکی میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ شاید ادھیڑ عمر کا مسافر بلا وجہ بیچ میں آکر تیل مالش ہو گیا۔ اصل مزہ لینے والا تو ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر لاجپت نگر کے بس اسٹاپ پر اتر بھی چکا تھا۔ یہ سب مناظر بھی دلی کی بسوں میں دیکھنے کو آتے ہیں۔ یقیناً کچھ خاموشی سے بھی طے ہو جاتے ہوں۔ ایجاب و قبول کی صورت میں بھی اور رسوائی کے خوف سے بھی جن کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بہر حال بسوں میں بھی کچھ لوگ جی۔ بی۔ روڈ والے موڈ اور مزے بھی تلاش کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں۔ بقا نے تو جھنجھلا کر میر کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا تھا۔

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر   اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

مگر آج ہر سنجیدہ اور عزت دار آدمی اور خصوصاً بسوں میں سفر کرنے والے مرد معقول کو یہ شعر سنایا جا سکتا ہے۔ یہ شعر آج بھی ہر موقعے پر دلّی میں اپنی مناسبت elevance رکھتا ہے۔ آپ کی جیب کٹے، ٹیکسی والا آپ کو دھوکا دے، اسپتال میں آپ کو امید سے زیادہ بڑھا ہوا BILL ملے۔ خدا نخواستہ آپ بس سے گر کر سڑک پر پڑے ہوں اور کوئی پرسان حال نہ ہو۔ یا کوئی ایک لڑکا اڑا، ایک میم کا بٹوہ لے کر والا سین ہو۔ ہر جگہ بقا کے اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ اور سن لیجئے۔ میری عادت ہے کہ اسٹیشن گاڑی چھوٹنے سے تقریباً ایک گھنٹے قبل پہنچ جاتا ہوں۔ اس کا مجھے بے حد فائدہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ الہ آباد آ رہا تھا۔ حسب عادت اسٹیشن پہنچ گیا۔ اب جس ڈبے میں میرا رزرویشن تھا اس نمبر کا ڈبہ پوری ٹرین میں ڈھونڈ ڈالا۔ مگر وہ

www.taemeernews.com

ڈبہ کہیں نہ ملا۔ خیر جب پانچ منٹ رہ گئے تو اس ڈبے میں ساتھ چلنے والے ٹی۔ ٹی صاحب بھی آگئے اور آکر وہ بھی ڈبہ ڈھونڈنے لگے۔ ایک ہجوم ان کے ساتھ ڈبہ ڈھونڈنے لگا۔ آخر ایک قلی نے بتایا کہ وہ ڈبہ غلطی سے یارڈ میں چھوٹ گیا تھا اب آخر میں لگ رہا ہے جلدی جائیے۔ ہم لوگ تو پہنچ گئے اور کسی طرح سوار ہوئے کہ گاڑی چل دی۔ بہت سے مسافر جو بروقت پہنچنے کے عادی ہیں چھوٹ گئے۔ اس لئے کہ انھیں ڈبہ ہی نہ ملا۔ دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ ٹی۔ ٹی صاحب اس صورت حال پر خوش ہو ہو کر کہہ رہے تھے۔ "ارے صاحب یہ دلّی ہے یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" بات یہاں بھی وہی ہے جو بقّا نے کہی تھی۔

ادبی دنیا میں کوئی خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے، جب تک دلّی سے اس کا سلسلہ نہ ہو اسے شہرت مشکل ہی سے ملے گی۔ بہت سے شاعر اور ناقدین اس لئے بھی مشہور ہو جاتے ہیں کہ وہ دلّی میں رہتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری اور ان کی تنقید بس الّا ماشاءاللہ ہے۔ دلّی میں رہنے والوں کو سیاست اور ادب سب میں جلد عروج ملتا ہے۔ ریلوے کے گارڈ، ڈاک خانے میں ٹھپّے لگانے والے، کباڑی کا کام کرنے والے، اور ہوٹل میں پلاؤ زردہ پکانے والے، معلوم نہیں کیسے کیسے لوگ بلند منصب حاصل کر لیتے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ دلّی کے روڑے بن جائیں۔ بات یہ ہے کہ دلّی میں ہر طرح کے موقعے میسّر ہیں۔ سانٹھ گانٹھ کے مواقع بھی اور عشق و معاشقوں کے بھی۔ پھر ایک کام اور یہاں بہت مقبول اور منافع بخش ہے۔ وہ ہے "آبے لڑکے جابے لڑکے" والا کام۔ اور یہ کام علی الخصوص تعلیمی اداروں میں بہت کام آتا ہے۔ اور یہ دھندا اضافیت کے اصول کے تحت بھی چلتا رہتا ہے۔ جب کوئی "آبے لڑکے جابے لڑکے" والا لڑکا خود صاحب منصب بن جاتا ہے تو وہ بھی اسی طرح کے غرض مندوں کو ڈھونڈھتا ہے اور انھیں اپنا "آبے لڑکے جابے لڑکے" بناتا ہے وقس علیٰ ھٰذا۔ جو ادبی وفود باہر سے آتے ہیں عموماً وہ بھی دلّی ہی تک آتے ہیں اور

www.taemeernews.com

مغربی ممالک میں تو اُردو دُنیا صرف دلّی کے اُردو والوں ہی کو اُردو کا ادیب سمجھتی ہے کچھ ایسے بھی بھولے بھالے ہیں جو دلّی میں اردو ادب کی کشتی کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مَن دَکیہا نَجی! ۔ اگر آپ خدانخواستہ دلی والے نہ ہوں تو کم از کم اُن سے تمسک ہی حاصل کر لیجئے۔ منہ تو یقیناً آپ کا بھی چکنا ہو ہی جائے گا۔ واہ میاں بقا اللہ خاں! تم دلّی کی کیسی نبض پہچانتے تھے!! اور کیا شعر کہہ گئے ہو!

www.taemeernews.com

ایک بے لطف رسم کہانی

مارچ ۱۹۷۹ء کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں اس وقت جواہر لال یونیورسٹی دلّی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا کہ گیان چند صاحب کا تار ملا کہ جلد ہی آئیے میں عازم حیدر آباد ہوں۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ حیدر آباد یونیورسٹی سے ان کی بات چیت چل رہی ہے کہ وہ حیدر آباد صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے آجائیں۔ مگر یکایک ایسی صورت آگئی کہ ۳۱ مارچ تک بہرحال انھیں وہاں پہنچ کر جوائن کر لینا چاہئے۔ ورنہ جگہ ضغطے میں آجائے گی۔ چنانچہ میں ۲۵ مارچ کو الہ آباد واپس آگیا۔ اور پروفیسر گیان چند کو ہم لوگوں نے الوداعی پارٹی دے کر رخصت کیا۔ شعبۂ اردو کی تاریخ میں یہ پہلی الوداعی پارٹی تھی جو کسی صدر شعبۂ اردو کو دی گئی۔ روائتیں جیسی بنائیے ویسی ہی بنتی ہیں۔ پروفیسر ضامن علی سے پہلے یہاں شیخ مہدی حسن ناصری، صدر شعبہ تھے۔ وہ الہ آباد سے ریٹائر تو نہیں ہوئے غالباً ان کا تبادلہ کہیں کا ہو گیا تھا۔ وہ میور سنٹرل کالج میں سرکاری ملازمت پر تھے، یہاں تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ ضامن علی صاحب اور ناصری صاحب میں ایک طرح کی چشمک رہا کرتی تھی۔ چنانچہ ناصری صاحب مرحوم کو الوداعی پارٹی نہیں دی گئی۔ جیسا کہ اعجاز صاحب نے مجھ سے بتایا جب ۱۹۵۴ء میں ضامن علی صاحب مستعفی ہوئے تو وہی روایت ان کے ساتھ بھی دہرائی گئی۔ اگرچہ اس وقت شعبے میں سبھی ان کے شاگرد تھے۔ جب مئی ۱۹۶۱ء میں اعجاز صاحب ریٹائر ہوئے تو ان کو بھی کوئی الوداعی پارٹی نہیں دی گئی۔ اگرچہ اس وقت بھی تقریباً سارے اساتذہ ان کے شاگرد تھے۔ احتشام صاحب اس منزل تک پہنچے ہی نہیں۔ ان کا انتقال ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی ہو گیا۔ اس طرح شعبۂ اردو میں ایک معاندانہ ماحول صدر اور اساتذہ کے

www.taemeernews.com

درمیان پیدا ہو جاتا تھا اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ آخر میں صدر کو بھگتنا پڑتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ "بادشاہ مرچکا اور بادشاہ سلامت رہے" کی روایت جس ہم آہنگی سے ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے شعبہائے اردو اور مسلم اداروں میں دہرائی جاتی ہے شاید ہی کہیں ہو۔ اس کی ایک بے حد روشن مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ جہاں وائس چانسلر بڑے شان و شکوہ سے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں لیکن ریٹائرمنٹ سے ایک سال پہلے ہی ان پر مصیبتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور پھر وہ تقریباً چوروں کی طرح خاموشی سے ریٹائرمنٹ سے دو ایک دن پہلے ہی یونیورسٹی سے چلے جاتے ہیں۔ دو ایک وائس چانسلر تو اس طرح گئے کہ اگر وہ چوک گئے ہوتے تو ان کو قتل بھی کر دیا جاتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلروں کے لئے یہ کہاوت مشہور ہے کہ "آتے بڑی شان سے ہیں، جاتے پریشان سے ہیں"۔ یہی صورت تمام شعبہائے اردو کے صدور کی بھی ہے جن میں الہ آباد یونیورسٹی شاید سب سے آگے ہے۔ ویسے بھی سازشیں اور بے مہری مسلمانوں کی تاریخ میں روز اول ہی سے داخل ہو گئیں تھیں۔ جس کا خمیازہ مسلمانوں کی بڑی بڑی حکومتوں کو بھی بھگتنا پڑا۔ اسپین، ترکی، ہندوستان ہر جگہ ان کی یہی تاریخ رہی ہے۔ ابو عبداللہ (اسپین)، نجاس بادشاہ (ترکی)، میر جعفر (بنگال)، میر صادق (میسور) حکیم احسن اللہ اور الٰہی بخش (دلی ۱۸۵۷ء)، نواب علی نقی خاں (لکھنؤ) یہ چند بلند سازشی چوٹیاں ہیں۔ ان بڑی مثالوں کے آگے بھلا شعبہائے اردو کس شمار قطار میں ہیں۔ مگر سوچئے تو کہ ایک طرف تو اردو کا زوال ہو رہا ہے تو دوسری طرف اردو کے شعبے خانہ جنگیوں میں گرفتار ہیں۔ اگرچہ عام قاری کو ان خانہ جنگیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے مگر تاریخ اور روائتیں اپنا کام کس طرح کرتی رہتی ہیں اس کا اندازہ کرانے کے لئے یہ باتیں برسبیل تذکرہ بیان کی گئیں۔

یونیورسٹی کی کارکردگی میں یہ بات ہر جگہ عملی طور پر مانی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے جس شعبے کو برباد کرنا ہو اس میں پروفیسر کے تقرر کو لیت و لعل میں ڈال دو، شعبہ خود

www.taemeernews.com

خود بخود بربادی کی طرف چل پڑے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ جو بھی سینیئر استاد ہے وہ صدر شعبہ کے فرائض انجام دینے لگتا ہے۔ اب اگر وہ ریڈر ہے تو پروفیسر ہونے کے لئے اسے بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ انتظامیہ میں بھی سب کو راضی رکھنا ہوتا ہے۔ اور شعبے کے اساتذہ سے بھی اسے بنائے رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں پروفیسر ہونے والے استاد کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انتظامیہ الٹے سیدھے آڈر دیتی رہتی ہے۔ جب چاہتی ہے صدر کے بغیر کوئی فیصلہ شعبے کے لئے کر دیتی ہے۔ اور پھر الٹا صدر پر الزام بھی دھرتی ہے۔ وائس چانسلر، الگ امیدوار پروفیسر پر چانپ چڑھاتا ہے۔ اسے وقت بے وقت دوڑاتا رہتا ہے۔ ہر جھگڑے کا کام اسی کے سپرد ہوتا ہے۔ اُدھر شعبے کے اساتذہ طلبا کو صدر کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں تاکہ موجودہ قائم مقام صدر مستقل نہ ہونے پائے اور جب قائم مقام صدر اس طرح کی کشمکش میں ہوتا ہے تو شعبے کے اساتذہ اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کلاس نہیں لیتے تو قائم مقام صدر ان سے باز پرس تک نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف وہی کلاس نہ لینے والے اساتذہ انتظامیہ کے لوگوں سے مل کر یہ مشہور کرتے ہیں کہ موجودہ صدر کا شعبے میں کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کلاس تک نہیں ہوتے۔ غرض کہ صدر کی جان ضیق میں ہوتی ہے۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

ایک استاد کا کلاس پہلے گھنٹے میں ذرا سویرے لگتا تھا۔ استاد کو اتنی جلدی آنے میں زحمت ہوتی تھی۔ ایک دن اس نے طلبا سے کہا کہ بھئی مجھے تو اس لئے آنا پڑتا ہے کہ میں ملازم ہوں۔ آخر تمہیں کیا مار پڑی ہے جو اتنے سویرے کلاس کرنے آجاتے ہو۔ اس میں ذرپردہ اشارہ یہ تھا کہ اگر طلبا نہ آئیں گے تو کلاس ہی نہ ہوگا۔ اور اس طرح استاد کلاس پڑھانے کی زحمت سے بچ جائے گا۔ اگر صدر اچھا استاد ہے تو شعبے کے اساتذہ طلبا کو ترغیب دیتے ہیں کہ کلاس ہی میں نہ آئیں اور جب طلبا نہ آئیں گے تو اچھے استاد کے پڑھانے کے جوہر کا کیا اندازہ ہوگا۔ اور نہ استاد کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح جرائم اور جرائم پیشہ لوگوں پر کتابیں مرتب کی گئیں ہیں، اسی طرح اگر کوئی بات

www.taemeernews.com

یونیورسٹی کے ایسے اساتذہ ان کی نفسیات اور ان کی مجرمانہ کارگزدگیوں پر کوئی کتاب مرتب کر سکے تو اساتذہ میں معلوم نہیں کتنے سلطانہ، مان سنگھ، پھولن دیویاں اور نٹور لال جیسے لوگ ملیں گے۔ ایسے ایسے دھوکے باز اور ادبی گرہ کٹ" کہ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے یہ اساتذہ دراصل ایسے ہی راستوں سے یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں۔ زندگی بھر تکڑم بازیاں کرتے رہتے ہیں اور تعلیم و تعلم سے انھیں دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو یونیورسٹیوں میں آنے سے پہلے کہیں ریلوے یا کسی دفتر میں کلرک تھے یا محکمۂ مال میں چنگی وصول کرتے تھے۔ محرر مال یا پرائمری اسکول میں نائب مدرس چنانچہ خوشامد برآمد کر کے جب وہ یونیورسٹی میں استاد ہو جاتے ہیں تو پھر ان پر "صاحب" بننے کا خبط سوار ہوتا ہے۔ پھر ان کا اترانا دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ کبھی چھوٹے بچے، قصے اپنے علم اور ادبی ذوق سے متعلق کبھی اپنی ملازمت کے زمانے میں اپنے رعب داب کے قصے کبھی بڑے آدمیوں سے اپنے خلا ملا کے واقعات کبھی دوسری یونیورسٹیوں کے مشہور اساتذہ کی کمزوریاں اور ان کے اسکینڈل Scandals/ وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ تاکہ سننے والوں پر رعب پڑے کہ یہ بڑے رسا اور جالوگ ہیں اور ان کی بڑی پہنچ ہے۔ اکثر سننے والے ان کی ایسی لن ترانیوں سے متاثر بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ حضرات، یہ تمام باتیں ایسی محفلوں اور ایسے لوگوں کے درمیان بیان کرتے ہیں جو یونیورسٹی کے معاملات ہی نہیں جانتے۔ آج کل ایسے اساتذہ تقریباً ہر یونیورسٹی میں ملیں گے۔

غرض کہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک الہ آباد یونیورسٹی میرے لئے جہنم کدہ بن گئی میری پروفیسری کے تقرر میں میرا جدیدیوں سے جھگڑا بھی اہم رول ادا کرتا رہا۔ میری پہلی سلیکشن کمیٹی مئی ۱۹۸۲ء میں ہوئی جس میں مجھے نالائق قرار دیا گیا۔ ماہرین میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور میرے ایک شناسا شکیل الرحمان تھے۔ شکیل الرحمان کے ریڈر بننے میں راقم الحروف نے بھی ان کی مدد کی تھی۔ احتشام حسین ان کے انتخاب میں ماہرین میں سے ایک تھے۔ شکیل الرحمان اس زمانے میں اس کام کے لئے برابر خط لکھا کرتے

www.taemeernews.com

تھے۔ مگر خیر' حسابِ دوستاں در دل! فاروقی صاحب نے ساختیات اور سرریلزم پر سوالات کئے! مجھ سے جتنا ممکن تھا میں نے جوابات دیئے کہ اس زمانے میں تنقید میں یہ موضوعات ہر وقت زیرِ بحث رہتے تھے اور میرے بھی زیرِ مطالعہ تھے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سوال تو کر رہے ہیں جوابات ان کے لئے بیکار ہیں۔ مگر دوسرے تو یقیناً واقف تھے۔ آخر میں خواجہ صاحب نے کہا کہ اچھا بتائیے۔ دیوبند مدرسے کا کورس کیا ہے؟ ذرا سوچئے کہ دیوبند مدرسے سے پروفیسری کے انٹرویو کا کیا واسطہ؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت نہ میں نے دیوبند میں پڑھا ہے۔ نہ پڑھایا ہے۔ پھر وہ ایک مذہبی اور دینی تعلیم کا مدرسہ ہے۔ آخر میں دیوبند مدرسے کا کورس کیوں جانوں؟ اس پر خواجہ صاحب برافروختہ ہو گئے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ خورشید الاسلام صاحب ان دنوں اردو والوں کے خدا بنے ہوئے تھے۔ ان کا وہ جاہ و جلال تھا کہ اردو کے ہر استاد اور طالب علم کو وہ ڈھول اور گرد سے بھی کمتر جانتے تھے۔ انھوں نے ایک فارسی شعر کا مطلب پوچھا ؎

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمارِ ما
چہ قیامتے کہ نہ می رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما

میں نے عرض کیا کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ شعر بیدل کا ہے مگر حافظ کے نام سے مشہور ہے۔ مگر حافظ کے مستند دیوان مرتبہ ڈکٹر قاسم غنی یا کسی مستند دیوان میں موجود نہیں۔ بلکہ اس بحر میں کوئی غزل، اس ردیف میں حافظ کے دیوان میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ میرے اس جواب نے خورشید صاحب کی "انا" کو چیلنج کر دیا۔ بولے کہ کیا میں غلط جانتا ہوں؟ خیر مطلب بتائیے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا بتایا۔ بھلا وہ کیوں مانتے۔ پھر دوسرا سوال وجودیت کے متعلق تھا۔ کہیں سارتر کا نام بھی میں نے لے لیا۔ پوچھا کہ اس کی کتاب کا نام بتائیے۔ جو وجودیت کے سلسلے میں اس نے لکھی ہے۔ میں نے عرض کیا Being and Nothingness کہا کہ ہاں یہی نام ہے۔ "کیا آپ سمجھ سکے یہ کتاب؟" میں نے عرض کیا ہاں کچھ سمجھا تو ہے۔ بولے ناممکن ہے۔ جب میری سمجھ میں نہیں آئی تو آپ کی سمجھ میں کیا آئے گی؟

www.taemeernews.com

بس یہ جواب معرکے کا تھا۔ غرض کہ میں نالائق قرار دیا گیا۔ خورشید صاحب تو اپنی انا کا شکار تھے مگر خواجہ احمد فاروقی اپنی جیب میں ایک امیدوار لئے ہوئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ الہ آباد میں اسے کسی طرح فٹ کر دیں اور سلیکشن کمیٹی میں جو فضا بن رہی تھی اس میں اب بہترین موقع تھا۔ میرے مقابلے میں جو حضرات آئے تھے ان میں میرے دوست قمر رئیس صاحب ظہیر احمد صدیقی صاحب اور عنوان چشتی صاحب تھے۔ مگر ہندی کے ڈاکٹر رگھوونش جو بے حد پڑھے لکھے آدمی ہیں جن کی انگریزی تنقید پر بھی اسی طرح نظر ہے جس طرح ہندی تنقید اور ادب پر۔ انھوں نے سوالات کر کے سب کی ہوا خیزی کر دی چنانچہ وائس چانسلر ادِت نرائن سنگھ نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی تقرر نہ ہوگا۔ جگہ پھر سے مشتہر کی جائے۔ خواجہ صاحب کو بڑا ناگوار گزرا اور مایوسی بھی ہوئی۔ مگر وائس چانسلر کو یہ اختیار تو ہوتا ہی ہے کہ وہ جس سلیکشن کمیٹی کو چاہے مسترد کر دے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے میرے کچھ شاگرد بھی جو خواجہ صاحب کے منہ لگے تھے۔ یہی چاہتے تھے کہ میرا تقرر نہ ہونے پائے۔ مگر اب تو وہ منزل آگئی کہ ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ستمبر ۱۹۸۲ء میں یہ سلیکشن کمیٹی دوبارہ ہوئی اور میرا تقرر بہ حیثیت پروفیسر ہو گیا۔ مومن حسین شعلہ کراروی نے تاریخ نکالی :-

یاس نے خود سر نکالا اور کہا شعلہ لکھو صدر شعبہ ہو نہیں سکتا مگر مردِ عقیل

غالباً یہ تخرجے کی تاریخ ہے۔ شعبۂ اردو سے ایک صاحب نے گورنر اتر پردیش کو اِدھر اُدھر سے میرے خلاف خطوط بھجوائے کہ اس شخص نے شعبے میں اردو اسوسی ایشن کی رقم خرد برد کی ہے۔ شعبے میں رکھی ہوئی بہت سی کتابیں چرا کر بیچ ڈالی ہیں۔ اردو کی ایک کانفرنس کی اور اس میں بہت سے جعلی ٹی۔ اے بل بنا کر رقم وصول کی اور اپنے مصرف میں لایا (یہ دلاور راست دُزدے!) اور اس لئے اس کا تقرر گورنر کی طرف سے مسترد (QUASH) کر دیا جائے۔ گورنر نے یہ خط وائس چانسلر کو بھیج دیا۔ وائس چانسلر نے مجھے وہی خط بھیج دیا۔ میں نے جواب دیا کہ ایک انکوائری کمیٹی بنا دی جائے، خود ہی پتہ چل جائے گا۔ مگر

www.taemeernews.com

وائس چانسلر نے وہ کاغذ لعد کو داخل دفتر کر دیا۔ اور میں شعبے کا سربراہ ہو گیا۔ جس دن میں نے چارج لیا اساتذہ تو سب بھیگی بلی بن گئے مگر کچھ طلبا کو ایک صاحب نے میرے خلاف مظاہرے کے لئے تیار کیا۔ مگر کچھ ہو نہ سکا۔ پھر دو ایک مزید شکایتی خطوط طالبات سے بھی میرے خلاف دوسری نوعیت کے بھجوائے گئے۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ آخر یہ سب کچھ ٹھنڈا ہو گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شعبے میں ان تمام فتنہ و فساد پھیلانے والوں نے پھر میرے ہی قلم سے ترقی پائی۔ میں ایسے مسئلوں میں ہمیشہ جوش ملیح آبادی کا مصرعہ پڑھتا ہوں "شبیر حسن خاں نہیں لیتے بدلہ" اور پھر بہرحال میں ان کے کردار کا پیرو ہوں جنہوں نے اپنے قاتل کو کاسۂ شیر پیش کیا تھا۔ یہ بھی خدا کا کرنا ہوا کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب کی بیٹی کا بہ حیثیت ریڈر جب دلی یونیورسٹی میں تقرر ہونے والا تھا تو باہر سے میں اکیلا ایکسپرٹ ہو کر دلی یونیورسٹی پہنچا۔ پھر میں نے خواجہ صاحب کی بیٹی کا تقرر کر دیا۔ اور ان کے گھر جا کر انھیں یہ مژدہ بھی سنا آیا۔ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا" خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کا یہ قول دہرائیے اور آگے چلئے۔

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں اس وقت جتنے اساتذہ ہیں یا تو میرے مقرر کردہ ہیں یا میرے ہی قلم سے "بام عروج" تک پہنچے ہیں۔ انتظامی امور کے لحاظ سے میں نے یہ اچھا نہیں کیا مگر انسانیت کے ناتے مجھے یہی کرنا چاہئے تھا۔ میرے زمانے میں باہر سے تین حضرات شعبے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی، پروفیسر فضل امام اور پروفیسر جعفر رضا۔ علی احمد فاطمی، آگرے سے آئے۔ فضل امام صاحب، بے پور سے۔ اور پروفیسر جعفر رضا، کشمیر سے۔ جنہیں راقم الحروف نے پہلے ریڈر بنایا بعد کو پروفیسر۔ فضل امام صاحب کے آنے پر شعبے میں میری اور ان کی دونوں کی سخت مخالفت ہوئی۔ مگر میں چونکہ ان کے جوہر سے واقف تھا اس لئے میں نے کسی کی کچھ نہ سنی۔ اور اب مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے بہرحال میری پہچان کی تصدیق کی۔ پروفیسر جعفر رضا صاحب کے متعلق میں کیا عرض کروں "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" فاطمی نے میرے ہی ساتھ عبدالحلیم شرر

www.taemeernews.com

پر اپنا مقالہ ۱۹۶۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ڈی۔ فل (پی۔ ایچ۔ ڈی) ڈگری کے لئے پیش کیا تھا۔ وہ ایک اچھے استاد، اچھے مقرّر اور جلسے جلوس کے ماہر ہیں۔ الہ آباد میں اُردو کی سرگرمیوں میں ان کا بڑا "یوگ دان" رہتا ہے۔ باقی حضرات بھی اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور "می گزرد" کا مصداق ہیں۔ پہلے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں علم و ادب کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ نئی ادبی تحریکات، نئی ایجادات اور انکشافات پر بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے۔ مگر اب یونیورسٹی کے اساتذہ ہر وقت مہنگائی بھتہ، تنخواہ میں اضافے اور یونیورسٹی کے اعزازی کاموں سے مزید آمدنی کے حصول کی کوششوں میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ کچھ اساتذہ کو یونیورسٹی سے باہر کے کوچنگ انسٹی ٹیوٹ میں جزوقتی تقرّر کی بھی تلاش رہتی ہے۔ اب تو کچھ حضرات خاصے معقول معاوضوں پر ٹیوشن بھی کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنی آمدنی بڑھاتے رہتے ہیں۔ علم و ادب کی پیاس کے بجائے اب ہوسِ زر نے اہل علم کو گھیر لیا ہے اور ظاہر ہے کہ 'سرسوتی اور لکشمی' ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسی صورت میں علمی اداروں کا انجام معلوم۔

www.taemeernews.com

لندن ـــــ بارِ دگر

۱۹۸۰ء میں لندن میں ترقی پسندوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں شرکت کے لئے جولائی میں مجھے پہلی مرتبہ لندن جانے کا موقع ملا۔ اس کانفرنس اور اس کی تفصیلات نیز لندن اور مضافات لندن کا تفصیلی تذکرہ میں نے اپنے سفرنامے "لندن آدھ۔ لندن" میں کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۸۲ء میں نصرت پبلشرس نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ اب یہاں اس کی تفصیل دوبارہ پیش نہیں کی جائے گی۔ ۱۹۸۷ء میں ایک عالمی سیمینار کے سلسلے میں مجھے پھر لندن بلایا گیا۔ یہ سیمینار مجاہد ترمذی نے منعقد کیا تھا۔ جس کا موضوع تھا "ادب پر سوشلسٹ فکر کے اثرات"۔ اس سیمینار میں ایک دن فیض صاحب پر بھی ایک مخصوص پروگرام رکھا گیا۔ جس کے خاص مقرر ڈکٹر کیرنن تھے۔ اس میں شریک ہونے والوں میں ہندوستان سے ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، شارب ردولوی، سردار جعفری اور راقم الحروف شامل تھے۔ اور کسی کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ شاید ایک دو حضرات اور ہوں چونکہ یہ ساری باتیں محض یادداشت کے بھروسے لکھی جا رہی ہیں۔ اس لئے سہو کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ کینیڈا سے بھی کچھ حضرات آئے تھے۔ اب صرف اشفاق حسین کا نام ذہن میں ہے پاکستان سے عطاء الحق قاسمی، احمد فراز اور مشہور ناول نگار ایوب مرزا نے شرکت کی تھی سوویت روس سے اناتورا اور لدمیلا واسلیوا شریک ہوئیں۔ جو آج کل ہندوستان اور پاکستان کے تقریباً تمام عالمی سیمیناروں میں شرکت کرتی ہیں۔ اور روس میں اردو کے اچھے اسکالروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ لندن میں مقیم کچھ ہندوستانی اور پاکستانی دانشور بھی شامل ہوئے۔ سیمینار کے پہلے دو اجلاس تو اچھے ہوئے۔ ایک اجلاس کی صدارت فیروز مکھرجی نے کی اور ایک مقالہ بھی اردو اور بنگالی افسانوں پر سوشلزم کے اثرات کے

www.taemeernews.com

کے اثرات کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ فیروز مکھرجی وہی خاتون ہیں جن کا ذکر قرۃ العین کے ناول "آگ کا دریا" میں فیروز جبیں کے نام سے ہوا ہے۔ مجھے ڈکٹر کیرن کی تقریر اور فیروز مکھرجی کا مقالہ دونوں پسند آئے۔ باقی تمام مقالے یونہی رسمی اور روایتی تھے۔ خود میرا مقالہ بھی کوئی دانشورانہ مقالہ نہ تھا جس میں کوئی تحقیق و تفتیش ہوتی۔ صرف ایک محاسبہ Assessemt سا تھا مگر مکمل۔ جس میں اردو کے ساتھ ہندی ادب کا بھی محاسبہ شامل تھا علی الخصوص شعری محاسبہ۔ لندن میں جو سمینار یا ادبی جلسہ ہوتا ہے اس کی شہرت بہت ہوتی ہے مجاہد ترمذی خود تو بے حد فعال آدمی ہیں۔ مگر وہی کہ اکیلا چنا بھاڑ تو نہیں پھوڑ سکتا۔ وہ شاید ٹیم ورک میں کمزور ہیں یا پھر ان میں ٹیم اسپرٹ نہیں۔ ان کے پاس فنڈ کی بھی خاصی کمی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے وعدوں کو بھی پورا نہیں کر سکے۔ پھر بھی اتنے لوگوں کے پہنچ جانے سے سمینار مجموعی طور پر اچھا ہو گیا۔ اس وقت تک روس کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ گرباچوف کے گلاس ناسٹ اور پرا سترائیکا کی ہر طرف دھوم تھی۔ کیا پتہ تھا کہ گلاس ناسٹ روس کا ستیاناس کرنے جا رہا ہے۔ سمینار ہو تو گیا مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لوگوں میں اس کے لئے جوش و خروش نہیں۔ ہر مقالے پر باسی پن اور ایک طرح سے رسمی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لندن ہر ادبی اور سیاسی فکر کا بیرومیٹر (بادپیما) ہے۔ یہاں سے اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہوا کیسی اور کس طرف کی ہے۔ اگرچہ محمد حسن صاحب اور ان ناموروں میں گلاسناسٹ اور پرا سترائیکا کی حیثیت پر کچھ گرما گرم بحث بھی ہو گئی مگر اس سمینار کی ایک عام فضا بازار کے مندے ہونے کا اندازہ کرا رہی تھی۔ وہ جو ایک عالمی سازش سی چل رہی ہے کہ مارکسی خیالات، مارکسی ادیبوں اور ادب کو اہمیت نہ دو اور Ignore کر دو مارکسی ادب اور ادیب خود ہی ختم ہو جائیں گے اس کا اندازہ یہاں بھی بخوبی ہو رہا تھا۔ تمام پرانے مارکسی ادیب ہی اس سمینار میں شریک تھے۔ نئی نسل کا کوئی نمائندہ اس سمینار میں نہ تھا۔ مارکسی مدبروں سے شروع ہی سے یہ بڑی چوک ہوئی کہ انھوں نے اپنی کوئی دوسری صف نہیں بنائی۔ وہ صرف خود کو بناتے سنوارتے establish میں لگے رہے

www.taemeernews.com

نہ وہ اپنے ہم خیالوں کے لئے سینہ سپر ہوتے اور نہ انھیں بنانے سنوارنے کی فکر کرتے۔ اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ جشن علی سردار جعفری (منعقدہ ۱۴،۱۵ مئی ۱۹۹۲ء، الہ آباد) میں سردار جعفری نے خود اعلان کیا کہ انھوں نے ۱۹۵۶ء سے پارٹی کے ٹکٹ کی تجدید نہیں کرائی۔ انھیں شاید روس جاکر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ (اب کسے رہنما کرے کوئی!!)

اگست ۱۹۸۸ء کی آخری تاریخیں تھیں کہ لندن کی فیض کلچرل اکیڈمی نے ڈاکٹر ایوب مرزا کے نئے ناول "دامِ موج" کی رسم اجرا کا اعلان کیا۔ یہ رسم اجرا ۲۴ راگست کو ہیمر اسمتھ کے کمیونٹی ہال میں ہوئی۔ اس رسم اجرا میں راقم الحروف مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوا (غالباً تمام اہم دانشور جاچکے تھے تبھی قرعۂ فال اس عاجز کے نام نکلا۔) میں نے ناول پڑھ رکھا تھا۔ یہ انوکھا ناول ہے۔ انوکھا ان معنوں میں کہ ایک مشہور سیاسی کارکن حیدر خاں پوٹھوہاری کی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ حیدر خاں (جنہیں دادا حیدر خاں بھی کہا جاتا ہے) ہی اس ناول کے ہیرو ہیں۔ شاید اردو میں یہ پہلا ناول ہے جو کسی سیاسی رہنما کی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ اگرچہ ایوب مرزا نے شاید اس سے پہلے کوئی ناول نہیں لکھا۔ مگر انھوں نے حیرت انگیز طور پر اس ناول میں فن کا مظاہرہ کیا ہے اور حیدر خاں کے متعلق ایسی جزئیات فراہم کی ہیں جیسے وہ ہر وقت حیدر خاں کے ساتھ رہے ہوں۔ "دامِ موج" کے برابر اور کسی اردو کے ناول میں ابھی تک اتنا بڑا کینوس مجھے نہیں ملا۔ جہاں ہندوستان، مشرق قریب، چین، امریکہ غرضیکہ جہاں جہاں حیدر خاں گئے ہر جگہ کی سماجی اور سیاسی زندگی اپنی چھوٹی سی چھوٹی تفصیلات کے ساتھ اس ناول میں موجود ہے۔ حیرت ہے کہ ناول کے ناقدین کی نظر اس ناول پر کیوں مرکوز نہیں ہوئی۔ شاید ادبی دنیا کے مبصرین ابھی تک اس ناول اور اس کے مصنف سے واقف تک نہیں۔ اس ناول میں حیدر خاں کی ابتدائی زندگی، پھر ان کی مزدوروں کی زندگی، پھر سندباد جہازی کی طرح جہاز میں نوکری کر کے کلکتہ، چین، امریکہ کے مزدور

www.taemeernews.com

کے مسائل کے ساتھ ورکنگ کلاس میں شامل ہو کر مل مالکوں اور انتظامیہ سے نپٹنے کی ایسی تصویریں پیش کی گئی ہیں کہ شاید ایسی تصویریں کسی امریکی ناول نگار سے بھی ممکن نہیں ہوسکیں ایک زمانے میں ہاورڈ فاسٹ نے امریکہ میں کالے لوگوں کے مسائل پر کئی ناول لکھے مگر یہ تفصیلات اس سے بھی ممکن نہ ہوسکیں۔ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں کسی ایک مزدور پیشہ پر پورے ناول کو مرتکز کرنا کسی مغربی ناول نگار سے بھی ممکن نہیں ہوسکا۔ ہاں گورکی کی ماں میں پاقل (PAVIL) کی زندگی ضرور کچھ اس ڈھنگ سے پیش ہوئی ہے۔ پھر ماں میں صرف پاقل ہی کے شب و روز کا تذکرہ نہیں ہے۔ پھر ماں میں ناول، ماں کے گرد و پیش گھومتا ہے ایک شخص کی زندگی پر تو متعدد ناول لکھے گئے ہیں جن میں برتول بریشت کا ناول گلیلیو کی زندگی پر، ماام کا ناول "مون اینڈ دی سیکس پنس" جو مصور وانگاف کی زندگی پر ہے اگرچہ اس نے ناول میں کہیں وانگاف کا نام ظاہر نہیں کیا۔ مگر 'دام موج' کی بات ہی کچھ اور ہے اس ناول کی رسم اجرا میں پروفیسر امین مغل نے ایک مقالہ پیش کیا۔ راقم الحروف اور لاشاری صاحب نے تقریریں کیں۔ بعد کو ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس ناول کے اس طرح لکھے جانے کے اسباب بیان کئے۔ یہ پروگرام تقریباً دو گھنٹے چلتا رہا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب میں ستمبر میں واپس ہوا تو دادا حیدر خاں دلی میں موجود تھے۔ وہ اس زمانے میں کچھ دنوں کے لئے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے مہمان تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً چورانوے سال تھی۔ تاہم جس نے بھی 'دام موج' ناول نہیں پڑھا وہ اردو ادب کے ایک اچھے ناول سے محروم رہ گیا۔

اب محرم شروع ہونے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا کہ باقر صاحب بھی الہ آباد سے لندن جا پہنچے۔ جب میں لندن چلا آیا تو باقر صاحب ٹورانٹو سے الہ آباد پہنچے اور پھر وہاں کچھ دنوں رہ کر تین چار دن کے لئے لندن آگئے۔ انھیں اپنی تھیسس کے لئے برٹش میوزیم کی لائبریری میں کچھ کتابوں کی تلاش تھی۔ پھر ایک صبح کو ہم دونوں، برٹش میوزیم لائبریری پہنچے۔ برٹش میوزیم لائبریری بھی برٹش میوزیم کی طرح دنیا کی عجیب و غریب لائبریری

www.taemeernews.com

ہے۔ ایک طرح دیکھئے تو یہ میوزیم زیادہ اور لائبریری کم ہے۔ لیکن اگر یہاں کے تمام اندوختہ کو عجائب گھر کی طرح شمار کیجئے تو یہ کتابوں کے بجائے تاریخ کے بولتے ہوئے واقعات بھی ہیں۔ انگریزوں نے کیا کمال کیا ہے!! مصر اور روم کی پوری پوری عمارتیں اور کئی سو ممیاں اٹھا لائے۔ روم اور یونان کے مندر توڑ کرلے آئے اور یہاں لاکر سب کو اسی طرح جوڑ کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہم تو تخت متحیر ہو کر ان چیزوں کو دیکھتے رہے اور ایک چوتھائی لائبریری بھی نہ گھوم سکے۔ پھر وہیں اندر بنے ہوئے رستوراں میں کچھ کھایا پیا اور پھر میوزیم گھومنے میں لگ گئے۔ کتابوں کے حصے پہنچے تو ایک الگ دنیا تھی۔ بابر کی مطلوبہ کتاب جس حصے میں تھی اتفاق سے اس حصے کا محافظ اس دن چھٹی پر تھا۔ میں نے کچھ اردو فارسی کے مخطوطے دیکھے۔ مگر سوا افسوس کرنے کے اور کیا تھا۔ یہاں کم از کم ایک ہفتہ کوئی آکر بیٹھے تو کتابوں کا کچھ اور چھور ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام تک صرف ہم برٹش میوزیم کے اندوختے پر ایک طائرانہ نظر ہی ڈال سکے۔ شام کو وہاں سے نکلے تو تھوڑی دیر پکاڈلی میں گھومتے رہے پھر فوائلیس (Book-Shop) کی طرف نکل گئے۔ کچھ کتابیں دیکھیں پھر چیرنگ کراس سے ریل میں سوار ہو کر ہانسلو واپس آئے اور پھر کراس ویز۔

دوسرے دن پہلی محرم تھی۔ رات کو قمر رئیس صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ کل ہم کو انڈیا آفس لائبریری چلیں گے۔ اور دوسرے دن صبح کو میں ایلنگ کے علاقے میں عاشور کاظمی کے یہاں پہنچ گیا۔ وہیں ناشتہ کیا اور وہیں سے بلیو لائن پکڑ کر ایکٹن ٹاؤن کے اسٹیشن پر اتر پڑے اور وہاں سے یلو لائن (yellow Line) لے کر بلیک فرائیر (Black FriaR) اسٹیشن پر اتر گئے کہ ہمیں یہی بتایا گیا تھا۔ باہر نکلے تو خیال ہوا کہ ٹیکسی لے لیں تاکہ بآسانی لائبریری پہنچ جائیں۔ اب جس ٹیکسی کو روک کر ہم اس سے لائبریری چلنے کی بات کرتے ہیں ٹیکسی والا ہاتھ ہلا کر چل دیتا ہے۔ گویا وہ ہماری بات ہی نہیں سمجھتا۔ ہماری وکٹورین بلکہ کوئینس انگلش اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ پریشانی کے عالم میں ہم پیدل چل پڑے۔ عجیب مشکل تھی کہ ہم انڈیا آفس لائبریری کے بالکل نزدیک

www.taemeernews.com

تھے۔ مگر کوئی ہمیں یہ نہیں بتا تا تھا کہ لائبریری کہاں ہے۔ ہم بلیک فرائرز سے بائیں ہاتھ کی طرف چل پڑے۔ ایک چھوٹا سا پل آیا۔ پل پار کیا تو ایک پرانے جنٹلمین قسم کے آدمی نظر آئے فلیٹ ہیٹ لگائے بالکل وکٹورین فیشن میں ملبوس۔ ہم نے انھیں مخاطب کر کے ان سے استفسار کیا۔ وہ ہماری انگلش اور ہماری پریشانی دونوں سمجھ گئے۔ پھر انھوں نے ہمیں صحیح راستہ سمجھا دیا۔ اور ہم چند منٹوں میں انڈیا آفس لائبریری کی بلڈنگ میں تھے اردو کا سیکشن اوپر کی منزل میں تھا۔ اوپر گئے تو ہمیں سلیم قریشی صاحب مل گئے جن کی ہمیں تلاش تھی اور جو اردو سیکشن کے انچارج تھے۔ قریشی صاحب ہم سے مل کر خوش ہوئے اور اردو کتابوں کا کیٹلاگ منگایا۔ قمر صاحب کیٹلاگ دیکھنے لگے اور میں ان کتابوں کو جو لوگ انڈیا آفس لائبریری میں "تحفتاً" بھیجا کرتے ہیں۔ اور جس میں یہ جذبہ پنہاں ہوتا ہے کہ ان کی کتاب یہاں ضرور محفوظ رہے گی۔ یہ کتابیں کچھ زمین پر اور کچھ ریک پر ڈھیر تھیں۔ یہ حالت بالکل ہندوستان کی لائبریریوں جیسی تھی۔ (مجھے پاکستان کی لائبریریوں کا حال نہیں معلوم) ان میں تین چار سال پہلے کی بھی چھپی ہوئی کتابیں تھیں جو ابھی تک کیٹلاگ نہیں ہوئی تھیں۔ قریشی صاحب نے میرے استعجاب کو بھانپ لیا اور اعتذار کے انداز میں بولے کہ ابھی یہ کتابیں کیٹلاگ نہیں ہو سکیں۔ میں اکیلا آدمی ہوں اور کام بہت ہے (میں بھی اپنی یہ کتاب انڈیا آفس لائبریری ضرور بھیجوں گا) ہم ان کی اس بات سے متفق تھے۔ واقعی وہاں کام بہت ہے۔ پھر قریشی صاحب کو گلہ ہے کہ محققین کی مدد بھی کرنی پڑتی ہے۔ جو پریم چند کی کرشنا اور امیر خسرو کی خالق باری یا دیوان سودا اور اودھ بلیو بک کے ابتدائی نسخے تلاش کرتے ہوئے یہاں آتے ہیں اور قریشی صاحب کا وقت اور پیسے دونوں برباد کرتے ہیں کہ اکثر ان محققین کو قریشی صاحب بڑے خلوص سے صرف چائے ہی نہیں پیش کرتے بلکہ 'وائے' کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ قریشی صاحب نے ہمیں بھی باہر لے جا کر بہت اچھا ناشتہ بھی چائے کے ساتھ کرایا۔ میری حماقت دیکھئے کہ میں نے ناشتہ کرتے کرتے اچانک قریشی صاحب سے پوچھا کہ 'کنگ ولیم اسٹریٹ' یہاں کہاں ہے؟ قریشی صاحب نے

www.taemeernews.com

بتایا کہ اسی پُل کی بائیں جانب ہے جہاں سے گزر کر ہم اس لائبریری میں آئے ہیں۔ پھر متحیّر ہو کر پوچھا کہ یہ سڑک آپ کو کیوں یاد آئی؟ میں نے کہا کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی کتاب "ویسٹ لینڈ" میں دفتر جاتے ہوئے بابو لوگوں کا بڑا اچھا نقشہ اس سڑک پر کھینچا ہے جو اس کی اشاری اور علامتی شاعری کا بہت اچھا ٹکڑا مجھے معلوم ہوا۔ قمر صاحب ناشتے میں جٹے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ امراض شکم میں گرفتار رہتے ہیں لیکن کھانے سے نہیں چوکتے اور پھر دو تین دن پریشان رہتے ہیں۔ معلوم نہیں انھوں نے ہماری باتیں سنی بھی یا نہیں۔ ناشتے کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم نے اپنا راستہ پکڑا اور واپس لوٹ آئے۔

www.taemeernews.com

اسگر تو آج بن میں

شام ہوئی تو باقر میاں نے سب کو تیار کیا کہ ٹھیک نو بجے ہیمر اسمتھ کے کمیونٹی ہال میں ڈاکٹر کلب صادق لکھنوی کی مجلس عزائے حسین شروع ہو جائے گی۔ اس لئے سب لوگ تیار ہو جائیں۔ ہم یہاں سے آٹھ سوا آٹھ بجے نکل چلیں گے۔ چنانچہ ہم لوگ سوا آٹھ بجے گھر سے نکلے اور تقریباً بیس منٹ میں ہیمر اسمتھ پہنچ گئے۔ باقر نے ایک مقام پر خالی جگہ پا کر گاڑی کھڑی کر دی اور بہت خوش تھے کہ پارکنگ کے لئے جگہ مل گئی۔ ورنہ یہاں پارکنگ کی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں پیدل چل کر ہم ہیمر اسمتھ کے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ کمیونٹی ہال جلسوں اور تقریبات کے واسطے وقت معینہ کے لئے کرائے پر لیا جاتا ہے۔ منتظمین نے اس ہال کو مجلسوں کے لئے بارہ سو پاؤنڈ پر دس دن کے لئے ۸ بجے سے ساڑھے دس بجے رات تک کے لئے بک کر رکھا تھا۔ یہ ہال کافی بڑا ہے۔ بالکل ہمارے یہاں کے سینما ہال جیسا۔ غالباً یہ تقریبات ہی کے لئے بنا ہے۔ ایک طرف اسٹیج ہے۔ فرش برابر ہے جہاں فرشی انتظام بھی ہوتا ہے اور فنکشن کرنے والے کرسیاں بھی لگا سکتے ہیں۔ مجلسوں میں تو فرشی انتظام ہی رہتا ہے۔ دروازے بھی چار پانچ اسی طرح سے ہیں جس طرح سینما گھروں میں ہوا کرتے ہیں۔ جس کے باہر ایک لابی بھی ہے۔ ہم پہنچے تو تھوڑے سے لوگ آ چکے تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنے آگے پلاسٹک کے کیری بیگ بھی رکھے ہوئے تھے جن میں ان کے جوتے محفوظ تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ حکمت عملی جوتے چوری چلے جانے کے خوف سے اختیار کی گئی ہے کہ ہندوستان (اور پاکستان میں بھی) ایسی محفلوں، مجلسوں اور مسجدوں سے جوتے چوری ہو جانے کی رسم عام ہے۔ تبھی تو مولانا حالی نے وہ مشہور شعر کہا تھا۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

www.taemeernews.com

نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنی نظم 'آدمی نامہ' میں اپنی مخصوص زبان اور طرز بیان کے ساتھ اس رسم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں　　　　اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں

جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تو کیا لندن میں بھی محفلوں اور مجلسوں میں جوتوں کی چوریاں ہوتی ہیں؟! لیکن بعد کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ اپنی سہولت کے لئے ایسا کرتے ہیں تاکہ انھیں بعد کو جوتے ڈھونڈنے اور وقت خراب کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ مگر ایک دن ان مجلسوں میں وہ بات بھی ہو گئی جس کا اشارہ مولانا حالی اور نظیر نے کیا ہے۔ کچھ لوگوں کے نئے جوتے نہیں ملے۔ یا تو نیچے گر گئے اور ادھر اُدھر ہو گئے یا کیا ہوا کہہ نہیں سکتا۔ خیر یہ تو برسبیل تذکرہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ہوڈلم (Hoodlum) یہ کام کر بھی گیا ہو۔

ٹھیک نو بجے کلب صادق صاحب نے مجلس شروع کر دی۔ یہ مجلس 'سماوات' Cosmos کی انسانی تلاش سے متعلق تھی۔ اور پھر آیات قرآنی میں، ان کے اشاروں سے متعلق بیان تھا۔ یہ بیان بے حد مدلل اور باوثوق۔ پورے ایک گھنٹے انھوں نے یہ مجلس پڑھی۔ انگلستان میں رہنے والے مسلمانوں کی نئی پود بھی ان مجلسوں میں آتی مگر اُن کی سمجھ میں مولانا کی زبان کیسی، سیدھی سادی اردو بھی نہیں آتی تھی۔ ان کے بزرگ انھیں انگریزی میں دھیرے دھیرے ترجمہ کر کے سمجھاتے جاتے۔ معلوم نہیں وہ کیا سمجھتے ہوں گے۔ ختم مجلس کے بعد مصطفےٰ گوکل صاحب نے چند پلے کارڈس (Playcards) اسٹیج پر دکھائے جن میں ان کاروں کے نمبر لکھے تھے جنہیں غلط جگہ پارکنگ کی وجہ سے پولیس اٹھا لے گئی تھی۔ اور اب صاحبان کار کو پولیس اسٹیشن پر بارہ پونڈ جرمانہ دے کر اپنی کاریں لینی تھیں۔ بہت سے حضرات جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کاریں جہاں جگہ پاتے کھڑی کر دیتے اور روز جرمانہ بھرتے مگر مجلس کا شوق انھیں ضرور ہیمر اسمتھ کھینچ لاتا۔ لندن کے رہنے والوں میں مجلس کا شوق بے پایاں ہے۔ میرے بھی دو شاگرد سید ابوالقاسم اور ڈاکٹر رضوان حیدر

www.taemeernews.com

ہر سال لندن مجلسیں پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ یہ دونوں یونیورسٹی میں میرے شاگرد تھے۔ مجلسیں پڑھنے میں نہیں (بھلا مجھ میں یہ صلاحیت کہاں۔ اگر خدانخواستہ میں مجلسیں پڑھتا تو لوگ مجلسیں چھوڑ کر بھاگ جاتے)

ان مجلسوں میں حصّہ بھی تقسیم ہوتا ہے۔ اس طرح کہ لوگ بڑی بڑی ٹرے Tray میں کبھی پھل اور کبھی سنبوسے یا اچھے بسکٹ بھر کر لابی میں رکھ دیتے ہیں۔ لوگ ختم مجلس کے بعد جب باہر نکلتے ہیں تو اپنے حصے خود ہی اٹھا لیتے ہیں۔ پھر نیچے کی منزل میں آکر ایک ایک گلاس چائے بھی پیتے ہیں اور تب اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ یہ بھی کہ مجلس میں بار بار اعلان کے باوجود کہ چائے کے خالی گلاس پاس رکھے ہوئے ڈرم میں ڈال دیئے جائیں مجلسی حضرات میں سے بہت کم لوگ ان پلاسٹک کے گلاسوں کو ڈرموں (Drums) میں ڈالتے ہیں۔ اور انھیں یوں ہی ہندوستان میں دونوں اور پتّل کی طرح فرش پر پھینک دیتے ہیں جو بعد کو منتظمین کے لئے یہ سب پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں۔ پھر لندن کی زندگی میں یہ خاصی بدتمیزی کا مظاہرہ ہے۔ حیرت ہے کہ لندن کی آسودہ اور مہذب زندگی میں بھی لوگ اپنی مشرقی علی الخصوص برّصغیر کی روایات نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک کہ میں بھی ایک معاملے میں شامل ہو گیا۔ اب قارئین چاہے اسے روایت کی پاسداری سمجھیں یا محض ایکٹیوٹی Activity ۔ بجائے ایک حصہ لینے کے کچھ حضرات دُہرے حصّے لے لیتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی ایکٹیوٹی کرنے والے میری ہی طرح نو وارد ہوں۔ ایک دن کچھ گرمی تھی تو منتظمین نے آئس کریم کا انتظام کیا تھا۔ آئس کریم میری کمزوری ہے اور ہر محفل میں جہاں آئیس کریم ملتی ہے ایک پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ یہ مصرعہ پڑھتا ہوں۔ جز ایک دو جام میں ساقی مرا کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ جس دن آئس کریم کا حصّہ بٹ رہا تھا۔ میں نے اور عاشور کاظمی نے چار چار حصّے لئے اور سب دلوں کی کسر نکال لی۔ کسی نے ازراہ مذاق ٹوکا تو عاشور کاظمی نے حاضر جوابی میں بولے "بھائی اسلام میں تو چار کی اجازت ہے۔" اس لئے ہم لوگ کوئی غیر شرعی کام نہیں کر رہے ہیں۔ عاشور کاظمی میں حسِّ مزاح بہت تیز

www.taemeernews.com

ہے۔ اس کا چھپا ہوا ثبوت ان کی کتاب "سخن گسترانہ بات" ہے۔

ہم اسی طرح روز شام کو ہیمر اسمتھ کی مجلسوں میں شرکت کرنے کے لئے جاتے۔ محرم کی پانچویں تاریخ تھی کہ عاشور کاظمی کا ٹیلیفون آیا کہ آج چھ بجے شام کو لیوٹن (LUTON) کاظم صاحب کے یہاں مجلس چلنا ہے۔ لیوٹن، لندن سے تقریباً پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم لوگ ٹھیک چھ بجے لیوٹن کے لئے روانہ ہوئے اور تقریباً پونے سات بجے وہاں پہنچ گئے۔ کاظم صاحب ہمارے منتظر تھے لیکن کچھ پریشان بھی کہ جن صاحب سے انھوں نے مجلس پڑھنے کو کہا تھا وہ نہیں پہنچے۔ مجلس میں کل چھ سات آدمی تھے۔ کاظم صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ ہی کچھ پڑھ دیجئے۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ اگر انیس یا دبیر کے مرثیئے آپ کے گھر میں ہوں تو لائیے۔ میں پڑھ دوں کہ میں نے اپنے بچپن میں مرثیئے کی دو ایک مجلسیں پڑھی ہیں۔ مگر مرثیئے وہاں نہ تھے۔ آخر میں عاشور کاظمی نے کچھ سوز اور کچھ سلام پڑھے اور گھر کی عورتوں نے کچھ نوحے پڑھ دیئے۔ اور اس طرح مجلس ہو ہی گئی۔ کاظم صاحب نے کھانے کا بھی انتظام کیا تھا۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔

ساتویں محرم سے ہیمر اسمتھ میں نوحہ و ماتم کا بھی اہتمام تھا۔ ختم مجلس کے بعد کچھ پاکستانی حضرات نے نوحے پڑھنے شروع کئے اور دو ہتڑ ماتم بھی۔ شروع کی صفوں میں انھوں نے ایک حلقہ سا بنا لیا اور نوحہ پڑھنے لگے۔ نوحے شاید ان کے پاس کم تھے اور شاید انھیں نوحے پڑھنے اور سینہ زنی کا کوئی خاص تجربہ بھی نہ تھا۔ مگر جس خلوص اور جذبے کے ساتھ ان لوگوں نے ماتم کیا اس کا اثر مجمع پر خاصا تھا۔ ان کے پاس شاید ایک ہی نوحہ تھا۔ پھر ان کا شین قاف بھی درست نہ تھا۔ مگر ان کا خلوص اور جذبہ ان کی آنکھوں سے چھلکا پڑتا تھا۔ شاید سبھی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میرے قریب کھڑے حبیب حیدرآبادی زار و قطار رو رہے تھے۔ اور دھیرے دھیرے ماتم بھی کرتے جاتے تھے۔ نوحے کا پہلا مصرعہ یوں تھا۔

www.taemeernews.com

ع اسگر (اصغر) تو آج بَن میں، پیاسا ہے ناتواں ہے

اور اسے وہ غم ناک آواز میں والہانہ انداز سے پڑھ رہے تھے۔ میں نے یہاں بہت سے حنفی مسلک کے لوگوں کو بھی ماتم کرتے اور غمناک ہوتے دیکھا کہ واقعۂ کربلا سے مسلمانوں کے تمام ہی مسالک متاثر ہیں۔ اس غم کے منانے کے طریقے صرف اپنے اپنے ڈھنگ سے الگ الگ ہیں۔ مگر شہدائے کربلا کا غم اور احترام سبھی مسلمان کیسے، بہت سے غیر مسلم حضرات کے دلوں میں بھی رہتا ہے۔ اور چھنو لال دلگیر اس کی روشن مثال ہیں۔ اس مجلس میں جو نئی نسل شریک ہوتی ہے معلوم نہیں وہ واقعات اور روایات کربلا سے کس قدر واقف ہے؟ میرا خیال ہے کہ نئی نسل جو اردو زبان سے بےگانہ ہے۔ اس کے لئے کچھ دنوں میں واقعات کربلا اور محرم کی مجلسیں سب محض ایک رسم (RITUAL) ہو کر رہ جائیں گی۔ پھر ان کا بھی وہی حشر یورپ میں ہو سکتا ہے جو رام کتھا اور گیتا کا ہندو شودروں میں ہوا جو سنسکرت تو سمجھتے نہیں صرف انھیں یہ خیال رہتا ہے کہ یہ مذہبی جلسے ہیں اور انھیں عقیدت سے سننا چاہئے۔ مگر جن گھروں میں یہاں بچے اردو سمجھتے ہیں اور روانی سے بول بھی لیتے ہیں وہ ضرور اس واقعے کی اہمیت اور اس کا احترام باقی رکھیں گے۔ آٹھویں اور نویں محرم کو ختم مجلس کے بعد اندر ہال ہی میں علم اور تابوت بھی نکلا۔ اور اسی ہال میں گھما پھرا کر ٹھنڈا کر دیا گیا۔

محرم کی آٹھویں تاریخ تھی کہ بی۔بی۔سی لندن کے یاور عباس کا فون آیا کہ آج ہمارے یہاں دو بجے گھر پر مجلس ہے۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ یاور عباس، باقر کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر رہتے ہیں۔ وہ اصلاً چرکھاری ضلع جھانسی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے چچا علی عباس مرحوم چرکھاری ریاست میں کبھی دیوان یعنی وزیر تھے۔ یاور عباس صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم بھی رہ چکے ہیں اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے چہیتے شاگردوں میں سے تھے۔ باقر مجھے لے کر یاور عباس صاحب کے گھر پہنچے تو کچھ لوگ آ چکے تھے۔ یہ مردوں اور عورتوں کی ملی جلی مجلس تھی۔ اس طرح کہ ایک طرف مرد

www.taemeernews.com

بیٹھے تھے اور دوسری طرف تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر عورتیں بیٹھی تھیں۔ یاور عباس نے مجھ سے کہا کہ میں انیس کا مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" پڑھوں گا۔ میں بہت خوش ہوا کہ لندن میں یہ مرثیے کی پہلی مجلس ہوگی جو سنوں گا۔ مجلس میں کل ملا کر تیس پینتیس نفوس رہے ہوں گے۔ سب سے پہلے بی بی سی کی ایک آرٹسٹ نے سوز شروع کیا۔ آواز کیا تھی بس یہی معلوم ہوا جیسے مومن کی وہ مشہور مغنیہ آگئی ہو جس کی تعریف میں انھوں نے وہ بات کہی تھی۔ وہی ! ع "شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو" والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دو تین سوز خاتون نے پڑھے۔ اس کے بعد برمنگھم کے فلسفی پروفیسر عسکری نے واقعات کربلا پر انگریزی میں ایک تقریر کی۔ پھر یاور عباس نے میر انیس کا مرثیہ شروع کیا۔ ان کے پڑھنے کا ڈھنگ وہی تھا جو شمالی ہندوستان میں تحت خوانی کا مرثیوں کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ وہ اس طرز خواندگی سے اچھی طرح واقف تھے۔ پاکستانی حضرات اور کچھ لندن کے سامعین بھی اس طرز خواندگی کو استعجاب کے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے دس بارہ بند ہی پڑھے ہوں گے، خاص طور پر بین کے بند۔ مرثیہ ختم ہوا تو افتخار عارف نے ایک بڑی اچھی اور موثر نظم، حضرت زینب کی شان میں واقعۂ کربلا کے پس منظر کے ساتھ پیش کی۔ یاور عباس نے لندن اور نواح لندن کے کچھ ادیبوں کو بھی مجلس میں شرکت کے لئے مدعو کر رکھا تھا جن میں قیصر تمکین، ضیاء الدین شکیب، رضا علی عابدی، حبیب حیدر آبادی اور معین الدین شاہ صاحبان تھے۔ مجھے یہ ملا جلا اجتماع بہت اچھا لگا۔ صاف ستھرا اور پُر اثر۔ مجلس کے بعد بڑے پُر تکلف سے حصّے کی بھی تقسیم ہوئی کہ اودھ کا سلیقہ یاد آگیا۔ یہ کل پروگرام گھنٹے سوا گھنٹے میں ختم ہو گیا۔

باقر نے بتایا کہ روز عاشورہ یہاں بھی جلوس اٹھتا ہے اور لندن کی سڑکوں سے گزرتا ہے اور دن بھر مجلسیں بھی ہوتی ہیں۔ میرا مزاج یہ ہے کہ میں جلوسوں کو مجلسوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں نے اپنی کتاب "مرثیے کی سماجیات" میں بھی یہ بات لکھی ہے کہ محرم کے

www.taemeernews.com

جلوس ایک طرح کے احتجاجی جلوس (Protest March) ہیں جو ظلم کے خلاف آرگنائیز کئے گئے تھے۔ اور انھیں جلوسوں نے اقوام عالم کو واقعہ کربلا اور اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے۔ آپ کے گھر کی مجلسیں آپ کی قوم (Community) کے لئے ہیں جبکہ جلوس عوام الناس کو اس واقعے سے متعارف کراتے ہیں۔ اس لئے میں جلوسوں میں ضرور شریک ہوتا ہوں کہ یہ جلوس احتجاج کے مظہر ہیں۔ میں نے باقر سے کہا کہ میں جلوس میں چلوں گا۔ اور پھر ہم لوگ بارہ بجے کے قریب لندن کے ہائیڈ پارک کے اس سرے پر پہنچ گئے جہاں سے جلوس اٹھنے والا تھا۔ ٹھیک ایک بجے دن میں جلوس اٹھا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جلوس کے آگے آگے باقاعدہ ڈھول تاشہ اسی طرح بج رہا تھا جیسے یو۔پی کے دیہاتوں میں جب محرم کا جلوس اٹھتا ہے تو ڈھول تاشے بجائے جاتے ہیں۔ بس فرق یہ تھا کہ یو۔پی کے دیہات میں یہ ڈھول تاشے ڈفالی یا مہتر بجاتے ہیں اور یہاں باقاعدہ خوش پوشاک (Well Dressed) جنٹلمین، ڈھول تاشے بجا رہے تھے۔ یہ فن انھوں نے کیسے سیکھا ہوگا کہہ نہیں سکتا۔ اپنے بچپن میں مَیں نے بھی محرم کے ڈھول بجائے ہیں۔ اس لئے مجھ میں جو ہلچل ان ڈھول تاشوں کو دیکھ کر اور سن کر پیدا ہوئی اس کا اندازہ قارئین شاید ہی لگا سکیں۔ روشن چوکی، تُرہی، مجیرہ وغیرہ سب بالکل یو پی کے دیہاتوں جیسے بجائے جا رہے تھے۔ جلوس ضرور بے حد باقاعدہ تھا۔ دُو دُو کی قطار میں لوگ چل رہے تھے گویا مارچ کر رہے ہیں۔ ہر ملک کے لوگ جلوس میں شامل تھے ایرانی عراقی، عرب، پاکستانی، ہندوستانی وغیرہ وغیرہ۔ کچھ نومسلم انگریز بھی تھے۔ زیادہ تر لوگ سیاہ لباس پہنے تھے۔ اس جلوس میں عورتیں، بچے اور مائیں بھی اپنے چھوٹے بچوں کو پرام پر لٹائے ہوئے جلوس میں برابر سے چل رہی تھیں۔ عجیب منظر تھا۔ جلوس آکسفرڈ اسٹریٹ اور دوسری سڑکوں سے بڑے منظم ڈھنگ سے گزر رہا تھا۔ ماربل آرچ Marble Arch کے قریب جلوس پہنچا تو یکایک ایک انگریز زور سے چلایا "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اس حرامزادے ملک کو کیا ہو گیا ہے۔" اور یہ کہہ کر اس نے جلوس پر حملہ کرنا چاہا۔

www.taemeernews.com

مگر پولیس نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا اور فوراً سین سے ہٹائے گئی۔ پولیس نے یہ انتظام کیا تھا کہ سڑک کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ آدھے سے جلوس گزر رہا تھا اور آدھے سے ٹریفک۔ جلوس کے ساتھ علم بھی تھے اور انگریزی میں لکھے ہوئے بینرز Banners بھی۔ کچھ پمفلٹ بھی جن میں شہادت عظمیٰ کی اہمیت کے متعلق اطلاعات انگریزی زبان میں درج تھیں۔ کچھ پرچے "جلوس کیوں؟" ٹائپ کے بھی مختصر طور پر چھپے تھے۔ جو سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیئے جا رہے تھے۔ جلوس میں شامل ہر شخص دھیرے دھیرے ماتم کر رہا تھا۔ بلند مکانوں سے انگریز مرد، عورتیں اور بچے سب اپنی اپنی کھڑکیوں سے سنجیدگی سے جلوس دیکھ رہے تھے۔ اور ایک طرح سے زیارت کر رہے تھے۔ کچھ متحیّر بھی کہ یہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ جلوس تقریباً ایک میل لمبا تھا۔

پانچ بجے شام میں جلوس وہاں پہنچا، جہاں اسے ٹھنڈا ہونا تھا۔ یہ ایک گرجا گھر تھا جسے ایرانیوں نے خرید کر امام باڑے میں تبدیل کر لیا ہے۔ اور اس میں محرّم کی تقریبات انجام دیتے ہیں۔ ہم بے حد تھک گئے تھے اس لئے اختتام تک نہیں جا سکے۔ جلوس کا احترام بھی یہ تھا کہ بوڑھے لوگ اپنی اپنی گاڑیوں سے ذرا آگے چلے جاتے اور جب تک جلوس وہاں نہ پہنچ جاتا اسی طرح سڑک کے کنارے کھڑے رہتے۔ پھر تھوڑی دور ساتھ چل کر پھر اپنی اپنی گاڑیوں سے آگے چلے جاتے۔ ایسے لوگوں میں حبیب حیدرآبادی اور معین الدین شاہ صاحبان تھے جو برابر اسی طرح جلوس کے ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ مسلمان انگریز بھی تھے اور کچھ مسلمان انگریز عورتیں بھی۔

محرّم ختم ہوا تو میری گھومنے پھرنے کی رگ پھر پھڑکی۔ ۱۹۸۵ء میں آیا تھا تو بہت سے اہم مقامات چھوٹ گئے تھے۔ مجھے شاعر کیٹس کے ہیمپ اسٹیڈ HAMP STEAD کے نہ دیکھ سکنے کا بڑا افسوس تھا۔ اس مرتبہ میرا وہ ارمان پورا ہو گیا۔ کیٹس کی قیام گاہ اس کی بہت سی تخلیقات کو جنم دینے والی بھی رہی ہے۔ انڈیمین ENDYMION، اوڈ ٹو اے نائٹنگیل ODE TO A NIGHTINGALE، آٹم، اوڈ آن اے گریشین

www.taemeernews.com

اَرن اور ہائپیرئین (Hyperion) جیسی نظموں کی تکمیل اسی ہیمپ اسٹڈ میں سنہ ۱۸۱۹ء میں ہوئی۔ لوگوں کو سب سے زیادہ دلچسپی اس چیری یا اوک کے درخت میں ہے جس پر نائٹنگیل بولا تھا۔ اس میں بھی ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ بلبل چیری پر بولا تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اوک کے پیڑ پر، اور کچھ کا خیال ہے کہ بلبل صرف کیٹس کے احساس کی شاخ پر بولا تھا اور کہیں نہیں۔ اس پر بھی بحثیں چلتی رہتی ہیں کہ اگر بلبل بولا تھا تو رات میں کیسے؟۔ ہاں صبح صادق میں اس کا امکان ہے۔ پھر چیری کا درخت ایک سو بہتر برس تک کیسے باقی ہے۔ ہاں اوک اتنے دنوں تک باقی رہ سکتا ہے۔ مگر مجھے اس بحث میں پڑنا کیا ضرور ہے۔ میرے لئے تو یہی بہت تھا کہ یہاں جہاں انسان بیٹھ کر ایک دوسرے کا دکھ درد سنتے ہیں۔ جہاں فکر، سوا افسردہ ہو جانے کے اور کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔" "حسن، حقیقت ہے اور حقیقت حُسن"، " ایک حسین شے لافانی مسرت ہے"۔ یہی سب کچھ بہت ہے۔ یہاں پہنچتے ہی یہ سب ذہن میں ابھرنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے فینی براؤن Fanny Brawne کے رقص کا لباس، اسے پارٹیوں میں آتے جاتے دیکھ کر کیٹس کا افسردہ ہونا اور کہنا کہ میں جتنی محبت تم سے کرتا ہوں، تم نہیں کر سکتیں۔ ٹام کی موت اور خود کیٹس کا مرض الموت میں خون تھوکنا اور کہنا کہ میں پہچانتا ہوں، یہ میری موت کا خون ہے۔ پھر "To Think is to be full of sorrow" اور پھر فراق صاحب کا شعر:۔

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

یہی بہت ہے۔ پھر مجھے روما (Rome) میں کیٹس کے سنگِ مزار کی وہ تحریر ملی جس پر لکھا ہے۔ "یہاں وہ سو رہا ہے جس کا نام نقش بر آب تھا"

"Here lies one whose name was Written on Water"

تو مجھے اپنے شاعر خواجہ میر درد کا یہ شعر یاد آ گیا۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا آدمی بلبلہ ہے پانی کا

www.taemeernews.com

یہ ساری باتیں میری آنکھوں کے سامنے اس طرح تیزی سے گزر رہی تھیں جیسے میں کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔

گھر واپس لوٹ کر آیا تو جی بھاری بھاری سا تھا۔ باقر نے اُداسی کا سبب پوچھا تو میں نے دردؔ کا شعر پڑھ دیا۔ اچانک ٹی۔وی پر جنرل ضیاؔ الحق کے ہوائی حادثے کی خبر آنے لگی۔ اور خواجہ میر دردؔ کے شعر کی کتنی سچی تصویر سامنے تھی!!

اب میر انیسؔ کا شعر پڑھئے

لحد میں سوتے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو

قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو!!

اور عمر خیامؔ کا یہ مصرعہ بھی دہرائیے۔

عمر کو بانگ جرس سہا، دگجا نالہ کوس؟! (خیامؔ)

(۰)

www.taemeernews.com

تازہ ہوا کے جشن

'انجمن فکر و فن' بریڈ فورڈ (یارک شائر) کی ایک ادبی انجمن ہے جس کی روح رواں، جاوید اقبال ستار صاحب ہیں۔ جن کا حال ہی میں ایک عمدہ شعری مجموعہ "امکان سے آگے" شائع ہوا ہے۔ 'انجمن فکر و فن' بے حد فعال انجمن ہے اور انگلینڈ میں اردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہے۔ اسی طرح جیسے یہاں کا اخبار 'راوی' اردو صحافت کا چراغ جلائے ہوئے ہے۔ بریڈ فورڈ کی یہ ادبی انجمن، جولائی، اگست، ستمبر میں بے حد فعال رہتی ہے جب برصغیر سے شعرا اور ادبا، برطانیہ علی الخصوص لندن کے ادبی جلسوں میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔ یہاں بہت سے جلسے، مشاعرے، مذاکرے، جشن، رونمائی اور کتابوں کی نمائشیں، بریڈ فورڈ کے بک سنٹر پر یا قریب کے کمیونٹی ہال میں ہوتے ہیں۔ اگست ۱۹۸۸ء میں جب میں دوسری مرتبہ لندن پہنچا تو ستار صاحب کا دعوت نامہ ملا کہ انگلستان کے مشہور شاعر باقر نقوی کی کتاب 'تازہ ہوا' کی رسم اجرا ہو رہی ہے آپ اس میں شرکت فرمائیے۔ اب صحیح تاریخ تو یاد نہیں مگر تقریب اچھی طرح یاد ہے۔ ٹرینٹی روڈ Trinity Road کے ایک وسیع ہال میں یہ رسم اجرا انجام پائی۔ حیرت ہوئی کہ اس چھوٹے سے شہر میں اقبال ستار صاحب نے کیسے اتنے لوگ جمع کر لئے۔ لندن سے اسکاربرو سے باورتھ سے، برمنگھم سے، مانچسٹر سے اور جانے کہاں کہاں سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ رہے ہوں گے کوئی ڈھائی تین سو آدمی جو معہ جن بچوں کے اس ادبی اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ کچھ دور پر میری ہی عمر کا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس کا چہرہ کچھ مانوس سا لگا۔ بہت غور کرتا رہا مگر یاد نہ آیا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب گیا۔ یکایک بجلی کی طرح یادوں میں ایک لپکا سا ہوا۔ اور فوراً اس شخص کا نام میری زبان پر تھا۔ 'مصطفےٰ کریم! اور مصطفےٰ کریم

www.taemeernews.com

اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ کرسچین کالج الہ آباد ۱۹۴۶ء کے بعد آج ۱۹۸۸ء میں ہم لوگ انگلینڈ میں مل رہے تھے۔ مصطفےٰ کریم (جو اب ڈاکٹر مصطفےٰ کریم، ایم۔ ایس اور ایم ڈی ہیں) اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر میرے پاس اٹھ آئے اور پھر ہم لوگ بڑی دیر تک جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتے رہے۔ کرسچین کالج، تیغ (مصطفےٰ زیدی) سروج بھٹناگر، سرلا کپور، بھتور گنپت سنگھ (مصطفےٰ کریم کا روم پارٹنر، جو لڑکیوں کی طرح ہر وقت سنگار کئے رہتا تھا) اور جانے کیا کیا۔ مصطفےٰ کریم کو کرسچین کالج میں بھی افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ مگر یہاں انگلستان میں یہ شوق ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی 'گگلو' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے یہ مجموعہ مجھے لندن ڈاک سے بھیجا بھی۔ بہت اچھے افسانے ہیں۔ جو زیادہ تر ایشیائیوں کے انگلستان میں معاشی اور نفسیاتی مسائل سے متعلق ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسے اچھے افسانوں کو برصغیر میں ابھی تک ادبی نظر بازوں نے کیوں نہیں دیکھا۔

"تازہ ہوا" کی رسم اجرا ہوئی تو بہت سے لوگوں نے تقریریں کیں۔ ہندوستان سے قمر رئیس صاحب اور راقم الحروف نے تقریریں کیں۔ پاکستان کے مشہور کالم نگار عطاء الحق قاسمی مہمان خصوصی تھے۔ عاشور کاظمی، صفات احمد علوی اور رشید صاحب (انگارچہ) کے علاوہ برمنگھم کے دو ایک حضرات بھی تھے۔ جنھوں نے 'تازہ ہوا' پر اپنے تاثرات بیان کئے۔ آخر میں مہمان خصوصی نے باقر نقوی اور 'تازہ ہوا' پر بڑی مُسکت تقریر کی اور سب سے آخر میں خود باقر نقوی نے اپنا نظریۂ شاعری بیان کیا۔ یہ محفل تقریباً دو گھنٹے تک چلتی رہی۔ اس کے بعد شعر خوانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ مقامی شعرا خاصے نکل آئے۔ مڈلینڈ کے رشید صاحب نے بڑی اچھی غزلیں سنائیں اور خوب داد وصول کی۔ بیرونی شعرا میں جناب محسن بھوپالی اور کینیڈا کے اشفاق حسین تھے کچھ دو ایک خواتین بھی تھیں۔ مگر کسی کا نام اب یاد نہیں۔ یہ عجیب بات تھی کہ شعرائے کرام خاص طور پر مجھے اور قمر رئیس صاحب کو ہی مخاطب کر کے اشعار پیش کر رہے تھے۔ میں

www.taemeernews.com

ایسے موقعے پر معلوم نہیں کیوں ذرا شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہوں، جب شعرا مجھے مخاطب کرنے لگتے ہیں۔ سب سے آخر میں اقبال ستار جاوید نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں۔ اس طرح مشاعرہ بھی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔

تقریب کے ہال سے نکلے تو بک سینٹر پہنچے۔ یہ بک سینٹر بھی خوب دکان ہے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ میں نے غالباً اپنے سفرنامے میں بھی کیا ہے۔ بک سینٹر وہائٹ ایبی روڈ (White Ebby Road) پر واقع ہے۔ کتاب کی یہ دکان، اردو دنیا کی کتابوں کی دکان میں تقریباً لندن کی فوائیلس (FOYLES) جیسی ہے۔ کم از کم میں نے ہندوستان اور کراچی (پاکستان) میں ایسی منظم اور ماڈرن سسٹم کے ساتھ سجی ہوئی کوئی دکان نہیں دیکھی۔ آپ ہندوستان اور پاکستان میں چھپی ہوئی کوئی قابل ذکر کتاب مانگیے تھوڑی دیر میں یہ کتاب آپ تک پہنچ جائے گی۔ خواہ کہیں چھپی ہو۔ میں نے تجربے کے لئے پوچھا کہ ابھی ۱۹۸۶ء میں میرا سفرنامہ 'لندن اولندن' شائع ہوا ہے۔ کیا وہ بھی آپ کی دکان پر مل سکتا ہے۔ بک سیلر صاحب نے کہا 'جی ہاں'۔ اور پھر ایک بٹن دبایا۔ ۵ منٹ نہ گزرے تھے کہ ایک شخص 'لندن اولندن' کی کئی جلدیں لے کر آگیا۔ کتاب آئی تو میں حیران رہ گیا۔ کچھ دوست وہاں کھڑے تھے انھوں نے ایک ایک جلد وہیں خرید لیں اور مجھ سے ان کتابوں پر دستخط بھی کرالئے۔ اور وہیں کھڑے کھڑے پانچ جلدیں کتاب کی فروخت ہوگئیں۔ میں نے دکاندار سے بہت پوچھا کہ اتنی جلدی یہ کتابیں آپ کے پاس کیسے ہندوستان سے آگئیں۔ مگر وہ مسکراتے رہے اور اپنا یہ تجارتی راز انھوں نے مجھے نہیں بتایا۔ یہاں جب میں نے اردو پڑھانے کے مختلف چارٹ اور جدید طرز پر اردو جلد سیکھ جانے کے چند پمفلٹ دیکھے تو خیال ہوا کہ بریڈ فورڈ میں ضرور لوگ بڑی دلچسپی سے اردو سیکھ رہے ہیں۔ یہاں جماعت اسلامی اور دینی تعلیم کے بہت سے مدارس بھی قائم ہیں۔ ایشیائیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اردو تہذیب کو بریڈ فورڈ میں بڑھتا دیکھ کر قدامت پرست انگریز بریڈ فورڈ چھوڑ کر دوسری انگریز بستیوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ یا

www.taemeernews.com

منتقل ہو رہے ہیں۔ خیر یہ سب تو ہے۔ لیکن اگر انگلستان کا قانون کبھی اسی طرح بدلا جس طرح افریقہ کا قانون بدلا اور تمام غیر ملکیوں کو وہاں سے شہر بدر کر دیا گیا۔ تب اس تہذیب، زبان اور اردو کی نئی بستیوں کا کیا ہوگا؟ تو اتنی بڑی آبادیاں انگلستان کا ہارلم (HORLUM) ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ تو میں نے بھی دیکھا کہ ایشیائیوں کے جلسے جلوسوں میں انگریز اور گورے لوگ شاذ و نادر ہی شریک ہوتے ہیں۔ رالف رسل، ڈیوڈ میتھوز اور شیکل جیسے کتنے لوگ ہیں؟ کچھ انگریز مسلمان بھی ہوئے ہیں۔ کچھ نے ہندوستانی اور پاکستانی لڑکیوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ حبیب حیدرآبادی (مرحوم) کی ایک لڑکی سے ایک نو مسلم انگریز نے شادی کی ہے۔ میں ان صاحب سے ملا تو وہ ابھی اردو نہیں بول سکتے مگر "سلام علیکم اور انشاء اللہ" جیسے الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر مجھ سے بتایا گیا کہ یہ نو مسلم انگریز جمعہ کی نماز میں پابندی سے شرکت کرنے ہالینڈ پارک کی مسجد میں جاتے ہیں۔ کئی ایشیائیوں سے میری باتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ زیادہ تر ایشیائی یہاں تجارت کرتے ہیں۔ خود ستّار صاحب بھی وی۔ ڈی۔ او کیسٹ کی دکان چلاتے ہیں۔ یہ بات اچھی تو ہے مگر انگلستان کی نئی نسل ان تاجروں سے خاصی خفا رہتی ہے۔ اور جب موقع ملتا ہے رات میں ان کی دکانوں میں آگ بھی لگا دیتی ہے کچھ لوگوں نے مغلائی کھانوں کی دکانیں کھول لی ہیں۔ جو انگلینڈ میں بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ میں باقر کے ساتھ ایک کشمیری ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے داخل ہوا۔ تو بریانی اور گوشتابہ کے لئے ہر میز پر انگریز خاندانوں کی ایک قطار بیٹھی تھی ہمیں بمشکل تمام جگہ مل سکی۔ انگریز بریانی کو روٹیوں میں لپیٹ کر رول بنا کر کھاتے ہیں۔ میں نے بریانی لی تو کشمیری سے کہا "اَن سَاز مَادُود" (دہی لاؤ) کشمیری اپنی زبان سن کر بہت خوش ہوا اور جلد ایک پیالے میں دہی لے آیا۔ ہم نے بریانی میں ملا کر چمچ سے کھانا شروع کیا تو انگریز یہ طریقہ دیکھ کر جلد جلد دہی اور چمچے مانگنے لگے۔ بیچارے ہوٹل والوں کی مصیبت آ گئی۔ مگر اس طریقے سے ان کی بکری میں بھی اضافہ ہو گیا۔

www.taemeernews.com

شام ہوتے ہی یہاں کی مسجدوں سے اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہوئیں۔ انگلستان میں بریڈفورڈ مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ پورے شہر میں تقریباً پینسٹھ یا ستر مسجدیں اس وقت تک ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سال دو سال میں اور اضافہ ہو جائے۔ ایک مسجد سے گزرے تو جماعت اقامت کی منزل میں تھی۔ باقر بھی جا کر نماز میں شامل ہو گئے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ابھی تک ان مغربی ممالک میں وہ بیہودہ رسم نہیں پہنچی جس نے مسلمانوں کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ابھی تک مسجدوں میں یہاں ہر مسلک کا آدمی نماز پڑھ سکتا ہے۔ یقیناً یہ جُزاک اللہ اور وَمَا توفیق اللہ" والی بات ہے۔ تھوڑے سے انسان بھی اگر ایک نقطے پر اکٹھا ہو سکتے ہیں تو یہ بھی انسانیت کی فلاح و بہبود کی باتیں ہیں۔

دوسرا جلسہ

(برمنگھم میں)

عجیب شہر نکلا!! داخل ہوتے ہی یہ معلوم ہوا جیسے کباڑیوں یا مستریوں کے محلّے میں آگئے ہوں۔ کہیں کہیں یو۔پی کے شہر کانپور کا سا جلوہ نظر آیا۔ سڑکیں بے حد تنگ اور گندی۔ مشینوں اور بگڑی ہوئی گاڑیوں کو جگہ جگہ مستری ٹھونک پیٹ کرتے ہوئے۔ کہیں کہیں جلے ہوئے تیل اور موبل آئیل کی وہ چرا ہند کہ میں نے ناک بند کر لی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں لندن کا تصور لئے ہوئے تھا۔ اور برمنگھم ایک خالص کاروباری شہر تھا۔ سڑکوں پر کہیں کہیں کیچڑ ابلتا ہوا اور نالیاں مشینوں کے کچرے سے بھری ہوئی جب اس علاقے سے نکل کر جلسہ گاہ میں پہنچے تو وہاں نسبتاً کچھ صفائی تھی۔ مگر وہ بھی کیا۔ یہ علاقہ مجھے عین بَین گورکھپور کے گول گھر مارکیٹ جیسا معلوم ہوا۔ بس یہ کہ بھیڑ بھڑکا اتنا نہیں تھا کہ کہاں ہندوستان کی روز افزوں آبادی اور کہاں انگلستان میں کنٹرول شدہ آبادی۔ مکانات بھی چھدرے بسے ہوئے تھے۔ گورکھپور کے گول گھر مارکیٹ میں تو بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ مگر یہاں تو سڑکوں پر جیسے الّو بول رہے تھے۔ پاکستانی اور ہندوستانی قسم کے

www.taemeernews.com

ہوٹل ضرور یہاں شام کو خوب چلتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بکری اگر نہ ہوئی تو مالکوں اور ملازموں کو یہ کھانا کھا کر خود ختم کرنا ہوتا ہے یا اپنے دوستوں کی مدد حاصل کرنی ہوتی ہے۔

باقر نقوی کی کتاب کی رسم اجرا میں تقریباً بیس پچیس خواتین و حضرات پہنچ گئے تھے۔ اب تو صرف کچھ کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ اشفاق حسین (کینیڈا) شارب ردولوی، قمر رئیس، راقم الحروف (ہندوستان) محسن بھوپالی (پاکستان) عاشور کاظمی (لندن)۔ برمنگھم اور اس کے نواح سے جو لوگ آئے تھے ان میں صفی حسن، طاہرہ حسن، یاسمین حبیب، صفات احمد علوی اور حسنی صاحب کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ اپنی ایک خراب عادت یہ بھی ہے کہ کوئی نوٹ اور یادداشت لکھ کر نہیں رکھتا۔ بلکہ سب کچھ اپنی یادوں کے سہارے لکھتا ہوں۔ یہ عادت اس لئے بھی خراب ہے کہ نام کہاں تک کوئی یاد رکھ سکتا ہے۔ انسانوں کے نام جگہوں کے نام، پہاڑوں، دریاؤں کے نام اور پھر واقعات اور حادثات سب کا یاد رکھنا کہاں ممکن ہے۔ اس لئے بہت سی چیزیں چھوٹ جاتی ہیں۔ باقر کی کتاب پر کئی حضرات نے یہاں بھی تقریریں کیں۔ یہ جلسہ راقم الحروف کی صدارت میں ہوا۔ صدارت پہلے تو بہت معزز عہدہ ہوا کرتی تھی مگر اب نئی زندگی اور نئی تہذیب میں صدر محض ایک کاٹھ کا الّو ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ اس سے کوئی مشورہ کرتا ہے، نہ اسے کچھ بتاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آخر میں اسے سب کی تقاریر اور گفتگو کا محاسبہ کرنا پڑتا ہے اور پھر خود اپنے خیالات کا بھی اظہار۔ اور اگر کوئی صدر ایسا نہیں کر سکتا تو اس کی صدارت پھسپھسی سمجھی جاتی ہے میری ایک خراب عادت یہ بھی ہے کہ لوگوں کی تقاریر کا محاسبہ کرتے وقت اپنے کمنٹس (Comments) بھی پیش کر دیتا ہوں اور اس طرح اکثر مقررین مجھ سے کبیدہ خاطر بھی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ میں یہ باتیں بہت سنبھال کر کہتا ہوں۔

خواتین بھی تھیں مگر انھوں نے تقریریں نہیں کیں بلکہ غزلیں سنائیں۔ رشید صاحب (انگارچہ) ہی نے اپنے ہوٹل میں یہ بزم سجائی تھی۔ اور وہی میزبان تھے۔ وہ اچھے شاعر

www.taemeernews.com

ہیں مگر یہاں انھوں نے تقریر بھی اچھی کی۔ وہ باقر میاں کے جیسے جاں نثاروں میں سے ہیں اور ان سے خلوص بے پایاں رکھتے ہیں۔ 'تازہ ہوا' کے حوالے سے بڑی زندہ دلی سے وہ باتیں کرتے رہے۔ جن شعراء نے اپنے اشعار اور غزلیں سنائیں وہ اس لحاظ سے تو اچھی تھیں کہ ان میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ اور کیفیت سب کچھ موجود تھا۔ تاہم یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حضرات جن حالات اور آب و ہوا میں رہ رہے ہیں انھیں اپنے کلام میں پیش کیوں نہیں کرتے؟ ان کی تخلیقات میں نہ تو ان کی اپنی اس نئی زندگی کے تجربے ہیں نہ تشبیہات و استعارے، نہ امیجز (Images) نہ لفظیات اور نہ ایسی کوئی تبدیلی نظر آتی ہے جو ان کی نئی تبدیلی اور تہذیب و زندگی کا احساس دلائے بہتوں پر تو ابھی تک ہجرت کا خمار طاری ہے۔ جیسے وہ نئی فضا اور نئی زندگی سے مفاہمت نہیں کر پاتے۔ یہ کیا بات ہے؟ شاید یہ حضرات اپنی نئی زندگی کو صرف ایک عارضی صورت سمجھتے ہیں۔ ایک طرح کا Make shift انتظام کہ اصل انتظام تو ان کا اپنے اصلی ملکوں میں ہے۔ جو کچھ بھی ہو کہہ نہیں سکتا۔ زیادہ تر لوگ جیسے محض محفلیں گرم رکھنے کے لئے یا سجانے کے لئے ایسی شاعری پیش کر رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان شعرائے اردو در انگلستان کے سامنے صرف برصغیر کے شعری معیار ہیں اور انھیں سے یہ آج تک اپنی تخلیقات کو آنکتے رہتے ہیں۔ کسی پنجابی گیت میں، اردو کے ڈھنگ سے ایک مصرعہ سنا تھا۔ ع "لکھا پردیس قسمت میں وطن کو یاد کیا کرنا" یا افتخار عارف نے جو بات ایک مرتبہ اپنی غزل میں کہی تھی کہ ع "بابا ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے" تو ایسی ہی صورتیں ان شعرائے اردو در انگلستان میں نظر آتی ہیں۔ ہاں صرف ساقی فاروقی کے یہاں ضرور نئی فضا اور نئی زندگی کا تاثر ملتا ہے ورنہ مغرب کے تمام اردو شعراء اور شاعرات کے لئے یہی تمام باتیں کہی جا سکتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ہو سکتا ہے، ساقی فاروقی کی طرح اور بھی کچھ لوگ ہوں جن سے میں واقف نہیں۔ مگر مجموعی صورت مجھے یہی نظر آئی۔ تاہم یہ کوئی نقص نہیں۔ اسے صرف امر واقعہ ہی سمجھنا چاہئے۔ نسٹالجیا ہر قوم میں ایک وقت تک رہتا ہے۔ برطانیہ سے جب

www.taemeernews.com

فادر پلگرمس (Father Pilgrims) امریکہ گئے تو انھوں نے نئی سرزمین میں اپنے پرانے شہروں کے نام تک رکھ ڈالے۔ مگر خیر انسانی ذہن کی نیرنگیوں پر کون قدغن لگا سکتا ہے

شام ہو رہی تھی کہ محفل ختم ہوئی۔ ہم لوگ وہاں سے اُٹھے تو صفی حسن صاحب کے یہاں ڈنر کے لئے روانہ ہوئے۔ کسی نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا کہ یہ برمنگھم یونیورسٹی ہے۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ میں نے باقر سے یونیورسٹی چلنے کو کہا۔ گئے تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ صرف باہر سے عمارت کی زیارت کر لی۔ مگر یہ جگہ خاصی صاف ستھری نظر آئی یہاں آبادی بھی بے حد چھدری ہے۔ تھوڑی ہی دور پر اکّا دکّا مکان نظر آئے۔ آبادی بہت کم معلوم ہوئی۔ زندگی کی رفتار بھی کافی سست۔ بھلا سترہویں اور اٹھارویں صدی میں یہ شہر کیا رہا ہوگا! صرف برصغیر کے قصبات جیسی صورت رہی ہوگی۔ صفی حسن صاحب کے یہاں کھانا کھا کر ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ خدا کا فضل ہوا کہ شاعری کی کمائی نہیں کھلی۔ ورنہ دو ایک گھنٹے اور صرف ہو جاتے۔ ڈھائی تین گھنٹے میں ہم لوگ لندن پہنچ گئے۔

دوسرے دن اچانک باقر دوپہر ہی کو دفتر سے واپس آگئے۔ وہ خوش بھی تھے اور افسردہ بھی۔ انھیں لیڈس (LEEDS) میں کسی فرم کو بینک سے قرض دئے جانے کے لئے فرم کی اصل صورت کی تفتیش کرنی تھی۔ خوش اس لئے کہ مجھے ایک اور نیا شہر دکھانے کا انھیں موقع ملا۔ اور افسردہ اس لئے کہ آج کا دن بھر اکیلا گزارنا پڑے گا۔ لیڈس کا نام سن کر میں بھی خوش ہوا کہ ایک اور یونیورسٹی دیکھنے کو ملے گی۔ میں لیڈس کو ہمیشہ خواجہ غلام السیدین کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھتا ہوں۔ خواجہ صاحب کی دو ایک کتابیں میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھیں جن پر ان کی ڈگریاں اور لیڈس یونیورسٹی کا نام درج رہتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ لیڈس اور خواجہ غلام السیدین میرے ذہن میں ساتھ آتے ہیں۔ خیر دوسرے دن ہم لوگ علی الصباح لیڈس کے لئے روانہ ہو گئے۔ پہنچے تو لیڈس کی آبادی خاصی پرانی لگی۔ لندن کے پرانے محلوں جیسی۔ مجھے اس کے بہت سے حصے "گریٹ فائر

www.taemeernews.com

آف لندن، والے علاقے جیسے لگے۔ ویسا ہی پرانا پن، بلند و بالا مکانات جن پہ عظمتِ پاستانی، سایہ فگن تھی۔ کسی سے دریافت نہ کیا کہ یہ شہر کب آباد ہوا ہوگا؟ مگر خاصہ پرانا شہر معلوم ہوا آبادی اور رقبے کے لحاظ سے بھی شہر بہت بڑا تو نہیں مگر بہت گنجان آباد ہے۔ نئے علاقے البتہ کھلے ہوئے ہیں مگر ان میں مجھے آؤٹ ہاؤس یا اینکسی (Annexe) جیسا ماحول نظر آیا۔ شہر کے باہر کے کچھ علاقے بالکل الہ آباد کا سول لائنز معلوم ہوئے۔ بلکہ الہ آباد میں سول لائنز کے مکانات زیادہ اچھے بنے ہوئے ہیں۔ باقر جب اپنا کام کر چکے تو ہم لیڈس یونیورسٹی پہنچے۔ یونیورسٹی ایک بے حد بلند کرسی پہ بنی ہوئی ہے۔ کرسی اور بلند ہو جاتی تو فتح پور سیکری کے بلند دروازہ جیسی کرسی ہو جاتی۔ بڑے بڑے اور موٹے موٹے کھمبوں پر بیرونی دالان ٹکا ہوا ہے اور قریب ہی یورپ کی روایتی تعلیم گاہوں کی طرح ایک چرچ بھی موجود ہے جس کے کلس کا سونا دور سے چمکتا نظر آتا ہے۔ یورپ کے تقریباً تمام قدیم تعلیمی اداروں کے ساتھ ایک گرجا گھر ضرور موجود ہے۔ آکسفرڈ، کیمبرج، پیرس کی سوربون ہر جگہ یہ گرجا گھر تعلیمی اداروں سے ملحق ملیں گے۔ اسلامی طرزِ تعلیم بھی مدرسوں کی صورت میں مسجدوں ہی سے وابستہ تھا کہیں کہیں آج بھی مسجدیں ابتدائی تعلیم گھر بنی ہوئی ہیں۔ چودھویں صدی کی دلّی میں بھی یہ صورت موجود تھی۔ فیروز تغلق کا مدرسہ، خانقاہوں میں ابتدائی تعلیم کے انتظامات سب اس کا ثبوت ہیں۔ عجب نہیں کہ یورپ میں یہ تصور مسلمانوں ہی کے ذریعہ پہنچا ہو کہ اُندلس میں اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اعلا نمونہ اہلِ یورپ دیکھ چکے تھے۔

لیڈس یونیورسٹی کی خوبی مجھے اس کے بھاری بھرکم Massive ہونے میں نظر آئی۔ معلوم نہیں کہ تعلیمی معیار کیسا ہے۔ ہاں یہاں طریقۂ تعلیم کو شاید مخصوص طور پر اہمیت حاصل ہے طریقۂ تعلیم کیلئے یہاں کی ڈگریاں خاصی وقیع ہوا کرتی ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے لیڈس اور ایڈنبرا یونیورسٹیوں کی ٹی۔ ڈپ T. Dip یعنی ٹیچرس ڈپلوما کی ڈگریاں ہندوستان کے تعلیمی نظام میں خاصے کی چیز سمجھی جاتی تھیں۔ ہم تھوڑی دیر تک لیڈس یونیورسٹی کی راہداری میں گھومتے رہے۔ ایک نظر لائبریری اور اس کے ریڈنگ روم پر بھی ڈالی جہاں شاید ریسرچ کے طلبا مصروفِ مطالعہ تھے۔ پھر ہم نیچے اتر آئے۔ شہر خاصہ خاموش ہے اور یونیورسٹی کا علاقہ تو مزید خاموش۔ لیڈس یونیورسٹی دیکھ کر میں نے اپنی ٹوپی میں ایک اور پر لگا لیا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

www.taemeernews.com

جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

چلئے آج سے پورے سو برس نہ سہی، ایک سو دس برس پہلے سہی۔ مولانا حالی نے شاعروں کے لئے کہا تھا کہ

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے   جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

اور ان کے سوچنے کا وہی طریقہ تھا جو افلاطون کا تھا کہ شعرا ہی معاشرے کو برباد کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ کیا کرتے ہیں؟ مگر حالی، افلاطون سے اس طرح الگ ہوئے کہ انھوں نے خود بھی شاعری کی اور نہ صرف شاعری کی بلکہ اپنا ایک پورا دیوان چھوڑ گئے جسکے مقدمے میں انھوں نے شاعری کے تجزئے میں کیسی کھکھیڑ اٹھائی؟ اصل میں حالی کے وقتوں میں مسلمانوں کا معاشرہ بھی ہندوستان میں انھیں حالات سے دوچار تھا جیسا کہ افلاطون کے زمانے میں یونان کا معاشرہ۔ جب ہی تو افلاطون نے یہ حکم لگایا تھا کہ میں اپنی خیالی ریاست میں شاعروں کو گھسنے نہ دوں گا کہ یہی لوگ معاشرے کو برباد کرتے ہیں۔ اصل بات یہ سمجھی گئی کہ شاعر صرف خیالی عیش و مسرت کی باتیں کر کے انسانوں کو خوگر عیش و نشاط کر دیتے ہیں۔ اور معاشرے کو تعمیری صورتوں اور عملی زندگی سے دور رکھے جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ ناکارہ اور مجہول ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاعر کے لئے "دیدۂ بینائے قوم" کی بات تو بہت بعد کی ہے۔ اسلام کی روشنی پھیلنے سے پہلے عرب معاشرے کا بھی یہی حال تھا۔ جہاں امراء القیس، عمرو بن کلثوم اور لبید وغیرہم کی شاعری، عرب کے معاشرے کو برباد کر رہی تھی۔ جب ہی تو قرآن کریم میں بھی شعرا کے لئے ایک پوری آیت نازل ہوئی۔ خیر یہ سب تو تحقیق اور تجزیئے کی باتیں ہیں۔ اگرچہ آج بھی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں کہ ادب کا مطلب صرف شاعری ہی ہے۔ جبھی تو ہر محفل میں چاہے وہ ادبی نثر کا سیمینار ہو

www.taemeernews.com

ناول اور افسانے یا فکشن پر بحث و مباحثے ہو رہے ہوں۔ جب سب ختم ہو جاتا ہے تو چپکے چپکے لوگ شاعری کی کمانی کھولنے لگتے ہیں اور پھر سیمینار یا نثر کی محفلیں محافل مشاعرہ میں بدل جاتی ہیں۔ لیکن کسی مشاعرے کے اختتام پر کیا کسی نے کبھی کوئی نثر کی محفل ہوتے دیکھا ہے؟ یہ سب وہی بات ہے کہ شاعری اعلیٰ قسم کی تخلیق ہے اور اب اس کے بعد، نثر، جو ادنیٰ ادب ہے اس کی محفل کیوں بار یاب ہو؟ فراق صاحب نے ایک دوسرا راستہ مفاہمت کا بیچ سے نکال لیا تھا اور وہ یہ کہ جب کبھی وہ تقریر کرتے تو آخر میں آپ ان سے لاکھ شعر سنانے کی فرمائش کیجئے وہ کبھی شعر نہیں سناتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نثری تقریروں یا مقالوں کے بعد اگر شعر خوانی ہوئی تو نثر کا تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شاعری کے بعد کوئی نہ تقریر وہ کرتے تھے اور نہ محفل میں کسی کو مقالہ پڑھنے یا افسانہ سنانے دیتے۔ مگر مغرب میں اردو کی بستیاں جو بسی ہیں وہ اسی طرح سوچتی ہیں کہ صرف شاعری ہی ادب ہے۔ خیر یہ بحث اکثر اٹھتی رہی ہے اور آئندہ بھی اٹھتی رہے گی۔ لوگ صرف شاعری ہی کو وہبی چیز سمجھتے ہیں اور ادب کے جملہ شعبوں کو اکتسابی۔

اگست ۱۹۸۶ء کا وسط تھا جب بخش لائل پوری نے مجھے اور باقر نقوی کو ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ آج شام کو ان کے گھر کے نزدیک کسی ہال میں عطاء الحق قاسمی کے اعزاز میں ایک نشست ہوگی جس میں قاسمی صاحب اپنے خاکے اور طنزیہ کالم سنائیں گے ہم بروقت پہنچ گئے۔ وہاں پندرہ بیس آدمی اکٹھا ہو گئے۔ ان میں شاعر، ادیب، ادھوری صحافی اور کچھ دانشور بھی آ گئے۔ پروگرام شروع ہوا تو مشہور ناول نگار عبداللہ حسین محفل کے صدر چنے گئے اور پھر عطاء الحق قاسمی نے اپنی حالیہ تصنیف سے کچھ خاکے اور کچھ طنزیے اور فکاہیے پیش کئے۔ قاسمی کے دو مجموعے "عطائیے اور روزن دیوار سے" میں پڑھ چکا تھا۔ اسی دوران میں ان سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ وہ ایک مدرس بھی ہیں۔ اور کالم نگار بھی اس لئے انسانی نفسیات اور اس کی بدلتی ہوئی سماجی صورتوں پر ان کی گرفت بہت اچھی

www.taemeernews.com

ہے۔ یہ تمام صورتیں "تبسم زیرلب" کے بڑے اچھے خیال پارے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے پطرس، مجید لاہوری اور کسی حد تک رشید احمد صدیقی کے بیچ سے اپنا راستہ نکالا ہے اور میرے خیال میں نئے لکھنے والوں میں یقیناً ان کا انداز تحریر سب سے بہتر ہے۔ خواہ ڈاکٹر وزیر آغا انھیں اچھا طنز نگار مانیں یا نہ مانیں (بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے!) یوں تو عطاء الحق صاحب شاعری بھی کرتے ہیں اور یورپ وہ بہ حیثیت شاعر ہی جاتے ہیں۔ مگر یہ دوسری بات ہے۔ میں نے ، ایسے اچھے فکاہیئے پیش کرنے پر انھیں مبارکباد دی تو وہ بڑے متشکر ہوئے۔

خیر تو عطاء الحق قاسمی صاحب نے کچھ فکاہیئے، بڑے دلچسپ انداز میں پیش کئے۔ پھر ایک صاحب نے قاسمی کے فن پر ایک طویل مقالہ بھی سنایا۔ مجھے خیال گزرا کہ آج عبداللہ حسین صاحب بھی اپنا کوئی افسانہ سنائیں گے۔ مگر عبداللہ حسین نے کچھ نہیں پڑھا۔ میں نے عبداللہ حسین کی تقریباً ساری کتابیں پڑھ لی ہیں۔ کم از کم تین مرتبہ انھیں محفلوں میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ دو مرتبہ لندن میں اور ایک مرتبہ دلی کے پریم چند سیمنار میں جہاں انھوں نے زبان انگریزی میں اپنا تنقیدی مقالہ پیش کیا تھا۔ مجھے کبھی ان سے گفتگو کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ وہ قد میں بھی اس قدر بلند و بالا ہیں کہ ان تک پہنچنا کسی عرفان حاصل کرنے سے کم نہیں۔ میں انھیں دوسروں سے گفتگو کرتے ہی دیکھ کر استخراج نتائج کرتا ہوں۔ اور میں گومگو کے عالم میں ہوں کہ انھیں کیا سمجھوں۔ وہ شخص جو "اداس نسلیں ، باگھ اور ندی" جیسے ناول اور ناولٹ لکھتا ہے وہ گفتگو میں بے حد کمزور اور بے رس (Poor) معلوم ہوا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ، ہر کہہ و مہہ کے سامنے اپنے علم کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتے پھر جب عبداللہ حسین نے اپنی صدارتی تقریر اتنے حاضرین کے سامنے کی تو وہ بھی بے حد پھسپھسی تھی اور اسے قطعی دانشورانہ نہیں کہہ سکتے۔ نہ انھیں عطاء الحق قاسمی کے فن کے متعلق کچھ اچھی معلومات تھیں اور نہ ان کے کالموں کو شاید انھوں نے کبھی غور سے

www.taemeernews.com

پڑھا تھا۔ اور نہ انھیں پاکستان و ہندوستان کے مزاح نگاروں کا کوئی گیان تھا۔ یہ بالکل غالب اور گوئٹے والی تقریر مجھے معلوم ہوئی۔

یکا یک شاعری کی کمانی کھل گئی جیسا کہ مجھے اندیشہ تھا۔ پھر بخش لائل پوری عاشور کاظمی، باقر نقوی، راج کھیتی، ساقی فاروقی، ایک خاتون جن کا نام یاد نہیں (یہاں بھی مشاعرے بغیر خواتین کے نامکمل سمجھے جاتے ہیں)، دو ایک سردار حضرات اور بلبل کاشمیری نے اشعار سنائے۔ بلبل کاشمیری نے مجھے اپنا مجموعہ "خندۂ گل" عنایت کیا۔ اس مجموعے میں اپنی تصویر کے نیچے انھوں نے اپنا تعارف لکھ رکھا ہے۔

سلام و علیکم اڑا جا رہا ہوں
مزا ہے بس ہے نہیں

واقعہ یہ ہے کہ "گل" کشمیر میں مردوں کا نام نہیں ہوتا بلکہ یہ 'غلام' کا کشمیری میں مخفف ہے۔ کشمیر میں 'غلام علی' اور 'غلام محمد' نام بہت ہوا کرتے ہیں جنھیں کشمیری تخفیف کرکے 'گل' یا 'گلا' کہا کرتے ہیں۔ حضرت بلبل کاشمیری کا پورا نام 'غلام علی' ہے اسی لئے انھوں نے تخفیف کرکے اپنا نام گل بتایا ہے۔ مجھے ان کا یہ تعارف پسند آیا۔ "خندۂ گل" مجموعہ پڑھا تو لندن کی زندگی سے متعلق بڑی دلچسپ نظمیں تھیں۔ خاص طور پر لندن کی رات، مادام لندن شہر ہیں" اور اختر شیرانی کی نظموں پر جو نظمیں لکھی گئی ہیں، پھر غزلوں میں بھی حالات کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ جیسے 'ریڈی غزل' (جس میں چیئرز ڈل کے پڑھتے ہوئے ریڈیوں پر طنز ہے) لطیفی غزل، تو دی غزل، موٹر غزل وغیرہ۔ اگرچہ بلبل کاشمیری کا حق تھا کہ طنز و مزاح کی اس محفل میں وہ جی بھر کر اپنا کلام سناتے مگر انھوں نے ایک بہت مختصر سی نظم سنائی۔ اور خاموش بیٹھ گئے۔ شاید "تحسین ناشناس" کے اس دور میں وہ اپنا کلام برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلط سمجھتا ہوں مگر لندن میں بھی "تحسین ناشناس" کی خوب گرم بازاری ہے۔ برصغیر میں تو اکثر مشاعروں میں وہ دھما چوکڑی مچتی ہے کہ شور و غل غپاڑے ہی سے شاعر کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس کیفیت سے شاعر بھی ہشیار ہو گئے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کلام پیش کرتے ہیں کہ سارا پنڈال ہل جاتا ہے

www.taemeernews.com

اور خود اتنا شور مچاتے ہیں کہ ایک کمزور شاعر جو چلایا تو اس کے حلق کا کوا گر گیا۔ پھر لوگ اسے پنڈال سے اٹھا کر ڈاکٹر کے یہاں لے گئے۔ مگر اب "تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس" دونوں ان معنوں میں نہیں رہ گئے جن معنوں میں صائب نے انھیں استعمال کیا تھا۔ اب صرف "شور شناسی" کا دور ہے۔ لندن کی شعری صحبتوں میں بھی یہ صورت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ کچھ تو واقعی اچھے شاعر ہیں اور کچھ ہندوستان اور پاکستان کے رسائل کی بدولت شاعر بن جاتے ہیں اور محفل میں سرخرو ہو لیتے ہیں۔ اگر برائٹن یا بادرتھ میں مشاعرہ ہوا تو ناصر کاظمی یا بیکل اتساہی کی غزلیں ان کے کام آتی ہیں۔ بریڈ فورڈ کے ایک مشاعرے میں میں تھوڑی دیر کے لئے رفع حاجت کے لئے چلا گیا۔ وہیں یکایک میرے کانوں میں بیکل اتساہی کے پڑھنے کی آواز آئی۔ میں حیران ہوا کہ ابھی تک جب میں بیٹھا ہوا تھا بیکل صاحب تو نہیں تھے یہ اچانک کہاں سے آگئے۔ بالکل وہی آواز وہی کلام۔ کہیں سے شبہے کی گنجائش نہ تھی۔ محفل مشاعرہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک تیس بتیس سال کے مولوی نما حضرت، بیکل صاحب کا کلام ان کی جوانی والی آواز میں اپنا کلام کہہ کر پڑھ رہے ہیں۔ ختم کلام کے بعد میں اُن سے ملا اور کلام کی تصدیق چاہی۔ انھوں نے اسے اپنا کلام بتایا۔ میں نے ازراہ مذاق کہا کہ اچھا تو یہ آپ کا کلام ہے جو بیکل صاحب اڑا کر ہندوستان میں پڑھتے پھرتے ہیں۔ مولوی تو ہشیار ہوتے ہی ہیں۔ انھوں نے جواب میں صرف یہ کہا کہ ہاں چند سال قبل، بیکل صاحب لندن آئے تھے۔ اب اس جواب میں دونوں اشارے موجود ہیں۔ سمجھنے والا دونوں باتیں سمجھ سکتا ہے اور مولانا کی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔ میاں صاحبزادے کسی مسجد کے امام بھی تھے۔ بھلا جو "دلق اویس و چادر زہرا" بیچ کھاتا ہو۔ اس کے لئے بیکل اتساہی کا کلام کیا ہے؟!

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ آخر شاعر بننے کے کیوں خواہش مند رہتے ہیں؟ آخر شاعری سے ہر کس و ناکس کو کیا ملتا ہے؟ کیا بغیر شاعر ہوئے انسان کی تکمیل نہیں ہوتی؟ خیر عام لوگوں کو تھوڑی سی شہرت سے دلچسپی ہو سکتی ہے مگر جو لوگ شہرت یافتہ ہوتے ہیں، وہ بھی

www.taemeernews.com

اس بات کے متمنی ہوتے ہیں کہ انھیں شاعر بھی مانا جائے۔ شاید بغیر شاعری کے نہ تو دانشوری مکمل ہوتی ہے اور نہ محفل۔ عقیقہ ہو یا عقد، سالگرہ ہو یا عرس، دکان کھلنے کی تقریب ہو یا سیاسی میٹنگ، شاعری کے لیئے وقفہ اور موقع نکال ہی لیا جاتا ہے۔ غم کی محفلوں میں بھی شعرا نے مرثیے کے قطعات تاریخ پیش کرکے اپنی شعر کہنے اور پیش کرنے کی حسرت پوری کرلی ہے۔ نقاد حضرات بھی جو زندگی بھر نثر لکھتے رہے، آخر آخر میں اپنا مجموعۂ کلام پیش کردیتے ہیں۔ پرانے نثر نگاروں میں فضلی، عطا حسین خاں تحسین، رجب علی بیگ سرور محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، ابوالکلام آزاد، سرسید احمد خاں، آسی، مرزا ہادی رسوا مرزا، احمد صدیق مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، اعجاز حسین، ڈاکٹر محی الدین زور، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، اختر اورینوی، کلیم الدین احمد یہاں تک کہ گیان چند جین اور محمد حسن صاحبان کے بھی کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ابھی قمر رئیس اور راقم الحروف کا مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ قمر رئیس صاحب تو ماشاءاللہ مکمل شاعر بھی باقاعدہ مشاعروں میں پڑھتے ہیں، مگر راقم نا سمجھ نے نہ مشاعروں میں اپنا کلام پیش کیا اور نہ کوئی مجموعۂ کلام ترتیب دیا۔ جس زمانے میں جدیدیت کا عروج تھا راقم نے بھی یہ کہہ کر بہت سی نظمیں لکھ ڈالیں کہ اس طرح کی نظمیں تو میں ایک دن میں کئی کہہ سکتا ہوں اور واقعی ایک ہفتے میں کئی نظمیں صرف تجربے کے لئے لکھ ڈالیں۔ مگر ایسی شاعری سے کیا فائدہ؟ سنا ہے کہ مشہور ناول نگار عزیز احمد آخر آخر میں کہنے لگے تھے کہ انھوں نے ناول لکھ کر اور ادب سے دلچسپی لے کر اپنا وقت برباد کیا ہے۔ آخر انھیں کیا ملا؟ خیر راقم الحروف کی اول تو حیثیت ہی کیا ہے۔ مگر راقم یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ادب سے دلچسپی لے کر وقت برباد کیا ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح میں نے اپنی تلاش کی ہے اور اپنی صلاحیتوں اور نااہلیوں کو ڈھونڈنے کی فکر کی ہے۔ ذہین اور دانشوروں کی دنیا کا ایک ایسا مسافر بنا جس نے مجھے انسانی زندگی اور اس کے پیچ و خم کو سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ اگر ادبی دلچسپی واقعی بے کار کا مشغلہ ہے تو عجیب سے علم و ادب کا چرچا ہوا ہوگا، آج تک انسانوں نے

www.taemeernews.com

کتنا وقت اور کتنی انرجی اور ساتھ ہی ساتھ کتنی دولت برباد کی ہوگی؟ راقم تو یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ راقم نے ادب ہی کی مدد سے انسان دوستی، مذہبی ہم آہنگی اور عقل کی فرزانگی کا سبق سیکھا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ "العلمُ حجابُ الاکبر" اور یہ بھی کہ صارفیت کے اس دور میں علم و آگہی کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ "کیا فائدہ" کا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ ہم علم سے صرف کسی مادی فائدے کی تلاش میں ہیں۔ شاید علم کی اتنی تذلیل کبھی نہیں ہوئی جتنی اس زمانے میں ہے۔ یہ صورت صرف اپنے یہاں ہی نہیں ہے، یورپ میں بھی تقریباً یہی صورت ہے کہ علم و آگہی کی تلاش میں رہنے والے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں اسی لئے لوگوں نے وہاں اب اعلیٰ تعلیم کا تصور چھوڑ دیا ہے۔ بس اتنی تعلیم حاصل کرو جو دولت حاصل کرنے میں معاون ہو۔ ہندوستان میں حرف شناسی کا تو بڑا زور ہے مگر معیارِ تعلیم روز بروز پست ہو رہا ہے۔ ایسے میں شعر گفتن چہ ضرور؟ مگر لوگ ہیں کہ شاعری کر رہے ہیں۔ شاید اردو زبان میں اتنے شعری مجموعے کسی اور زمانے میں شائع نہیں ہوئے جتنے کہ فی زمانہ شائع ہو رہے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ بات علمائے ادب اور مدیرانِ علم و آگہی کے سوچنے کی نہیں ہے؟ کیا اس مسئلے پر بھی مذاکرات اور سیمینار نہیں ہونے چاہئیے ہیں۔ آخر اس کا تجزیہ کیوں نہ ہو؟

ستمبر کا پہلا ہفتہ رہا ہوگا کہ مجاہد ترمذی نے ایک شعری نشست لندن کے ساؤتھ ہال میں رکھ دی اور خود آکر مجھے شام کو اپنے ساتھ اس میں شرکت کے لئے لے گئے۔ وہاں پہنچا تو احمد فراز، راج کھیتی، عاشور کاظمی، دیوان محمود، اقتدا خاں اور دو ایک حضرات شعرائے کرام میں سے موجود تھے۔ باقر میاں اپنے کسی کام سے مڈلینڈ چلے گئے تھے، اس لئے وہ اس محفل میں نہ تھے۔ احمد فراز نے بہت اچھی غزلیں اور دو ایک نظمیں بھی سنائیں۔ وہ یقیناً درجۂ اوّل کے شعرا میں سے ہیں اور شاید فیض کے بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہوں پر سب سے سربلند شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں وہ ایک غزل اور ایک شعر کے شاعر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ایک غزل "رنجش ہی سہی دل کو

www.taemeernews.com

دکھانے کے لئے آ"   اور ایک شعر

اب کے بچھڑے ہوئے شاید کبھی خوابوں میں ملیں   جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

عجیب بات ہے کہ ان کی یہ دونوں چیزیں لڑکیوں اور خواتین میں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ بہت دنوں تک یہ اوپر کا شعر الہ آباد میں فراق صاحب کے نام سے مشہور رہا۔ ایک دن الہ آباد یونیورسٹی کی ایک خاتون استاد جو شعبۂ انگریزی میں ہیں بطور خاص میرے پاس تصدیق کے لئے آئیں کہ یہ شعر کس کا ہے؟ تمام لوگ اسے فراق صاحب کا کہتے ہیں۔ جب میں نے انھیں احمد فراز کا نام بتایا تو اس وقت تک انھیں احمد فراز کا نام معلوم نہ تھا۔ پھر کسی گلوکار نے جب احمد فراز کی اوپر لکھی ہوئی غزل اپنی آواز کی ساتھ پڑھ کر پیش کر دی تو احمد فراز ہندوستان میں بھی عام سامع اور قاری میں مشہور ہو گئے۔ خیر تو ساؤتھ ہال کی یہ محفل زیادہ دیر نہیں چل سکی مگر مجھے احمد فراز کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ اور ان سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بہت پہلے ملاقات ہوئی تھی مگر وہ اس ملاقات کو بھول چکے تھے۔ یہ واقعہ بھی ہے کہ کوئی کہاں تک یاد رکھے اور کسے یاد رکھے۔ یہیں معلوم ہوا کہ احمد فراز کا اصل وطن پشاور ہے اگرچہ اب وہ لاہور میں رہ رہے ہیں۔ ضیاء الحق حکومت میں وہ لندن میں مقیم تھے اور پاکستان کے دروازے ان پر بند تھے۔ ہر ترقی پسند دانشور کے لئے اس وقت پاکستان میں یہی صورت تھی۔ بہر حال یہ محفل زیادہ نہیں چل سکی۔ مگر احمد فراز کو اچھی طرح سننے کا یہ بہترین موقع ملا۔

www.taemeernews.com

سُنار بانگلہ

آمار سُنار بانگلہ، آمی تماٹے بھالو باشی
چرو دِن تمار، آکاش تمار، باتاس آمار پراٹے، اباجائے بانشی
او، ماں، پھاگن تور، آمر سے ایتے گھرانے پاگل کرے
مری، ہائے، ہائے رے۔

(اے میرے سنہرے بنگال۔ میں تیرا عاشق ہوں۔ ابدالآباد سے تیرے آسمان تیری ہوائیں، میری روح میں بانسری بجا رہے ہیں۔ اے ماں! پھاگن میں تمہارے مہکتے ہوئے آم کے باغ مجھے پاگل کر دیتے ہیں۔

آہ، میں مرا، میں مرا، رے) (ٹیگور)

صبح کو آنکھ کھلی تو ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تا حد نظر۔ زمین تھی کہ جیسے بچھی ہوتی چلی جارہی تھی۔ اور واقعی مہکتے ہوئے آموں کے سبز باغوں کی مہک ہمارے نتھنوں میں گھسی آرہی تھی۔ یہ پھاگن ہی کا مہینہ بھی تھا۔ آئیون پال گھوش تھا تو عیسائی مگر آخر بنگال کا رہنے والا بھی۔ اور کرسچین کالج الہ آباد میں جب اس کی طبیعت موج میں آتی تو ٹیگور کا یہ نغمہ بڑے جذب کے عالم میں اکثر گانے لگتا۔ اور اتنا گاتا کہ مجھے یہ ابتدائی حصے تقریباً ازبر ہو گئے تھے۔ اور آج جیسے ہی بنگال کی سرزمین شروع ہوئی، اچانک تقریباً پچاس سال بعد آئیون پال گھوش کے گائے ہوئے یہ ٹیگور کے مصرعے میری زبان پر اچانک اس طرح آگئے کہ مجھے خود حیرت ہوئی۔ میں کلکتہ ایک سیمینار اور ایک 'ابھی نندن سماروہ' میں شامل ہونے کے لئے جارہا تھا۔ مارچ ۱۹۸۹ء کی بالکل ابتدائی تاریخیں تھیں۔ اور یہ میرا کلکتے کا پہلا سفر۔ ابھی کلکتے تو نہیں پہنچا تھا مگر کلکتے

www.taemeernews.com

کی توصیف میں غالب سے لے کر مرزا پور کے ایک تقریباً گم شدہ شاعر حرمت الاکرام تک کے اشعار یاد آنے لگے۔ عجیب تحیر اور تشویق آمیز تصور کلکتے کا ذہن میں آموجود ہوا! میرے ساتھ ہندی کے مشہور فکشن نگار حضرات، بھیروں پر ساد گپت، مارکنڈے، دُودھ ناتھ سنگھ اور سیلیش مٹیانی تھے۔ اردو کے صرف واحد افسانہ نگار اور میرے شاگرد اسرار گاندھی ساتھ تھے۔ اصلاً یہ جنوادی لیکھک سنگھ والوں کا جشن تھا جس میں بنگال کی حکومت نے بھی تعاون کیا تھا۔ اور 'ابھی نندن' بھیروں پر ساد گپت کا تھا۔ چونکہ ایک کہانی کار اور ناول نگار کو اعزاز دینا تھا اس لئے پریم چند اور جدید افسانے کی صورت حال پر ایک سیمینار بھی رکھ دیا گیا تھا۔ کچھ لوگ دلّی سے، کچھ بھوپال سے، کچھ بہار اور کچھ بنگال کے ہندی اُردو کے ترقی پسند ادیب اس سیمینار اور ابھی نندن میں شرکت کرنے کے لئے آرہے تھے۔ بنگال کی سرحد تو شروع ہو چکی تھی مگر ابھی کلکتہ دور تھا۔ میری عادت ہے کہ میں سفر میں ہمیشہ مناظر میں کھو جاتا ہوں اور کتابیں پڑھنے یا کسی بحث میں حصّہ لینے سے گریز کرتا ہوں مجبوری کی بات الگ ہے۔ میں آر۔ ایل۔ اسٹیونس کے آرڈرڈ ساؤتھ (ordered South) والے سفر جیسا مزہ لینا چاہتا ہوں اور اس کیفیت میں کسی مداخلت کو پسند نہیں کرتا۔ مگر بدقسمتی سے دودھ ناتھ سنگھ کے ایک دوست منڈل صاحب اتفاقاً اسی خانے میں پڑے تھے جس میں مَیں تھا۔ یکایک منڈل کے دماغ میں عجیب لہر آئی۔ کچھ ہندوستانی زبانوں پر انھوں نے مجھ سے باتیں چھیڑ دیں۔ منڈل صاحب مجھ سے متعارف نہ تھے۔ چونکہ ایک ہندی کے ادیب کا 'ابھی نندن' ہونے جا رہا تھا، منڈل نے مجھے بھی کوئی ہندی کا ادیب سمجھ لیا۔ انھوں نے اُردو زبان کا آغاز اور ارتقا مجھے سمجھانا شروع کر دیا۔ پھر یہ سمجھانے لگے کہ اردو بنی کیسے۔ انھیں کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ محض ایک جرنلسٹ تھے اور بے حد بک بک کرنے والے۔ پھر جس طرح کی باتیں جرنلسٹ کرتے ہیں، اسی طرح کی عامیانہ باتیں وہ اردو کی بناوٹ اور آغاز کے سلسلے میں بڑی تندہی (Gusto) کے ساتھ کرنے لگے میں بالکل خاموش ان کی معلومات اور دلائل سنتا رہا۔ میری خاموشی کو وہ میری لاعلمی

www.taemeernews.com

سمجھ کر اور بے تکی ہانک رہے تھے۔ اردو لشکری زبان ہے۔ اردو لفظ خود باہر سے آیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک دلچسپ واقعہ اُردو کے سلسلے میں جب انھوں نے بتایا تو میری آنکھیں پھیل گئیں۔ واقعی آج تک میں نے یہ سبب اردو کے نام کا نہ سنا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ دراصل شاہ جہاں کے ایک وزیر کو اُردَ کی دال بہت پسند تھی اور وہ اس دال کو اردد کہہ کر مانگتا اور پکواتا۔ بس وہیں سے اُردو زبان کو ایک نیا نام مل گیا بھلا اُردو زبان کے ماہرین اس امر سے کہاں واقف ہیں!! ابھی میں منڈل صاحب کے حیرت انگیز انکشافات سے محظوظ ہی ہو رہا تھا کہ بغل کی کیبن سے بحث سُن کر دودھ ناتھ سنگھ آگئے اور اپنے خاص انداز میں منڈل سے مخاطب ہو کر بولے "ابے منڈل! تو کیسے اُردو کا اوریجن (ORIGIN) بگھار رہا ہے؟!" اور پھر انھوں نے ایک زوردار قہقہہ مار کر مجھ سے کہا، "کہئے استاد! کچھ سمجھ میں آیا کہ اردو کیسے بنی؟!" (دودھ ناتھ مجھے ہمیشہ استاد ہی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں) پھر انھوں نے منڈل پر میری شخصیت واضح کر دی۔ منڈل کو یکایک جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر دوسری کیبن میں چلے گئے اور دودھ ناتھ سنگھ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

جیسے جیسے کلکتہ نزدیک آتا جاتا، پلاسی کے میدان سے لے کر فورٹ ولیم کالج اور واجد علی شاہ کے مٹیا برج تک تصویروں کا ایک مرقع میری نظر کے سامنے موجود تھا۔ کلکتہ اترے اور ہوڑہ برج پار کیا تو عجب شاک سا لگا۔ ہمیں سالٹ لیک سٹی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔ مگر جس طرف سے ہم اپنی منزل مقصود کی سمت چلے وہ حصہ جیسے 'شہرِ سوختہ' کا منظر پیش کر رہا تھا۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ اور ٹریفک کی کثرت۔ خیر ہمارے رہبر نے کسی طرح اس جمگھٹے سے ہمیں نکالا اور نسبتاً کم آبادی کی جگہ سالٹ لیک سٹی کے ہوٹل میں پہنچا دیا جو بے حد صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ دوسرے دن صبح کو افتتاحی جلسہ تھا یہ بھیروں پرساد گپت کے لئے اعزازی جلسہ تھا۔ مختلف لوگوں نے بھیروں پرساد گپت پر تقریریں کیں۔ ایک مختصر سی تقریر راقم الحروف نے بھی، الہ آباد کے حوالے سے بھیروں

www.taemeernews.com

پرساد کی ترقی پسندی سے متعلق کی۔ بھیروں پرساد گپت بڑے خلوص اور بڑی نیک نیتی سے ہمیشہ سے ترقی پسندوں کے ساتھ رہے اور جب انھیں ترقی پسندوں میں مصلحت نظر آنے لگی تو وہ ترقی پسندوں کے دوسرے ونگ (Wing) کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور اب وہ جنوادی لیکھک سنگھ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ الہ آباد کا ہندی کا تقریباً پورا ترقی پسند گروپ، جنوادی لیکھک سنگھ میں چلا گیا ہے۔

شام کے اجلاس میں ترقی پسندی کے حوالے سے ہندی، اردو افسانہ نگاری پر مقالے پڑھے جانے تھے۔ پہلا مقالہ پروفیسر محمد حسن کا تھا جو ریل گاڑیوں کی کچھ گڑبڑی کی وجہ سے کلکتہ نہیں پہنچ سکے۔ مقالہ انھوں نے بھیج دیا تھا۔ جو اسرار گاندھی نے پڑھ دیا۔ مقالہ بے حد سرسری تھا اور شاید بڑی عجلت میں لکھا گیا تھا۔ نئے افسانوں کا جائزہ بھی مکمل نہیں تھا۔ محمد حسن صاحب کے مقالے کے بعد میں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پھر ظفر اوگانوی کا مقالہ تھا۔ اردو کے یہی تین مقالے تھے۔ میرے مقالے میں اچھے نئے لکھنے والوں کا تذکرہ تھا۔ خصوصاً ان کا جن کی کچھ حیثیت دنیائے افسانہ میں بن چکی ہے۔ کلکتے کے کچھ نئے لکھنے والوں کا تذکرہ میرے مقالے میں نہ تھا، کہ ابھی ان کی کوئی حیثیت نہیں بنی ہے۔ جدیدیت کی رو نے، اردو میں ایک خراب مزاج یہ پیدا کیا ہے کہ محض دو چار افسانے یا نظمیں لکھ لینے والے بھی خود کو تاریخ ساز تخلیق کار سمجھنے کے خبط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ بات سب کے لئے نہیں کہی جا سکتی۔ مگر زیادہ تر یہی صورت نظر آتی ہے۔ آخر یہ کیا جذبہ ہے؟ وہ جو ہم اردو والے کہا کرتے ہیں کہ ''کے آمدی و کے پیر شدی'' وہ سب اب بدل گیا ہے۔ پہلی ہی تخلیق پیش کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے، ورنہ وہ آپ کو بے شعور سمجھے گا۔ خیر وہیں یہ بھی سنا کہ میں دراصل نیا ادب اور نئے لوگوں کو نہیں پڑھتا۔ اس لئے ان کے متعلق نہیں جانتا اور نتیجے کے طور پر میرے مقالے میں نئے لوگوں کا ذکر نہیں آتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ نئے لوگ میرے مقالے نہیں پڑھتے، صرف سیمناروں میں سُن لیتے ہیں۔ ورنہ انھیں اندازہ ہوتا کہ میں نے نئے شعرا اور نئے افسانہ نگاروں

www.taemeernews.com

کو کس حد تک بڑھا ہے۔ ظفر اوگانوی، نقاد بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ایک زمانے میں انھیں جدیدیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ مگر ان کا ایک ہی مجموعہ 'بیج کا ورق' چھپا تھا کہ انھوں نے افسانے لکھنے چھوڑ دیئے۔ عبدالصمد، شفق، شوکت حیات، حسین الحق وغیرہ ظفر اوگانوی کے بہت بعد کے لکھنے والے ہیں، مگر انھوں نے اپنی حیثیت اتنی بنا لی کہ عبدالصمد کو تو ساہتیہ اکاڈمی کا انعام بھی مل گیا۔ جب میرے مقالے پر اس طرح کی باتیں ہوئیں تو میں نے اپنے انداز محاسبہ کی وضاحت کر دی مگر کچھ نئے لوگ پھر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ یہ بات میں نے بہت واضح طور پر کہی کہ ادیب کا مزاج اور اس کی تحریر کی حیثیت، اس کے دو چار مجموعوں کے بعد بنتی ہے۔ دو چار افسانوں کے بعد نہیں۔ پھر ادب نہ تو ملازمت اور ملازمت میں ادیب کے عہدے سے پرکھا جاتا ہے اور نہ سن و سال سے، بلکہ اس کی مسلسل تخلیق سے، اس کے نقطۂ نظر، اس کے فن اور اس کی زندگی کے اِدراک کے کینوس سے، ادیب اور تخلیق کی حیثیت بنتی بگڑتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی ادیب نے بہت لکھ کر ڈھیر لگا دیا تو وہ بہت بڑا ادیب ہو گیا۔ اُردو کیا دنیا کی ہر زبان کے ادب میں دونوں صورتیں موجود ہیں۔ کچھ ادیب اپنی صرف ایک کتاب ہی سے ادب کی تاریخ میں اپنی شناخت ہی نہیں بنا لیتے بلکہ ادب پر چھا جاتے ہیں۔ اور ایسے ادیب بھی ہیں جنہوں نے زندگی بھر لکھا مگر ان کی کوئی حیثیت نہ بنی۔ اسی طرح کی کچھ اور باتیں بھی میں نے کہیں۔ جو اردو کے چند نوجوان افسانہ نگاروں کو پسند نہیں آئیں۔ کچھ تو اٹھ کر چلے بھی گئے۔ پھر کچھ مقالے، ہندی کے نئے افسانوی ادب پر بھی پڑھے گئے اور مجھے اندازہ ہوا کہ اردو کا افسانوی ادب ابھی ہندی کے افسانوی ادب سے بہت پیچھے ہے۔ اور یہ بھی کہ ہندی کا آلوچک، اردو کے فکشن کے نقاد سے بہت آگے ہے۔ اور اس کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ سچ بات تو یہی ہے کہ اردو میں اردو فکشن کے نقاد ہی کتنے ہیں؟ ــ یہاں سریندر چودھری، نامور سنگھ، شیو کمار مشر، سرلا مہیشوری، دودھ ناتھ سنگھ اور.. مارکنڈے وغیرہ نے جو ہندی کے افسانوی ادب کا جائزہ پیش کیا، وہ جائزہ تنقید اور

www.taemeernews.com

طریق تنقید بھی مجھے اردو کے افسانوی ادب کے ناقدین سے بہت بہتر اور زیادہ تفتیشی (PROBING) معلوم ہوا۔ کہ ہندی کے ادیب، مدت ہوئی کہ یہ لوگ واد، عسلامتی رنگ ڈھنگ (پرتیک واد) اور "اگیے جی" کے چمتکار سے باہر نکل آئے ہیں اور اب وہ تخلیق کی ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں۔ جس میں آج کی زندگی اور اس کی سماجی حقیقتیں زیادہ دھاردار ہو گئی ہیں۔ ہندی کا نیا کہانی کار ان حقیقتوں کو پکڑنے اور تیزی سے بدلتے ہوئے سوشل آرڈر کی تفہیم اور اس کے تجزیئے میں مصروف ہے۔ اس نے تخفیت کے ہالے کو توڑ دیا ہے، جب کہ اردو میں ایک طرف تو انفرادی تجربوں کی بھی کمی ہے۔ دوسری طرف افسانہ نگار حضرات زندگی کے حقائق کو پیش کرنے سے گھبراتے ہیں یا تو تیسری طرف ابھی تک وہ تخفیت کے ہالوں میں اسیر ہیں۔ یہ مزاج اردو ادب کی تخلیق اور تفہیم دونوں کے دائروں کو تنگ کر رہا ہے۔ ہندی کی تنقیدی تحریروں میں اب انگریزی اور یوروپی ادب کے تنقیدی اسٹاک سے مسالہ بہت کم درآمد کیا جا رہا ہے۔ مگر اردو والے ابھی تک مغرب میں، تنقید میں چھوٹی ہوئی پھلجھڑیوں کے اسیر ہیں۔ اور "مانگے کے اجالے" پر کام چلا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اردو کے ناقدین نے شعری ادب کی تنقید اور تفہیم پر اپنا سارا زور صرف کیا ہے۔ نثری ادب کی طرف ان کی وہ توجہ نہیں جو ہونی چاہئے تھی۔

بہر حال کلکتے کے ادبی سمینار سے راقم الحروف نے یہی باتیں سیکھیں۔

دوسرا دن خالی تھا۔ ہم گھومنے نکلے۔ فورٹ ولیم کالج، مٹیا برج، پارک اسٹریٹ بہو بازار، نیو مارکیٹ، تمام گھومتے پھرے۔ اندازہ ہوا کہ کلکتے میں مفلسی بہت ہے اور پھر مفلسی سے پیدا ہونے والی بے راہ رویاں بھی کچھ سڑک چھاپ ریستوراں بھی کچھ عورتیں مل کر چلاتی ہیں، جو شاید ہندوستان میں ایک نیا تجربہ ہے کہ یہ ریستوراں غریب اور مفلس مزدوروں اور گاہکوں ہی کے بل بوتے پر چلتے ہیں۔ میں نے بھی ایک بالکل ہی سڑک چھاپ ریستوراں میں چائے پی۔ ان کے پاس نہ تو وافر پیالیاں تھیں اور نہ گلاس اور انھیں خریدنے کی ان میں سکت نہ تھی۔ اگر گاہک زیادہ ہو جاتے ہیں تو یہ عورتیں انتظار میں رہتی

www.taemeernews.com

ہیں کہ کب آپ گلاس خالی کریں تاکہ وہ دوسرے گاہکوں کو نپٹا سکیں۔ کوئی کمرہ یا عمارت بھی نہیں۔ کسی خالی جگہ پر چھولداری یا پلاسٹک تان کر جگہ بنالی جاتی ہے اور اسی سے کام چلتا ہے
گھومتے گھومتے شام ہوگئی۔ میرے ساتھ میرے شاگرد اور ایک اچھے افسانہ نگار، اسرار گاندھی اور ان کے ایک دوست انیس رفیع بھی تھے، جنہوں نے علامتی افسانہ نگاری کے دور میں چند بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ایک افسانوی مجموعہ بھی 'اب وہ اترنے والا ہے' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کی رہبری اور معیت میں کچھ کھا پی کر ہم وکٹوریہ میموریل دیکھنے گئے۔ پتہ چلا تھا کہ یہاں ۱۸۵۷ء کے تعلق سے بہت بڑا تاریخی مسالہ ہے۔ بہت سی تصاویر ہیں۔ مگر یہ سب یک طرفہ ہے جس میں صرف انگریزوں کے کارناموں کو سراہا گیا ہے اور ان کی فتوحات کو ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔ اس طرح کی تصویروں سے انگریزی راج کی ہوا بندھتی تھی اور ہندوستانیوں کو نفسیاتی طور پر پست کرنے میں مدد ملتی تھی۔ اگرچہ وکٹوریہ میموریل کو تاج محل کے مقابلے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر بقول فراق صاحب :-
؏ بھنگ کے کلہڑ کہاں، صہبا کے پیمانے کہاں! فراق صاحب نے تو یہ بات اپنے خاص انداز میں اردو شاعری اور ہندی شاعری کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ مگر یہ بات یہاں بھی درست ہے۔ فراق صاحب کا شعر ہے ؎

کیا بتاؤں فرق کیا ہے اُردو ہندی میں فراق ۔۔۔ بھنگ کے کلہڑ کہاں، صہبا کے پیمانے کہاں

(یہ شعر وہ صرف محفلوں میں سناتے تھے۔ اپنے کسی مجموعے میں اسے شامل نہیں کیا۔)

ہم وکٹوریہ میموریل میں تاریخی دستاویزات اور تصویریں دیکھتے رہے کہ رات ہوگئی باہر نکلے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ کچھ پیرس کی شانز الیزے اور بنگال کی صورت اور کچھ لندن کے سوہو (Soho) اور کونٹ گارڈن کی جھلکیاں نظر آئیں۔ کچھ دلال یہاں بھی اسی طرح گاہکوں کو آنکتے پھرتے تھے۔ ہم لوگ اِدھر اُدھر گھوم ہی رہے تھے کہ اچانک اسرار گاندھی کو دیکھا کہ وہ ایک اجنبی سے گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں۔ ہم آگے بڑھتے جاتے اور اسرار گاندھی اس اجنبی کے ساتھ دھیرے دھیرے پیچھے چھوٹتے جاتے تھے۔ مجھے

www.taemeernews.com

خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں فاطمی کی پیرس والی صورت نہ پیش آئے تو میں نے اسرار گاندھی کو آواز دی کہ بھئی چلو جلدی۔ ابھی سالٹ لیک بھی پہنچنا ہے۔ اسرار گاندھی جلد واپس آگئے واللہ اعلم کیا باتیں اس اجنبی سے انھوں نے کیں۔ ہم لوگ فوراً وکٹوریہ میموریل سے پلٹ آئے ٹیوب ریلوے کی طرف گئے۔ مگر وہ اسٹیشن بند ہو چکا تھا۔

اگلے دن ہمیں الہ آباد واپس آنا تھا۔ کانگریس پارٹی نے اس دن کسی مسئلے پر ہڑتال کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر کلکتے کی نارمل زندگی میں کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں نہیں آئی ایک جگہ ہڑتالی تو ملے مگر ان میں کوئی گرمی نہ تھی۔ واقعہ یہی ہے کہ ہندوستان میں آج صرف بنگال جائے امن ہے ورنہ پورا ہندوستان ایک خلفشار سے دوچار ہے۔ ہم اطمینان سے ہڑتالیوں کے درمیان سے اسٹیشن پہنچے جہاں ہمارے بقیہ ساتھی بھی آگئے اور دوسرے دن ہم الہ آباد میں تھے۔ ہڑتالیوں کو دیکھ کر مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ کہاں ۱۹۴۲ء کی تحریکات کی گرمی اور کہاں یہ بے دلی سے ہڑتال کرنے والے جیسے کرائے کے ٹٹو ہوں۔ کانگریس نے اب غرض مند سیاست سے ناتا جوڑ لیا ہے۔ گاندھی جی کی بے غرض (SELF LESS) سیاست اب کانگریس میں فیل ہو چکی ہے۔ نئے حالات کے ساتھ چلنے کی اب ان میں سکت نہیں رہی۔ فرقہ واریت کی سیاست سے توازن برقرار رکھنے کا دور، مدت ہوئے ختم ہو چکا ہے۔ اب پچھلے ہوئے طبقات کے اوپر آنے کا زمانہ ہے۔ فرقہ واریت کی سیاست اس اسکڈ میزائیل اور راکٹوں کے دور میں اب توڑے دار بندوق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ سیکولر طاقتوں کو اکٹھا کر کے اگر ہندوستان کے سیاست داں نہیں چلتے تو ملک کو ٹکڑے ہونے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ مگر ان سیکولر طاقتوں کو جوڑنے کی کوشش الفاظ اور اسپرٹ دونوں کے ساتھ ہونی چاہئے۔ صرف زبانی سیکولرزم کا نعرہ بلند کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ مسجد اور مندر پالیٹکس عوام میں زیادہ دنوں تک نہیں کھیلی جا سکتی۔

کب تک قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

(حالی)

www.taemeernews.com

معترض کے منھ سے ہے کتّا بندھا

اب سن تو ٹھیک سے یاد نہیں شاید ۱۹۸۲ء تھا اور بھرے جاڑے تھے کہ مجھے جنوبی ہندوستان کی ترو پتی یونیورسٹی سے ایک پی۔ایچ۔ڈی کے زبانی امتحان Viva Voce لینے کا دعوت نامہ ملا۔ مجھے سری وینکٹیشور کے مندر دیکھنے کا بڑا شوق تھا کہ پہاڑ کی اتنی بلندی پر بنا ہوا یہ کیسا عجیب و غریب مندر ہے! نقشہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ترو پتی جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک مدراس ہو کر جو قدرے لمبا راستہ ہے اور دوسرا گڈور کی طرف سے جو نسبتاً چھوٹا ہے۔ ابھی میں اسکیم ہی بنا رہا تھا کہ شام کی ڈاک سے، مدراس کے مشہور شاعر علیم صبا نویدی کی مؤلفہ ایک کتاب 'قید شکن' ملی، جو آزاد غزلوں کا انتخاب تھی۔ اس زمانے میں آزاد غزل کی بڑی ہوا چلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ 'شاعر' بمبئی نے ایک آزاد غزل نمبر بھی شائع کر دیا تھا۔ کتاب 'قید شکن' کے پہلے ہی صفحے پر ایک شعر یوں درج ہے ؎

معترض کے منھ سے ہے کتّا بندھا
اس لیے سننا پڑے گا عف عف

چونکہ اس شعر کے نیچے کسی کا نام درج نہیں ہے اس لئے قیاس کیا کہ یہ شعر خود مرتب یعنی علیم صبا نویدی کا ہے (اصلاً یہ شعر حضرت ظفر اقبال کا ہے) مجھے یہ شعر پڑھ کر لطف آ گیا میں کہیں اور بھی لکھ چکا ہوں کہ خراب اور مضحکہ خیز اشعار یاد کر لینے میں مجھے مہارت حاصل ہے۔ چنانچہ یہ شعر فوراً میری زبان پر چڑھ گیا۔ میں علیم صبا نویدی کی شاعری اور ان کی افسانہ نگاری اور اس طرح خود ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ بلکہ ان کے پہلے شعری مجموعے 'طرح نو' مطبوعہ ۱۹۷۶ء کا دیباچہ بھی لکھ چکا تھا۔ 'طرح نو' کی غزلوں میں ایک کیفیت ہے جو کلاسکی اور جدید رنگوں کے درمیان سے جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔

بہر حال 'قید شکن' کے ملتے ہی طے ہو گیا کہ ہم مدراس ہو کر ترو پتی چلیں گے۔ میرے ساتھ

www.taemeernews.com

میرے شاگرد ڈاکٹر رفیع اللہ بھی تھے، جو اب کاشی ودیا پیٹھ بنارس میں اُردو کے لیکچرر ہیں۔
ہم علیم صبا نویدی کی تالیف کا یہی شعر پڑھتے ہوئے ایک صبح کو مدراس کے لیے روانہ ہوگئے
علیم صبا نویدی کو ہم نے اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔ چونکہ اس وقت تک نہ انھوں نے مجھے دیکھا
تھا نہ میں نے انھیں، اس لئے پہچاننے میں دقت کے امکانات خاصے تھے۔ ہم کاجو (CASHEW NUT) اور ناریل کے باغوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے دوسرے دن رات کے گیارہ
بجے مدراس کے اسٹیشن پر پہنچے تو علیم صبا نویدی صاحب موجود تھے۔ میں نے انھیں ان کی
تصویر کی مدد سے پہچان لیا اور اتر کر ان سے بغل گیر ہوا۔ اور پھر انھیں کے ساتھ ہم لوگ
ان کے مکان ماؤنٹ روڈ، امیر النساء اسٹریٹ پہنچے۔ میں نے ان سے اپنا تروپتی کا پروگرام
بتایا تو انھوں نے کہا کہ صبح سات بجے بسیں یہاں سے تروپتی جاتی ہیں، آپ انھیں سے چلے
جائیے کیوں کہ دوسرے ہی دن مجھے امتحان لینا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے کہ علیم صبا صاحب نے بتایا کہ مدراس کے مشہور شاعر کاوش
بدری بھی یہیں رہتے ہیں۔ آئیے انھیں بھی ساتھ لیتے ہیں۔ کاوش بدری صاحب سے میں
اچھی طرح واقف تھا، اور ان کی طویل شعری تخلیق 'کاوئیم' پڑھ چکا تھا۔ جو اردو میں
ایپک پیش کرنے کی ایک کوشش تھی۔ کاوش بدری میں بڑی اچھی شعری صلاحیتیں تھیں۔
'کاوئیم' ایک اچھی شعری تخلیق ہے جو کاوش بدری کے لاابالی پن کا شکار ہو گئی۔ خیر اس کی
باتیں پھر کبھی ہوں گی۔ کاوش صاحب کے ساتھ ہم لوگ والاجاہ روڈ کے ایک ہوٹل میں
داخل ہوئے کہ کچھ کھا پی لیں، تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لوگ
جوق در جوق اس طرح آ رہے ہیں جیسے ابھی شام کے آٹھ بجے ہوں۔ جب کہ اب رات
کے ایک بج رہے تھے۔ یہ ہوٹل بریانی کے لئے مشہور ہے اور لوگ یہاں بریانی کھانے کے
لئے رات کے ایک بجے چلے آ رہے تھے۔ ہم نے سیر ہو کر بریانی کھائی۔ واقعی بہت اچھی تھی اور
پھر کاوش بدری صاحب کے ساتھ والاجاہ روڈ پر ٹہلتے ہوئے سمندر کے ساحل تک چلے گئے
ہمارے کانوں میں پرشور سمندر کے ساحل سے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور دوسری

www.taemeernews.com

طرف کاوش بدری صاحب اپنی غزلوں پر غزلیں سُرکر رہے تھے۔ میرا ایک کان سمندر کے لئے تھا اور دوسرا شاعری کے لئے۔ بس اس شش کے فرق سے دونوں اپنا اپنا کام کر رہے تھے اور کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ کاوش بدری صاحب تو اب 'زاہدِ مرتاض' ہیں مگر کبھی رِندِ شاہد باز بھی تھے۔ جیسا کہ اتنی دیر کی ملاقات میں پڑھے لئے دیئے اور سنجیدہ انداز میں انھوں نے مجھ سے بیان کیا۔ ان کی تخلیق "کاوکیم" میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ ہم تین بجے رات تک "ساحلِ سمندر" اور والاجاہ روڈ پر ٹہلتے رہے۔ محمد علی آف ارکاٹ سے لے کر آج مدراس میں مسلمانوں کی صورتِ حال پر باتیں کرتے رہے۔ پھر ادبی صورتوں اور یہاں کی دوسری دلچسپیوں پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیں صبح پانچ بجے اٹھ کر ترو پتی کی بس پکڑنی تھی۔ یہ طے پایا کہ ہم کاوش بدری کے ساتھ ٹھہر جائیں۔ وہ جب علی الصباح نماز کے لئے اٹھیں گے تو ہمیں بھی جگادیں گے۔ کاوش صاحب اکیلے ہی ایک معمولی سے مکان میں رہتے ہیں جو ان کا حجرہ بھی ہے اور آستانہ بھی۔ حجرہ خود ان کے لئے اور آستانہ خلائق کے لئے، جن میں آج ہم بھی شامل تھے۔ کاوش صاحب ہمیں ٹھہرانے کے لئے تیار تو ہو گئے مگر یہی کہتے رہے کہ آپ لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ میں تو سخت زندگی بسر کرنے کا عادی ہوں اور فقیر آدمی ہوں اور اسی طرح رہتا ہوں۔ میں نے کہا حضرت صرف دو گھنٹے کی تو بات ہے۔ اور اب تو یہ دو گھنٹے آپ کے ملفوظات سننے میں بھی گذر سکتے ہیں۔ پھر میں بھی ہر طرح کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہوں کہ میرا بھی تعلق ایک فقیر خاندان سے ہے۔ اب کاوش بدری چونکے ان پر اس زمانے میں تصوف جنون کی طرح حاوی تھا۔ چنانچہ تفصیل پوچھنے لگے۔ میں نے بتایا کہ میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے خاندان سے ہوں۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ کاوش بدری صاحب کو جیسے بجلی کا کرنٹ لگا۔ جھٹ میرا ہاتھ پکڑ کر انھوں نے چومنا شروع کیا اور آنکھوں سے لگایا اور ایک وَجد کے عالم میں "زہے قسمت، زہے قسمت" کہنے لگے۔ میں ان سے یہ راز کہہ کر خود شرمندہ ہوا۔ اس کا ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ ایک مرتبہ میں اپنے بزرگ دوست پروفیسر اظہر انصاری اور کچھ تاریخ کے طلبا کے ساتھ چنار گڑھ کا قلعہ

www.taemeernews.com

دیکھنے گیا۔ اوپر ایک مزار ہے اور ایک کتبہ لگا ہے۔ اظہر انصاری صاحب اور طلبا بھی تجسس میں تھے کہ یہ مزار کس کا ہے مگر وہاں ایک فقیر گلیم سیاہ اوڑھے بیٹھا تھا اور کسی کو حدود مزار میں داخل ہونے نہ دیتا اور بڑے جلال میں للکارتا کہ "خبردار اندر قدم نہ رکھنا سید صاحب آرام کر رہے ہیں۔ ابھی جل کر خاک ہو جاؤ گے" سب ڈر کر رک گئے۔ میں قدرے پیچھے تھا کہ ایک محراب کی صناعی دیکھنے میں محو تھا۔ میں نے جو فقیر کی بلند آواز سنی تو تیز قدموں سے وہاں پہنچا۔ اظہر صاحب اور طلبا خوف سے رک گئے تھے اور وہ درویش کسی کو آگے بڑھنے نہ دیتا تھا کہ میں پہنچ گیا۔ یکایک مجھے بھی جلال آگیا۔ میں آگے بڑھا اور درویش کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹاتا ہوا حدود مزار میں داخل ہو گیا۔ درویش سے میں نے کہا کہ میں تو حضرت خواجہ بختیار کاکی کی اولاد ہوں۔ سید صاحبؒ سے معذرت کر لوں گا۔ تم مجھے روکنے والے کون ہوتے ہو؟ درویش خوف زدہ ہو کر کنارے ہو گیا۔ میں نے پھر طلبا کو بھی بلا لیا۔ درویش خاموش مجھے بڑے احترام سے دیکھتا رہا۔ وہ کوئی خاص مزار نہ تھا مگر کسی سید بابا کا مزار ضرور تھا۔ واپسی پر درویش کی ہم لوگوں نے کچھ خدمت بھی کر دی اور حدود مزار سے باہر نکل آئے۔ درویش نے سب کو دعائیں دیں اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

ہم والا جاہ روڈ سے چل کر سیدھے کاوش بدری صاحب کے آستانے پہنچے۔ اندر داخل ہوئے تو جو حالت وہاں کی تھی اس سے ہم بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ واقعی کاوش صاحب سخت قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ "گر موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے" والا طرز زندگی اور طرز رہائش تھا۔ زمین پر ایک بوریا بچھا تھا وہی ان کی جائے نماز تھا اور وہی بستر۔ اسی پر کاوش صاحب تھوڑی دیر لیٹ کر کمر سیدھی کر لیتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت تو تسبیح و تہلیل میں بسر ہوتا تھا۔ "تسبیح و تہلیل" محاورے میں نہیں بلکہ حقیقت میں۔ رہ رہ کر وہ "ہلِلّٰہ" کا نعرہ بھی بلند کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے لئے وہ ذرا مشوش ہوئے مگر وہاں ایک تخت الٹا ہوا رکھا تھا اور کافی بڑا تھا۔ میں نے اور رفیع اللہ نے اسی پر اپنا بستر

www.taemeernews.com

بچھالیا اور اسی کے فریم میں ہم فٹ ہوگئے۔ ۵ بجے ٹھیک میری آنکھ خود بخود کھل گئی۔ میں نے جاکر کاوش صاحب کو اٹھایا تو وہ گھبرا کر اٹھے اور جلد وضو کرکے یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ ہم لوگ بھی منہ ہاتھ دھوکر بالکل تیار ہوگئے۔ اب دیکھا تو کاوش بدری صاحب سر بسجود ہیں اور کسی طرح سر سجدے سے نہیں اٹھاتے۔ میں تو یونہی سفر میں گھبرایا رہتا ہوں اور قبل از وقت بس یا ریل گاڑی پر پہنچ جاتا ہوں، یہ صورت دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ اب کیا کیا جائے۔ علیم صبا نویدی صاحب بھی ابھی تک نہ آئے تھے اور اب چھ بجا چاہتے تھے۔ تقریباً ۱۵ منٹ اسی عالم میں گزر گئے اور کاوش بدری غالباً "مقامات" میں کھو گئے!

آخر میں نے رفیع اللہ سے کہا کہ چلو بھئی۔ یہ سالک راہ رضا کیا معلوم کس مقام پر رہ گئے۔ اب تو د ہی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ یہ کام اب کوئی نہ آئے گا فقط دل کے سوا۔ اور یہ کہہ کر اپنا بیگ لے کر ہم باہر نکل آئے کہ بس اسٹیشن کا راستہ کسی سے معلوم کرکے روانہ ہوں۔ جیسے ہی باہر آئے علیم صبا نویدی بھی گھبرائے ہوئے آپہنچے کہ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر کاوش بدری کو پوچھا۔ ہم لوگوں نے واقعہ بتایا۔ وہ اندر گئے اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد کاوش بدری کے ساتھ واپس آئے۔ کاوش صاحب بالکل کھوئے ہوئے آکر کھڑے ہوگئے۔ چھ بج چکے تھے۔ اب بس کے لئے آٹھ بجے تک انتظار کرنا تھا۔ خیر پاس ہی کے ایک ہوٹل میں ہم لوگوں نے کھڑی چائے پی، اور کاوش صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ کر علیم صبا نویدی کے ساتھ بس اسٹیشن کے لئے روانہ ہوگئے۔ بس تیار تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے چل پڑی۔ علیم صبا صاحب سے یہ پروگرام بنا کہ واپسی میں مدراس گھومیں گے۔

ٹھیک گیارہ بجے ہم ترونتی پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ شہر ایک پیالے نما وادی میں بسا ہوا ہے۔ کچھ ابر و باد کی بھی اس دن کیفیت تھی۔ ہم بس سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پروفیسر رضی الدین احمد صاحب ہمیں کہیں نظر نہ آئے۔ جب سب مسافر چلے گئے اور ہم ادھر ادھر بار بار دیکھنے لگے تو دو ایک طالب علم نما لڑکے ہمارے پاس آئے کہ کیا آپ عقیل صاحب ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور انھیں کے ساتھ ہو

www.taemeernews.com

ہو لیا۔ وہ لوگ ہمیں رضی الدین احمد صاحب کے گھر پر لے گئے۔ وہاں سے ہاتھ منہ دھو کر کچھ ناشتہ کر کے ہم یونیورسٹی پہنچے۔ امتحان لیا پھر واپس آکر کھانا کھایا۔ اب ہمارے پاس دن کے چند گھنٹے بچے تھے۔ میں نے رضی الدین احمد صاحب سے سری وینکٹیشور جی کا مندر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ رضی الدین صاحب نے ایک ادبی نشست کا بھی پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ پہلے مندر دیکھنا ہے پھر بعد کو دیکھا جائے گا۔ اور ہم لوگ مندر دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ مندر کا فاصلہ تروپتی کی اصل آبادی سے اتنا ہی ہے جتنا کہ کاٹھ گودام سے نینی تال کا۔ اسی طرح چکّر دار پہاڑی راستہ اور تقریباً وہی اونچائی۔ اوپر پہنچے تو مندر ایک مسطّح رقبۂ زمین پر بنا ہوا ہے۔ لوگ جوق در جوق مورتی کے درشن کے لئے جا رہے تھے۔ ایک بہت بڑے گھیرے میں یہ مندر بنا ہوا ہے۔ جہاں مجمع درشن کے لئے بے چین رہتا ہے۔ اس لئے مندر کے ارباب حل و عقد نے یہاں بھی تجارت شروع کر دی ہے۔

پچیس روپئے سے دو سو روپئے تک کی رقم اس وقت درشن کرنے کے لئے خرچ ہوتی تھی۔ اگر درشن کرنے والے جلد درشن سے فارغ ہونا چاہتے تو دو سو روپئے خرچ کریں پھر انھیں مورتی کے ایک نزدیکی دروازے سے مورتی تک فوراً پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ دروازہ دو سو روپئے والا گیٹ کہلاتا ہے۔ بس مورتی کے سامنے پہنچ کر لڈو چڑھائیے اور تین منٹ کے اندر اندر واپس آئیے۔ پچیس روپئے والوں کو آپ پرانی اردو میں چونی والا سمجھئے۔ یا شیکسپیئر کے تھیٹروں کا گراؤنڈ لنگ (Ground Ling)۔ لیکن درشن کا موقع سب کو ملتا ہے۔ ہم جیسے لوگ، باہر ہی سے مورتی کا جلوہ دیکھ لیتے ہیں اور مورتی کو ششتانگ کرنے والوں کا خضوع و خشوع بھی۔ مورتی باہر سے بھی دکھائی دیتی ہے مگر مورتی کا قرب حاصل کرنے کے لئے، شردھالو یہ مشکلیں برداشت کرتے ہیں۔ پھر انھیں دیوی کے چرنوں میں لڈو بھی چڑھانے ہوتے ہیں۔ یہ لڈو، ٹینس بال کے سائز سے لے کر فٹ بال تک کے سائز کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے لڈو یہاں دیکھنے میں نہیں آئے شاید چھوٹے لڈو، دیوتا کو خوش نہیں کر سکتے۔ مگر مندر کے ارباب حل و عقد ان تمام پیسوں اور چڑھاوؤں سے بے حد اہم سماجی کام

www.taemeernews.com

انجام دیئے ہیں۔ پوری یونیورسٹی اسی مندر کی   انھیں رقوم سے چلتی ہے اور بہت سے فلاح عامہ کے کام بھی اسی مندر کی مدد سے کئے جاتے ہیں۔ شاید دنیا میں کسی درگاہ، خانقاہ یا مندر اور گرجا گھر سے ایسے فلاحی کام نہیں ہوتے۔ جموں کے رگھوناتھ مندر، ویشنو دیوی کا مندر، کشمیر کے امرناتھ مندر سے لے کر اجمیر شریف کی درگاہ، حضرت نظام الدین کی درگاہ، کلیر شریف کی درگاہ، جوگی پورہ، حسینی ٹیکری کی درگاہ، کہیں یہ جذبہ نہیں کہ ان کی مدد سے جدید تعلیم کی کوئی یونیورسٹی یا کوئی ٹیکنیکل کالج چلایا جائے اور لوگوں کو بہتر شہری بنانے کی فکر کی جائے۔ سری وینکٹیشور مندر کے منتظمین اس کے لئے قابل صد مبارکباد ہیں کہ وہ یہاں کی رقم سے علم و ادب کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں ہر طرح کی تعلیمات ہوتی ہیں۔ یہاں فارسی اور اُردو کے بھی شعبے قائم ہیں جہاں پروفیسر کی بھی اسامیاں ہیں۔

دوسرے دن صبح ۵ بجے کی بس سے ہمیں مدراس پہنچنا تھا۔ ہم لوگ گیسٹ ہاؤس سے اٹھ کر چار بجے ہی سڑک پر آ گئے۔ ہمیں مدراس کی بس تھوڑی دیر میں مل گئی اور دس بجتے بجتے ہم مدراس میں تھے۔ ہم سیدھے علیم صبا نویدی کے گھر پہنچے تو وہ ہمیں گھر پر ہی مل گئے۔ ہماری خاطر انھوں نے اس دن چھٹی لے رکھی تھی۔ علیم صبا نویدی پانی کے جہاز کے کسی محکمے میں ملازم ہیں، مگر ان میں یہ علم کی پیاس ہے جو انھیں تصنیف و تالیف کے لئے اکساتی رہتی ہے۔ انھوں نے شاعری کی ہے، افسانے لکھے ہیں اور کبھی کبھی وہ علمی ادبی اور تحقیقی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء تک ان کے بارہ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ تین شعری تالیفات ہیں اور تین ہی افسانوں کے مجموعے بھی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ انھیں اس تصنیف و تالیف سے کون سی مالی منفعت حاصل ہو سکتی ہے؟ یہ بھی تو نہیں کہ شمال کے حضرات اس بے غرض (SELF LESS) اردو کے مجاہد کو اپنے مشاعروں ہی میں یاد کر لیا کریں۔ مگر علیم صبا نویدی ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے علمی و ادبی کام میں لگے رہتے ہیں۔ اس میں وہ گھر پھونک تماشا دیکھنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ جو کچھ رقوم ان کو ملتی ہیں اور جہاں سے بھی ملتی

www.taemeernews.com

ہیں ایسے ہی علمی اور ادبی کاموں میں لگا دیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ نہ ان کے پاس سجا ہوا ڈرائنگ روم ہے نہ کوئی رنگین ٹی۔ وی اور نہ ڈی سی۔ آر (اب کا حال نہیں معلوم) اور نہ اس طرح کے جملہ لوازمات۔ اس وقت ان کی بیوی، ماں اور ایک عدد بچی تھی۔ وہ خود تو پکے جامنی رنگت کے ہیں بلکہ جب وہ کھٹا اچار یہ اور تمباکو کا قوام کھا لیتے ہیں تو اس جامن سے کبھی کبھی رس بھی ٹپکنے لگتا ہے۔ شاید اسی لئے وہ بیحد کم سخن ہیں کہ اگر بولیں گے تو جامنی مشروب سے محروم ہو جائیں گے۔ مگر ان کی بیگم بیحد شگفتہ اور جامنی قول صورت بی بی ہیں۔ تروپتی سے واپسی پر علیم صبا نویدی نے ہم لوگوں کو اپنے گھر ہی میں ٹھہرایا۔ اگرچہ ان کے گھر میں جگہ واجبی واجبی تھی۔ مدراس اور نواح مدراس میں علیم صاحب کا بڑا در خور ہے۔ یہ تو بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ ادب کی تاریخ میں کون رہ جائے گا اور کون نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ جب بھی دکن اور نواح ارکاٹ میں اردو ادب کی بات ہوگی علیم صبا نویدی کو کوئی فراموش نہ کر سکے گا۔ اور اگر ... غزل چل گئی تو ایسی غزل کے لئے بھی علیم صبا نویدی ضرور یاد کئے جائیں گے۔

اب گولڈن بیچ اور میرینا بیچ کا تذکرہ تو شاید بنالٹی (BANALITY) میں شمار ہوگا مگر میرینا بیچ پر کھڑا جب میں پرشور سمندر کی لہریں ابھرتی آتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو انسان کی حقیقت ایک تنکے سے بھی کم نظر آرہی تھی۔ یہی صورت حضرت تمیم انصاری کے مزار کے چاروں طرف سمندر دیکھ کر میں نے محسوس کی تھی۔ مگر اس تنکے سے بھی کم حیثیت رکھنے والی مخلوق نے اس پرشور سمندر کو بھی کس طرح اپنے لئے کارآمد بنایا اور روئے زمین کو کس طرح مسخر کیا، پھر چاند تاروں پر بھی جا پہنچا!! مگر کتنا عاجز!!

ع یہی انسان ہے سلطان بحر و بر کا!!

www.taemeernews.com

مگر کوئی بنارس شاہدے ہست

غالب جب بنارس پہنچے تو عین جوانی کا عالم تھا۔ تبھی تو انھوں نے یہ کہا کہ

بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور — سراپا نور ایزد چشم بد دور
میانہا نازک و دلہا توانا — ز نادانی، بکار خویش دانا
بہ سامانِ دو عالم گلستانِ رنگ — ز تابِ رُخ چراغانِ لبِ گنگ
بہ مستی موج را فرمودہ آرام — ز لغزش، آب را بخشیدہ اندام

اور میری معرفت صرف اس باب کے عنوان ہی تک ہے کہ میں اپنی عمر کے دورِ خزاں میں پہنچا۔ مگر یہ بھی کتنا عجیب ہے۔ الہ آباد سے بنارس کا فاصلہ صرف اسّی میل ہے۔ مگر کبھی اس 'ہمانا کعبۂ ہندوستانست' کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکا اور ملا بھی تو اسی یونیورسٹی کے سہارے جن میں طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا میں مخالف ہوں۔ ڈاکٹر حکم چند نیّر آنجہانی نے مجھے یونیورسٹی کے کچھ کاموں کے سلسلے میں دو تین بار بنارس آنے کا موقع فراہم کیا مگر اس کی صورت 'ملّا کی دوڑ مسجد' سے زیادہ نہ تھی۔ صبح گیا اور شام کو واپس۔ پھر دو ایک موقعے اور ملے مگر کبھی مجھے اس شہر کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہ ملا۔

اپنی عمر میں پہلی مرتبہ مجھے مارچ ۱۹۷۲ء میں بنارس جانے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر علیم مسرور جو بنارس میں ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر تھے۔ ان کا ایک ناول 'بہت دیر کر دی' شائع ہوا تو انھوں نے اس ناول کی رسمِ اجرا بڑی دھوم دھام سے منائی۔ الہ آباد سے پروفیسر احتشام حسین اور راقم الحروف کو بھی انھوں نے بلایا۔ مگر ہم شام میں پہنچے اور رات ہی میں واپس آ گئے۔ صرف اتنا وقت ملا کہ شیخ علی حزیں کا مقبرہ دیکھ سکے۔ اس میں ایک دلچسپی یہ بھی تھی کہ کیسا الہامی شعر اس فارسی کے شاعر نے کہا جو حقیقت بن گیا! وہی شعر جسے تمام فارسی

www.taemeernews.com

اور اُردو سے دلچسپی رکھنے والے پڑھا کرتے ہیں، یعنی :-

از بنارس نہ روم معبدِ عام است ایں جا   ہر برہمن پسر لچھمن و رام است ایں جا

مگر یہ مقبرہ تو اب ایک مزار بن چکا ہے، جہاں ہر شام زائرین کا مجمع ہوا کرتا ہے اور جمعرات کو قوالی۔ مجھے نہیں معلوم شیخ محمد علی حزیں کس مسلک کے ماننے والے تھے۔ صوفی صافی یا رند شاہد باز مگر ان کے متعلق ایک اچھے شاعر ہی کا تصوّر رکھتا ہوں۔ شام کو ناول بہت دیر کر دی کے متعلق جو پروگرام ہوا اس میں جملہ حضرات کے ساتھ احتشام حسین، اور راقم الحروف نے اس ناول پر تقریر کی۔ مگر جب اس تقریر کی تصویر ایک نمبر میں شائع ہوئی جیسے الٰہ آباد کے ایک ۔۔۔ صاحب نے ترتیب دیا تھا تو راقم الحروف جو آخر میں بیٹھا تھا، اس کی تصویر اس گروپ میں سے کاٹ دی گئی۔ گویا اس عام جلسے میں بھی یونیورسٹی کی سیاست اور سازشیں داخل ہوگئیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

بنارس جانے میں پھر بڑا وقفہ ہو گیا۔ ابھی دو تین سال پہلے کاشی ودّیا پیٹھ یونیورسٹی کے امتحانات کے سلسلے میں جانا ہوا تو بنارس کو ٹھہر کر دیکھنے کا موقع ملا۔ صبح بنارس بھی دیکھنے کی تمنا کیا، تجسّس ہوا کرتا ہے؟ اس وقت کاشی ودّیا پیٹھ میں میرے تین شاگرد استاد ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر شاہینہ رضوی، ڈاکٹر رفیع اللہ اور ڈاکٹر محمد اشتیاق۔ میں نے ایک رات شاہینہ کے گھر قیام کیا اور علی الصباح اٹھ کر دس اشومید گھاٹ ،صبح بنارس دیکھنے کے لئے روانہ ہوا۔ معلوم نہیں کہاں سے یہ شعر ذہن میں گونجا :-

علی الصباح چوں مردم بہ کاروبار روند   بلا کشانِ محبت بہ کوئے یار روند

اب بھلا صبح بنارس دیکھنے میں اور وہ بھی اس عمر میں، اور اس شعر میں کیا ربط ہے؟ مگر ذہن کی رَو ہی تو ہے بس اسی شعر کی طرف چلی گئی۔

خیر گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک ہجوم گھاٹ کا جلوہ دیکھنے کے لئے رواں دواں تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں سے زیادہ بیرونی ممالک کے لوگ اس ہجوم میں شامل تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مغربی سیاحوں کو کون سی چیز بنارس کے

www.taemeernews.com

گھاٹ دیکھنے کے لئے آسکتی ہے۔ مجھے تو یہ گھاٹ بے حد گندا، رپٹنا اور بے کیف لگا۔ اس قدر کیچڑ اور گندگی کے باوجود عقیدت تو نے جاسکتی ہے لیکن مغربی لوگوں کو اس میں کیا عقیدت ہو سکتی ہے جو مغربی سیاح ان گھاٹوں کا رُخ کرتے ہیں؟ یہ کچھ تو نہاتے ہوئے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ کچھ خود بھی مٹی کے جلتے دیئے مشغلے کے طور پر پانی میں بہاتے ہیں اور کچھ ملاحوں کی کشتیوں پر بیٹھ کر سیر دریا کرتے ہیں۔ ایک ملاح کے لڑکے کو دیکھا کہ وہ ایک فرانسیسی جوڑے سے فرانسیسی میں باتیں کر رہا ہے۔ جب دریا میں گھومنے کا معاملہ طے ہو گیا تو میں نے ملاح کے لڑکے سے پوچھا کہ تم نے فرانسیسی زبان کہاں سے سیکھی؟ اس لڑکے نے جواب دیا کہ یہی گھاٹ میرا اسکول ہے۔ میں نے یہیں انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبان سیکھی ہے پھر وہ جوڑا اور مغربی سیاحوں کو لے کر دریا میں سیر کرانے چلا گیا۔ میں اب بھی سخت متحیّر ہوں کہ مغربی سیاح گنگا کے گھاٹ پر کیا دیکھنے آتے ہیں؟ صبح بنارس دیکھنے والوں کے لئے سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ عورت مرد سب دریا میں نہاتے ہیں اور جلتے ہوئے دیئے پانی میں تیراتے ہیں۔ پھر نہ عورتیں ننگی ہو کر نہاتی ہیں نہ مرد۔ پھر مغرب کے لئے یہ کون سی خاص بات ہے؟ جہاں نیوڈ (Nude) کلب ہیں، جہاں شارع عام پر بوس و کنار کے سین رات دن دیکھے جاسکتے ہیں، وہاں گھاٹوں پر نہانا کون سا عجوبہ ہے؟ تو پھر کون سی دلچسپی انھیں بنارس لے آتی ہے؟ بعض مغربی سیاحوں کو دیکھا کہ دلی اتر کر سیدھے بنارس کا رخ کرتے تو پھر کیا چرس اور گانجہ ان کی دلچسپی ہے؟ اگر یہ دلچسپی ہے تو وہ کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ بنارس ہی کیوں۔ پھر میں نے کہیں گانجا اور چرس علی الاعلان کسی کو پیتے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں سادھوؤں کے مٹھوں میں یہ محفلیں جمتی ہوں۔ پھر عورتوں کو بھی میں نے بڑے سلیقے سے نہاتے دیکھا ہے۔ وہ نہاتی ہیں سورج کی آرتی اتارتی ہیں اور بڑے استادانہ ڈھنگ سے اپنے کپڑے بدلتی ہیں کہ ان کے جسم کا کوئی حصہ عام طور پر نمایاں نہیں ہوتا۔ ہاں نکلتے ہوئے سورج کی روشنی میں عقیدت کا یہ نظارہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بڑی دیر تک اس سہانی فضا اور اس عقیدت مندی کو دیکھتا رہا۔ ذرا آگے بڑھا تو ایک جگہ ایک

www.taemeernews.com

یوروپی سیاح زمین پر ایک گدے پر لیٹا ہوا اپنے ہاتھ پاؤں دلوا رہا تھا۔ گویا یہ مساج ہو رہا تھا۔ سُنا ہے کہ یوروپین عورتیں بھی اسی طرح کا مساج (Massage) کراتی ہیں تو ایک بھیڑ اس مساج کو دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو جاتی ہے۔ یہ کیا جذبہ ہے؟ البتہ کسی ہندوستانی مرد یا عورت کو ایسا مساج کراتے نہیں دیکھا۔ ہم ناؤ لے کر دوسرے گھاٹوں پر اپنے تجسس میں گئے۔ بنارس میں ایسے گھاٹ تقریباً اسّی توّے بتائے جاتے ہیں۔ جن میں دس اشومید گھاٹ سب سے اہم ہے۔ جسے عام آدمی دُسا سومید گھاٹ کہتا ہے۔ جو یہی گنگا کے نصف قطر کے بیچوں بیچ میں ہے کہ گنگا یہاں نصف قطر بنا کر بہتی ہے۔

مجھے سارناتھ دیکھنے کی بھی بہت خواہش تھی۔ جو مہاتما گوتم بدھ کا ایک وہار رہ چکا ہے۔ چنانچہ دس بجے دن میں ڈاکٹر رفیع اللہ اور رعنی میاں (ایک طالب علم) کے ساتھ سارناتھ کے لئے روانہ ہوا۔ شہر کے مختلف علاقوں سے گزر کر جب اس علاقے میں داخل ہوئے تو یہاں وہی خاموشی اور وہی سکون تھا جو بودھ گیا میں ہوتا ہے۔ مندر کے اندر سامنے ہی مہاتما بدھ کی سنہری مورت رکھی ہوئی ہے اور کچھ بھکشو چپ چاپ مورت کی بغل میں کھڑے ہوئے کسی مقدس کتاب کے اوراق ہاتھ میں لئے ہوئے خاموشی سے ایک مالا پر سُمرن کر رہے تھے۔ ایسا سکون مہاتما بدھ کے چہرے پر ہے کہ دیکھنے والا بھی جیسے اتھاہ سکون اور خاموشی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہم تھوڑی دیر مندر کے بڑے ہال میں کھڑے رہے۔ ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم بھی خاموش کھڑے تھے۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ہم بولے تو یہ اتھاہ سکون ٹوٹ جائے گا۔ باہر نکل کر ہم تھوڑی دیر کے لئے پیڑوں کی چھاؤں میں لان پر بیٹھ گئے اور میری زبان پر بے اختیار :

" بدھم شرنم گچھامی "

کے الفاظ رواں ہو گئے۔

ہمیں کاشی نریش کا محل دیکھنے رام نگر بھی جانا تھا۔ سارناتھ سے رام نگر کا راستہ

www.taemeernews.com

بے حد تکلیف دہ تھا۔ سڑک پر پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے (BOULDERS) پڑے ہوئے تھے جس پر ہماری کار مینڈھک کی طرح اچھل اچھل کر چل رہی تھی۔ سارناتھ میں ہم نے جتنا سکون حاصل کیا تھا سب غارت ہوگیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں اس اچھل کود کے باعث طبیعت مالش کرنے لگی۔ رام نگر پہنچے تو طبیعت پر ایک اضمحلال طاری تھا۔ رام نگر سے ایک غیر شعوری دلچسپی یہ بھی تھی کہ یہیں راجہ ایشری نرائن سنگھ نے اردو کے صاحب طرز نثار رجب علی بیگ سُرور کو پناہ دی تھی۔ ان کی آنکھوں کا علاج بھی کرایا اور پھر سُرور کا یہیں انتقال ہوا اور وہ یہیں کہیں دفن بھی ہوئے۔ خیال ہوا کہ کہیں یہیں ان کا مقبرہ بھی ہوگا جو مجھے معلوم نہ ہوسکا۔ کچھ محققین نے تو سُرور کا مقبرہ ، فاطمین میں بنا دیا۔ مگر یہ محقق نہیں ہے۔ ایک زمانے میں یہ بھی دبی دبی بات چلی تھی کہ سُرور شیعی مسلک کے ماننے والے تھے یا حنفی مسلک کے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ اگرچہ کسی ادیب کے سلسلے میں یہ قطعی اہم بات نہیں۔ مگر اکثر محققین اس میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

رام نگر محل کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ یہ صورت اب اکثر بڑے رجواڑوں میں ہوگئی ہے۔ جے پور کا محل بھی دیکھنے کے لئے ٹکٹ لے کر جانا پڑتا ہے اور یہاں بھی وہی صورت تھی۔ ٹکٹ لے کر داخل ہوئے تو عجیب احساس ہوا۔ جیسے ہندوستان کے راجگان اپنی عظمت رفتہ کا احساس بھی ناظرین کو دلانا چاہتے ہیں، مگر اس کے دام بھی وصول کر رہے ہیں۔ یہ راجہ صاحب کی موٹروں کا کمرہ ہے۔ یہ پالکیوں کا کمرہ ہے، یہ اسلحہ خانہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوشش تو مغربی ممالک کے قلعوں کی طرح ہے۔ ہر چیز احتیاط سے رکھ کر نمائش کی ہے۔ مگر نہ وہ انتظام نہ ویسی صفائی، نہ روشنی کا انتظام، نہ سازو سامان میں وہ چمک دمک۔ بس یہ کمرکٹ کھڑا ہے، وہ نالکی ہے، یہ ہوادار ہے۔ یہ چھرٹ ہے۔ یہ وکٹورین کار ہے، یہ چارجین، یہ ہتھ نال ہے، یہ گج نال ہے، یہ توڑے دار بندوق ہے یہ چار بور (BORE) کی بندوق ہے۔ سب پر قریب قریب زنگ چڑھا ہوا۔ ہر طرف کوڑا پڑا

www.taemeernews.com

ہوا۔ کہیں کہیں چمگادڑوں کی بیٹ اور اس کی بدبو، کہیں ہوا اور روشنی کی کمی سے سانس گھٹنے لگتی ہے۔ وہ لندن کے ونڈسر کیسل اور ٹاور کی سی صورت کہاں؟ تھوڑی دیر میں طبیعت منغض ہو گئی۔ باہر نکلے تو کمپاؤنڈ میں گھاس کا بن کھڑا نظر آیا۔ کہیں کہیں بجز۔ پھول خشک افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اداس' والی کیفیت بھی نظر آئی۔ کہیں بیچ بیچ میں چٹیل میدان بھی۔ کاشی نریش قلعے میں موجود تھے۔ کیونکہ وہاں کی رسم کے مطابق محل پہ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ رام نگر کی آبادی بھی جیسے اجڑی اجڑی سی لگی۔ بھلا تو برس پہلے یہاں کی آبادی کیا رہی ہوگی! شاید صرف کرم چاریوں اور حوالی موالی کے گھر رہے ہوں گے۔ کئی گائڈوں اور قلعوں کے منتظمین سے پوچھا مگر یہ معلوم نہ ہوا کہ کلکتہ جاتے ہوئے واجد علی شاہ، بادشاہ اودھ کو اس وقت کے مہاراجہ نے کہاں ٹھہرایا ہوگا۔ وہاں کسے خبر تھی مگر میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ چاہتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی تاریخی باتیں بھی معلوم ہوں۔

عرفی میاں اور رفیع اللہ کے ساتھ شام کو وشوا ناتھ مندر کے ساتھ ملی ہوئی مسجد دیکھنے کا پروگرام بنا۔ یہی وہ مسجد ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے آدھا مندر توڑ کر مسجد بنوادی۔ دراصل مندر کے اس حصے میں ایک پوشیدہ تہہ خانہ تھا جہاں مندر کے پنڈے، مہنتوں کے اشارے پر عورتوں کے زیورات وغیرہ اتار کر انھیں غائب کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اورنگ زیب کے ایک راجپوت سردار کی بیوی کے ساتھ یہی حرکت پنڈوں نے کی۔ بس اسی وقت بادشاہ نے اس تہہ خانے کو توڑ دینے کا حکم دیا اور وہاں پہ مسجد بنادی۔ میں اس سلسلے میں بشمبھر ناتھ پانڈے جو مشہور مورخ بھی ہیں اور الہ آباد کے پرانے کانگریسی، جو اڑیسہ کے گورنر بھی رہ چکے ہیں، ان کا بیان نقل کرتا ہوں۔ یہ اقتباس ان کی اس تقریر کا ہے جو انھوں نے جشن علی سردار جعفری منعقدہ ۱۵ رمئی ۱۹۹۴ء، الہ آباد میں کی تھی جس کی ٹیپ ریکارڈنگ انھیں کی آواز میں محفوظ ہے۔ اس مندر کے سلسلے میں پنڈت جی فرماتے ہیں :-

"اورنگ زیب، بنارس سے کچھ فاصلے پر اپنی فوجوں کے ساتھ بنگال کی طرف جا رہا تھا۔

www.taemeernews.com

کہ کچھ راجپوت رانیوں نے بنارس میں گنگا اشنان کی خواہش ظاہر کی۔ اجازت ملتے ہی بہت سی ہندو رانیاں بنارس گئیں۔ شام کو سب لوٹ آئیں، سوا کچھ (گجرات) کی رانی مندکیرا کے۔ رانی کی تلاش ہوئی مگر وہ نہ ملی۔ تب شاہی فوج نے وشوا ناتھ مندر کو گھیر لیا اور رانی کی تلاش شروع ہوئی۔ گنیش جی کی ایک مورتی کے پیچھے تہہ خانہ تھا۔ اسی میں رانی کو قید کر کے اس کے سب زیورات چھین لئے گئے تھے اور پنڈوں نے اس کی عصمت دری بھی کی تھی۔ اورنگ زیب نے شیوجی کی مورتی ہٹوا کر وہ حصّہ جس میں خفیہ تہہ خانہ تھا، اور یہاں اس طرح کے واقعات ہوا کرتے تھے گروا دیا اور وہیں مسجد بنوا دی۔"

پنڈت لشمبھر ناتھ پانڈے نے یہ بات بھی بتائی کہ یہی واقعہ کانگریس کے ایک بڑے مورخ "پٹابھی سیتا رمیا" نے بھی اپنی کتاب "دی فیدرس اینڈ اسٹونس The Feathers and stones" میں لکھی ہے۔

مندر اور مسجد دیکھنے کے لئے ہم ایک نہایت پتلی سی گلی میں داخل ہوئے تھے کہ دوسری طرف سے ایک سانڈ آتا دکھائی دیا۔ گلی میں اتنی جگہ نہ تھی کہ ہم اور سانڈ آسانی سے گزر جاتے چنانچہ ہم کو پھر پیچھے کی طرف بھاگنا پڑا۔ پھر جب سانڈ جی نکل گئے تو ہم گلی میں داخل ہوئے۔ بنارس کے لئے ایک کہاوت مشہور ہے کہ :-

رانڈ، سانڈ، سیڑھی، سنیاسی   ان سے بچو تو نہاؤ کاشی

گویا ان چاروں چیزوں کی بنارس شہر میں وہ بہتات ہے کہ ان سے جان بچانا آسان نہیں۔ خیر ہم سانڈ والی گلی سے نکل کر وشوا ناتھ گلی میں داخل ہوئے۔ بھئی کمال کی گلی ہے اور کمال کے لوگ ہیں جو اس گلی میں دکانیں سجائے بیٹھے ہیں! مشکل سے تین چار آدمی سر جھکا کر چل سکتے ہیں۔ مگر دکانیں ہیں کہ سامانوں سے پٹی پڑی ہیں۔ علی الخصوص عورتوں کی آرائش اور زیبائش کی کون سی ایسی چیز ہوگی جو یہاں دستیاب نہیں؟! اسی وجہ سے عورتوں کا ایک ہجوم ہے جو اس گلی میں ہر وقت رُکتا رہتا ہے۔ اسی گلی سے ہو کر راستہ وشوا ناتھ مندر کو جاتا ہے تو درشن ابھیلاشیوں (زائرین) میں مرد اور عورتیں سب ہوتے ہیں جن

www.taemeernews.com

کے درمیان مزہ لوٹنے والے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ قدم قدم پر پولیس بھی نگراں رہتی ہے۔ دوسری طرف شام کے وقت مندر سے بھجن اور کیرتن کی وہ آوازیں آتی ہیں اور انھیں کے ساتھ گھنٹوں اور ناقوس کی صدائیں بھی کہ ایک گھیر دم رہتا ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مہاتما بدھ نے تو گیان دھیان، امن، خاموشی اور سکون کی تہذیب بنائی مگر سناتنیوں نے یہ شور شرابے، بھجن، کیرتن کا تصور کیا بدھ مت تہذیب کی مخالف سمت جانے کے لئے پیدا کیا۔؟ کہ بہر حال انھیں اپنے مت کی بقا کی بھی فکر ہوئی ہو گی اور گیان دھیان کی خاموشی اور سکون سے الگ ہٹ کر ایک جذب کے عالم میں بھجن کیرتن کو بھی یاد الٰہی کا ایک دوسرا زینہ بنایا ہوگا۔ بہر حال اس کا میرے پاس کوئی ثبوت تو نہیں، اسے صرف میری ایک ذہنی رو ہی سمجھنا چاہئے۔ جدید دور میں بھی، جدید آچاریوں نے بھی دونوں طرح کی عبادت کی صورتوں کو جدید تہذیب کے ساتھ شامل کیا ہے۔ خاموشی، سکون اور گیان دھیان نے آچاریہ رجنیش کی فکر کو اپنایا۔ یا خود آچاریہ رجنیش نے یہ طریقہ پسند کیا اور انھیں خطوط پر اپنے آشرم کھولے۔ جبل پور میں ابھی مجھے آچاریہ رجنیش کا ایک آشرم اور ان کی اوشو OSHO لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا جو شہر سے باہر، مدن محل کی گھاٹیوں میں بنی ہے۔ وہی سکون، وہی خاموشی۔ اوشو لائبریری میں نوجوان لڑکے لڑکیاں گیروا بستر پہنے، گیان دھیان اور کتابیں پڑھنے میں مشغول ہیں۔ دوسری طرف لندن میں مَیں نے 'ہرے راما ہرے کرشنا' مسلک کے لوگوں کو جن میں مغربی سنت سادھو شامل تھے' دیکھا کہ وہ آکسفرڈ اسٹریٹ اور ریگر اسٹریٹ پر ایک جذب کے عالم میں بھجن اور کیرتن گاتے، گھنٹے اور مجیرے (جلاجل) بجاتے بڑے جذب (Gusto) کے ساتھ چلے جارہے تھے۔ گویا یہ سکون اور خاموشی کے برخلاف بھجن اور کیرتن کے ساتھ سناتنیوں کی روایت Tradition کو چلا رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اسی بنارس میں دونوں روایتیں موجود گیا سارناتھ میں مہاتما بدھ کی روایت اور وشوا ناتھ مندر میں سناتنیوں کی روایت۔ اور دونوں اپنی اپنی روایات کی بقا میں کوشاں۔

www.taemeernews.com

اسی سامان آرائش اور نمائش سے پٹی ہوئی گلیوں سے ایک راستہ وشوا ناتھ مندر کو جاتا ہے اور ذرا آگے بڑھ کر جب گلی مڑتی ہے تو مسجد کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ حکومت نے یہاں قدِ آدم سے بھی زیادہ اونچے لوہے کے کھمبے لگا کر کنٹیلے تاروں سے مسجد کو الگ کر دیا ہے اور آج کل ہر وقت یہاں فوجی پہرہ رہتا ہے فوجی کسی کو زیادہ دیر تک گلی میں رکنے نہیں دیتے ہیں۔ مسجد کا صدر دروازہ، دوسری سڑک پر کھلتا ہے۔ یہاں بھی پی۔اے۔سی کے نوجوان بیٹھے رہتے ہیں۔ اور صرف نماز کے وقت مسلمانوں کو اندر جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ بھارتی جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں یہ صورت یہاں پیدا ہوئی۔ جب یہاں ہندو مسلم تناؤ کافی بڑھ گیا تھا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد اس دور کی حکومت نے اس مسجد کو بھی توڑ دینے کا پروگرام بنایا تھا جو عمل میں نہیں آسکا۔ نئی نسل کے ہندوستانیوں کی عجیب ٹریجڈی ہے

وہ آئے دن ہندوستان میں اور علی الخصوص صوبہ جات میں حکومتوں کے بدلتے رہنے سے اپنی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں بنا سکتے۔ کبھی ایک حکومت کے ساتھ چلتے ہیں کہ دوسرے نظریات رکھنے والی پارٹی برسرِ اقتدار آجاتی ہے تو پھر ان کے ساتھ نعرے لگانے لگتے ہیں۔ کیونکہ سارے مادّی وسائل تو حکومتوں ہی کے پاس ہوتے ہیں اور لوگوں کو بہر حال زندہ رہنے کے لئے مادّی وسائل کی تو ضرورت ہوتی ہی ہے۔ پھر ابھی یہ نوجوان کسی ایک پارٹی سے اپنا رابطہ استوار نہیں کرنے پاتے کہ دوسری پارٹی اقتدار میں آجاتی ہے۔ ایسے میں زندگی کے اصول اور نظریات اگر کچھ بنتے ہیں تو سوا منافقت کے اور کیا بنیں گے؟ اسی لئے نئی نسل اپنے قول و فعل میں کوئی مطابقت نہیں کر پاتی۔ اور نہ ان میں کسی کردار کو استحکام مل پاتا ہے۔ وعدہ خلافی، مقصد برآری، جھوٹ، بے کرداری، بے اعتباری، احسان فراموشی، یہی وہ صورت ہے جو نئی نسل کا جیسے کردار بناتی جاتی ہے۔ پورا ہندوستان اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اور یہ صورت صرف سیاست والوں نے پھیلا رکھی ہے۔ آج چھوٹے موٹے وقتی فائدوں کے لئے کردار اور تعلقات کا بدل لینا کوئی خاص بات نہیں۔ یہی صورت ہر سیاسی اور مذہبی ادارے میں بھی نظر آئے گی۔ بابری مسجد ٹوٹنے کے بعد جن سنگھی حکومتیں

www.taemeernews.com

یہی تاثر دینے لگی ہیں کہ اس گیان واپی مسجد (بنارس والی مسجد) کا بھی یہی حشر ہوگا۔ میں نے جو یہاں اس وقت تناؤ دیکھا ہے، وہ کسی وقت بھی بابری مسجد والی صورت پیدا کر سکتا ہے ابھی تک یہ مندر اور مسجد اشتراک باہمی کا نمونہ تھے۔ مگر اب ہوا دوسری ہے۔ اب تو شیو سینا کے صدر بال ٹھاکرے کے قول کے مطابق تمام مسلمان یا تو سمندر میں غرق کر دیئے جائیں گے یا جرمنی کے یہودیوں کی طرح وہ فیکٹریوں کے گیس چیمبرس میں ڈال دیئے جائیں گے۔ ہندوستان کے یہ مسلمان جو تعداد میں کم از کم اٹھارہ بیس کروڑ ہیں۔ لیکن ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں ایسا کبھی ہوا نہیں۔ نہ یہ ملک اس طرح کا مزاج رکھتا ہے۔ یہ ملک ہمیشہ سے مجموعی طور پر صلح و آشتی کا ملک رہا ہے اور یہاں خون خرابہ بھی ایک حد تک برداشت کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر جن سنگھی نظریات اور حکومتیں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئیں جیسا کہ بال ٹھاکرے صاحب کا خیال ہے تو اس ملک، ہندوستان کا بالکل سے کایا کلپ ہو جائے گا اور ہندوستان کی فکری اور سماجی تاریخ کے لئے پھر ایک نیا نظریہ بنانا پڑے گا۔ دیکھنا ہے کہ کسے کامیابی ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کو یا بال ٹھاکرے اور جن سنگھیوں اور ان کے ہم خیالوں کو۔

بنارس کی سماجی زندگی میں اوپر سے دیکھنے میں تو کچھ خاص نظر نہیں آتا لیکن اندر اندر یہاں کی سماجی زندگی پوری طرح سے برہمنوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ جیسا چاہتے ہیں طبقات کی سماجی زندگی کو موڑتے رہتے ہیں۔ کبیر داس نے اس برہمنی نظام کی سخت گیری کے خلاف بغاوت کی تھی اور مرتے وقت بنارس چھوڑ کر مگہر چلے گئے تھے۔ مگہر چلے جانے میں بھی وہی بغاوت پنہاں تھی کہ پنڈتوں کا کہنا تھا کہ مگہر میں جو مرے گا وہ نرک (دوزخ) میں جائے گا۔ دراصل اس بات کو مشہور کرنے میں بھی وہی اجارہ داری کا تجارتی رویہ کارفرما تھا کہ لوگ صرف بنارس کے گھاٹوں ہی پر جلائے جائیں تاکہ زاد آخرت کے طور پر جو کچھ ہندو سماج دیتا ہے وہ صرف برہمنوں ہی کو ملے اور وہ بھی بنارس کے برہمنوں کو۔ مگر کبیر کی بغاوت کچھ کام نہ آئی۔ آج بھی کوئی مگہر جا کر مرنا پسند نہیں کرتا، بلکہ برہمنوں اور

خار بر عدہ

www.taemeernews.com

اُن کے گرگوں نے ایک نئی مثل، کبیر کے لئے ایسی بنادی کہ وہ مثل آج بھی شہر سے لے کر دیہات تک مشہور ہے۔ مثل یوں ہے۔

" سگل جون کاسی مرتی جون مگہر کی پاٹی "

گویا یہ طنزیہ مثل بنائی گئی کہ اس بدنصیب کو دیکھو کہ تمام عمر تو کاشی میں رہا اور مرتے وقت مگہر یعنی جہنم میں چلا گیا۔ گویا کبیر کی بغاوت ان کی بدنصیبی پر محمول کی گئی۔ آخر ہندو سماج برہمنوں سے چھٹکارا کیوں نہیں پاتا؟ ہندوستان میں اتنے پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ ہوئے مگر برہمنی نظام نے آخر آخر میں سب کو شکست دے دی۔ سوامی رام تیرتھ، سوامی دیانند سرسوتی، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کوئی بھی ہندو سماج کو برہمنوں اور برہمنی نظام کے چنگل سے نہ چھڑا سکا۔ اور جو کچھ ہندو سماج کے لئے اصلاحی طور پر ہوا وہ سب کچھ کاغذی کاروائی سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ پونہ پیکٹ اور ہندوستان کا آئین کوئی بھی برہمنی نظام کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ حیرت کی بات ہے کہ بنارس کے گھاٹ کی زندگی میں کیوٹ یعنی ملاح بھی برابر کے دخیل ہیں مگر کوئی اختیار انھیں آج تک نہیں ملا۔ پرانی زندگی کا حال تو مجھے نہیں معلوم مگر بیسویں صدی کی سیاسی زندگی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کملاپتی ترپاٹھی اور لوک پتی ترپاٹھی، ہی بنارس کی سیاست پر حاوی رہے۔ سماج کے افراد کو عام انسان کی بھی فکر کرنی چاہئے، مگر کوئی بھی مفکر عام انسانوں کے لئے کچھ عملی طور پر نہیں کرپاتا۔ گاندھی جی نے بھی بہت کوشش کی مگر برہمنی نظام سے عام ہندو اور ہندوستان کے افراد کو نجات نہ دلوا سکے۔ تبھی تو اقبال نے اپنے ڈھنگ کا وہ شعر کہا تھا۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

برہمنی نظام اور طریق کار سے مسلمان بھی نہ بچ سکے۔ مسلمانوں کے طبقۂ مولویاں نے بھی برہمنوں سے وہی طریقے سیکھ لئے۔ غرض کہ بنارس کے گھاٹ سے لے کر کشمیر کے،

www.taemeernews.com

امرناتھ دھام تک اور دکن میں رامیشورم تک ہندوستانی سماج برہمن کے طلسم کا ایسا اسیر ہے کہ کوئی شاید ہی اسے چھٹکارا دلا سکے۔ دیکھئے پھر بات کہاں سے کہاں پہنچی بنارس کے گھاٹ سے ان چیزوں کا کیا واسطہ، اور پھر کسی خود نوشت سوانح میں ایسی باتیں چھیڑنا کیا معنی رکھتا ہے؟۔ مگر یہ بھی تو سوچئے کہ سوانح نگار کیا کہیں خلا (ISOL-ATION) میں ہوتا ہے؟ وہ یہاں بھی جاتا ہے یا جو کچھ دیکھتا سنتا ہے، سب اس کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں۔ یہی سمجھ کر یہ باتیں لکھی جا رہی ہیں۔

○

www.taemeernews.com

۹۶ء

یوں کراچی میں ہوں

پہلے کبھی ارادہ نہ کیا کہ پاکستان جاؤں، ورنہ موقعے تو مل سکتے تھے۔ میرے گھر کے تمام افراد پاکستان چلے گئے تھے سوا میرے۔ علی اصغر بھائی کے بچے تو پہلے ہی ۴۷ء میں پاکستان پہنچ چکے تھے۔ پھر علی اصغر بھائی گئے۔ پھر میری دو بہنیں اور میرے تمام بھانجے، سب پاکستان سدھارے۔ میری بہنوں نے بہت زور دیا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں۔ مگر مجھ پر تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوا اس کا بے حد خراب اثر پڑا تھا۔ اس کا کچھ تذکرہ میں ابتدا میں کر چکا ہوں۔ میں تو سیاسی آدمی کبھی بھی نہ تھا مگر مجھ پر نیشنلزم کا اثر بے حد گہرا تھا اور "آبِ رودِ گنگا" مجھے اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پھر میں نے یہ کبھی نہیں سمجھا کہ خود میرے اپنے ملک میں مجھ پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ اگرچہ اس وقت کا یہی طریقہ تھا کہ بہت سے لوگ تعلیم تو ہندوستان میں مکمل کرتے مگر ملازمت کی تلاش میں پاکستان یا مغربی ممالک کو سدھارتے۔ اس کے بھی بہت سے اسباب تھے جن کا ذکر یہاں چنداں ضروری نہیں۔ تاہم پاکستان کے رسالے، وہاں کی کتابیں، اردو کا وہاں سرکاری زبان ہونا، سب ہم تمام اردو والوں کو ڈہکاتے تھے۔ لکھنا شروع کیا تو نقوش اور فنون، لاہور، سیپ، جائزے اور کراچی کے دو ایک رسالوں میں میرے مضامین شائع ہوتے۔ اس طرح ادبی صورتیں اور دلچسپیاں یقیناً مجھے پاکستان کی طرف متوجہ کرتی رہیں۔ مگر کبھی کسی ادبی جلسے یا اجتماع میں پاکستان جانے کا موقع نہیں ملا۔ ایک موقع ۱۹۸۵ء میں ترقی پسندوں کی عالمی کانفرنس میں کراچی جانے کا آیا تو سید سبط حسن نے مجھے بھی دعوت نامہ دلی کے دوستوں کی معرفت بھیجا۔ اچنبھا یہ کہ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں ہندوستان آنے پر بتایا اور پوچھا بھی کہ تم کیوں نہیں

www.taemeernews.com

آئے) مگر وہ دعوت نامہ کہیں دلی کے دوستوں کے درمیان گم ہو گیا اور مجھ تک نہیں پہنچا۔
بہرحال نومبر ۱۹۹۳ء میں مجھے کراچی کے 'ارتقا' رسالے کے گروپ نے، احتشام حسین انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کے لیئے کراچی مدعو کیا۔ بڑی دوڑ دھوپ اور ردّوقدح کے بعد اس سیمینار میں شرکت کے لئے حکومت پاکستان نے صرف کراچی کا پندرہ دن کا ویزا عنایت کیا۔ چنانچہ میں اور میری بیٹی ڈاکٹر ریشماں عازم پاکستان ہوئے۔ P.I.A کی فلائٹ سے کراچی پہنچے ارتقا گروپ والوں نے میرے بلانے کی اتنی فکر کی کہ جہاز میں جگہ نہ ہونے کے باوجود جہاز کا کپتان مجھے اپنے ساتھ کاک پٹ میں V.I.P کی طرح لے گیا۔ حسن عابد، راحت سعید اور شاہد نقوی صاحبان کراچی کے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ اسی جہاز سے ڈاکٹر محمد حسن اور ان کی بیگم بھی، اسی سیمینار میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ اچھی صحبت رہی۔ کراچی ایرپورٹ پر میرے بھانجے علی باقر عرف محمد میاں بھی اپنی بیٹا اور گاڑی لئے موجود تھے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میرا قیام محمد میاں ہی کے ساتھ ڈیفنس ہاوسنگ اتھارٹی میں کراچی اسکول کے پاس رہا۔

دوسرے دن نیپا NEPA نام کے آڈیٹوریم میں سیمینار کا افتتاح تھا۔ محمد میاں تو اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ مگر میرا تیسرا بھانجا حسن باقر مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر نیپا لے گیا۔ میں عین وقت کے مطابق پہنچا مگر یہاں تو مجلسی وقت تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد پروگرام شروع ہوا۔ خاصے لوگ اکٹھا ہو گئے تھے۔ لاہور سے ڈاکٹر عبادت بریلوی، آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، کینیڈا سے خورشید عالم، لندن سے عاشور کاظمی، اور کراچی کے بہت سے ادیب جن میں مشفق خواجہ، جمیل الدین عالی، صہبا لکھنوی، شوکت صدیقی، ڈاکٹر عتیق احمد، شہزاد منظر، شاہ علی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، زاہدہ حنا، حمایت علی شاعر، صبا اکرام، شان الحق حقی، نورالحسن جعفری، رؤف نظامانی، تاج بلوچ، ڈاکٹر عالیہ امام، حسن عابد، راحت سعید، محمد علی صدیقی، حکیم محمد سعید، طفیل عباس، ریاض صدیقی، ڈاکٹر اسلم فرخی، عظمت بلگرامی، صہبا اختر، ہلال نقوی، شکیل نوازش رضا

www.taemeernews.com

امید فاضلی، سید ضمیر جعفری، فہیم اعظمی، نسیم درانی، مطیع اللہ ناشاد شامل تھے۔ اور بھی حضرات ہوں گے جن کے نام اب اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ ہندوستان سے پروفیسر محمد حسن، میری بیٹی ریشماں اور راقم الحروف شامل تھے۔ جلسۂ افتتاحیہ کی صدارت جسٹس علی نصرت نے فرمائی، جو الہ آباد اور لکھنؤ دونوں یونیورسیٹیوں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے بڑے عزیز شاگردوں میں تھے۔ رسم افتتاح کے بعد کچھ مقالے اور کچھ تقریریں سید احتشام حسین کی فکر و فن پر پیش ہوئے۔ سیمینار کی پوری بحث اور مقالوں کی تفصیل 'ارتقا' رسالے کے احتشام حسین نمبر میں معہ تصاویر کے شامل ہے۔ یہ سیمینار ۱۱، ۱۲ فروری ۱۹۹۲ء کو کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ میں پہلی مرتبہ پاکستان کے بہت سے مشہور ادیبوں سے ملا۔ کچھ سے تو ہندوستان میں ملاقات ہوئی تھی لیکن زیادہ تر لوگوں سے میرا غائبانہ ہی تعارف تھا۔ مختلف افسانہ نگاروں اور شعراء سے بھی مختلف محفلوں میں ملاقاتیں ہوئیں۔ مشفق خواجہ صاحب نے غالب لائبریری میں افسانہ نگاروں کا ایک جلسہ کیا جس میں راقم الحروف کی ملاقات کراچی کے بہت سے افسانہ نگاروں سے کرائی اور ان سے تبادلۂ خیال کا موقع مجھے فراہم کیا۔ راقم نے ہندوستان کی افسانہ نگاری کی صورت حال پر کچھ باتیں کیں۔ کچھ پاکستانی افسانہ نگاروں پر باتیں ہوئیں جنھیں میں نے پڑھ رکھا تھا۔ اس جلسے میں کراچی میں رہنے والے تمام پرانے اور نئے افسانہ نگاروں کو مشفق خواجہ صاحب نے میرے لئے جمع کر لیا تھا۔ ان کی عنایت سے بیک وقت اتنے افسانہ نگاروں سے مل بھی سکا اور ان سے تبادلۂ خیال بھی ہوا۔ ان میں ہاجرہ مسرور، احمد ہمیش، علی حیدر ملک، زاہدہ حنا، طاہر تونسوی، فردوس حیدر، صبا اکرام، پیرزادہ قاسم، نعیم آروی اور اے خیام کے علاوہ اور کچھ نئے افسانہ نگار شامل تھے۔ ہم لوگوں نے جدید افسانے کے مسائل اور طرز پیش کش پر باتیں کیں۔ نئے لکھنے والوں میں مجھے زاہدہ حنا کے افسانے بے حد پسند ہیں۔ جن کے یہاں زندگی کی سچائیاں بڑی گہرائی اور دیرپا تاثر کے ساتھ بیان ہوتی ہیں۔ کوئی مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے

www.taemeernews.com

مگر میرا خیال ہے کہ فکشن زاہدہ حنا کے ساتھ بڑے سلیقے اور اپنی تفہیم کی مختلف الالوانی کے ساتھ بہت دور تک جائے گا۔ گفتگو میں کم و بیش سبھی اس بات سے متفق تھے کہ جدید افسانے پھر اپنے حکائی انداز کے ساتھ تفہیمی انداز لئے واپس آرہے ہیں اور علامتی رنگ کی دھند چھٹتی جارہی ہے۔ بلکہ خالدہ حسین اور انور سجاد کے افسانوی انداز کو قاری نے ٹاٹ باہر کر دیا ہے۔ ٹھیک ہے یہ بھی اُردو کی افسانوی دنیا میں ایک طرح کا تجربہ ہی تھا۔ علامتی افسانوں نے نئی نسل کو بھٹکایا زیادہ اور نیا راستہ کم دکھایا۔ اور تجربہ برائے تجربہ کر کے ہفوات کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے۔ علامتی افسانہ زیادہ تر اس ڈھنگ سے پیش کیا گیا کہ فن افسانہ نگاری کا منہ ٹیڑھا ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان صارفیت (CONSUMERISM) کے جال میں بُری طرح سے گرفتار ہو چکا ہے، اور جس کی بھیانک شکل زر برائے تفریح اور سوشل اسٹیٹس ہے۔ اور اس کا اثر ادب پر بھی پڑنا لازمی ہے۔ جب انسان صرف حصول زر کے لئے کوشاں ہوتا ہے تو اس کی تمام اخلاقیات اور فکر و فن سب مجروح ہو جاتے ہیں۔ کوئی اخلاقی قدر باقی نہیں رہ جاتی۔ کیوں کہ زندگی کا مقصد صرف دولت اکٹھا کرنا رہ جاتا ہے۔ انسانی رشتے ناطے اور جذباتی لگاؤ وغیرہ سب ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نے جو جنسی ارزانی یورپ میں دیکھی ہے اینیسی فرائی ڈے وغیرہ جیسی لکھنے والیوں نے جس طرح کی زندگی کے نقشے اور آپ بیتیاں اپنی کتابوں میں پیش کی ہیں وہ افسانہ بھی ہیں اور حقیقت بھی اور جن کا مقصد سوا دولت اکٹھا کرنے کے اور کیا ہے! اب کوئی ایسے ناولوں اور افسانوں کو کتنا ہی بازاری یعنی CHEAP کیوں نہ کہے مگر یہ دولت کے اکٹھا کرنے میں تو مدد کرتے ہی ہیں۔ پاکستان میں جو عروج اور مقبولیت ڈائجسٹوں، جاسوسی افسانوں اور جنسی لٹریچر کو حاصل ہوئی، اتنی سنجیدہ فکشن کو حاصل نہیں ہے۔ شاید نئے لکھنے والے بھی اسی لالچ میں دو ایک قدم اس منزل کی طرف بڑھا لیتے ہیں۔ جب عام قاری ہم جنسی یا جنسی بے راہ روی کے افسانوں میں دلچسپی لے رہا ہو تو سنجیدہ ناول یا افسانہ نگار کیا کریں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ خوف گھیر لیتا ہے کہ شاید ہمارا

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

کی جو رنگا رنگی ہے وہ اردو کے بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ کرشن چندر اور ترقی پسندوں کو وہی لوگ خاص طور پر انڈر ریٹ (under Rate) کرتے رہے جن کا اپنا قد لنبا تھا یا چھوٹا تھا۔ اس میں بہت کچھ ترقی پسندی اور سوشلزم کی مخالفت اور کرشن چندر کی زندگی کے نجی حالات بھی شامل ہیں۔ مگر خیر۔ اب ایک بدنصیبی کرشن چندر کی یہ بھی تھی کہ خود ان کے ہم خیال ترقی پسند افسانہ نگار بھی ایکانت Asides میں کرشن چندر کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ اور یہ بھی کہ کرشن چندر کو خود ستائی کا فن نہیں آتا تھا۔ مجھے منٹو کی عظمت سے انکار نہیں کہ وہ یقیناً اردو ادب کے ایک بڑے افسانہ نگار رہیں گے۔ مگر ایسے عظیم بھی نہیں کہ انھیں موپاساں اور فلابیر سمجھ لیا جائے۔ انگریزی کے بہت سے ایم۔ اے جو اردو کے ادیب بن گئے ہیں ان کی ایک ٹریجڈی اور فرسٹیشن یہ بھی ہے کہ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے باوجود وہ انگریزی ادب کے بحرِ ذخار کا تمام و کمال مطالعہ تو کر نہیں سکتے، خواہ وہ اپنی انگریزی دانی کا کتنا ہی ڈھول پیٹیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ انگریزی میں لکھ کر انگریزی کے عالمی ادیبوں سے بھلا کہاں مقابلہ کر سکتے ہیں؟ تو اپنا سارا علم اور علم کا زعم انھوں نے بیچارے اردو والوں پر لاد دیا۔ پھر جنہوں نے انگریزی میں لکھنے کی کوشش کی بھی تو انھیں انگریزی ادب کی تاریخ میں تو بھلا کیا مقام ملتا کہ یہ بیچارے انگریزی کے ایم۔ اے جانتے ہی کیا ہیں۔ ہاں جس طرح ہندو سماج میں جب کوئی ہندو نہیں ہو سکتا تو اسے ہندو سوسائٹی اُدیہ سماجی کہہ کر اپنے حلقے میں شامل کر لیتی ہے اسی طرح انگریزی کے یہ کلونیل ادیب جن میں بہت بڑے بڑے نام ا ہندوستان اور پاکستان میں ہیں۔ انھیں انگریزی کے ادیبوں نے بھی انڈین انگلش رائیٹر کہہ کر ایک خانے میں ڈال دیا اور یہ کلونیل مزاج کے پلے ہوئے حضرات اسی کو اپنے لئے ایک کلاہ فخر سمجھنے لگے باتیں بہت ہو گئیں اور کچھ تلخ باتیں بھی ہو گئیں۔ مگر انھیں برسبیل تذکرہ ہی سمجھنا چاہئے۔ بعد کو کچھ اور محفلیں بھی کراچی کے دانشوروں نے منعقد کیں۔ ایک نشست 'منشور' رسالے کے دفتر میں بھی ہوئی۔ جس میں روس میں سوشلزم کے زوال اور کمیونزم کے مستقبل

www.taemeernews.com

پر بھی باتیں ہوئیں۔ ان میں زیادہ تر مقررین سوشلزم کی حمایت میں تھے اور روس میں جو سیاسی بحران آیا ہے اسے عارضی فیز (Phase) سمجھتے تھے۔ پروفیسر ریاض صدیقی نے اچھا مقالہ پیش کیا۔ بے حد تجزیاتی اور قابل قبول (Convincing)۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود میں گم رہنے والے آدمی ہیں۔ یقیناً ان کی نظر دنیا کی سیاست اور اشتمالی سیاست پر گہری ہے۔ مگر جس طرح بے دلی سے وہ اپنا مقالہ پیش کر رہے تھے اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید وہ نہیں چاہتے کہ سامعین بھی ان کے مشاہدات کا حصہ بنیں۔ مقالے کے بعد جو دو ایک سوالات ہوئے اس کا بھی انھوں نے اسی طرح بے دلی سے جواب دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا یہی انداز گفتگو ہو میں نے انھیں غلط سمجھ لیا ہو۔ کیونکہ ان کی تحریروں میں تو مجھے یہ مرعوبیت نظر نہیں آتی۔ طفیل عباس صاحب نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی۔ ڈاکٹر محمد حسن اور راقم الحروف نے بھی تقریریں کیں۔ میری تقریر سب سے خراب تھی۔ میں کبھی اس قسم کی سیاسی تقریریں نہیں کرتا کہ میں اس کا اہل نہیں۔ میں نے روس کے انتزاع کا کبھی تجزیاتی مطالعہ کیا بھی نہیں۔ بس ایک عام آدمی کا تصور میرے پاس بھی ہے کہ یہ سب سرمایہ داروں علی الخصوص، امریکہ کی سیاست ہے جس پر انھوں نے اسٹالن کے مرتے ہی عمل شروع کر دیا تھا۔ مجھے تو پہلے یہی حیرت تھی کہ پاکستان میں یہ منشور کا دفتر قائم کیسے ہے؟! اور پھر ایک خاصہ مارکسسٹ گروپ یہاں کام کس طرح کر رہا ہے؟ ایک بات ضرور سمجھ میں آئی کہ جو ہم ہندوستان میں بیٹھ کر یہ سوچا کرتے ہیں کہ پاکستان کے تمام باشندے ہمارے دشمن ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ دانشورانہ سطح پر شاید دونوں ملکوں کے باشندے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ شاید یہ بات پاکستان کی تمام فوجی حکومتوں نے سمجھ لیا تھا اسی وجہ سے پاکستانی حکومت دونوں ملکوں کے دانشوروں کے ملنے میں رخنے ڈالتی رہتی تھی۔ فوجی حکومتوں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی میل جول کو کبھی پسند نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں تو کتابیں اور رسالے بھی نہیں آجا سکتے تھے۔

رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا تھا مگر ادبی جلسے جاری تھے۔ بس یہ ہوتا کہ افطار کے

www.taemeernews.com

وقت جلسے رکھے جاتے۔ اوّل طعام بعدہٗ کلام والے فارمولے پر عمل ہو رہا تھا یعنی پہلے افطار ہوتا پھر جلسہ شروع ہوتا۔ ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک دن اپنی نئی کتاب "شاعرِ انقلاب" کی رسمِ اجرا کراچی پریس کلب میں رکھی۔ مجھے اور محمد حسن صاحب کو بطورِ خاص مدعو کیا۔ ہم لوگ ذرا دیر سے پہنچے کہ بڑے شہروں میں بروقت کسی محفل میں پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ میں نے اور محمد حسن صاحب نے بھی تقریریں کیں۔ دوسرے دن "ڈان" کراچی میں میری اور محمد حسن صاحب کی بڑی بڑی تصویریں تقریر کرنے والے پوز میں شائع ہوئیں۔ رپورٹر نے دلچسپ کارگزاری کی تھی کہ میری تصویر کے نیچے محمد حسن صاحب کا نام لکھا تھا اور محمد حسن صاحب کی تصویر کے نیچے میرا نام تھا۔ بہرحال "محمد" تو دونوں میں مشترک تھا۔ پھر دوسرے دن اسی پریس کلب میں ایئر مارشل اصغر خاں کی ایک کتاب کی رسمِ اجرا ہوئی۔ کتاب خالص سیاسی نوعیت کی تھی اور پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بہت اچھا مطالعہ تھا۔ جس میں مسئلۂ کشمیر پر بھی بڑی متوازن بحث تھی۔ میں نے بھی ایئر مارشل اصغر خاں سے کچھ تبادلۂ خیال کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بے حد متوازن آدمی ہیں اور ہندوستان و پاکستان کے معاملات پر ہمدردی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ معاملت کرنے کے حق میں ہیں۔ جب سے جمہوریت کو پاکستان میں فروغ ہوا ہے، حالات بہت بدلے ہیں۔ خارجہ پالیسی بھی برابر زیرِ بحث رہتی ہے اور عوام بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان یگانگت اور صلح و آشتی کی تلاش میں ہیں۔ کم از کم مجھے یہی محسوس ہوا۔ اپنی ایک تقریر میں میں نے یہ کہہ دیا کہ آج جب کہ برلن کی دیوار گر چکی ہے، شمالی اور جنوبی کوریا کے تنازعے ختم ہو رہے ہیں تو ہندوستان اور پاکستان کیوں ان طریقوں پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ لوگ خاموش رہے اور سنتے رہے۔ میرے پاس ہندوستانی ایمبیسی کے فرسٹ سکریٹری ڈوگرا صاحب بیٹھے تھے۔ انھوں نے چپکے سے مجھے دبایا۔ ان کا مطلب تھا کہ مجھے ایسی باتیں کہنے میں محتاط رہنا چاہیے جیسا کہ بعد کو انھوں نے مجھ سے چپکے سے کہا بھی۔ مگر میں نے کوئی سیاسی بات تو نہیں کہی تھی یہ تو محض انسانی ہمدردی کی بات تھی اور دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی بات

www.taemeernews.com

ایک دن سحر انصاری صاحب کا ٹیلیفون ملا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی میں اردو میں ریسرچ کے مسائل پر ایک تقریر کردوں۔ میں تیار ہو گیا۔ وقت مقررہ پر کراچی یونیورسٹی پہنچا تو اگرچہ میری کار کا نمبر محافظین کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا مگر ملٹری کے جوانوں نے آکر باقاعدہ کار کی پوری چیکنگ کی تب داخلے کی اجازت ملی۔ شعبۂ اردو میں تمام اساتذہ اور طلبا کی خاصی بڑی تعداد اکٹھا تھی۔ تقریباً پینتالیس منٹ تک میں نے تقریر کی۔ بعد کو طلبا اور اساتذہ نے کچھ سوالات بھی کئے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جلسے کی صدارت کی تھی۔ افسوس کہ حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایک اہم محقق تھے۔ ان کی کتاب 'لکھنؤ کا دبستان شاعری' ہمیشہ طلبا کی رہبری کرتی رہے گی۔ میں نے بھی ان کی اس کتاب سے اپنے مقالے کی تیاری میں استفادہ کیا تھا۔ کتابیں تو ان کی اور بھی ہیں مگر شاید یہی کتاب ان کو طلبا کے درمیان ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ طلبا سے گفتگو کر کے اندازہ ہوا کہ اگرچہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے، مگر اردو کے طلبا ہندوستانی طلبا سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہیں۔ اس میں کچھ ماحول کا بھی اثر ہے۔ کراچی ایک کاروباری شہر ہے اس کے باوجود جو لوگ یہاں علم و ادب کی شمعیں روشن کئے ہیں وہ لائق صد مبارک باد ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کے نوجوان ادیبوں میں ڈاکٹر سحر انصاری مجھے بے حد فعال معلوم ہوئے اور معقول بھی۔ احتشام حسین سیمینار میں بھی انھوں نے جو مقالہ پڑھا تھا وہ بے حد خیال انگیز تھا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب سے بھی شعبۂ اردو میں ملاقات ہوئی۔ مگر بہت سرسری۔ وہ شاید جلسے جلوسوں میں زیادہ شامل ہونا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے ان سے اور کہیں ملاقات نہیں ہو سکی۔

جب انجمن ترقی اردو کے دفتر پہنچا تو طبیعت خوش ہو گئی۔ بڑی اچھی عمارت اور بے حد اچھا عملہ۔ حضرت جمیل الدین عالی اس زمانے میں انجمن کے سربراہ تھے اور اردو کے چوٹی کے ادیب اس وقت یہاں کے عملے میں شامل تھے۔ چنانچہ شہزاد منظر صاحب، اسلم فرخی صاحب اور ڈاکٹر عتیق احمد صاحب جیسے لوگ انجمن ترقی اردو پاکستان کی

www.taemeernews.com

زیب وزین ہیں۔ مگر ایسا محسوس ہوا کہ ابھی یہاں ماڈرن طریقے نہیں پہنچے۔ شاید کمپیوٹر ٹائپنگ وغیرہ کی آسانیاں ابھی یہاں نہیں ہیں۔ جمیل الدین عالی صاحب نے مجھ سے ایک مقالہ پڑھنے کو کہا تھا۔ وہ میں نے پیش کیا۔ یہ مقالہ غزل کی نئی صورتوں پر تھا۔ انجمن نے میری کتاب "غزل کے نئے جہات" کو شائع کرنے کا معاہدہ بھی مجھ سے کر لیا ہے۔ عنقریب یہ کتاب دوبارہ پاکستان سے شائع ہوگی۔

ایک اور محفل مرثیے کے متعلق، خصوصاً مرثیے میں نئی صورتوں کے متعلق کہیں برپا کی گئی۔ (مجھے محلّے کا نام یاد نہیں) جس میں کراچی کے تمام نئے پرانے مرثیہ گو شامل تھے جن میں جناب امید فاضلی، پروفیسر سردار حسین، شید احسن صاحب، ہلال نقوی صاحب ڈاکٹر سحر انصاری اور ایک سندھی زبان کے مرثیہ گو شامل تھے۔ شرکا میں عظمت بلگرامی، صہبا اختر اور تسنیم فاطمہ بھی تھیں۔ یہ لوگ ہندوستان بھی آ چکے تھے اور مجھ سے پہلے ہی سے متعارف تھے۔ تسنیم فاطمہ صاحبہ نے مجھے سامعین سے متعارف بھی اس محفل میں کرایا۔ راقم الحروف نے جدید مرثیے کے امکانات اور صورتوں پر ایک تقریر کی۔ مجھے پاکستان کے نئے مرثیہ نگاروں میں، مرثیے کے فن کو ترقی دینے کے امکانات زیادہ نظر آئے۔ ان نئے لوگوں میں کلاسکی مرثیے کا احترام بھی ہے اور یہ نئے موضوعات اور امکانات کے ساتھ مرثیے کو اپنے دور سے ہم آہنگ کرنے کا فن بھی خوب جانتے ہیں اس طرح مجھے یہ محسوس ہوا کہ کراچی میں جدید مرثیہ گوئی کا ایک اسکول بن گیا ہے، جو ہندوستان کی مرثیہ گوئی سے بہتر نظر آتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی نئی کتاب "مرثیے کی سماجیات" میں ان نئی صورتوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ اس جلسے کی صدارت جمیل الدین عالی صاحب نے کی اور تاریخ اسلام نیز واقعۂ کربلا پر اور پھر مرثیے پر بڑی مدلل تقریر کی۔

جمیل الدین عالی صاحب بے حد ادب نواز اور مہمان نواز انسان ہیں۔ وہ دلّی کے نواب لوہارو کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس طرح غالب کے سسرالی عزیز ہیں

www.taemeernews.com

میں بھی ہوتے ہیں۔ مجھے وہ تقریباً روز آ کر اپنے ساتھ لے جاتے اور دن میں کراچی کے مشہور مقامات دکھاتے اور پھر کسی ریستوراں یا کلب میں ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھاتے۔ کھانے میں خاصی دقت ہوتی کہ رمضان کا مہینہ تھا۔ مگر میں تو سفر میں تھا اور عالی صاحب میرے میزبان تھے۔ ہم لوگ اردو شاعری کی صورت حال پر گفتگو کرتے اور کبھی کبھی پاکستان کے ادیبوں اور ادب پر بھی باتیں ہوتیں۔ عالی صاحب بے حد متوازن آدمی ہیں۔ انھیں اردو میں 'دوہے' لکھنے کا شوق ہے۔ دو ایک مجموعے بھی ان 'دوہوں' کے شائع کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی انتھک کوشش سے اردو میں اس صنف کو پروان چڑھانے کی خاصی فکر کی ہے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ اردو شاعری جو اپنے بہت سے ممنوعات بنائے ہوئے ہے ان میں بہت سی چیزوں کو اس نے صرف ہندی شاعری کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ "دوہا" بھی انھیں میں سے ایک ہے اردو میں "دوہوں" کی کیا حیثیت بنے گی اور وہ بھی پاکستان میں کہا نہیں جا سکتا۔

ساہیوال کے ناصر شہزاد نے ہندی زبان اور لہجے میں اردو غزل اور نظمیں پیش کرنے کی بڑی کوشش کی۔ دو ایک مجموعے بھی ان کے شائع ہوئے، مگر اردو شاعری میں غزل کے ایک خاص رنگ اور ایک خاص گلاسری نے اس رنگ کو سرسبز ہونے نہیں دیا۔ اور یہ تجربہ شاید انھیں تک محدود رہ گیا۔ بہرحال 'دوہا' ایک اچھی صنف ہے اور اردو شاعری کو اسے تسلیم کرنا چاہیے۔ مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے مزاج اور گڑھی ہوئی صورتوں نے عوامی رنگ کی شاعری کو ہمیشہ بنالٹی (Banality) ہی سمجھا اور اس سے اپنا بڑا نقصان کیا۔ 'دوہا' بھی ایک عوامی رنگ کی شاعری ہے جس میں جذبات کو آزادی کے ساتھ چلنے کی بڑی چھوٹ ہے۔ اردو میں اسے پاپولر بنانا چاہیے۔ عالی صاحب نے پوری کوشش کی ہے کہ 'دوہا' بھی رباعی کی طرح موثر اور مسکت بن سکے۔ مگر جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں اس فن میں عالی صاحب کے متبعین بہت کم ہیں۔ شاید انھیں 'دوہوں' میں دیہاتیت (Rusticity) کی بو آتی ہے۔ اگرچہ عالی صاحب خالص دلّی والے ہیں اور ان کی زبان ایک اسٹینڈرڈ زبان ہے۔ دیکھنا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ

www.taemeernews.com

'دو ہے' کو کس طرح آنکتی ہے۔

ایک جلسہ ایک دن ناردن ناظم آباد میں بھی منعقد ہوا جس میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ شامل ہوئے۔ یہ ادبی کم اور کمیونسٹ آئیڈیالوجی کے زوال کا تجزیہ کرنے کے لئے زیادہ معلوم ہوا۔ کچھ جماعت اسلامی اور دوسری ثقافتی انجمنوں کے لوگ بھی اس میں شامل تھے ڈاکٹر محمد حسن اور راقم بھی اس میں شریک ہوا۔ نظیر صدیقی، سحر انصاری، علی حیدر ملک محمد علی صدیقی، طفیل عباس اور پروفیسر ریاض صدیقی بھی تھے۔ باتیں سب طرح کی ہوئیں۔ جماعت اسلامی کے کچھ حضرات نے کچھ طنزیہ انداز میں زوال روس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ زور اس پر بھی تھا کہ اتنے دنوں تک یہ سیاست لادین چلتی رہی یہی کیا کم ہے۔ پھر اقبال کے کچھ اشعار بھی کسی نے پڑھے۔ ایک صاحب نے بڑے استہزائیہ انداز میں یہ بھی کہا کہ اب Comintern کا کیا ہوگا؟ مجھے تو یہ گفتگو بڑی بچکانی Juvenile معلوم ہوئی۔ قوموں اور آئیڈیالوجی کے عروج و زوال میں بہت سے اسباب کام کرتے رہتے ہیں۔ بقول اقبال ؎

اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

یونان، مصر، روما، غرناطہ اور دولت عثمانیہ سب کاروانِ ہستی کی رواروی میں غائب ہو گئے۔ خود دولت برطانیہ، جس پر سورج غروب نہیں ہوا کرتا تھا، یکایک کس حالت میں پہنچ گئی۔ یہ تباہیاں، تضادات سے بھی آتی ہیں اور سیاسی اتھل پتھل سے بھی۔ اور تضادات اندر سے بھی آتے ہیں اور باہر سے بھی۔ بہر حال یہ جلسہ بھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے چلتا رہا۔ میں نے اسی طرح کی چند باتیں کہیں۔ کچھ لوگ مطمئن ہوئے کچھ نہیں۔ خیر یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ محمد حسن صاحب بھی اس محفل میں بڑے غور سے سب باتیں سنتے رہے۔ انھیں میری تقریر بہت پسند آئی۔

www.taemeernews.com

پورا نام تو نہیں معلوم مگر سب اسے ساجدہ کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ غالباً جوش صاحب کی پوتی تھی۔ پہلے ہی دن احتشام حسین سمینار میں نیپا آڈیٹوریم میں اپنی بے حد چھوٹے قد کی ماں کے ساتھ ملی اور جوش صاحب کی برسی کا ۲۲ فروری کے لئے دعوت نامہ مجھے دیا۔ اور متعدد بار مجھ سے وعدہ لیا کہ میں جوش کی اس برسی میں ضرور شریک ہوں اور کچھ تقریر بھی کروں۔ بے حد موٹے موٹے نقشے والی اور گٹھے ہوئے Stocky جسم کی یہ لڑکی سبھوں سے مل رہی تھی اور جوش صاحب کی برسی میں جتنے ادیب تھے سب کو شرکت کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ صرف چہرے سے یہی فکرمندی ٹپک رہی تھی کہ دیکھئے کتنے لوگ ان میں سے جوش صاحب کی برسی میں آتے ہیں۔ لباس سے نہ ماڈرن نہ اسلامی، روایتی لباس، بس لباس تھا جس پر کلف استری بھی برائے نام۔ بس ایک ہی فکر کہ جوش صاحب کا پروگرام کامیاب ہو۔ میں نے ساجدہ سے حتمی وعدہ کیا کہ میں ضرور آؤں گا۔ پھر میں کراچی کے ادبی ہنگاموں میں کھو گیا۔ ۲۲ فروری آئی تو صبح ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ ساجدہ تھی جس نے نہ صرف جوش صاحب کے پروگرام کی یاد دہانی کرائی بلکہ یہ بھی کہا کہ تین بجے ایک کار آئے گی اور آپ کو اور آپ کی بیٹی کو جائے تقریب پر لے آئے گی۔ اور ٹھیک تین بجے ایک کار آئی جو ایک جج صاحب لے کر آئے تھے اور تھوڑی دیر میں ہم لوگ کراچی یونیورسٹی کے بزنس ایڈمنسٹریشن کے بلاک میں تہہ کے کسی حصے میں تھے۔ ساجدہ دوڑ دوڑ کر مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اور سب کو ایک کمرے میں اس نے اکٹھا کر لیا۔ پروگرام چار بجے سے تھا۔ مگر چار بجے سوا مہمانوں کے سامعین کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آخر کچھ تو ہونا ہی تھا۔ کچھ دفتر کے بابو کچھ مہمان سب ملا کر دس پندرہ آدمی ہو گئے تو جلسہ شروع کیا گیا۔ یہ اجتماع اس شاعر کی یاد میں تھا جس کی زندگی میں اس کی شرکت کا نام سنتے ہی سامعین کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے

www.taemeernews.com

تھے اور مشاعروں کے پنڈال ہیں چاہے وہ کتنے ہی بڑے ہوں، لوگوں کے کھڑے ہونے تک کی جگہ نہ ہوتی۔

خیر جلسہ شروع ہوا۔ صدارت راقم الحروف نے کی اور شرکا میں پروفیسر محمد حسن ڈاکٹر فرمان فتح پوری، محمد علی صدیقی، راحت سعید، ڈاکٹر سحر انصاری، ڈاکٹر مسعود احمد برکاتی، سجاد خروش (جوش صاحب کے بیٹے) ڈاکٹر ریشاں، ساجدہ، ساجدہ کی والدہ کوئی ایم۔ پی (نام یاد نہیں) جج صاحب (نام یاد نہیں) صہبا اختر، عظمت بلگرامی، تسنیم فاطمہ اور چند حضرات۔ جوش صاحب کے بیٹے سجاد نے کچھ ٹوٹی پھوٹی سی تقریر کیا، بس باتیں کیں۔ وہ مجھے بس واجبی واجبی پڑھے لکھے معلوم ہوئے۔ پھر کچھ مقالے پڑھے گئے۔ سحر انصاری نے کچھ معقول قسم کا مقالہ پڑھا۔ پھر محمد علی صدیقی کی ایک مختصر تقریر ہوئی۔ پھر محمد حسن صاحب آئے۔ انھوں نے جوش صاحب کی روشن خیالی اور سماجی شعور پر بہت جامع تقریر کی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی اپنے کچھ نوٹس اور کچھ زبانی تقریر کی مدد سے جوش صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کچھ اور بھی تقریریں ہوئیں۔ آخر میں راقم الحروف نے جوش صاحب کی یاد میں اتنے مختصر سامعین کی تعداد پر افسوس بھی ظاہر کیا اور جوش صاحب کے فکر و فن اور ان کی انقلابی شاعری پر پندرہ بیس منٹ کی ایک تقریر کی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جوش صاحب کی شہرت کو دھندلانے کے لئے پاکستان کی روایتی مذہبی فضا ہی کیا کم تھی، جس میں روشن خیالی، ترقی پسندی اور مارکسسٹ آئیڈیالوجی کے مخالف بھی شامل ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف جدیدیت کے چھٹ بھیئے بھی جوش صاحب کی دیو قامت شخصیت پر للی پٹ کے بونوں (Pigmies) کی طرح حملے کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب تک اردو نظم، اردو میں روشن خیالی اور شعری روایت میں الفاظ کی قدر و قیمت، ان کی تہہ داریوں اور ان کے صرف کے سلیقے کا احساس باقی رہے گا جوش کی شخصیت تابندہ رہے گی اور جدیدیت کے بونے جوش صاحب کے شعری سرمائے، ان کے اسلوب نگارش اور الفاظ کی تخلیقی صورتوں کا بدل نہیں لا سکتے

www.taemeernews.com

اس برسی کے جلسے میں اور حضرات نے بھی بہت سی باتیں کیں جو اب یاد نہیں رہ گئیں۔ میں نے شرکا کا شکریہ ادا کیا اور ساجدہ کی تگ و دو کو سراہا۔ یہ دعا بھی کی کہ خدا ہر شاعر اور ادیب کو ساجدہ جیسی بیٹی عطا کرے۔ سجاد سے میں نے 'حرفِ آخر' (جوش صاحب کی طویل نظم) کی اشاعت کو دریافت کیا۔ مگر انھیں کچھ معلوم نہ تھا۔ ذرا 'آبِ حیات' کا وہ واقعہ یاد کیجیے جہاں آزاد نے سوداکے بیٹے کا ذکر کیا ہے اور فاتحہ پڑھیے۔

کراچی میں ادبی پروگراموں کی وہ کثرت تھی کہ دن بھر کہیں نہ کہیں مارا مارا پھرتا رہتا۔ شام کے سات بجے ہوں گے، میں ملیر کالونی سے اپنے دوست نصیر حسن سے مل کر جائے قیام پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ چوکیدار نے گیٹ پر سے ٹیلیفون کیا کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اسی طرح گیٹ تک گیا تو دیکھا کہ ایک قدرے معمّر مگر خوبصورت سے آدمی اور دو خواتین کار میں بیٹھے ہیں۔ آگے ایک پولیس گارڈ بھی۔ میں آگے بڑھا تو خوبصورت معمّر صاحب نے اشارہ کیا کہ آئیے۔ اب کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون ہیں اور کہاں "آئیے" اور کیوں؟ ایک سناٹا سا میرے اوپر سے گزر گیا۔ بس یہی خیال گزرا کہ اپنی حماقت میں ضرور میں نے کہیں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو پاکستان کی حکومت کو پسند نہیں آئی، اور یہ حراست کے سب انداز ہیں۔ کار پر حکومت پاکستان کی جھنڈی بھی لگی تھی۔ میں عجیب مخمصے میں ہوا۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر وہ معمّر اور خوبصورت سے صاحب کار سے اترے اور بولے، ارے صاحب کیا آپ بھول گئے کہ آپ نے بمبئی میں مجھ سے آج شام کو میرے غریب خانے پر پروگرام میں شریک ہونے کا وعدہ کیا تھا؟ پھر بھی مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ مگر میں کار میں بیٹھ گیا۔ کار گھومتی ہوئی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے فیز ۶ میں پہنچی اور ایک مکان کے سامنے رکی جس پر 'خیابانِ سحر' لکھا ہوا تھا۔ کار اندر داخل ہوئی۔ میری حیرت اور میرا خوف ابھی تک کم نہ ہوا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو میری جان میں جان آئی کہ وہاں مشفق خواجہ صاحب بیٹھے تھے اور ایک خاتون بھی جو بعد کو ہاجرہ مسرور نکلیں۔ (میں نے انھیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا) تھوڑی دیر بیٹھا ہوں گا کہ وہ شفیق معمّر خوبصورت

www.taemeernews.com

صاحب میرے پاس آئے اور بولے کہ آئیے میرے ساتھ اوپر چلیئے۔ میں بالکل -SPELL
BOUND) معمول کی طرح ان کے ساتھ اوپر گیا تو پتہ چلا کہ یہ معمر خوبصورت آدمی محمد لطف اللہ
خاں تھے جنہوں نے شاید اردو دنیا کا پہلا پرائیوٹ آوازوں کا میوزیم اور لائبریری کھول
رکھی ہے۔ جس میں دنیا کے تمام بڑے ادیبوں کی آوازوں کو صدا بند کر کے الگ الگ ڈبوں میں
رکھ چھوڑا ہے۔ ایک رجسٹر میں تمام ادیبوں کے نام لکھے ہوئے ہیں اور ان کے آگے صدا
بند ڈبوں کے نمبر۔ آپ جس ادیب یا شاعر کا کلام اسی کی آواز میں سننا چاہیں، لطف اللہ
خاں صاحب اپنے اسٹوڈیو کے لبریری ڈی۔ اور پلیر پر لگا کر ایک منٹ میں سنا دیں گے۔
خاں صاحب نے مجھ سے بھی پوچھا کہ آپ کس کی آواز سننا چاہیں گے؟ پھر خود ہی بولے آپ
احتشام حسین سیمینار میں آئے ہیں تو میں آپ کو احتشام صاحب ہی کی آواز سناتا ہوں
ایک منٹ میں انھوں نے رجسٹر دیکھا اور ایک ڈبے سے ایک ٹیپ نکال کر ٹیپ ریکارڈر
پر چلا دیا۔ احتشام حسین اپنی وہ غزل سنا رہے تھے جو مرنے سے ایک ہفتہ قبل انھوں
نے الہ آباد ریڈیو اسٹیشن پر پڑھی تھی۔ غزل تھی ؎

محفلِ دوست میں گو سینہ فگار آئے ہیں　　صورتِ نغمہ، بہ اندازِ بہار آئے ہیں

میں حیران رہ گیا۔ میں نے پھر خاں صاحب سے لاکھ لاکھ پوچھا کہ یہ آواز آپ کو کیسے ملی،
مگر انھوں نے یہ راز مجھ سے نہ بتایا۔ پھر بولے کہ آپ یہیں بیٹھے رہئے میں آپ کی آواز کا بھی
ریکارڈ رکھنا چاہتا ہوں۔ پھر ادھر ادھر کئی مائک لگا کر مجھ سے ایک مختصر تقریر کے لئے کہا
میں نے کسی موضوع پر تقریباً ۵ منٹ کی تقریر کر دی۔ پھر بولے آپ شاعری بھی ضرور کرتے
ہوں گے۔ اب نہیں تو کبھی طالب علمی کے زمانے میں۔ میں نے اقرار کیا اور پھر میری آواز
میں ایک غزل کے کچھ شعر خاں صاحب نے ریکارڈ کر لئے۔ میں بالکل مسحور ان کے اس
شوق اور اس سرمائے کو دیکھ رہا تھا چنانچہ جب میں نے ایک غزل کے دو شعر پڑھے تو
بے خیالی میں اسی بحر میں اپنی دوسری غزل کے شعر پڑھ گیا۔ پڑھنے کے بعد مجھے احساس
ہوا۔ مگر میں نے خاں صاحب سے یہ بات نہیں بتائی۔ اب یہ آواز ان کے پاس "ذوالغزلین"

www.taemeernews.com

کی شکل میں موجود ہوگی۔ اسٹوڈیو دیکھا تو ایک بڑے کمرے میں ہر طرف دیواریں ٹائپ رائیٹر کے ڈھکن جیسے ڈبے فٹ ہیں اور پورا کمرہ ایک مشینی کارخانہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر خاں صاحب نے میری کئی تصویریں کئی زاویوں سے کھینچیں اور مجھ سے ان کی نقل الہ آباد بھیجنے کا بھی وعدہ کیا، مگر ہنوز روز اوّل ہے۔

نیچے اترے تو اور بھی کچھ مہمان آچکے تھے۔ طے ہوا کہ ہم لوگ یہاں سے چل کر کراچی کے سب سے پرانے کلب میں ڈنر کھائیں گے۔ کئی گاڑیوں میں بیٹھ کر تقریباً پندرہ، سولہ لوگ کراچی کے سب سے پرانے کلب میں پہنچے۔ یہ کلب ۱۸۸۶ء (یہی سن یاد ہے) میں انگریزوں نے بنایا تھا۔ ہم جس حصّے میں بیٹھے تھے وہ بالکل پانی کے جہاز کے ڈک (DECK) جیسا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جہاز کے ڈک پر بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے ہیں۔ اس حصّے کو بہت خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ یہاں اکثر رات کے کھانے ہوتے رہتے ہیں۔ بہت ہلکی ہلکی روشنیاں جل رہی تھیں۔ مشفق خواجہ اور ہاجرہ مسرور کے علاوہ کچھ نئے ادیب خواتین و حضرات کی شکل میں اور اس محفل میں تھے۔ ڈان کراچی کے ایڈیٹر محمد علی صاحب بھی موجود تھے۔ مگر ہم لوگ صرف ادبی باتیں کر رہے تھے۔ ہاجرہ مسرور نے حال ہی میں اپنے تمام افسانوں کو اکٹھا کر کے ایک جلد میں شائع کیا ہے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے والد احمق پھپھوندوی کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی ہے جو مظفر حسن (سابق کانگریسی لیڈر اور یو۔پی منسٹر) کے پاس ہے، آپ کو اس کی خبر ہے؟ مگر انھیں معلوم نہ تھا۔ ان دونوں بہنوں کے پاس بھی احمق صاحب کا کچھ کلام نہ تھا۔ پھر نئے افسانے پر کچھ باتیں ہوئیں۔ ہاجرہ غالباً اب کسی ناول کے لکھنے کی تیاری میں تھیں۔ یہ محفل گیارہ بجے رات تک چلتی رہی۔

مارچ کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ پاکستان سے دلّی پہنچا۔ دلّی میں سدبھاؤنا، (خیرسگالی) اور سیکولرزم قائم رکھنے کے جلسے ہو رہے تھے کہ بمبئی بلاسٹ (Blast) کی خبریں ملیں۔ دوسرے دن ہم الہ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ ۱۴/ مارچ ۱۹۹۳ء کا دن

www.taemeernews.com

تھا جب ہم الہ آباد پہنچے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ہندوستانی ایک بیمار قوم بن گئے ہیں جس کو کسی مسیحا کی ضرورت ہے۔ مگر یہ مسیحا آئے کہاں سے؟ کہ سیاست نے بے اعتباری کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ اب ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

راقمِ آثم نے زندگی کے جو حالات لکھے اِن میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔ کسی کو یہ دلچسپ اور سبق آموز معلوم ہوں یا نہ ہوں، مگر راقم الحروف نے اپنے تمام کوائف خود اپنی تصویر دیکھنے اور اپنی تلاش و جستجو میں بیان کئے ہیں، کسی کو سبق سکھانے کے لئے نہیں۔ پھر ہر انسان کو اس کی زندگی ہی سبق سکھاتی ہے اور اس کی زندگی ہی اس کی رہبری کرتی ہے۔ بس اسی زندگی پر بھروسہ کرنا چاہئے اور عقل و آگہی کی مشعل لے کر چلتے رہنا چاہئے۔

٭

www.taemeernews.com

مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

ستائیس سال قبل الہ آباد میں ایک فعّال ادبی انجمن، "انجمن تہذیب نو" کی تاسیس ہوئی۔ شہر الہ آباد کے عام ادبی مزاج کے مطابق پہلے، اس انجمن نے صرف مشاعرے کرنے شروع کئے اور ۱۹۶۸ء میں اسی انجمن کے زیر اہتمام ایک شاندار مشاعرہ بیادِ شکیلؔ، مشہور فلمی شاعر شکیل بدایونی کی یاد میں پروفیسر سید احتشام حسین کی سرپرستی میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ پھر ۱۹۶۹ء میں جشن شعرائے الہ آباد منایا گیا۔ زمانے میں الہ آباد ہی سے جدیدیت کا بھی غلغلہ ہوا اور اس بات کی فکر کی گئی کہ الہ آباد کی تمام ادبی انجمنوں پر قبضہ کیا جائے اور الہ آباد کے ادیب اور شاعر بھی جدیدیت کے جال میں پھنسائیں جائیں۔ اس کا تفصیلی تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جاچکا ہے۔ چنانچہ انجمن تہذیب نو کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی۔ مگر انجمن کے جنرل سکریٹری، ذوالفقار صدیقی انجمن کے ادبی کردار کی حفاظت میں سینہ سپر ہوگئے۔ ذوالفقار صدیقی باقاعدہ ادبی شہرت کے مالک تو نہیں ہیں مگر علم و ادب کی ایک عجیب و غریب پیاس اُن میں ہے کہ اس کے لئے وہ "گھر پھونک تماشا دیکھ" والی منزل تک جا پہنچتے ہیں۔ لیکن انجمن کے کردار کو ہر طرح بچاتے رہتے ہیں۔ وہ ایک پرنٹنگ پریس چلاتے ہیں مگر اُردو کی صحبت اور مزاج کے رمز آشنا ہیں۔ چنانچہ جب ان پر ایک عالم دین کی وساطت سے انجمن تہذیب نو کو ہتھیانے کی کوشش ہوئی تو ذوالفقار نے صاف انکار کر دیا۔ اسی زمانے میں میری کتاب "نئی علامت نگاری" زیر تکمیل تھی۔ ذوالفقار صدیقی نے میری اس کتاب کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور مجھ سے انجمن کی سرپرستی بھی چاہی۔ کچھ دنوں بعد کتاب شائع ہوئی۔ بس پھر کیا تھا۔ انجمن تہذیبِ نو اور راقم الحروف سے مخالفت کا ایک محاذ کھول دیا گیا۔ جدیدیت

www.taemeernews.com

کے چند نادان دوستوں نے ہر محفل میں اعلان کرنا شروع کیا کہ ادب اور ادیب کو صرف وہی لوگ مستند بنا سکتے ہیں۔ وَمَن تَخَلَّفَ غَمَاقَ وَھُوَا (معاذ اللہ) میں تو بدنام کنندۂ نکونامے چند ہوں، مگر افسوس کہ میری مخالفت میں در پردہ میرے ایک استاد بھی میرے مخالفین کے حلیف بن گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام میرے مخالفین نہ تو 'جدیدیت' سمجھتے تھے اور نہ 'جدت' کا انھیں کچھ پتہ تھا۔ انھیں تو بس راقم اور ترقی پسندی کی مخالفت سے کام تھا (کیا پتہ ترقی پسندی کو بھی وہ کتنا سمجھتے تھے) انھیں گمان تھا کہ اس طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے، میری کوئی ادبی حیثیت نہ بن پائے گی (خیر ادبی حیثیت تو اب بھی کیا ہے) یہ لوگ میرے محکم گیری والے مزاج سے واقف نہ تھے اور سمجھتے تھے کہ اپنی چھچھوری حرکتوں سے مجھے جھکا لیں گے اور میں اپنی ملازمت میں آئندہ ترقی کے خوف سے، اس گروہ کے آگے سربسجود ہو جاؤں گا۔ انھیں خبر نہ تھی کہ میں "سب جہاں رکھتے ہیں سر، واں ہم قدم رکھتے ہیں" والے مزاج کا آدمی ہوں۔ خیر، ایک طرف تو انجمن تہذیب نو فعال رہی اور دوسری طرف راقم اپنے ادبی سفر پر گرم سفر رہا۔ پھر انجمن نے میری مزید دو کتابیں شائع کیں۔ پہلی 'تنقید اور عصری آگہی' اور دوسری 'سماجی تنقید اور تنقیدی عمل'۔ پھر انجمن کے کئی تاریخی جلسے بھی ہوئے اور میرے مخالفین کا بھرم بہت جلد ٹوٹ گیا جب انجمن نے 'یاد احتشام'، اقبال سیمینار، نئے افسانے پر سیمینار، جشن انتظار حسین اور احمد ہمیش، نئی علامت نگاری، کی رسم اجرا، جشن کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بیکل اتساہی کی کتاب 'پُروائی' کی رسم اجرا، شفیق الہ آبادی کی یاد میں جشن، عتیق الہ آبادی کی کتاب 'چشم براہ' کی رونمائی کا جشن، یاد فراق، یاد فانی بدایونی، جشن تہنیت ڈاکٹر عقیل رضوی، عزیز الہ آبادی کی کتاب 'غزل کا سہاگ' کا جشن رونمائی اور آخر میں اسلم الہ آبادی کے شعری مجموعے 'سلگتی ریت' کے جشن رونمائی کے ساتھ انجمن تہذیب نو کی سلور جبلی منائی جس میں ہندوستان اور بیرون ہند کے شعرا اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اس درمیان، راقم الحروف ہی انجمن کا صدر رہا

www.taemeernews.com

اور انجمن نے اپنی شہرت اور مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ راقم تو انجمن کا صدر ضرور تھا، مگر انجمن کو بام عروج تک پہنچانے میں ناصر فاخری، نصر قریشی، علی احمد فاطمی اسرار گاندھی، فخر کریم صدیقی، عتیق الہ آبادی، اسلم الہ آبادی، اختر عزیز اور ذوالفقار صدیقی جیسے جیالوں نے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ پھر اسی انجمن نے 'اندازے' نام کا ایک دو ماہی رسالہ نکالا جس میں صرف کتابوں پر ریویو چھپتے ہیں۔ 'اندازے' راقم الحروف کی نگرانی میں آج بھی نکل رہا ہے۔ جس کی شہرت اب انٹرنیشنل حیثیت رکھتی ہے (گو حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی) 'اندازے' کے ریویو کتابوں کو اعتبار بخشتے ہیں۔ 'اندازے' نے جو ریویو کا ادبی معیار ابتدا میں قائم کیا تھا وہ آج بھی برقرار ہے۔ یہ رسالہ نئے نئے مبصرین کو ادبی دنیا میں متعارف کرنے میں خاصہ سرگرم ہے 'اندازے' کی بھی سخت مخالفت ہوئی۔ لکھنؤ کے کچھ 'تکیہ داران گورستان ادب' جن کا خیال ہے کہ کلاسیکی ادب کی تفہیم اور اس کے رموز و نکات، بس ان کا خاندانی ورثہ ہیں اور ان کے بعد بس - Daluge ہے، انھوں نے ادھر اُدھر 'اندازے' کے تبصروں پر اپنے گرد و پیش رہنے والے گونڈے لپاڑیوں' سے نکتہ چینیاں کرائیں مگر 'اندازے' اپنی راہ پر گامزن رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں کتابوں اور رسالوں کو خرید کر نہ پڑھنے والا مزاج، 'اندازے' کو بھی نقصان پہنچا رہا ہے۔ 'اندازے' کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس نے بہت سے 'جعلی صاحبانِ کتاب' کے بھی پول کھولے ہیں۔ اور بہت سے ماہرین غالبیات اور ساختیات کی اصلیتوں کو بھی واضح کیا ہے۔ اور یہ کام ایسا ہے کہ مخالفت کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ اگرچہ ایسی صورتوں میں بھی 'اندازے' نے اپنا ادبی لہجہ اور معیار قائم رکھا ہے۔ مگر انجمن تہذیب نو، اور اندازے کی بیخ کنی کی کوششیں آج بھی جاری ہیں۔ ویسے تو اس کمپیوٹر اور گیجٹس (Gadgets) کے طوفانی دور میں ادب کی حیثیت ہی کیا رہ گئی ہے۔

www.taemeernews.com

اور پھر اردو ادب کی حیثیت ؟ ۔ لیکن پھر بھی ؎

حلقہ کئے بیٹھے رہو، اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے، ہر چند کہ کم ہے

(فیض)

دسمبر ۱۹۹۴ء
الہ آباد

www.taemeernews.com

سید محمد عقیل (گلمرگ - ۱۹۶۲ء)

سید محمد عقیل - (۱۹۴۸ء)

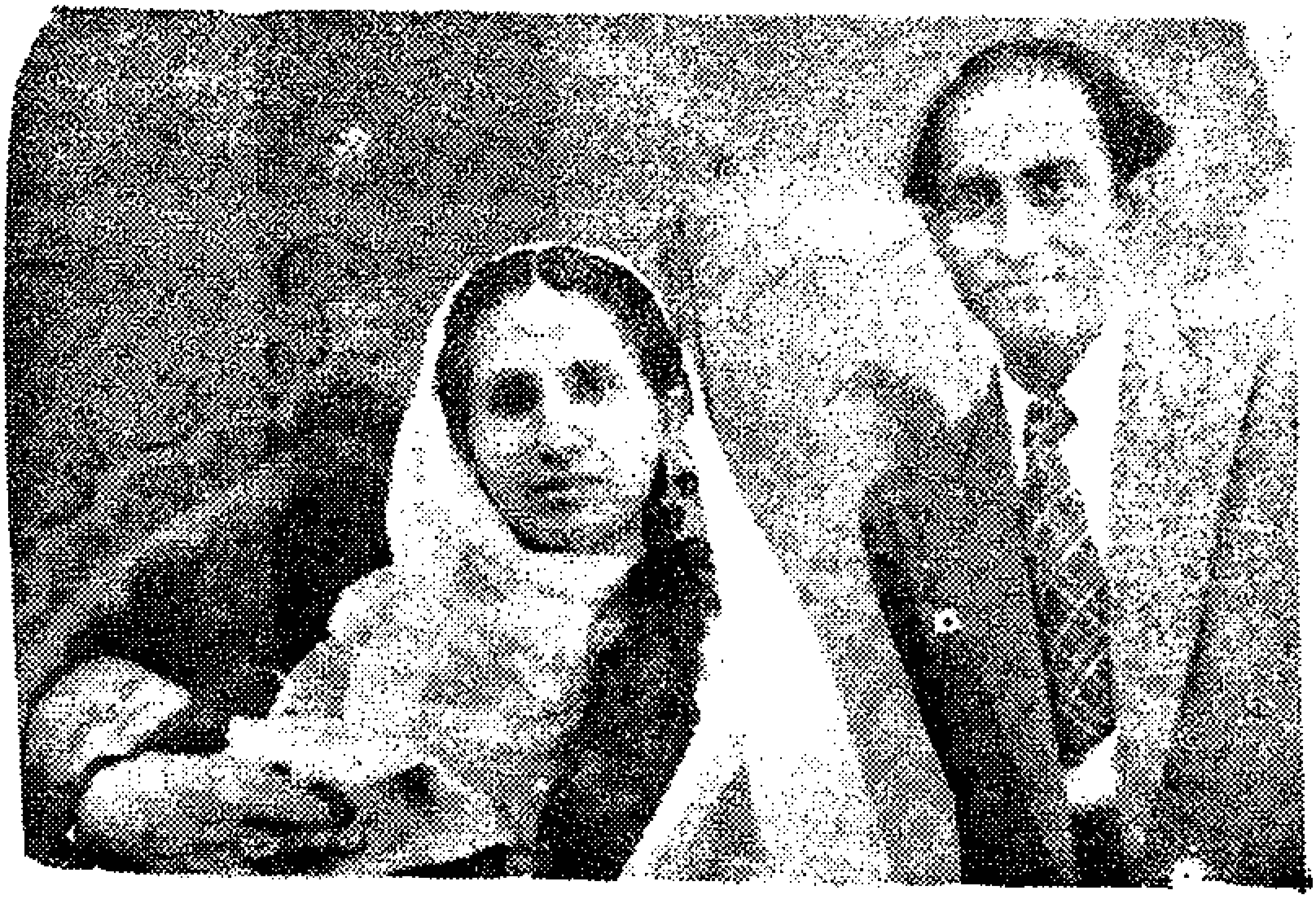

سید محمد عقیل، نجمی بیگم، ریشماں (گود میں)، مارچ ۱۹۵۵ء

www.taemeernews.com

افشاں

سید محمد عقیل گلمرگ سے کھلن مرگ جاتے ہوئے ۵ مئی ۶۳ء

بابر، افشاں

www.taemeernews.com

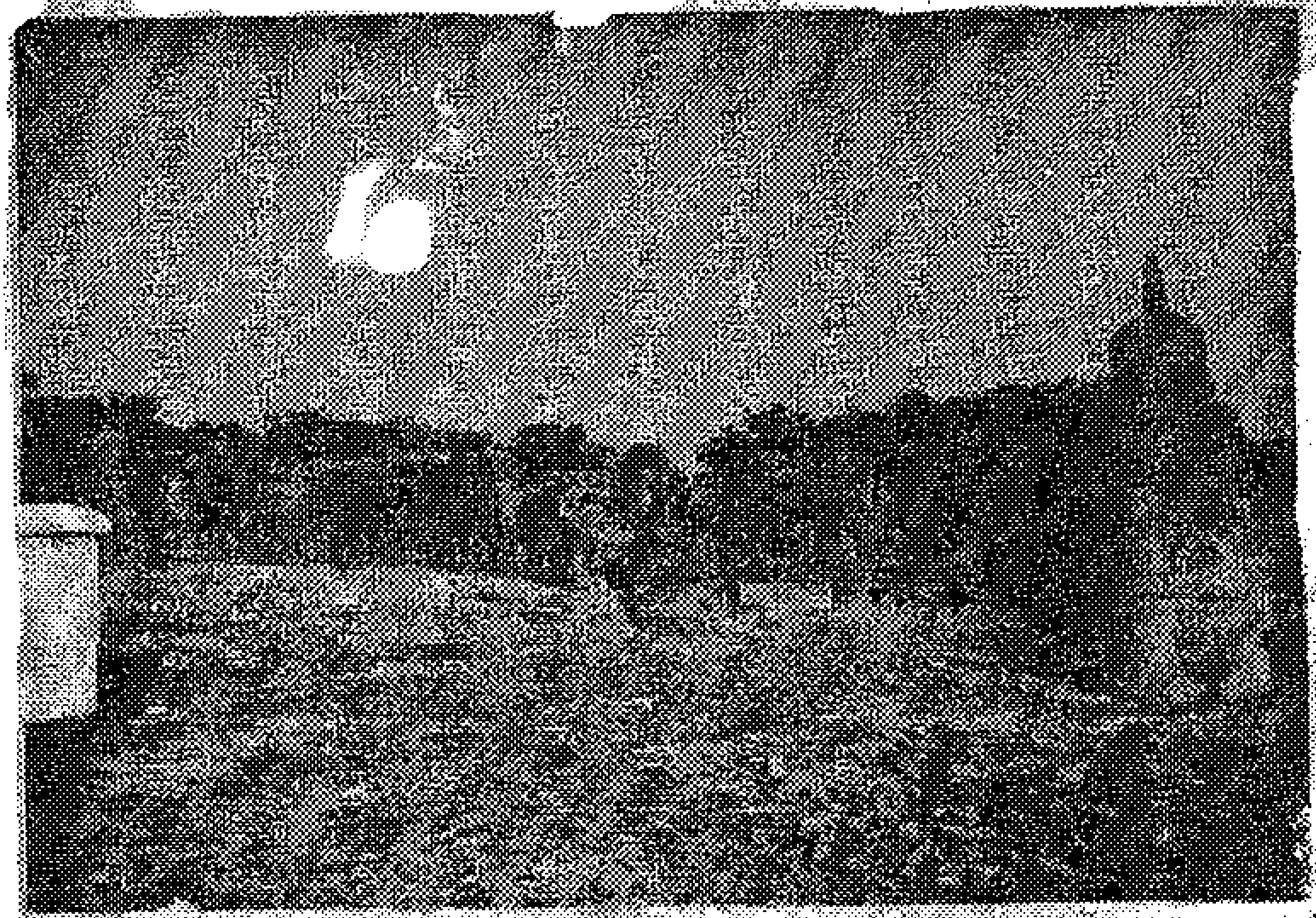

کربلا کی زیارتگاہ

بینا اور ترانی بہنیں

www.taemeernews.com

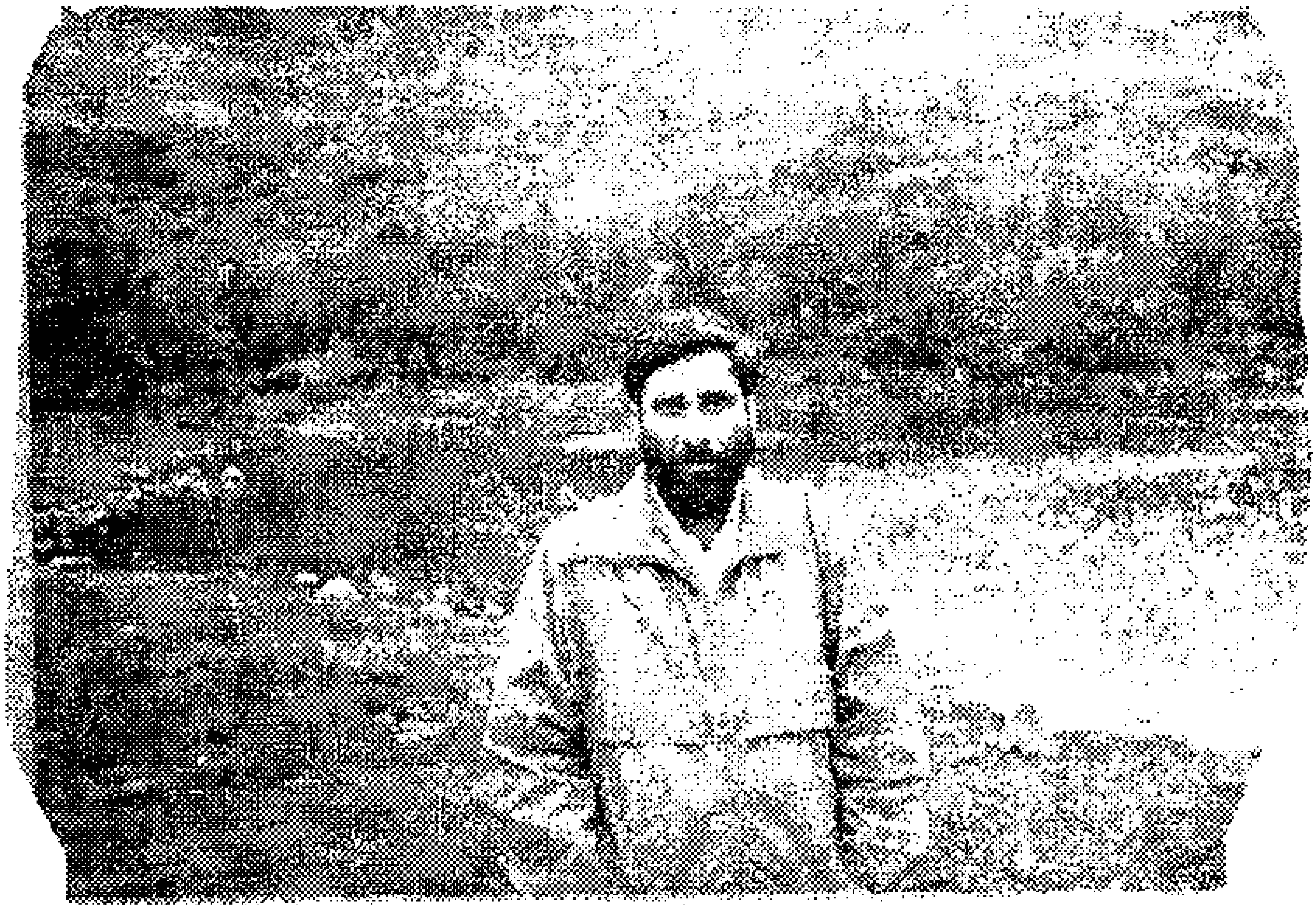

ابرڈنڈیر ہیڈ میں (اگست ۸۹ء)

ریشاں (تھامس ہارڈی کے مکان کے قریب ۱۹۸۹ء)

www.taemeernews.com

[illegible]

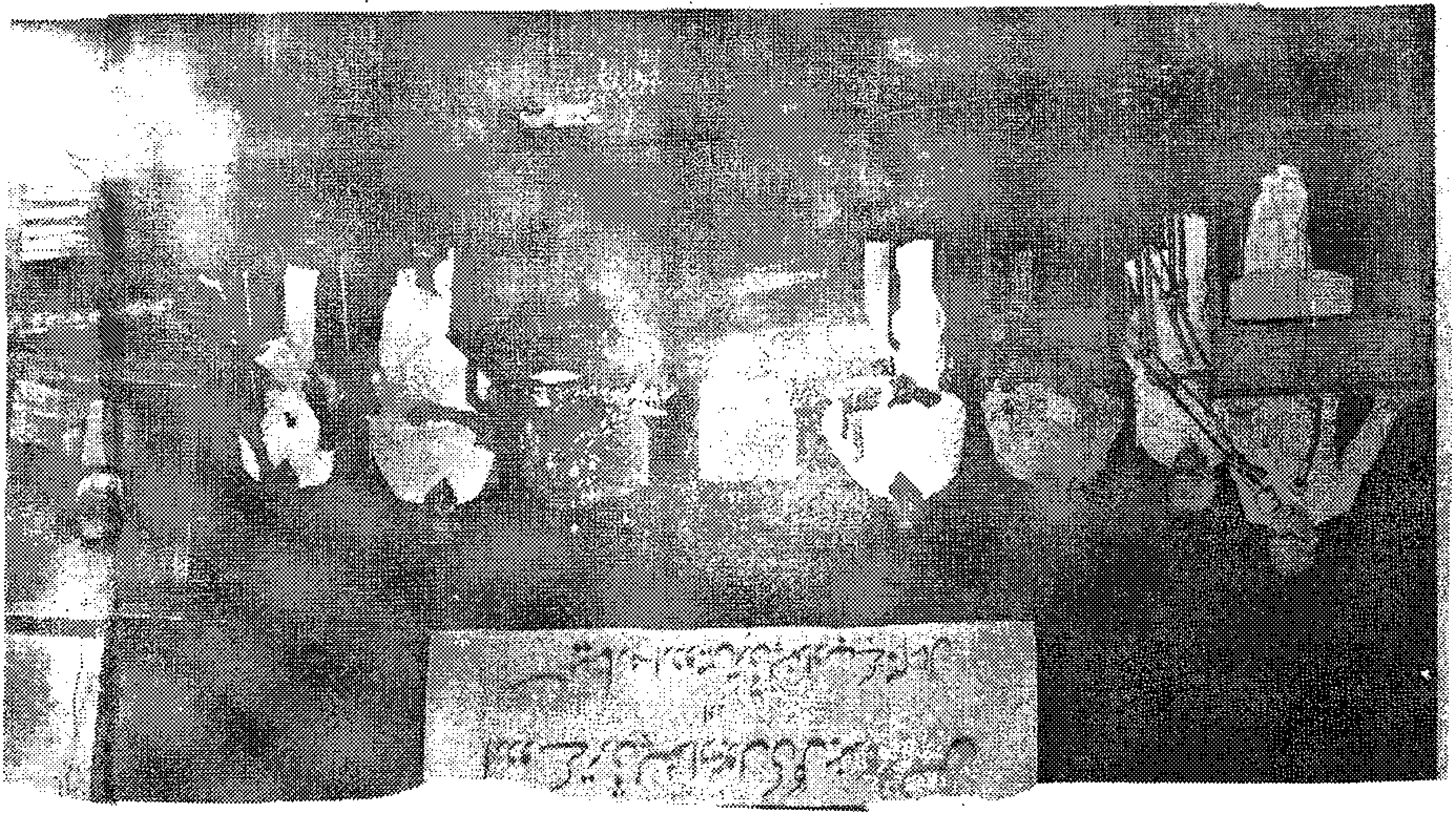

www.taemeernews.com

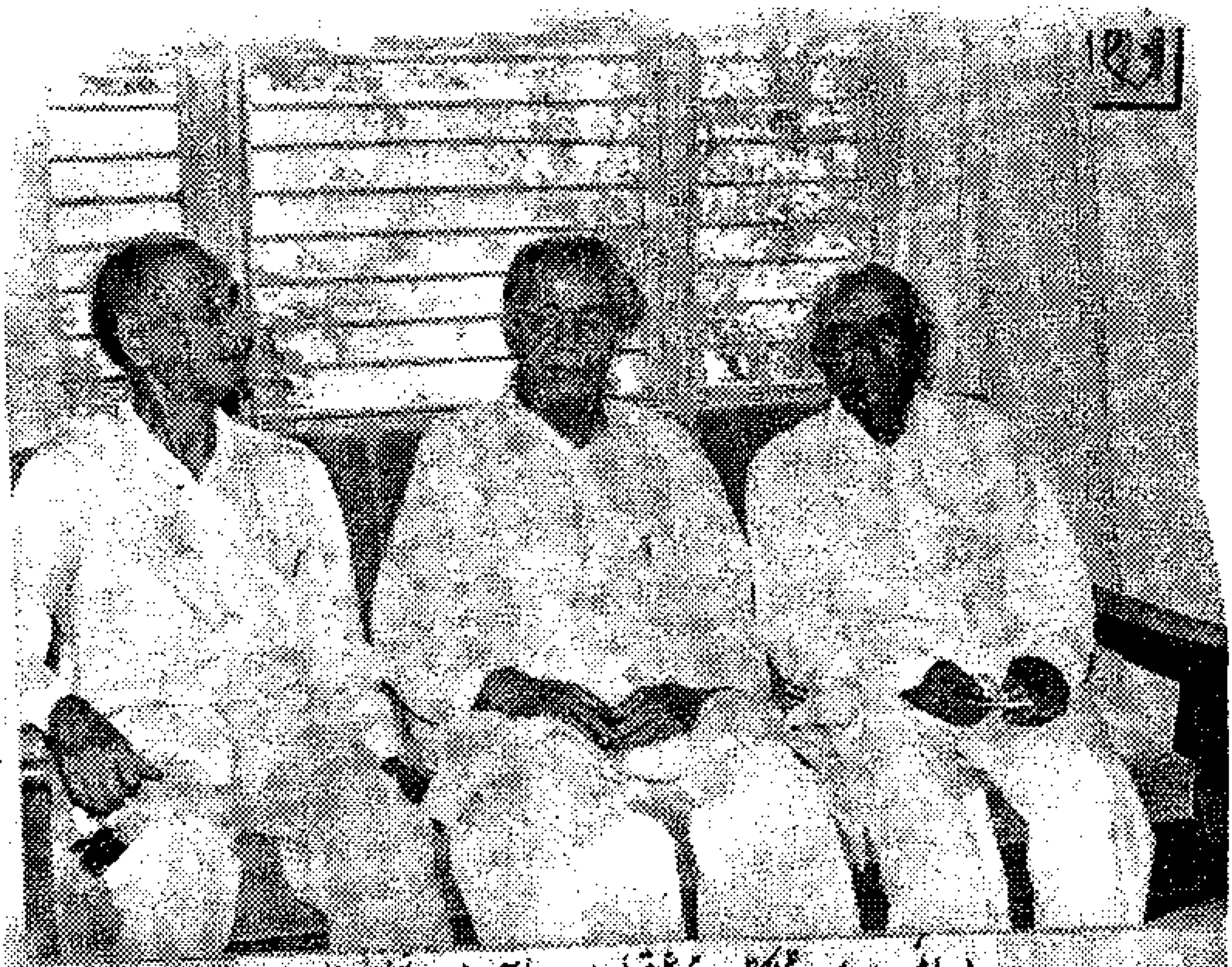

(دائیں سے) ۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل ، سردار جعفری ، عقیل الرب ،

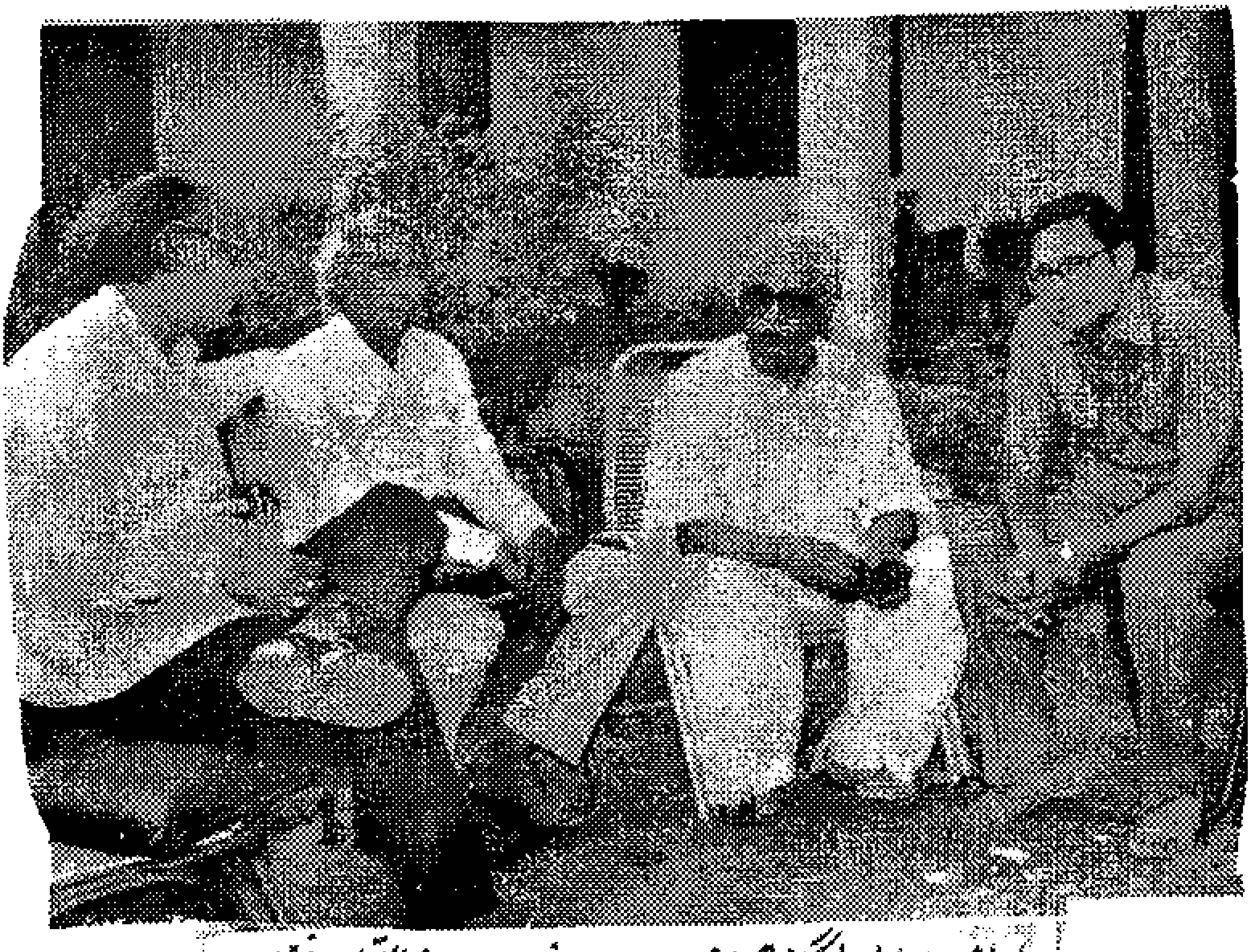

(دائیں سے) اسرار گاندھی ، مجروح سلطانپوری ، سید محمد عقیل ، فضل امام

www.taemeernews.com

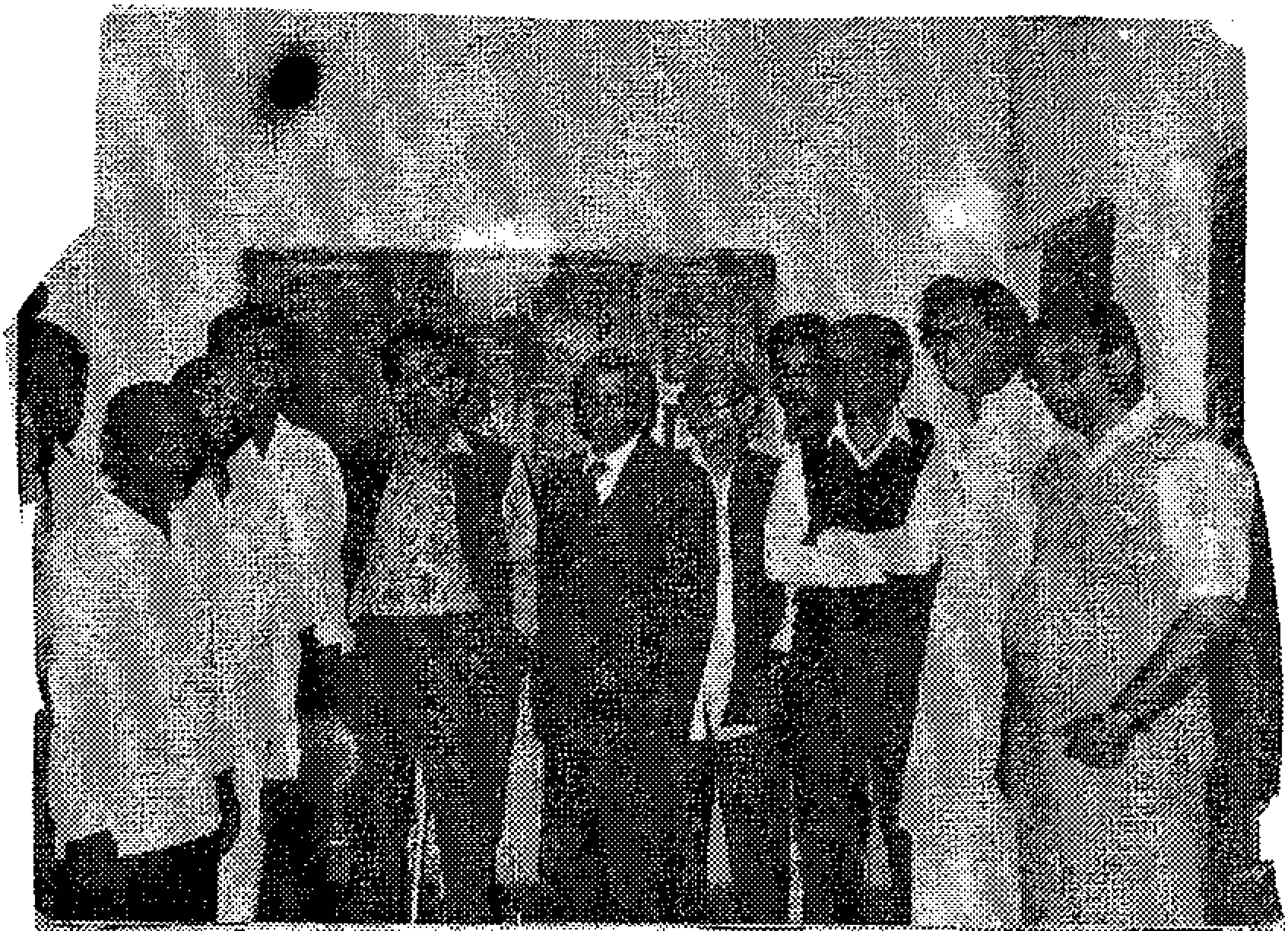

(دائیں سے) ۔ اسرار گاندھی، شبنم نقوی، علی احمد فاطمی، نیر عاقل، چندر پرکاش جوہر بجنوری، سید محمد عقیل، شمس الرحمٰن فاروقی، کامل اختر، چودھری ابن النصیر، وحید، عرفان علیمی (دسمبر ۹۲)

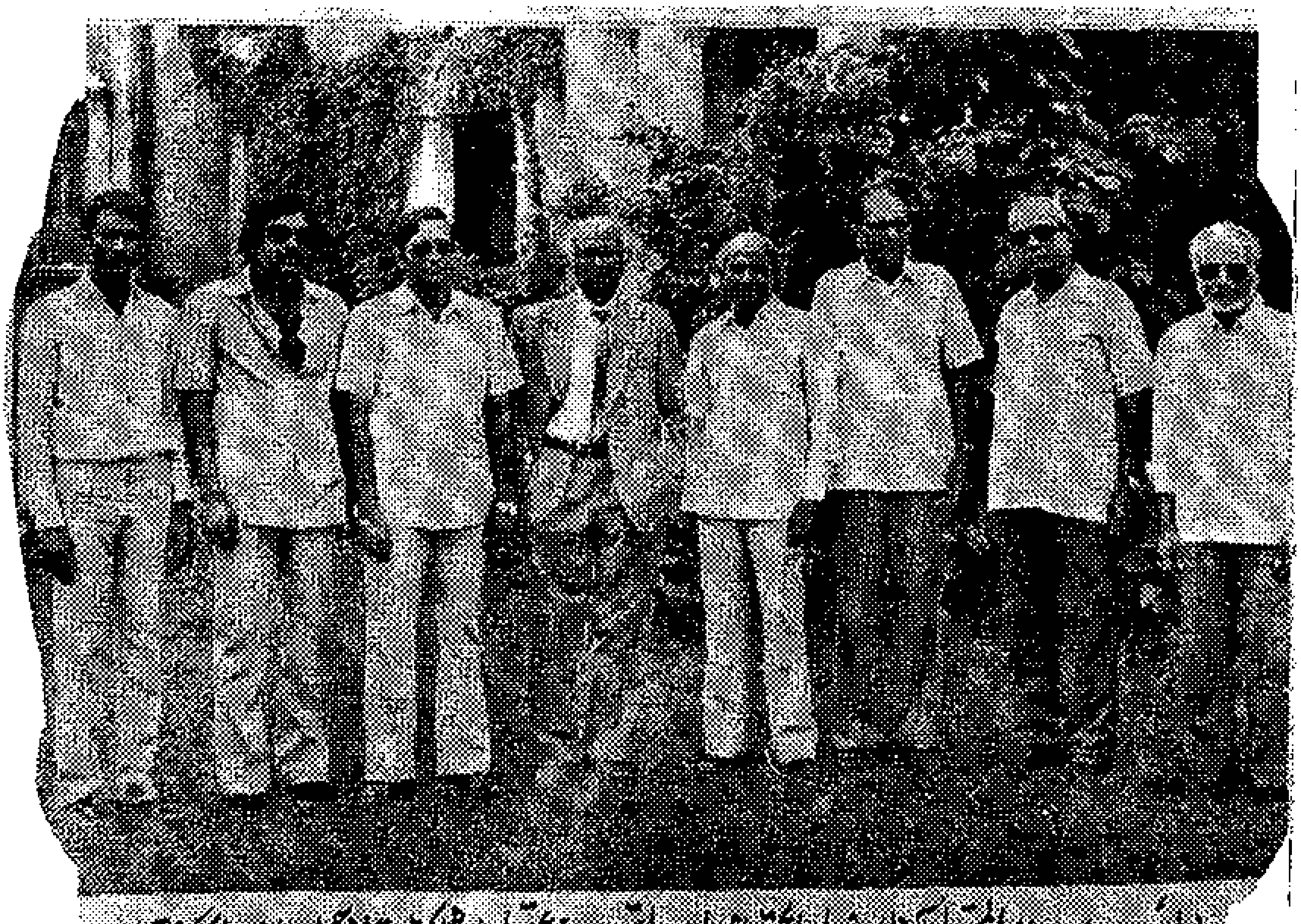

(دائیں سے) سید ابوالمجتبیٰ آغا، ضیاء الحق، مسلم صدیقی، سید محمد عقیل، ڈاکٹر ممتاز حسین، اسرار گاندھی

www.taemeernews.com

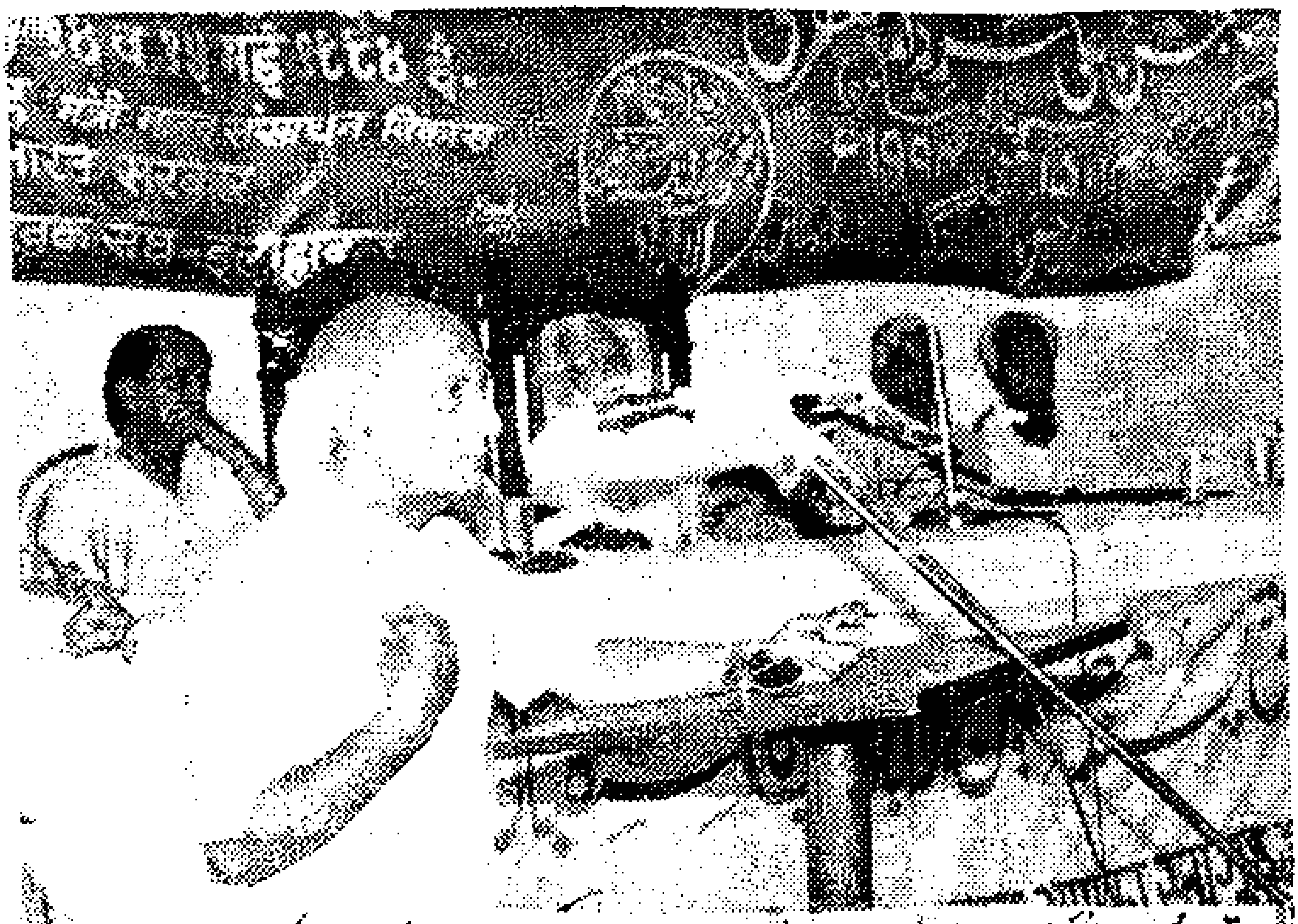

قمر رئیس، بشمبھر ناتھ پانڈے، محمود الحسن رضوی، عابد سہیل، (سید محمد عقیل خطاب کرتے ہوئے)

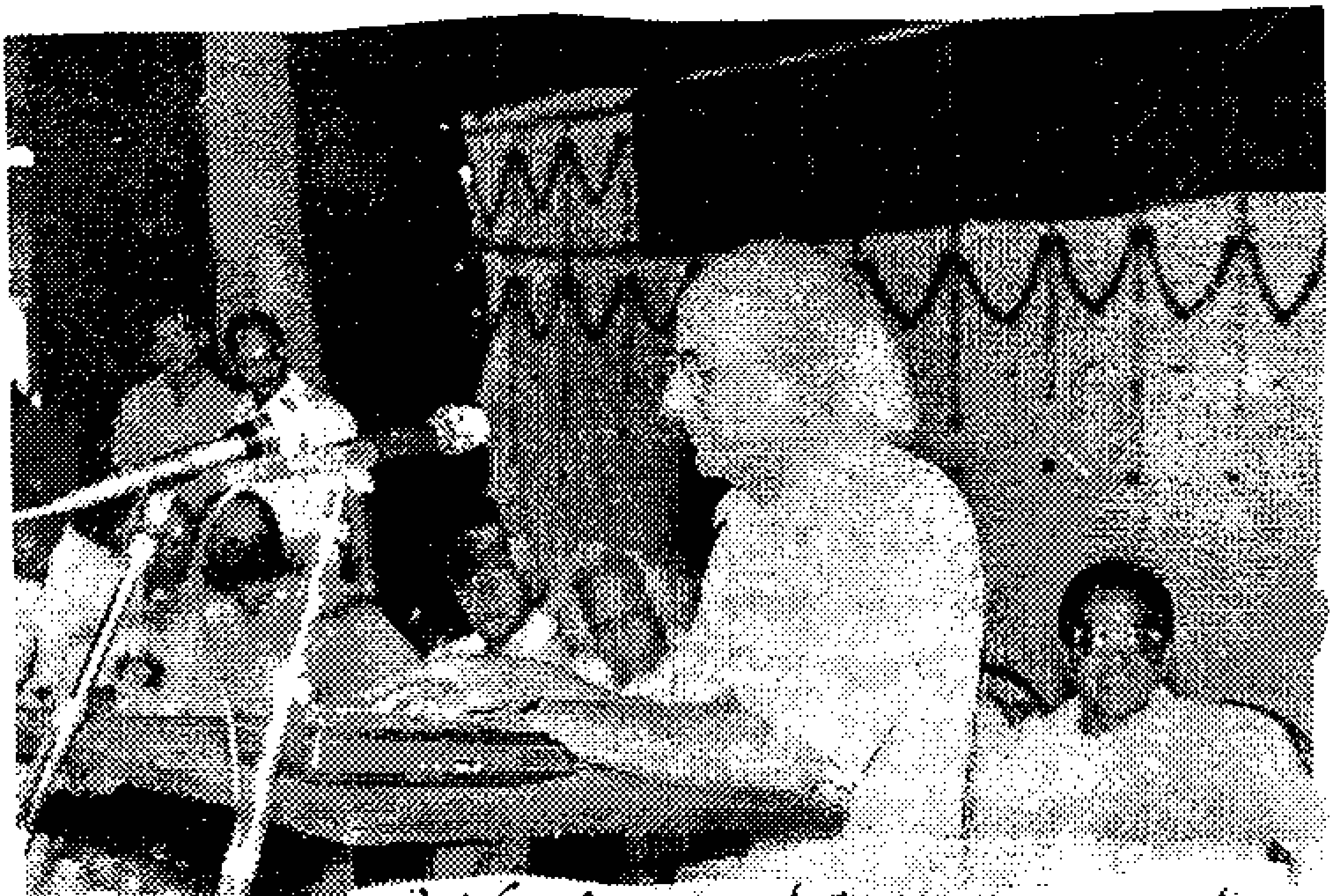

(بیٹھے ہوئے دائیں سے) یوسف ناظم، شہریار، قمر رئیس، بھیروں پرشاد گپت، کیفی اعظمی، سید محمد عقیل (خطاب کرتے ہوئے)

سید محمد عقیل (نیلو) صاحبزادی علی احمد فاطمی ، سید ظہور قاسم ، محمود الحسن رضوی

تقریب

باقر نقوی

انجمنِ فکر و فن

پروفیسر عقیل رضوی - جاوید اقبال ستار - باقر نقوی - عطاء الحق قاسمی اور عقب میں ڈاکٹر صفات احمد علوی -

www.taemeernews.com

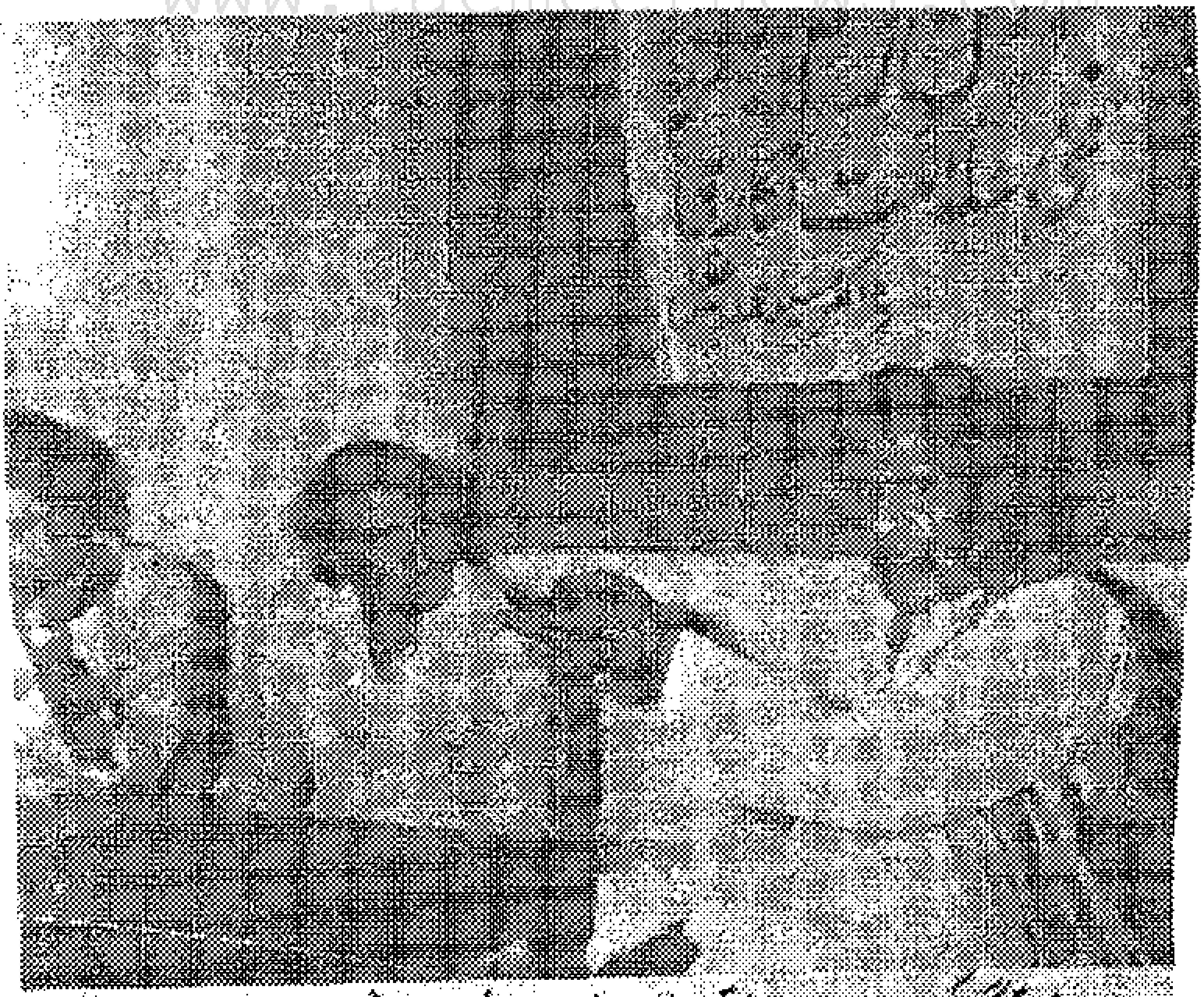

فراق گورکھپوری، سید محمد عقیل اور علی احمد فاطمی - (مئی ۱۹۸۰)

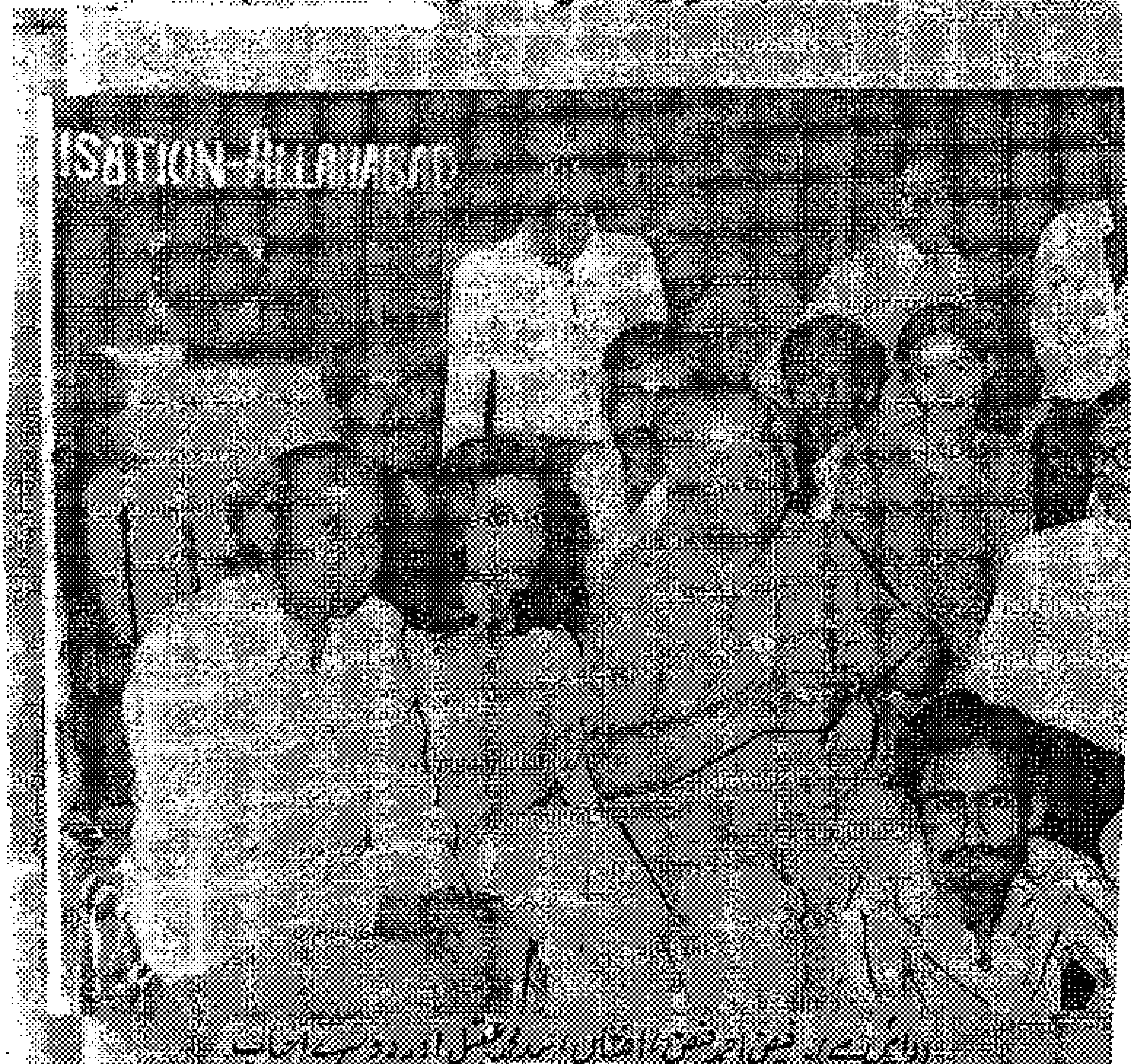

دائیں سے: فیض احمد فیض، احتشام، سید محمد عقیل اور دوسرے احباب

www.taemeernews.com

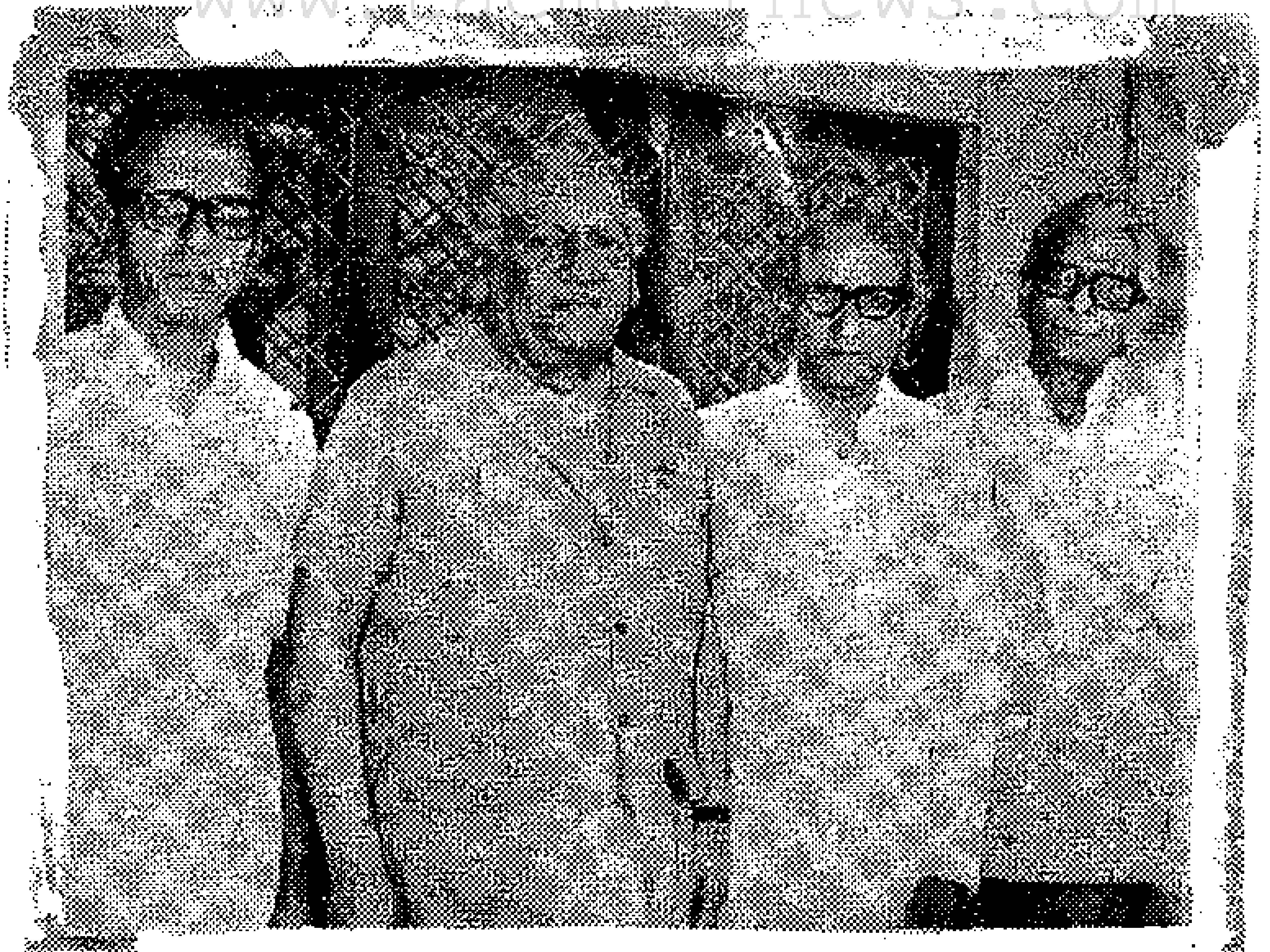

(دائیں سے) - اوپیندر ناتھ اشک، ڈاکٹر سید محمد عقیل، فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد حسن (اپریل ۸۳ء)

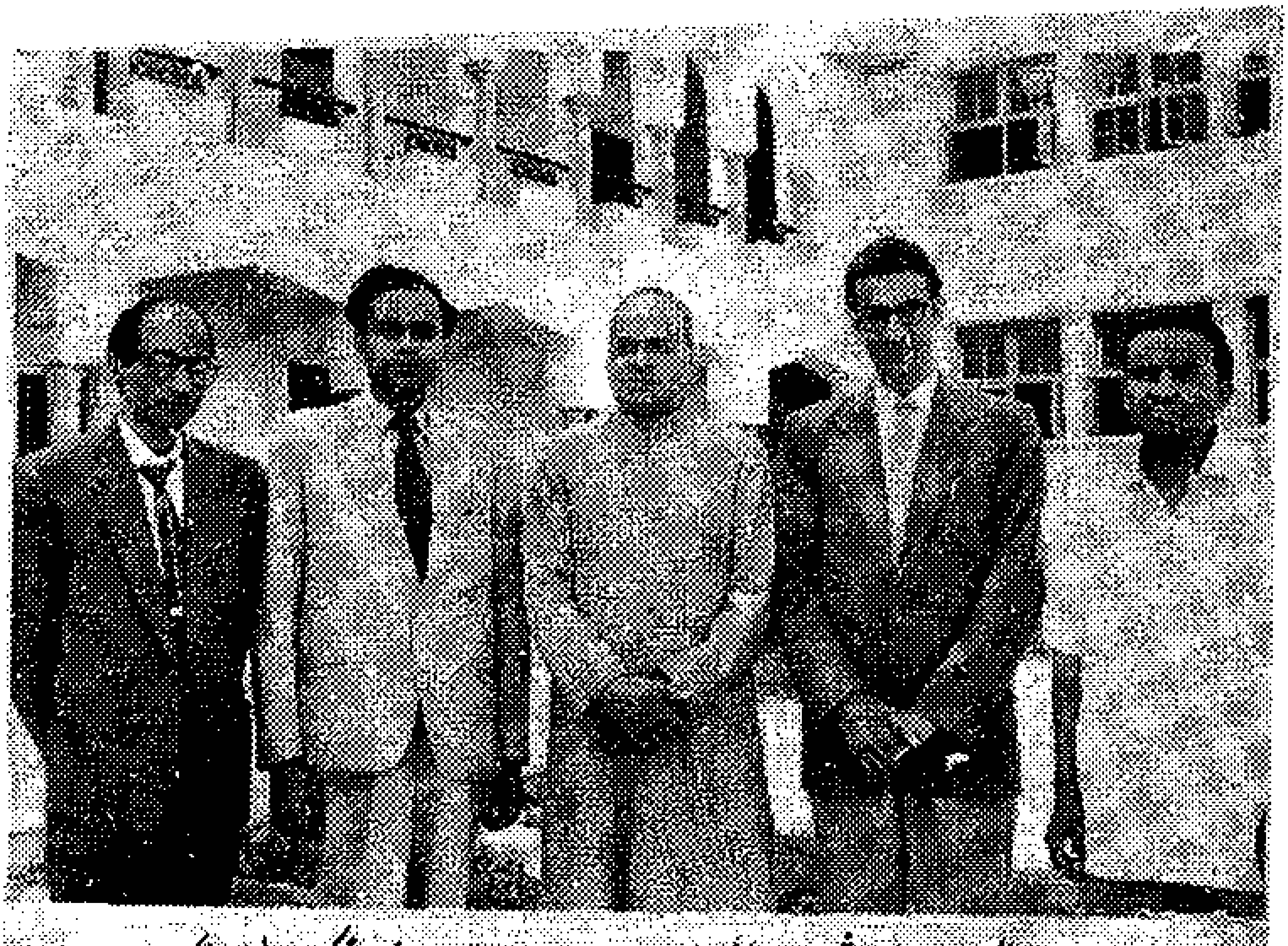

پروفیسر محمد شریف، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر شکیل الرحمن، ڈاکٹر سید محمد عقیل۔

(بائیں سے) سید محمد عقیل، احتشام حسین، بچا حکیم اللہ، عظمتون، محروف، ماسٹر اگروال، نامعلوم
مددگار حسین رضوی، آرے جین۔ (بیٹھے ہوئے بائیں سے) تاتیانا، بیلاریتا، شرف جہاں
نامعلوم (ادیب تاشقندی) اپریل ۱۹۷۰ء

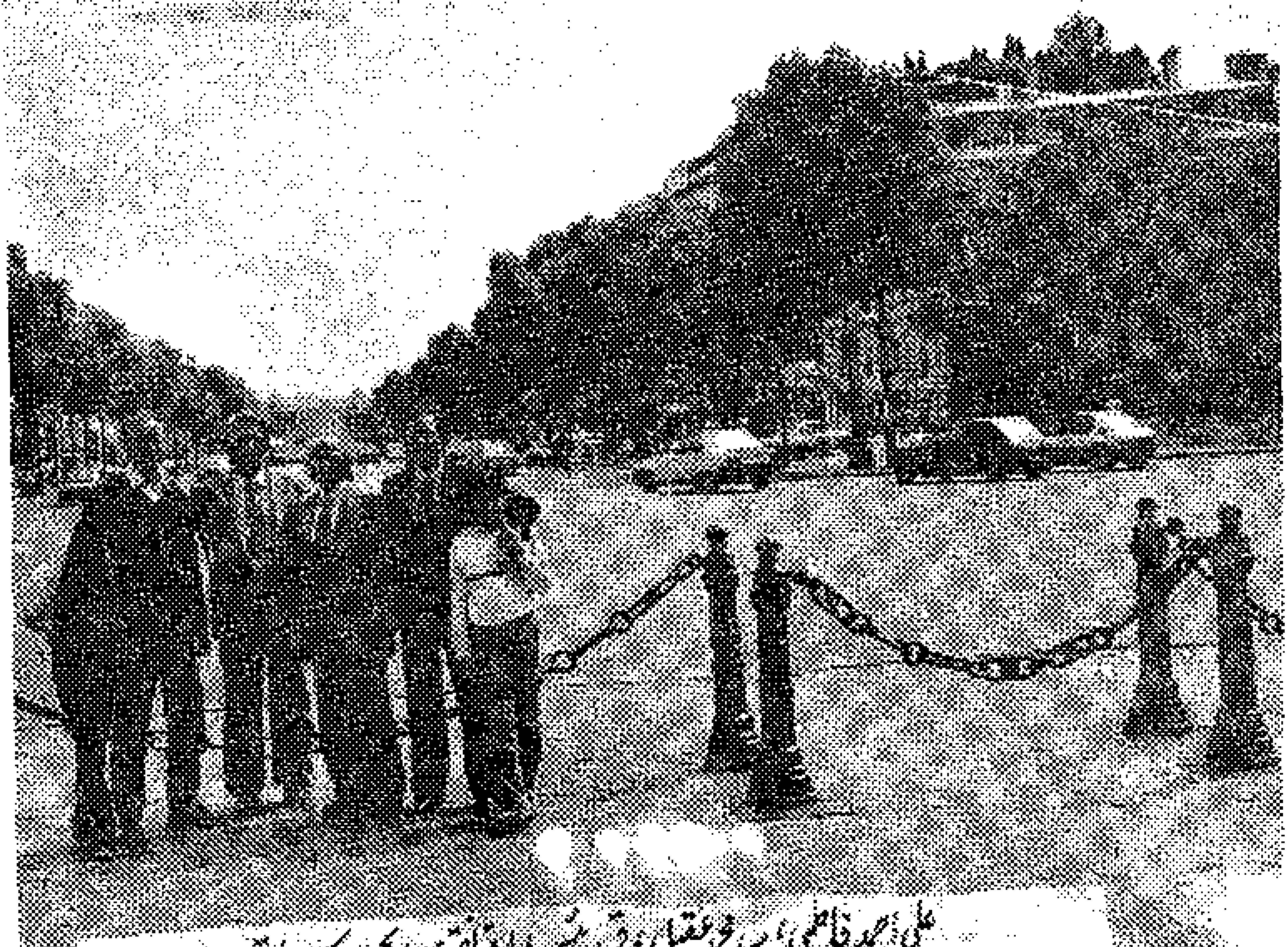

علی احمد فاطمی، سید محمد عقیل، قمر رئیس، اطہر نقوی اپنے بچوں کے ساتھ پیرس ۱۹۸۵ء)

www.taemeernews.com

(بیٹھے ہوئے دائیں سے) اجمل اجملی، ممتاز حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سید محمد عقیل (خطاب کرتے ہوئے)

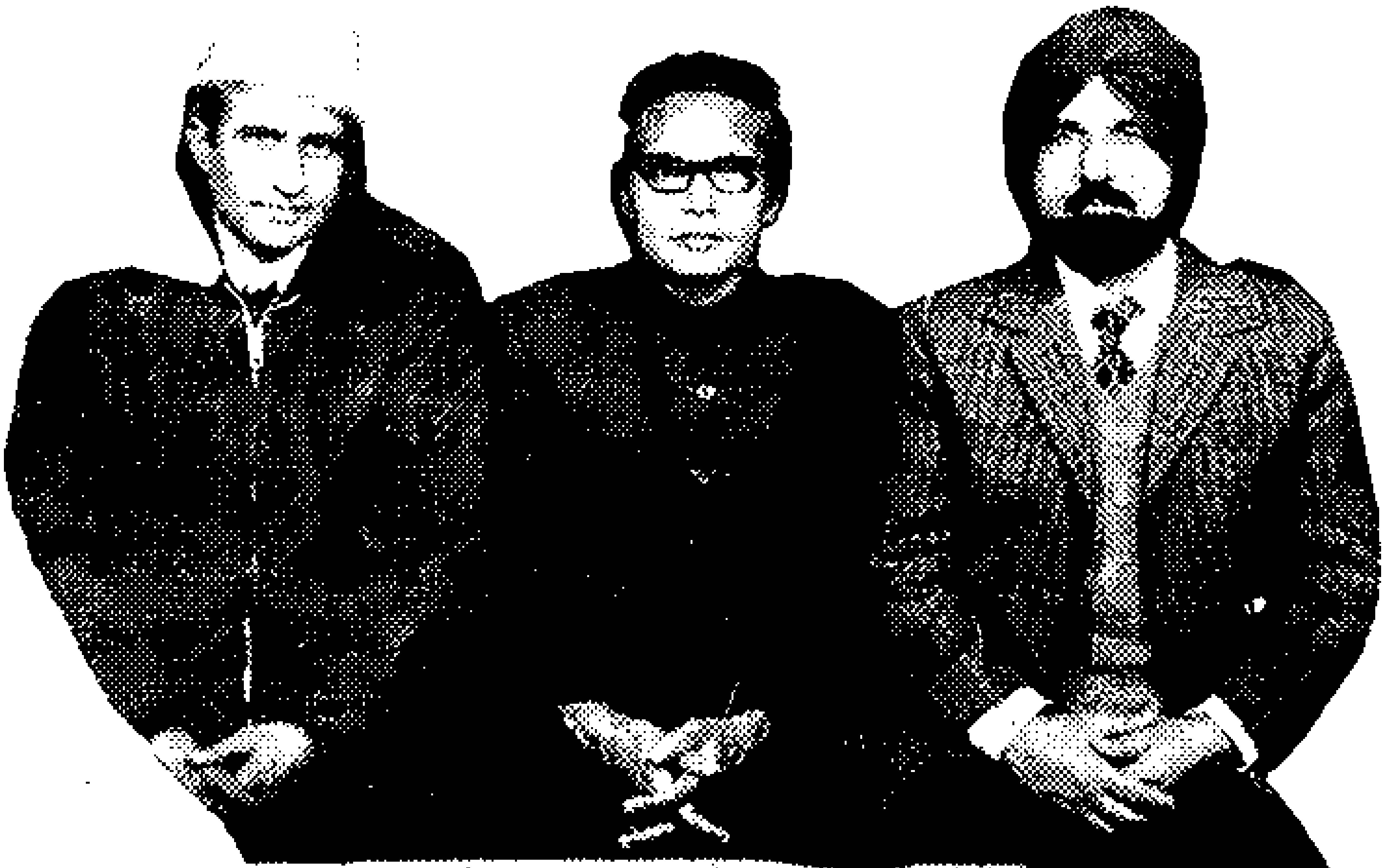

بلونت سنگھ، قاضی عبدالستار، سید محمد عقیل

www.taemeernews.com

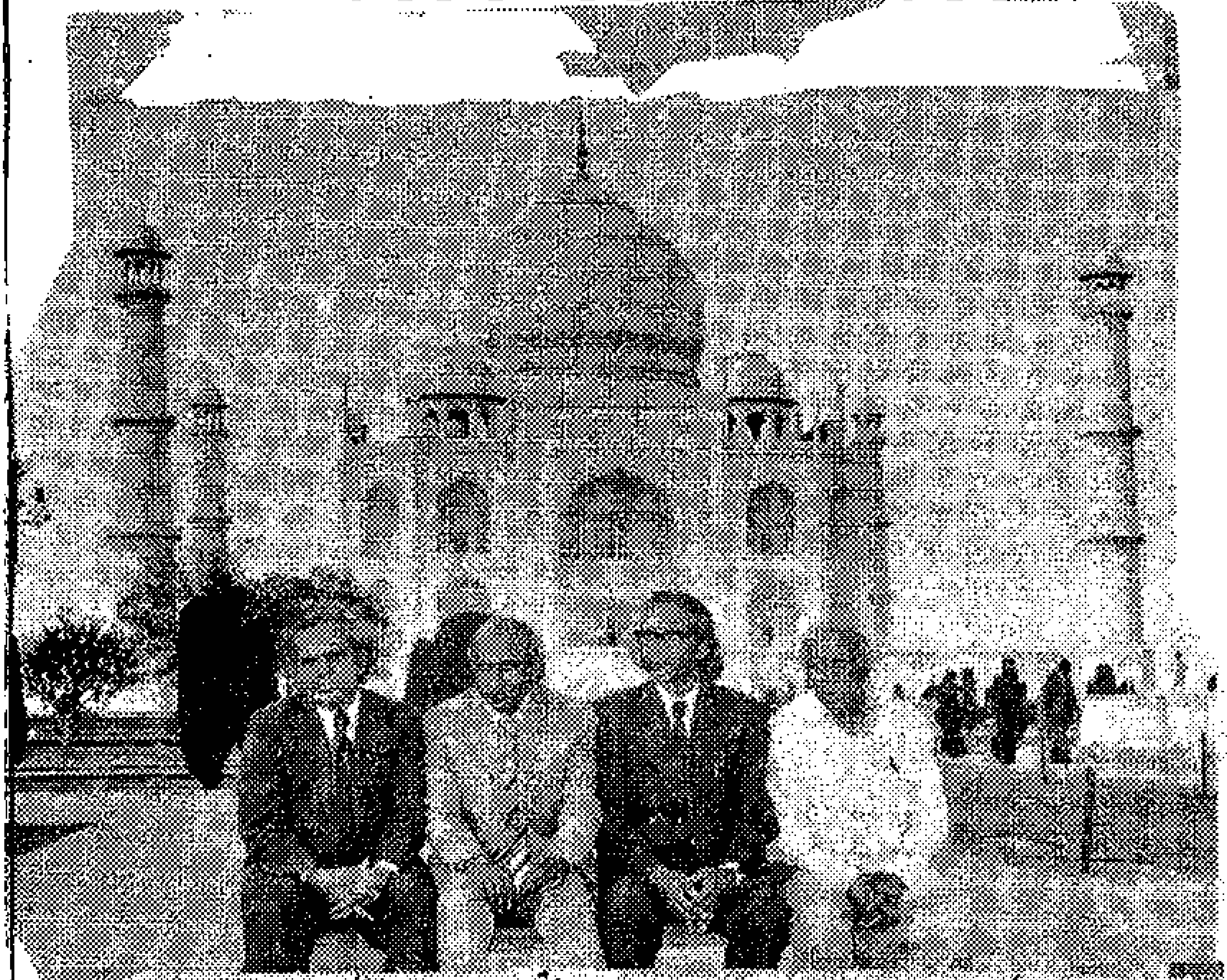

(دائیں سے) معین احسن جذبی، قاضی عبدالستار، سید محمد عقیل اور انجم اعظمی (آگرہ ۱۹۸۰ء)۔

مہادیوی ورما، ڈاکٹر سید محمد عقیل، اوپندر ناتھ اشک، فیض احمد فیض سے خطاب کرتے ہوئے (اردو)

www.taemeernews.com

احمد یوسف ، اقبال متین ، انتظار حسین (خطاب کرتے ہوئے) سید محمد عقیل)

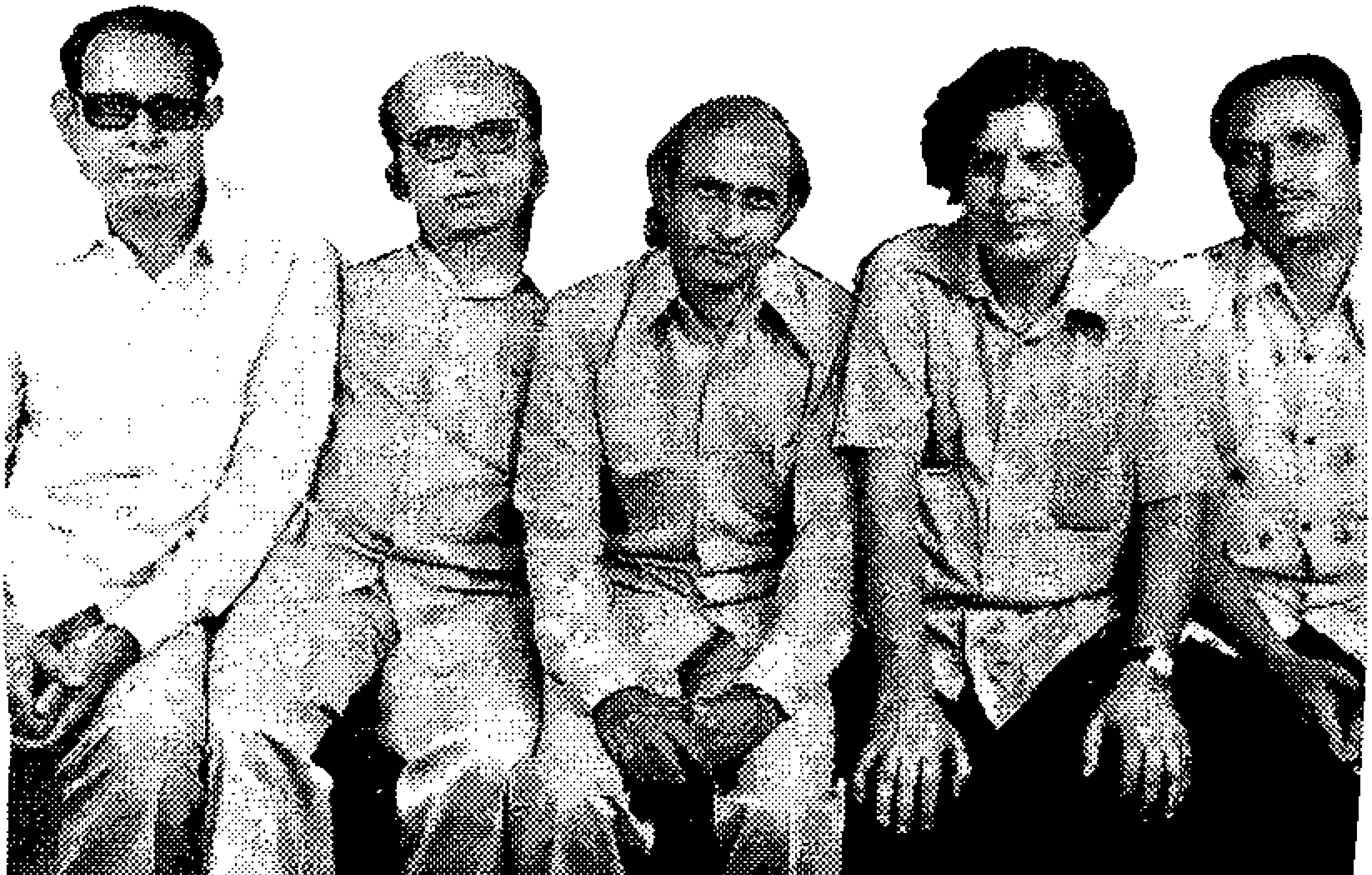

(بائیں سے) احمد یوسف ، اقبال متین ، سید محمد عقیل ، احمد ہمیش ، ذوالفقار صدیقی ۔

www.taemeernews.com

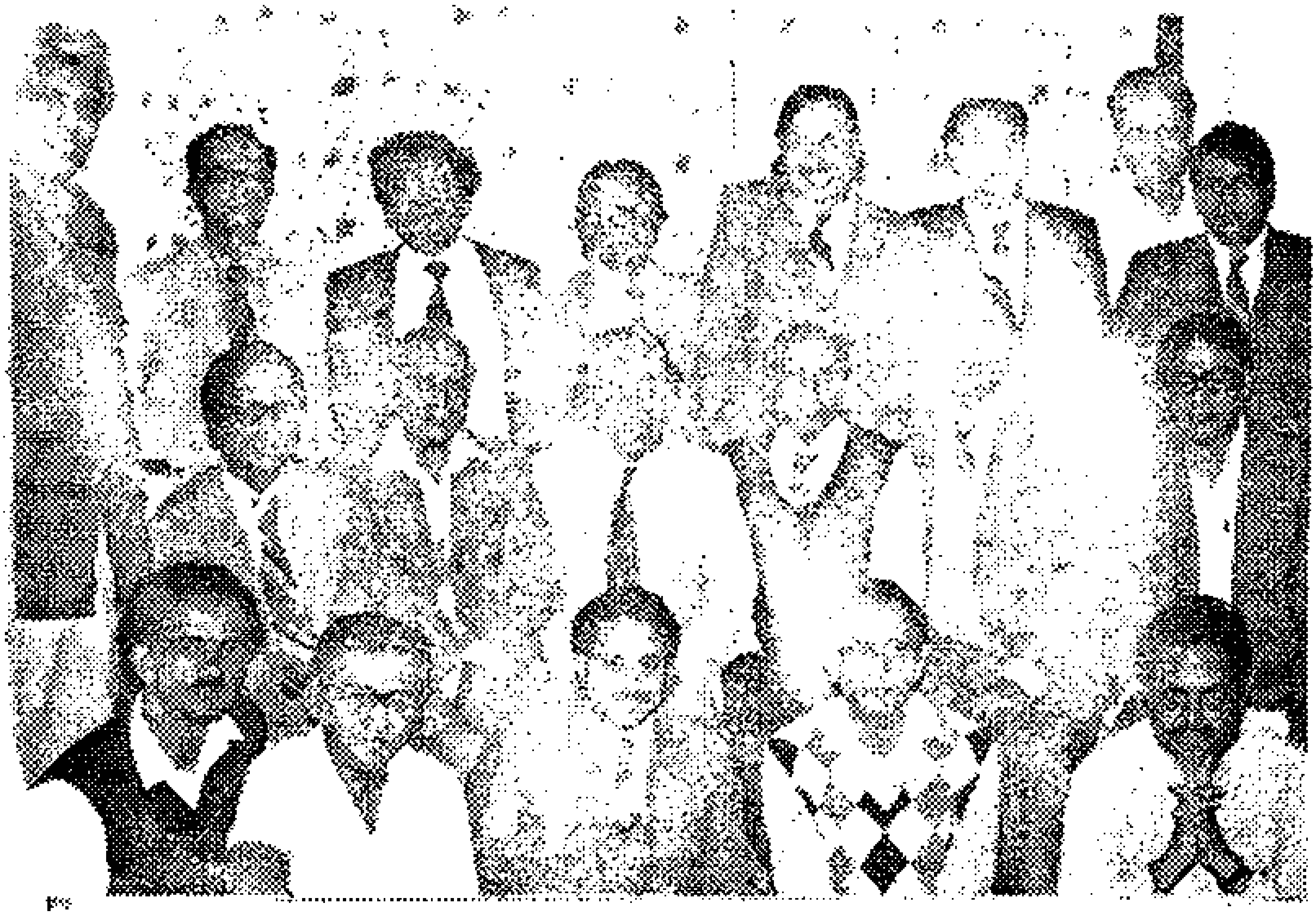

(کھڑے ہوئے بائیں سے) رشید رنگا رچید، شین اختر صدیقی، رحمن تیواری، وہاب اشرفی، نامعلوم، فضل امام
لطف الرحمٰن۔ دوسری صف، محمد حسن، شاہد مدنی، نا۔ ۔ فاروق، سید محمد عقیل، قمر رئیس، حقی ناگپوری
بیٹھے تیسری صف، علی احمد فاطمی، عاشور کاظمی، اعجاز علی ارشد، قمر غوری، آفاقی آدمی (نامعلوم) لندن ۱۹۸۹ء

دائیں سے، شارب ردولوی، نامعلوم، سید محمد عقیل، عاشور کاظمی، اشفاق حسین

www.taemeernews.com

یوم حسرت منعقدہ

مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد

۱۰ جنوری ۱۹۶۳ء

دائیں سے بائیں - نعیم مفتی صدیقی - سید محمد عقیل رضوی - عبدالله ولی بخش قادری - پرنسپل ریاض الدین احمد ڈاکٹر سید اعجاز حسین - پروفیسر اظہر فاروقی - اجمل اجملی -

www.taemeernews.com

گئودھول

خود نوشت سوانح حیات

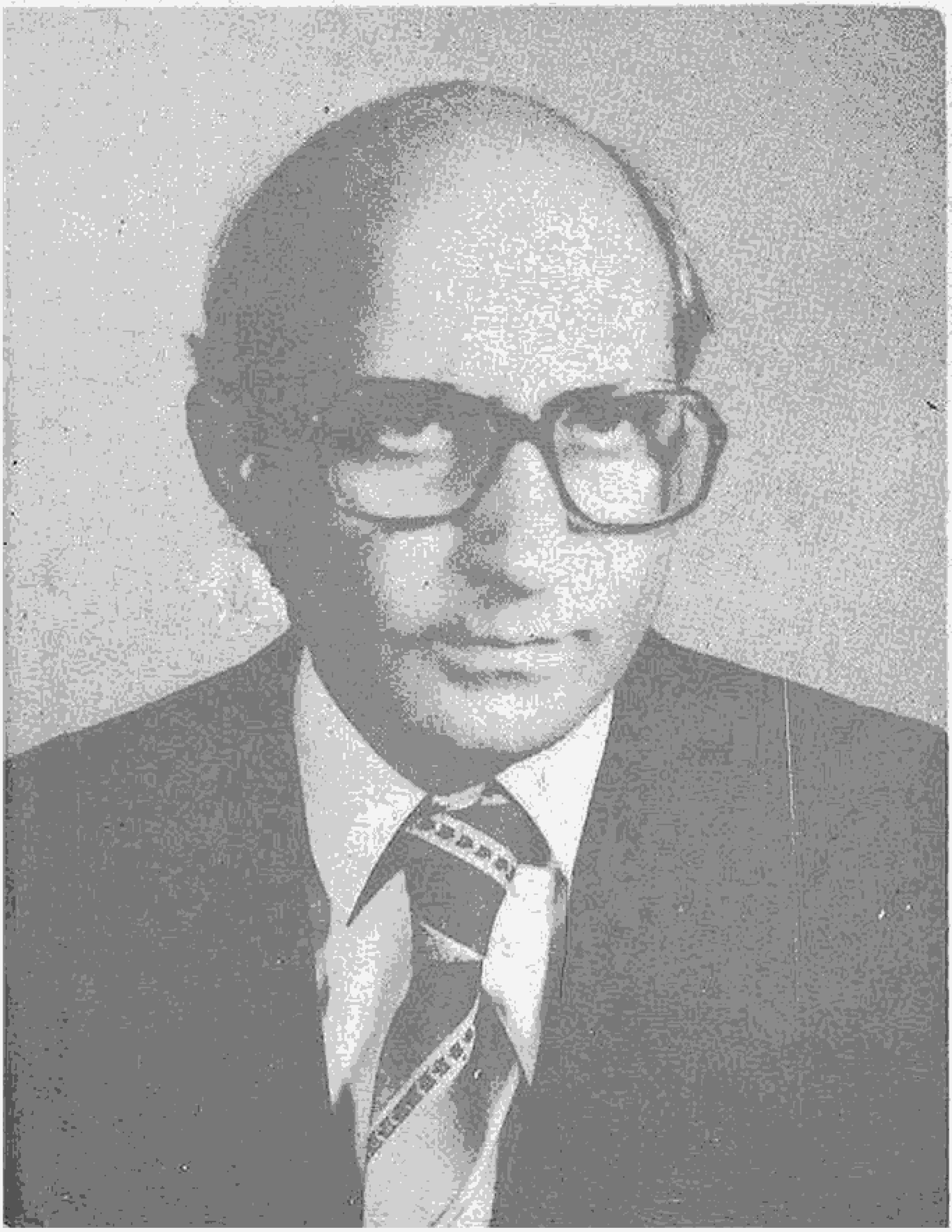

سید محمد عقیل